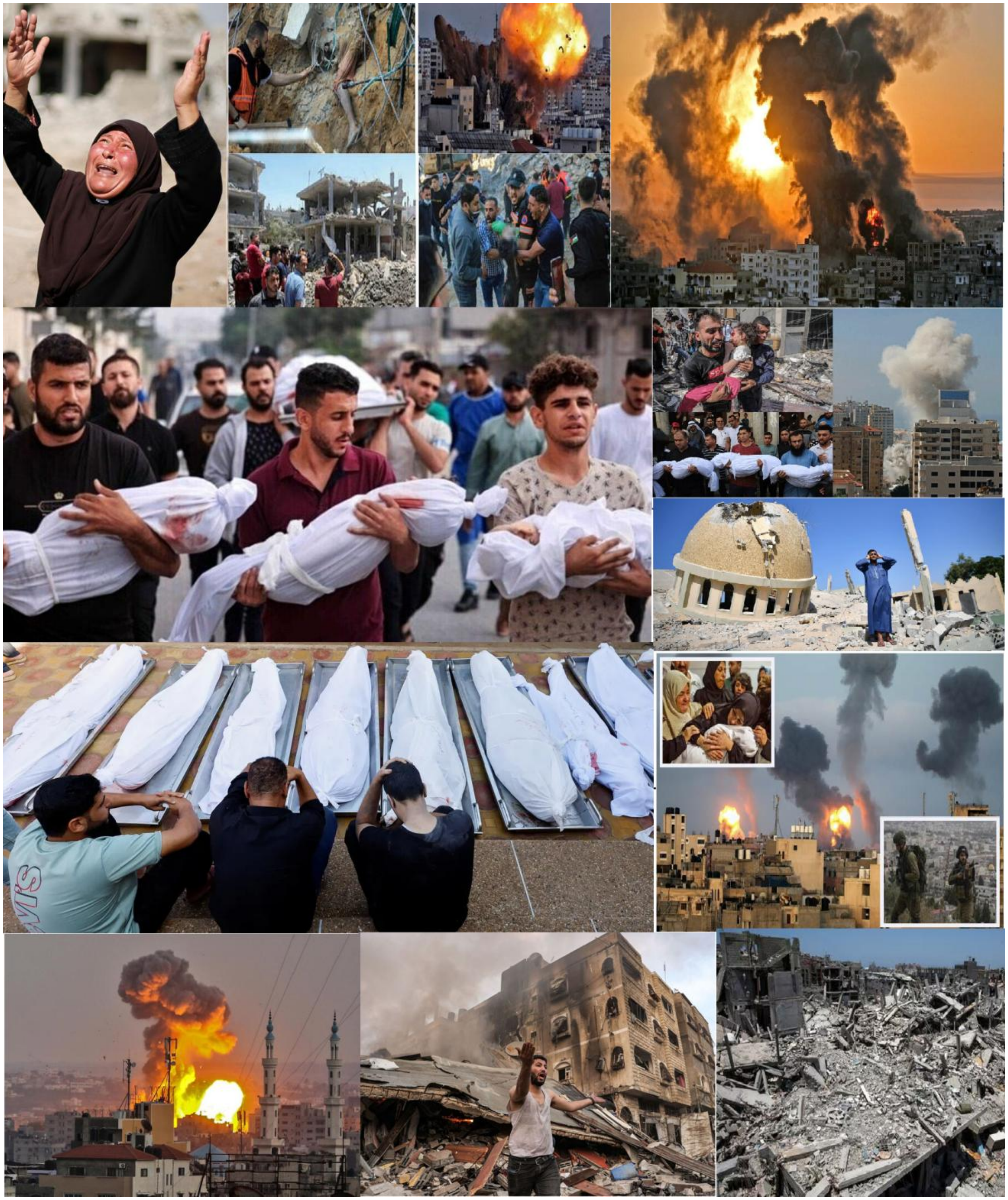

حدیثِ حریت

سمیع اللہ ملک

حدیثِ حریت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی
الۡاَرۡضِ کَمَااسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ
الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ
لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ
﴿النور:۵۵﴾

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں (النور۔۵۵)

انتساب

اے غزہ: تو اتنا لاوارث کیوں ہے؟

غزہ فلسطین کے مظلوم، مجبور و مقہور باسیوں کے نام
جنھوں نے بہادری واستقامت کی تاریخ رقم کر دی

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے
مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

فہرست مضامین حدیثِ حریت

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	ماضی کی گواہی:1947ء کے سانحے کی عکاسی	بروز سوموار20ربیع الاول1446ھ23ستمبر2024ء	9
2	ذہنی مریض	بروز جمعتہ المبارک24ربیع الاول1446ھ27ستمبر2024ء	16
3	میں کون ہوں	بروزہفتہ25ربیع الاول1446ھ28ستمبر2024ء	21
4	اپنی باری کاانتظار	بروز منگل28ربیع الاول1446ھ29ستمبر2024ء	27
5	گریٹراسرائیل کامنصوبہ:تاریخ،سیاست اور حقیقت	بروزبدھ29ربیع الاول1446ھ2/اکتوبر2024ء	29
6	پاکستان کامقدمہ	بروز جمعتہ المبارک یکم ربیع الآخر1446ھ4/اکتوبر2024ء	34
7	ایران اسرائیل تنازعہ:عالمی چیلنج	بروزہفتہ2ربیع الآخر1446ھ5/اکتوبر2024ء	37
8	امریکی پابندیوں کااثر۔چین اورپاکستان کاردعمل	بروز سوموار4ربیع الآخر1446ھ7/اکتوبر2024ء	42
9	طوفان سے قبل خاموشی	بروزبدھ6ربیع الآخر1446ھ9/اکتوبر2024ء	47
10	اسرائیل:امریکاکاکرائے کاسپاہی	بروز جمعتہ المبارک8ربیع الآخر1446ھ11/اکتوبر2024ء	52
11	خون کی ندیاں بہانے میں ہوئیں صدیاں تمام	بروزاتوار10ربیع الآخر1446ھ13/اکتوبر2024ء	58
12	قیامت کی چاپ:اسرائیل عالمی جنگ	بروز منگل12ربیع الآخر1446ھ15/اکتوبر2024ء	63
13	اگر ایساہواتو۔۔۔۔	بروزبدھ13ربیع الآخر1446ھ16/اکتوبر2024ء	68
14	ایران کے جوہری اہداف	بروز جمعرات14ربیع الآخر17/اکتوبر2024ء	71
15	تحریکِ پاکستان کی بنیادیں اوراغیار کی سازشیں	بروزہفتہ16ربیع الآخر1446ھ19/اکتوبر2024ء	74
16	عالمی طاقتوں کی مداخلت اور مظالم کی داستان	بروزبدھ20ربیع الآخر1446ھ23/اکتوبر2024ء	82
17	یحییٰ سنوار کی جگہ کون لے گا	بروز جمعرات21ربیع الآخر1446ھ24/اکتوبر2024ء	85
18	بحیرہ روم کاآتشیں مستقبل:تنازعات کی سمت	بروزہفتہ23ربیع الآخر1446ھ26/اکتوبر2024ء	90
19	ایرانی میزائل پروگرام:تاریخ،ترقی اور موجودہ	بروز سوموار25ربیع الآخر1446ھ28/اکتوبر2024ء	95
20	ماضی کی گونج:آج کے امریکی مسلمان	بروز جمعرات28ربیع الآخر1446ھ31/اکتوبر2024ء	103
21	امریکی دستاویزات لیک:مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی	بروزاتوار یکم جمادی الاول1446ھ3نومبر2024ء	110
22	امریکی اقداراورٹرمپ	بروز منگل3جمادی الاول1446ھ5نومبر2024ء	115
23	آزادیِ اظہاراور حدود کاتوازن	بروز جمعتہ المبارک6جمادی الاول1446ھ8نومبر2024ء	121
24	قومی خزانے پرعدالتی مراعات کابوجھ	بروزاتوار8جمادی الاول1446ھ10نومبر2024ء	125
25	اقبال کایقینِ کامل اور قومیت کاناسور	بروز منگل10جمادی الاول1446ھ12نومبر2024ء	130
26	ایٹمی پاکستان:امریکی اوراسرائیلی مفادات کااصل	بروز جمعتہ المبارک13جمادی الاول1446ھ15نومبر24ء	135

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	ٹرمپ کی کابینہ کے اہم ارکان: نامزدگیوں کا تجزیہ	بروز اتوار 15 جمادی الاول 1446ھ 17 نومبر 2024ء	140
28	ٹرمپ اور مشرقِ وسطیٰ: جنگ، امن یا حل	بروز منگل 17 جمادی الاول 1446ھ 19 نومبر 2024ء	145
29	کیا امریکا کے دن گزر چکے ہیں؟	بروز جمعرات 19 جمادی الاول 1446ھ 21 نومبر 2024ء	150
30	روس اور امریکا میں کشیدگی	بروز ہفتہ 21 جمادی الاول 1446ھ 23 نومبر 2024ء	154
31	سعودی عرب اور ایران کے تعلقات میں تبدیلی	بروز سوموار 23 جمادی الاول 1446ھ 25 نومبر 2024ء	159
32	عرب دنیا میں فلسطین: یکجہتی یا سیاسی مفادات؟	بروز بدھ 25 جمادی الاول 1446ھ 27 نومبر 2024ء	163
33	جوہری خطے میں ڈرونز: جنگی ٹیکنالوجی کی نئی حقیقت	بروز جمعتہ المبارک 27 جمادی	168
34	انا کی موت: زندگی کی حقیقت	بروز اتوار 29 جمادی الاول 1446ھ یکم دسمبر 2024ء	173
35	یورپ میں چین کی بڑھتی ہوئی موجودگی	بروز سوموار یکم جمادی الآخر 1446ھ 2 دسمبر 2024ء	176
36	انصاف کی جنگ: عالمی عدالت اور اسرائیل	بروز بدھ 3 جمادی الآخر 1446ھ 4 دسمبر 2024ء	181
37	چین کی عالمی عسکری ڈپلومیسی اور امریکا	بروز ہفتہ 6 جمادی الآخر 1446ھ 7 دسمبر 2024ء	186
38	بشارالاسد کا اقتدار اور فرار	بروز سوموار 8 جمادی الآخر 1446ھ 9 دسمبر 2024ء	191
39	کرم کا تنازعہ: فرقہ وارانہ کشیدگی یا عالمی سیاست۔	بروز بدھ 10 جمادی الآخر 1446ھ 11 دسمبر 2024ء	196
40	ٹرمپ کا امن منصوبہ اور سعودی ردعمل	بروز جمعرات 11 جمادی الآخر 1446ھ 12 دسمبر 2024ء	200
41	مالیاتی عالمی نظام میں یو آن اور ڈالر کا مستقبل	بروز ہفتہ 13 جمادی الآخر 1446ھ 14 دسمبر 2024ء	205
42	مشرقِ وسطیٰ: اسرائیل، فلسطین اور عالمی سیاست	بروز سوموار 15 جمادی الآخر 1446ھ 16 دسمبر 2024ء	210
43	خوف کی زنجیریں	بروز جمعرات 18 جمادی الآخر 1446ھ 19 دسمبر 2024ء	215
44	شام کی ممکنہ تقسیم کا خطرہ اور اسرائیلی کردار	بروز جمعتہ المبارک 19 جمادی الآخر 1446ھ 20 دسمبر 2024ء	218
45	ہتھیاروں کی دوڑ اور امریکی دہرا معیار	بروز اتوار 21 جمادی الآخر 1446ھ 22 دسمبر 2024ء	223
46	عرب بہار کا عفریت اور گریٹر اسرائیل	بروز بدھ 24 جمادی الآخر 1446ھ 24 دسمبر 2024ء	231
47	ایران کے داخلی اور خارجی چیلنجز: پیچیدہ صورتحال	بروز ہفتہ 27 جمادی الآخر 1446ھ 28 دسمبر 2024ء	235
48	بھارت کی بحری توسیع پسندی: چیلنجز اور حقیقت	بروز اتوار 28 جمادی الآخر 1446ھ 29 دسمبر 2024ء	240
49	شام کی پیچیدگیاں اور مستقبل کی پیشین گوئیاں	بروز منگل 30 جمادی الآخر 1446ھ 31 دسمبر 2024ء	245
50	خوش گمانی یا بد گمانی	بروز جمعرات 2 رجب المرجب 1446ھ 2 جنوری 2025ء	250
51	روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ	بروز ہفتہ 4 رجب المرجب 1446ھ 4 جنوری 2025ء	255
52	امریکا: اسلام فوبیا کی تاریخ	بروز منگل 7 رجب المرجب 1446ھ 7 جنوری 2025ء	261
53	زہر کا پیالہ	بروز جمعتہ المبارک 10 رجب 1446ھ 10 جنوری 2025	268
54	شہادت کا رقصِ بسمل	بروز سوموار 13 رجب المرجب 1446ھ 13 جنوری 2025ء	275

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
55	طالبان اور خطے کے ممالک: ایک نئی تزویراتی حقیقت	بروز بدھ 15 رجب المرجب 1446ھ 15 جنوری 2025ء	280
56	بنگلہ دیش اور انڈیا: سیاسی تناؤ اور کشیدگی	جمعتہ المبارک 17 رجب المرجب 1446ھ 17 جنوری 2025ء	286
57	کرپشن مافیا: سزا و جزا	بروز سوموار 20 رجب المرجب 1446ھ 20 جنوری 2025ء	291
58	لڑادے ممولے کو شہباز سے	بروز بدھ 22 رجب المرجب 1446ھ 22 جنوری 2025ء	296
59	سوشل میڈیا کا مؤثر اور مثبت استعمال: ایک ضرورت	بروز جمعتہ المبارک 24 رجب 1446ھ 24 جنوری 2025ء	301
60	پاک بنگلہ دیش: دفاعی تعاون کی اہمیت	بروز اتوار 26 رجب المرجب 1446ھ 26 جنوری 2025ء	306

ماضی کی گواہی: 1947ء کے سانحے کی عکاسی

تحریکِ پاکستان کا مطالعہ ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے۔ اس تحریک کی خون کو گرما دینے والی رُوددادیں اوراس کے کارکنوں اور لیڈروں کی جدوجہد، جذبوں اور قربانیوں کی ولولہ انگیز داستانیں پڑھتے ہوئے میرے دل ودماغ پر ایک عجب سُرور کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس تحریکِ پاکستان کا موضوع کھول لیا۔ دورانِ مطالعہ کئی نئی معلومات اور حقائق سال بھی اگست کا مہینہ آیا تو اپنی یادداشتیں تازہ کرنے کیلئے ایک بار پھر سامنے آئے، غوروفکر کے نئے دریچے واہوئے، لیکن اسی دوران ہمیشہ کی طرح ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے بے بس اور لاچار مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ظلم وستم اور غارت گری کے بے شمار واقعات بھی پڑھے۔ ان میں سے کچھ حقائق اور واقعات اس قدر رُوح فرسا تھے کہ ذہن سے چپک کر رہ گئے۔ باوجود ہزار بار جھٹکنے کے جب یہ ذہن سے محو نہ ہوئے تو سوچا کہ انہیں اوراس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے چند سوالات اپنے ہم وطنوں سے شیئر کرلوں کہ شاید اس سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔

3 جون 1947ء کو ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے نام کے ساتھ ایک الگ مسلم ملک کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کیلئے 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی رات بارہ بجے کا وقت طے ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کسی خاص مصلحت یا مشیت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ یہ رات لیلۃ القدر تھی۔ اگلا دن 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع تھا اوراس کے تین روز بعد عید الفطر آنے والی تھی۔ مسلمانوں کیلئے یہ ہر اعتبار سے ایک مبارک ساعت، مبارک رات، مبارک دن، مبارک ماہ اور مبارک سال تھا۔ پورے ہندوسان کے مسلمان خواہ وہ مجوزہ پاکستان کا حصہ بننے والے تھے یا نہیں، خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ جشن کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ مبارک بادیں دی اورلی جارہی تھیں۔ نعرہ تکبیر بلند ہورہے تھے۔ گلی گلی، گاؤں گاؤں اور شہر شہر "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے لیکن دوسری طرف ہندوؤں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت، طاقتور مذہب، نامی گرامی لیڈروں، بڑی تعداد میں کانگرسی اوراحراری مسلم علماء کی معاونت اورانگریزوں کی علانیہ اور خفیہ حمایت کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کا ایک نحیف ونزار لیڈر محمد علی جناح اپنی ذہانت، فطانت، دیانت، کردار کی مضبوطی، آئینی وقانونی معاملات میں مہارت، موقف کی مضبوطی، جہدِ مسلسل اوراپنی قائدانہ صلاحیتوں کے زور پر اُن تمام کو چاروں شانے چت کر کے بھارت کا ایک حصہ پاکستان کے نام پر اُن کے ہاتھوں سے چھین لے جائے گا۔ یہ اُن کی "بھارت ماتا" یعنی اِن کی ماں کو دو ٹکڑے کرنے کے مترادف تھا۔ اُن کے ہاں سوگ برپا ہوگیا، صفِ ماتم بچھ گئیں اور آہ وبکا شروع ہوگئی۔ پھر وہ غیض وغضب اور نفرت وانتقام کی آگ کا بگولہ بن کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور پھر چشمِ فلک نے ان ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم وستم کے وہ مظاہرے دیکھے کہ انسانیت رہتی دنیا تک اِس پر ماتم کناں رہے گی۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے جب مجوزہ پاکستان کے قریبی علاقوں کے مسلمانوں نے اپنے گھر بار اور مال واسباب سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ اپنی جانیں بچانے کیلئے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا چاہی تو ہندوؤں اور سکھوں نے انہیں اپنی تلواروں، کرپانوں، برچھیوں اور نیزوں کی نوک پر رکھ لیا۔ شہروں کے شہر، قصبوں کے قصبے، گاؤں کے گاؤں اور محلوں کے محلے مسلمانوں کے وجود سے صاف کر دیئے گئے۔ اس طرح کہ بچے، جوان، بوڑھے اور بوڑھیاں تہِ تیغ کر دی گئیں اور جوان لڑکیوں اور عورتوں کو وحشیانہ آبروریزی کے بعد یا ذبح کر دیا گیا، جلادیا گیا، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا یا باندیوں کی طرح گھروں میں ڈال لیا گیا، اوران کے گھر لُوٹ لئے گئے۔ اس شیطنت اور فرعونیت کے دوران 10 لاکھ سے زائد مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو شہید کیا گیا، لاکھوں زخمی اور لاکھوں عمر بھر کیلئے معذور ہو گئے۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب جوان مسلمان لڑکیاں اور عورتیں اغوا کرلی گئیں۔ جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ

سے محروم ستر سے اسی لاکھ مسلمان ہندوستان کے مختلف علاقوں سے راستے میں اپنے پیاروں کو گنواتے، کٹواتے، مرتے اور مارتے خالی ہاتھ پاکستان ہجرت کر آئے۔ آیئے! آپ بھی اس نوع کے ہزاروں واقعات میں سے چند ایک کی جھلکیاں دیکھ لیں۔

اس ضمن میں پہلا واقعہ ایک مظلوم مسلمان عورت کی اپنی زبانی سنیے:

قیامِ پاکستان کے اعلان کے فوراً بعد شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑے۔ انسانی اور اخلاقی قدریں محض قصہ ماضی بن کر رہ گئیں۔ سالہا سال سے اکٹھے رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان حالات میں میرے والد نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مشورے کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی اور عین ہماری روانگی کے وقت آس پاس کے گاؤں سے مسلح جتھے وہاں پہنچ گئے اور چشم زدن میں تمام مردوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ نوجوان لڑکیوں کو ان کی ماؤں کے سامنے اجتماعی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ آج بھی جب میں ان دلخراش منظر کو چشم تصور سے دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ ابن آدم ذلت کی ان گہرائیوں تک بھی جا سکتا ہے۔ میرا معصوم بھائی باقی بچوں کی طرح ڈرا سا کھڑا تھا۔ جب اس نے چند حیوانوں کو میری طرف بڑھتے دیکھا جن پر میری منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا تو بھاگ کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ تبھی ایک منحنی سے ہندو نے اپنی کلہاڑی کا زوردار وار اس معصوم کی گردن پر کیا جس سے اس کا سر تن سے جدا ہو کر دُور جا پڑا۔ اس پر اس ظالم نے شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری گردن اتنی کمزور ہے تو اپنی کلہاڑی تمہارے گندے خون سے بھرشٹ (ناپاک) نہ کرتا۔ اب مجھے اپنی کلہاڑی گنگا جل سے دھو کر پوتر (پاک) کرنی پڑے گی"۔ یہ کہہ کر وہ بھی شیطانی کھیل میں شامل ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹ کر گرا۔ تمام بوڑھی عورتوں کو قتل کرنے کے بعد سب لڑکیوں کو وہ ایک حویلی میں لے گئے اور سب قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور باری باری اپنے "اشرف المخلوقات" ہونے کا ثبوت فراہم کرتے گئے۔ نئے آنے والے قطار کے آخر میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ اس عمل میں، میں زندہ بچ جانے والی چند خوش نصیب یا بدنصیبوں میں بھی شامل تھی۔ اس کے بعد میں ایک کے ہاتھوں سے دوسرے تک پہنچتی رہی۔ آخر سوہن سنگھ نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا اور شادی بھی کر لی۔ سات سال بعد سوہن سنگھ سورگباش ہو گیا تو اس کے چھوٹے بھائی مہندر نے مجھ سے شادی کر لی"۔ (بحوالہ: 1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی۔ از حکیم محمد طارق محمود مجذوبی چغتائی)۔

اور ہوشیار پور کا یہ دردناک واقعہ بھی سن لیں:

"ہوشیار پور کی وہ رات بے حد طویل تھی۔ چوک سراجاں پر حملے کی دوسری رات۔۔۔ حملہ آوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے روز پچاس نوجوان شہید ہوئے۔ دوسرے روز ساٹھ، شام ہونے سے پہلے دو چار ایسے دلدوز واقعات ہوئے کہ مسلمانوں کی عزیمت اور جوش میں زبردست اضافہ ہوا۔ بزرگ اور نو عمر بھی میدان میں اترنے لگے۔ عصر کے وقت سے دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک مسلمان نوجوان گرا، خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ اس نوجوان کا گھر لڑائی کے میدان کے بالکل سامنے تھا۔ گھر کا ایک چھوٹا بچہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ خواتین کو ہوش نہ رہا اور بچہ باپ کو پکارتے ہوئے دروازے سے نکل کر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف بھاگا۔ سکھوں نے بچے کو پکڑ لیا اور چلّا چلّا کر اعلان کیا، دیکھو ہم آج مُسلے کے بچے کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ مسلمان دم بخود تھے کہ یہ بچہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔ سکھوں نے بچے کو اوپر اُچھالا اور نیچے سے نیزے پر اسے لے لیا۔ بچے کی چیخ اس قدر دلدوز تھی کہ آسمان تک لرز اٹھا۔ اُس نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔" (بحوالہ: اُردو ڈائجسٹ 2016)

راستے میں اِکا دُکا مسلمان ایک کانوائے کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آنے والے ایک نوجوان نے دورانِ راہ جو کچھ دیکھا وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

عورتیں ملتی گئیں، انہیں بھی ساتھ لیتے آئے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی درندگی کا جی بھر کر مظاہرہ کیا تھا۔ ہوشیار پور سے نکلتے وقت ایک عورت زخمی حالت میں پڑی ملی۔ والد صاحب نے اٹھایا تو اس کی ٹانگیں اور سینہ کٹے ہوئے تھے۔ ایک مشہور خاندان کی نوجوان خاتون تھی۔ اباجی کو معلوم ہوا تو ضبط نہ کر سکے۔ اس خاتون نے صرف اتنا کہا" آپ جایئے چاچا جی، غم نہ کریں! اتنا سب کچھ ہو جانے پر پاکستان تو بن گیا۔ مجھے خوشی ہے میں امت کے کسی کام تو آئی"۔ ''نہر عبور کر کے ہم سب شدت تاثر سے کانپ رہے تھے کہ ایک طرف سے کراہنے کی آواز آئی۔ ایک بزرگ ڈاکٹر نصیر الدین آگے بڑھے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟ نسوانی آواز آئی۔ وہ فوراً لپکے۔ ایک خاتون خون میں لت پت پڑی تھی۔ پانی پلا کر مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس خاتون نے مرتے وقت صرف اتنا کہا'' شام چوراسی کی جنگ میں میرے والد اور سات بھائی، چچا اور ان کے چار لڑکے شہید ہو گئے۔ تین بہنیں لڑتے لڑتے اور اپنی عزت بچاتے ہوئے نہر میں ڈوب گئیں۔ والدہ کو انہوں نے قتل کر دیا۔ میں چھپ گئی، انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا جب قریب آئے تو میں نے چھرے اور ٹوکے سے دو کو زخمی کر دیا۔ انہوں نے جھلّا کر میرا یہ حشر کیا ہے۔ آخری سانس لینے سے پہلے اِس مظلوم خاتون نے کہا'' پاکستان کو میرا اسلام پہنچا دیجئے''۔

جالندھر کے مسلمانوں نے جس بے جگری، دردمندی اور زبردست قربانی سے تحریک پاکستان کیلئے کام کیا وہ تاریخ پاکستان کا روشن باب ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کیلئے تحریک پاکستان کو تاریخی قربانیوں سے ہمکنار کیا۔ جالندھر کیمپ کے واقعات بڑے دلدوز تھے۔ مجھے یاد ہے ایک خاتون آخری دموں پر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ کانوائے پر پاکستان جا رہے ہیں تو اس نے باباجی کو بُلا کر کہا،'' یہ میرے زیورات ہیں خاندان کے سارے مرد شہید ہو چکے۔ ان زیورات کو قائداعظم تک پہنچا دیں۔ شاید پاکستان کے کام آجائیں'' (بحوالہ: اُردو ڈائجسٹ اگست 2016)۔ مشرقی پنجاب میں خون کا جو سیلاب آیا اس کا کچھ اندازہ ''لندن ٹائمز'' کے نامہ نگار آین مورسن کی ذاتی مشاہدات پر مبنی ان تین رپورٹوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے اگست اور ستمبر 1947ء کو جالندھر اور امرتسر سے اپنے اخبار کو ارسال کی تھیں۔ پہلی رپورٹ میں وہ لکھتا ہے'' سکھ مشرقی پنجاب کو مسلمانوں سے خالی کروانے میں سرگرم ہیں۔ وہ ہر روز بے دردی سے سینکڑوں افراد کو تہِ تیغ کرتے ہیں اور ہزاروں کو مغرب کی جانب بنوکِ شمشیر بھگا دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے دیہات اور گھروں کو نذر آتش کر رہے ہیں۔ اس ظلم و تشدد کو سکھوں کی اعلیٰ قیادت نے منظم کیا ہے اور یہ خوفناک کام بڑے معین طریقے سے علاقہ بہ علاقہ کیا جا رہا ہے''۔ دوسری رپورٹ میں لکھتا ہے'' امرتسر میں 8 اگست کے بعد مسلمانوں کے محلوں کے محلے دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گئے تھے اور لوگ پناہ کیلئے بھاگنا شروع ہو گئے۔ 13 اور 14 اگست کو پورا امرتسر شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ 15 اگست کو امرتسر میں ہندوستان کا'' یوم آزادی'' بڑے عجیب طریقے سے منایا گیا۔ سہ پہر کو سکھوں کے ایک ہجوم نے برہنہ مسلمان عورتوں کا جلوس امرتسر کے گلی کوچوں میں نکالا۔ ان کی آبروریزی کی اور پھر بعض کو کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بعض کو زندہ جلا دیا''۔ تیسری رپورٹ میں وہ مسلمانوں کے ایک بیس میل لمبے قافلے کے بارے میں ایک خبر ان الفاظ میں بھجواتا ہے'' اس قافلے میں 20 ہزار سے زائد افراد تھے اور ان میں سے اکثر پیدل ہی پاکستان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایسے ہی کئی اور قافلے مشرق سے مغرب کی طرف رواں دواں تھے۔ آبلہ پا، تھکان سے چور، بھوکوں کے مارے، سفر کی صعوبتوں سے نڈھال''۔ دو ماہ بعد وہ لکھتا ہے'' 70 لاکھ سے زائد مہاجرین گرتے گراتے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ وہ بالکل بے سروسامان تھے۔ ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور ان کپڑوں کی بھی اکثر دھجیاں اُڑی ہوئیں تھیں۔ یہ وہ دردکشانِ بلا تھے جنہوں نے معصوم بچوں کا قتل، لاشوں کی قطع و بریدی اور عورتوں کی بے حرمتی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ راستے میں ہر قدم پر موت ان کی گھات میں تھی۔ ان میں سے ہزاروں بھوک و بیماری

سے راستے ہی میں جاں بحق ہو گئے یا سکھوں کے خون آشام جتھوں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہت سے پاکستان کی سرحد پر پہنچتے ہی ابدی نیند سو گئے"(بحوالہ: خونِ مسلم ارزاں ہے۔ از ڈاکٹر سعید احمد ملک)

پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مہاجرین کی ٹرینوں پر بھی جابجا حملے ہوتے رہے۔ اکثر ٹرینوں کے سارے کے سارے مسافر فنا کے گھاٹ اتار دیئے جاتے، نوجوان لڑکیاں اغوا کر لی جاتیں اور ان کی زندگیاں موت سے بدتر ہو جاتیں۔ اس ضمن میں بے شمار واقعات میں سے صرف دو کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ پہلے واقعہ کا راوی گنڈا سنگھ والا ریلوے سٹیشن کا اسسٹنٹ ریلوے ماسٹر خود ہے۔ وہ کہتا ہے: "ایک مہاجر ٹرین فیروزپور کی طرف سے دیکھا کہ سب قصور آرہی تھی۔ گنڈا سنگھ والا سٹیشن پہنچ کر رُکی۔ مجید یزدانی صاحب پلیٹ فارم پر اس کا استقبال کر رہے تھے۔ گاڑی رُکی تو انہوں نے بوگیاں خون سے لت پت ہیں اور ڈبوں میں لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ یہ منظر اس زمانے کا معمول تھا۔ آگے ایک اور قسم کا منظر آرہا تھا۔ سب بوگیوں میں جھانکتے ہوئے جب وہ آخری بوگی کے قریب پہنچے تو وہاں بچوں کے رونے پیٹنے اور کراہنے کی دردناک آوازوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جھانک کر دیکھا تو ایک روح فرسا منظر ان کے سامنے تھا۔ اس بوگی میں ایک سال سے پانچ سال تک کی عمر کے بے شمار بچوں کی زندہ لاشیں خون میں لت پت کلبلا رہی تھیں۔ ان بچوں کو ذبح نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر زندہ لاشوں کی صورت میں پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کیا اس سے زیادہ بہیمیت اور درندگی کی مثال کہیں تاریخ میں مل سکے گی"(بحوالہ: جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار" از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)۔

اس نوع کا دوسرا واقعہ یوں ہے کہ نومبر 1947 کو ایک شام واہگہ ریلوے اسٹیشن پر اہل لاہور کا ایک جم غفیر اس گاڑی کے استقبال کیلئے موجود تھا جو مہاجرین کو لے کر کالکا سے چلی تھی اور براستہ امرتسر پاکستان پہنچ رہی تھی۔ خاصے انتظار کے بعد دھندلائے ہوئے اُفق پر ایک سیاہ دھبہ منتظر لوگوں کی سمت بڑھتا ہوا نظر آیا۔ یہ ریل کا انجن تھا۔ خوشی کی ایک لہر ہجوم میں پھیل گئی۔ وہ پانی کے مٹکوں اور کھانے کے طباقوں کا جائزہ لینے لگے جو انہوں نے پاک وطن میں آنے والے مہاجر بھائیوں کیلئے تیار کر رکھے تھے۔ جوں جوں گاڑی نزدیک آتی گئی لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ انہوں نے نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے لیکن گاڑی سے ان کے نعروں کا کوئی جواب نہ آیا۔ گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی اور ہلکی رفتار سے چلتی پلیٹ فارم پر آرکی، مگر گاڑی کا کوئی دروازہ کھلا نہ اس میں سے کوئی ذی روح برآمد ہوا۔ لوگوں کے دل انجانے اندیشے سے دھڑک اُٹھے اور جب انہوں نے کھڑکیوں سے ڈبوں کے اندر جھانکا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کرپانوں سے کٹے ہوئے گلے، گولیوں سے چھلنی سینے، جسم سے علیحدہ ہوئے بازو، پھٹے ہوئے پیٹ، ظلم و تشدد کی المناک داستان سنا رہے تھے۔ پھر نوجوانوں نے گاڑی کے ڈبے آپس میں تقسیم کر لئے اور خون میں لت پت، کٹی پھٹی اوپر نیچے پڑی لاشوں کو عزت و احترام کے ساتھ آبدیدہ آنکھوں سے ہدیہ عقیدت پیش کرتے اتارنے لگے۔(بحوالہ: 1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی۔ از حکیم محمد طارق محمود چغتائی)۔

لندن کے اخبار 'ڈیلی میل' کے نمائندہ خصوصی مسٹر رالف نے انہی ایام میں کراچی سے دہلی تک کا سفر کیا۔ اس نے 27 اگست: 1947 کے 'ڈیلی میل' میں لکھا: "میری کہانی صرف وہ لوگ سُن سکتے ہیں جو بہت بڑا دل گردہ رکھتے ہوں۔ جب میں کراچی سے براستہ لاہور عازم دہلی ہوا تو کراچی سے لاہور

تک راستے میں سفاکی کا کوئی منظر نظر نہ آیا، اور نہ ہی میں نے کوئی لاش دیکھی۔ لاہور پہنچ کر مشرقی پنجاب میں ہونے والی دہشت وبربریت کے آثار نمایاں نظر آنے لگے کیونکہ اسی دن لاہور میں خون سے لت پت ریل پہنچی تھی، یہ ریل 9 ڈبوں پر مشتمل تھی جس پر آسانی سے ایک ہزار مسافر سما سکتے تھے۔ اس ریل کے مسافروں کو بٹھنڈا کے جنکشن پر بے دریغ تہِ تیغ کر دیا تھا۔ ہماری گاڑی اتوار کی صبح دہلی کیلئے روانہ ہوئی۔ پاکستان کی سرحد عبور کرنے کے بعد جابجا ایسے مناظر بکھرے پڑے تھے جو لاہور کی لُٹی پٹی ٹرین سے کہیں زیادہ ہولناک اور دہلا دینے والے تھے۔ گدھ ہر گاؤں کے قریب سے گزرنے والی ریلوے کی پٹری پر اکٹھے ہو رہے تھے، کتے انسانی لاشوں کو بھنبوڑ رہے تھے اور فیروز پور کے مکانات سے ابھی تک شعلے اُٹھ رہے تھے۔ جب ہماری ریل بٹھنڈا پہنچی تو مجھے ریل سے ذرا فاصلے پر انسانی لاشوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کے دو سپاہی وہاں مزید لاشوں سے لدی بیل گاڑی لائے جو لاشوں کے ڈھیر پر ڈال دی گئی۔ اُس ڈھیر پر ایک زندہ انسان کراہ رہا تھا۔ سپاہیوں نے اسے دیکھا لیکن وہ اپنی لائی ہوئی لاشیں ڈھیر پر پھینک کر سسکتے اور کراہتے انسان کو وہیں چھوڑ کر چلتے بنے"۔ وہ مزید لکھتا ہے: "فیروز پور سے ہجرت کرتے ہوئے ایک لُٹاپٹا قافلہ جب ایک جگہ ستانے کیلئے رُکا تو اچانک سکھوں نے حملہ کر دیا۔ ایک عورت کی گود میں پانچ چھ ماہ کا بچہ تھا۔ ایک وحشی درندے نے وہ بچہ ماں کی گود سے چھین کر ہوا میں اچھالا اور پھر اس کی کرپان ننھے معصوم کے سینے میں ترازو ہو گئی اور اس کا پاکیزہ خون اس وحشی درندے کے کراہت آمیز چہرے پر ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ بچے کے تڑپتے جسم کو ماں کے سامنے لہرا کر درندے نے کہا 'لو! یہ ہے تمہارا پاکستان'۔ جب ماں نے اپنے جگر گوشے کو نوکِ سناں پہ سجے دیکھا تو اس کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا اور اس نے بھی وہی دم دے دیا"۔ ڈیلی میل کا یہ نمائندہ خصوصی آگے چل کر لکھتا ہے: "بٹھنڈا اسٹیشن پر ہم نے جو آخری نظارہ دیکھا وہ انتہائی کریہہ، گھناؤنا اور انسانیت سوز تھا۔ جونہی ہماری ٹرین چلی، ہم نے دیکھا کہ چار سکھ چھ مسلمان لڑکیوں کو انتہائی بے دردی سے زدوکوب کرتے ہوئے ان کی سرعام عصمت دری کر رہے ہیں۔ دو لڑکیوں کو تو انہوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے ذبح بھی کر ڈالا۔" (بحوالہ: خون مسلم ارزاں ہے۔ از ڈاکٹر سعید احمد ملک)

امرتسر کی صورتِ حال بھی باقی جگہوں سے کچھ مختلف نہ تھی۔ ہر طرف قتل وغارت، آتش زنی اور لُوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ 15 / اگست کی صبح نو بجے کے قریب تقریباً 5 سو بلوائیوں نے ہندو، سکھ پولیس اور فوج کے ساتھ مل کر کوچہ رنگریزاں پر حملہ کر دیا اور اس کے تمام مسلمان باسیوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ دوسرے دن جب ایک مجسٹریٹ کے ساتھ اس محلے کا معائنہ کیا گیا تو گلی کوچوں میں لاشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مکانوں کے اندر جھانکا تو وہ بھی لاشوں سے اَٹے پڑے تھے۔ ایک مسجد کے اندر نظر ڈالی تو وہاں بھی متعدد لاشیں نظر آئیں مگر وہ سب نوجوان لڑکیوں کی لاشیں تھیں۔ امتِ مسلمہ کی ناموس کی 46 برہنہ لاشیں۔ ان کے گلے کٹے ہوئے تھے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ذبح کرنے سے پہلے ان کی عصمت دری کی گئی تھی۔ دیہات سے آنے والے لوگوں نے بتایا کہ کپورتھلہ اور پٹیالہ کے ریاستی فوجی موٹر گاڑیاں لے کر آتے اور ہماری نوجوان لڑکیوں کو زبردستی اٹھا کر لے جاتے۔ کچھ عورتیں جان بچا کر دروازہ مہان سنگھ سے شریف پورہ کی طرف آ رہی تھیں۔ انہیں بلوائیوں اور ہندو سکھ فوجیوں نے دن دیہاڑے سڑک پر سے اُٹھا لیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُمتِ مسلمہ کی ان بیٹیوں کا کیا بنا۔

اسی طرح 3 ستمبر 1947ء تک دہلی کے نواحی دیہات میں بھی فسادات شروع ہو چکے تھے اور جلد ہی دہلی شہر بھی ان کی لپیٹ میں آ گیا یعنی اب دہلی میں بھی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ گلی گلی، محلے محلے مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی نظر آتیں۔ 5 / ستمبر کو قرول باغ میں امتحانی ہال کے باہر ان تمام مسلمان بچوں کو قتل کر دیا گیا جو میٹرک کا امتحان دینے آئے تھے۔ ہر طرف مسلمان قتل کئے جا رہے تھے، سامان لوٹا جا رہا تھا اور مکان جلائے جا رہے تھے۔ سبزی منڈی کے علاقے میں ولبھ بھائی پٹیل کے اشارے پر گورکھا فوج نے 3 ہزار مسلمانوں کو انتہائی بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ایک عینی شاہد نے بتایا کہ 9 ستمبر تک دہلی کے واٹر ورکس اور فیروز شاہ کوٹلہ کے درمیان کم از کم 10 ہزار لاشوں کا ڈھیر لگ چکا تھا جو ٹرکوں میں بھر بھر کر وہاں لائی گئیں تھیں۔ شام کو سات بجے ان تمام لاشوں کو پٹرول ڈال کر جلا دیا گیا۔ اس جلتے ہوئے انسانی جسموں کے الاؤ کی روشنی دور تک دیکھی جا سکتی تھی۔ چار اور چودہ ستمبر کے درمیان بیس سے پچیس ہزار تک مسلمان مارے جا چکے تھے۔ ایک مسلمان جو جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، وہ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک جگہ اس نے دیکھا کہ ہندو بلوائی ایک ڈھیر کے گرد خوشی سے ناچ رہے تھے۔ کیا ہم سوچ سکتے ہیں کہ یہ ڈھیر کس چیز کا تھا؟ یہ مسلمان عورتوں کے جسموں سے کاٹے ہوئے پستانوں کا ڈھیر تھا۔ (بحوالہ: خونِ مسلم ارزاں ہے۔ از ڈاکٹر سعید احمد ملک)

1947ء کے قتل و غارت گری کی داستان بہت لمبی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کم از کم دس لاکھ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق پٹیالہ، کپور تھلہ، فرید کوٹ، جنڈ اور نابھ کی ریاستوں میں 8 لاکھ 33 ہزار مسلمان آباد تھے۔ ان میں سے اکثر کو اگست ستمبر 1947 میں نیست و نابود کر دیا گیا۔ صرف پٹیالہ سے ڈھائی لاکھ مسلمان غائب ہو گئے جن کا کوئی نام و نشان نہیں۔ کپور تھلہ میں شاید ہی کوئی مسلمان زندہ بچا ہو۔ یاد رہے کہ ریاست کپور تھلہ میں مسلمان اکثریت میں تھے اور 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد 2 لاکھ 13 ہزار 7 سو 54 تھی۔ 15 ستمبر 1947ء کے روز ایک لاکھ مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ اردیسہ سے روانہ ہوا۔ اتنی بڑی تعداد کو ختم کرنا آسان نہ تھا۔ لہٰذا پہلے انہیں بھالوں، کرپانوں اور بندوقوں سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے لیکن پھر بھی ہزاروں زندہ بچ گئے۔ چنانچہ ہندو سکھ فوجیوں کے ٹرک بھیجے گئے جو فوجی انداز میں منظم طریقوں سے ڈیڑھ گھنٹے تک مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ ایک لاکھ کے قافلے میں سے صرف چند ہزار بچ کر پاکستان پہنچ سکے۔ 96 ہزار مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ (بحوالہ: خونِ مسلم ارزاں ہے۔ از ڈاکٹر سعید احمد ملک)

دوستو! تحریک پاکستان صرف انہی چند واقعات کا نام نہیں۔ یہ تو ان ہزاروں میں سے چند ایک ہیں جو کتابوں میں درج ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں اور بھی ہیں جو سنے اور سنائے تو گئے لیکن کسی رسالے یا کتاب کا حصہ نہ بن سکے اور ان کے علاوہ ہزاروں وہ ہیں جو مرنے والے اپنے سینوں میں اپنے ساتھ ہی لے گئے کہ انہیں اِن کو کسی کو سنانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ ان واقعات کو پڑھ اور سُن کر پہلا سوال جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے کس مقصد کیلئے اس قدر جانی قربانیاں دیں، اپنی عزتیں اور عصمتیں لُٹوائیں اور اپنا مال و اسباب اور گھر بار چھوڑا؟ کیا یہ سب کچھ کسی سیکولر معاشرے کے قیام کیلئے تھا؟ یا کیا یہ سب کچھ کسی معاشی تحفظ اور ترقی کیلئے تھا؟ اور اگر ایسا تھا تو کیا مجوزہ پاکستان میں ہندوستان کی نسبت زیادہ دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی تھیں؟ کیا یہاں معاشی ادارے، زمینیں، کانیں، دوکانیں اور کارخانے ہندوستان کی نسبت زیادہ تھے؟ اور وہ روزگار کے متلاشیوں کو ڈھونڈ رہے تھے؟ کیا 'پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!' کے نعرے کے سوا کسی اور نعرے پر اس قدر تعداد میں مسلمانانِ ہند لبیک کہہ سکتے تھے؟

کیا مال، معیشت، سیکولرازم، نیشنلزم وغیرہ کے نام پر کروڑوں لوگوں کا کوئی گروہ، اور وہ بھی پسماندہ ترین، اتنی قربانیاں اور اتنا جوش و خروش دے اور دِکھا سکتا ہے؟ نہیں! ہر گز نہیں! اتنی قربانیاں کوئی گروہ صرف اپنے وطن اور اپنے مذہب کی حرمت اور تحفظ کی خاطر ہی دے سکتا ہے! یقیناً یہ صرف اپنے لئے ایک الگ وطن کے حصول، کہ جہاں وہ اکثریت میں ہوں اور کسی کے غلام نہ ہوں، جہاں امن و امان ہو، عزت و آبرو کا تحفظ ہو، انسانی رواداری اور انصاف ہو اور کہ جہاں وہ اپنی زندگیاں اور اپنے تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور حکومتی معاملات اپنے مذہب کے اصولوں اور ہدایات کی روشنی میں چلا سکیں، کا اعلیٰ و ارفع مقصد اور عزم ہی ہو سکتا تھا جس کی خاطر مسلمانانِ ہند اتنی بڑی تعداد میں اپنی جانوں، عزتوں اور مال و اسباب کی قربانی دے گذرے، اور دے کر بھی راضی رہے۔ نہ کوئی شکوہ، نہ کوئی پچھتاوا بلکہ فخر۔

تو دوستو! اب سوال یہ ہے کہ آج جب کہ قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی تیسری نسل بھی جوان ہو چکی ہے، کیا ہم وہ مقصد حاصل کر سکے ہیں؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے اور ویسا ہی پاکستان ہے جس کا خواب ہمارے آباؤ اجداد نے دیکھا تھا؟ اور کیا ہم نے ان کے خوابوں کا پاکستان بنا کر ان کی پاکستان کیلئے دی گئی جان و مال اور عزتوں کی قربانیوں کا وہ قرض چکا دیا ہے جو وہ جاتے ہوئے ہمارے ذمہ کر گئے تھے؟ اگر نہیں تو کیا یہ ان شہیدوں کے خون سے غداری نہیں؟ اور کیا اس غداری پر گردنیں کٹے، اعضاء بریدہ ہمارے باپ، بھائی، بیٹے اور پیٹ پھٹی، پستان کٹی اور عِصمت لُٹی ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں، اور نیزوں، تلواروں، کرپانوں اور برچھیوں میں پروئے معصوم بچے ہمیں معاف کر دیں گے؟

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے، فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

بروز سوموار 20 ربیع الاول 1446ھ 23 ستمبر 2024ء

ذہنی مریض

اللہ نے وطن اور گھر کی محبت انسان ہی نہیں درندوں اور پرندوں کے دل میں بھی پیدا فرمائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ درندے اپنی غار اور پرندے اپنے گھونسلے کے ایک ایک تنکے کی حفاظت کرتے ہیں اور ہر جاندار شام کو اپنے ٹھکانے کی طرف پلٹتا ہے۔کوئی جاندار اپنے گھر اور وطن کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتا لیکن جب کسی کو اس قدر ستایا جائے کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑ جائیں تو وہ ہر چیز چھوڑنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔بس یہی ایک عمل ہے کہ دیارِ غیر میں جب وطن کی یاد بہت ستاتی ہے تو اپنی اس فرقت کا غم دور کرنے کیلئے کوئی ایسا کندھا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں سر رکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔

اسی سلسلے میں کچھ دوستوں نے "ایکس سپیس" پر وطن کو یاد کرنے کا ایک بہت ہی خوبصورت اہتمام کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ سوشل میڈیا کا ٹرینڈ بدلتے ہوئے ارضِ وطن کے متعلق مستند تاریخی شواہد کے ساتھ نوجوان نسل کو ان حقائق سے ضرور آگاہ کیا جائے تاکہ علم ہو سکے کہ دو قومی نظریہ کیا ہے، پاکستان کس لئے معرضِ وجود میں آیا، اگر پاکستان نہ بنتا تو، قیامِ پاکستان کے وقت اغیار کی سازشیں، مشاہیر انِ پاکستان کا کردار، قیامِ پاکستان کے وقت اس صدی کی ہجرت اور لازوال قربانیوں کے پیچھے پنہاں بے مثال دکھ اور درد اور اپنے رب سے کئے گئے اوفوبالعہد کی عہد شکنی پر آج مبتلا مصائب پر بے لاگ گفتگو کرنے کیلئے اگست کا پورا مہینہ وقف کر دیا گیا اور اس منفرد پروگرام کے انعقاد کیلئے جناب ڈاکٹر فرید اختر کی اس منفرد تجویز پر ایک دن مجھے اچانک برادرم شاکر قریشی نے اسپیس پر لیکچرز دینے کیلئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔میں نے نہ صرف ان کو مبارکباد دی بلکہ خود کو بھی اس کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

جب پروگرام کا سلسلہ شروع ہوا تو دلچسپی کا یہ عالم ہو گیا کہ ہمدرد و بیدار ذہن اور پڑھے لکھے دوستوں کے سوال وجواب سے کئی نئے عنوانات جنم لیتے گئے اور یہ سلسلہ تاحال جاری وساری ہے۔اس پروگرام میں نصف درجن سے زائد ممالک میں بسنے والے کثیر دوستوں کی رات گئے تک شرکت اس بات کی گواہی دینے لگی کہ:

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کینیڈا سے دردِ دل رکھنے والے محترم نعیم صاحب، نجیب بٹ صاحب، امریکا سے جناب مرزا صاحب، سعودی عرب اور یو اے ای سے احسن یعقوب صاحب اور مضبوط دلائل کے ساتھ جناب نوید احد صاحب نے اس میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے اشتیاق کا ایسا منظر باندھا کہ اسپیس کے بارے میں کئی اہل علم اور مختلف اداروں نے مجھ سے یہ سلسلہ جاری رکھنے کی فرمائش کر دی اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے الحمد اللہ۔

تاریخ اس کی گواہ ہے کہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ارضِ پاکستان کے حصول کیلئے مشاہیر انِ پاکستان نے جو درست فیصلہ کیا، آج وقت ان کے صحیح اور بر وقت فیصلے کی نہ صرف گواہی دے رہا ہے بلکہ پاکستان میں بسنے والے تمام افراد ان کے گراں قدر احسانات کے ممنون بھی ہیں۔

جب ہندوستان میں انگریز کو رخصت کرنے کا وقت آیا تو مسلمانوں نے کیونکہ ہندوستان میں کئی سو سال حکومت کی تھی، انگریز کی غلامی تو ایک سازش کے تحت قبول کرنی پڑی لیکن انگریز اور ہندو کی مشترکہ دوستی اور مسلم دشمنی کو ہمارے اکابرین نے وقت سے پہلے بھانپ لیا اور یہی وجہ ہے کہ مشاہیر انِ

پاکستان نے ایک الگ وطن کا مطالبہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اس لئے رکھا کہ انگریز کے جانے کے بعد ہمیں اس ہندو قوم سے واسطہ پڑنے والا تھا جن کے خود ساختہ مذہب نے انسانوں کے درمیان بھی تقسیم پیدا کر رکھی تھی اور انہوں نے اللہ کے بندوں کو کم از کم چار مختلف قوموں میں اس طرح بانٹ رکھا تھا جس سے ہر روز انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔

بھارت میں ذات پات پر مبنی نظام سے ہم سبھی واقف ہیں۔ یہ نظام ہندو سماج میں طبقاتی تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ ذات پات کا یہ رواج آریا اپنے ساتھ لے کر آئے، جو وقت کے ساتھ مختلف شکلوں میں تشکیل پاتا رہا۔ یہ نظام نام نہاد اونچی ذاتوں (برہمن، کھشتری اور ویش) کے ارکان کے حق کو مزید مضبوط کرتا ہے جبکہ نچلی ذاتوں (شودر، دلت) کے ساتھ تذلیل پر مبنی سلوک کو جائز قرار دیتے ہوئے ان کیلئے پنچ اور کم اہمیت کے حامل پیشوں کو مخصوص کرتا ہے۔

جدید دور میں بھی اس نظام کی تعریف کے مطابق ہندوؤں کو چار مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سب سے اونچا درجہ برہمنوں کو دیا گیا ہے۔ تنزلی کے اعتبار سے کھشتری (جنگجو اور حکمران) دوسرے، ویش (کسان اور تجارت) تیسرے جب کہ شودر (مزدور) چوتھے درجے پر ہیں۔ یہ تعریفیں ہندوؤں کی مقدس کتابوں خاص طور پر "منوسمرتی" سے لی گئی ہیں۔ "شودر یا اچھوت" اور اب نیا نام "دلت" جو سب سے نچلی ذات ہے اور ان کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ آج یہ 20 کروڑ کی آبادی کے ساتھ ایسی اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں جسے مختلف طریقوں سے تعصب کا سامنا اور ان کی سماجی ترقی کی راہ میں مشکلات کھڑی کی جاتی ہیں۔ بھارت کی حکمران جماعت بی جے پی جہاں اپنی ملکی تاریخ کو مسخ کرنے کے درپے ہے وہیں ملک میں اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ ہر روز ان پنچ ذات (دلت) کے افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

دلت کو غلیظ ترین کاموں میں الجھا کر انہیں ہر طرح سے کمزور رکھنے کی ملکی پالیسی، تاکہ یہ کبھی طاقتور بن کر نہ ابھر سکیں۔ قانوناً پابندی کے باوجود دلتوں کو انسانوں کے فضلہ کو نالوں، سیوریج یا سیپٹک ٹینکوں سے نکالا ہاتھ سے صاف کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینکڑوں لوگوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ان کی بستیاں شہر سے الگ بنی ہوئی ہیں۔ حقوق انسانی کی تنظیم ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو لوگ غلاظت اٹھانے کا کام کرنے سے منع کرتے ہیں انہیں اعلیٰ ذات کے لوگوں کی طرف سے دھمکی اور زیادتی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مزید برآں ان نچلی ذات کے لوگوں کی کسی سیاسی جماعت میں نمائندگی نہیں، اس لئے ان کے مسائل کی کہیں بھی شنوائی نہیں۔ ان کے ساتھ کھانا، شادیاں کرنا مذہبی طور پر غلط مانا جاتا ہے۔ اس اقلیت کو اعلی تعلیم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اس وجہ سے ان کو اعلی عہدوں تک رسائی نہیں ملتی۔ اگر کبھی کوئی ایسی جرات بھی کرے تو ہندو انتہاپسند اس پر ظلم و ستم کی انتہاء کر دیتے ہیں۔ ظلم کی انتہاء تو یہ ہے کہ آج بھی ہندوستان میں کئی مقامات پر اگر کسی شودر کے کان میں ہندوؤں کی مقدس کتاب کے اشلوک (الفاظ) سنائی دیں تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا ہے اور ان کی عورتوں کی عصمت دری یہ کہہ کر جائز قرار دی جاتی ہے کہ یہ "ناری" عورت خوش نصیب ہے کہ ایک برہمن کے جسم کو چھونے کا موقع مل گیا۔ آج بھی ہندوستان کے کئی علاقوں میں شودر کو پاؤں میں جوتا اور نیا کپڑا پہننے کی اجازت نہیں۔

ہندو انتہاپسندوں کی درندگی سے تنگ یہ لوگ یا تو دیگر ممالک میں ہجرت کرنے پر مجبور ہیں یا پھر اپنے بچاؤ کیلئے اپنا مذہب تبدیل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق بھارتی ریاست گجرات کے قصبے اونا کے نواحی گاؤں سمادھیالہ میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق اور تشدد سے

تنگ و مجبور تقریباً 300 دلت خاندان اپنے مذہب کو خیر باد کہہ کر بدھ مذہب میں داخل ہو گئے ہیں۔

2020 میں بھارتی ریاست اتر پر دیش میں ایک دلت عورت کے ریپ اور قتل نے بھارتی معاشرے میں ذات پات کی تقسیم کی حدوں کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق مودی کی بی جے پی کے تحت اتر پر دیش بھارت کی "ریپ ریاست" بن چکی ہے۔ ہندو انتہا پسند تنظیمیں اس نچلی ذات کے لوگوں اور باقی اقلیتوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں، بھارت کی سرکاری پالیسیاں اور اقدامات مسلمانوں، عیسائیوں، بدھ متوں اور دلتوں کو بربریت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ ان اقلیتوں سے منظم طور پر امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے اور اس ظلم و ستم کا اختیار یہ ذات پات کا نظام ہی سونپتا ہے۔ اس ذات پات کے نظام نے بھارتی سماج کو ایک معاشرتی و نفسیاتی بیمار بنا دیا ہے جہاں کسی کارآمد سوچ کے جنم لینے کے امکان دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک معاشرے کے پھلنے پھولنے کی امید کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ عورتیں جن کے ساتھ جنسی زیادتی اس لیے جائز قرار دے دی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک نچلی ذات سے تعلق رکھتی ہیں وہ جس نفسیاتی ڈپریشن سے گزرتی ہیں وہ کیسی اولاد کو جنم دیں گی؟ وہ بچے جنہیں دلت ہونے کی بنا پر تعلیم کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے، ان سے غلاظتیں صاف کروائی جاتی ہیں، وہ بڑے ہو کر کیسے ایک مفید شہری بن سکتے ہیں؟

ان کی ذہنی نشوونما کو پنپنے سے پہلے ہی روک دیا جاتا ہے۔ وہ دلت، شودر اور اچھوت کے لفظ کو اپنے ساتھ بڑے ہوتے دیکھا اور صرف لاشیں اٹھانے، سڑکیں صاف کرنے، نالیاں اور گٹر کھولنے، برہمنوں کی چاکری کرنے میں زندگی گزاری ہو وہ کیسے محب وطن ہو سکتے ہیں؟ ان سے بغاوت کا گلہ کیسے کیا جا سکتا ہے، جب ان کو جائز اور بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہو؟ یہ تمام غیر انسانی کھیل حکومتی جماعت کی ناک تلے کھیلا جاتا ہے اور ہندو پسند تحریکیں اس کھیل کو اپنے انتہا پسندانہ عمل اور نعروں سے اور ہوا دے رہی ہیں۔

انسان کی تکریم کو سب سے بڑا نقصان اور سب سے بڑی رکاوٹ جو ہندوؤں کے ذات پات کا طبقاتی نظام ہے۔ ہندوانہ نظام میں انسانوں کو پیدائش کی بنیاد پر اعلیٰ و ادنیٰ قرار دینے میں ان کی مذہبی کتاب "منوشاستر" میں انسان کی تخلیق کے بارے میں جس طرح کی من گھڑت روایات بیان کی گئی ہیں، وہ انسان کی خود تذلیل کر رہی ہیں جس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ابتدا میں ایک ہی روح تھی یہ روح جب اپنے ارد گرد دیکھتی ہے تو اسے اپنے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ یہ روح پکارتی یہاں میں ہوں تب اس لمحے "مس" کا تصور قائم ہوا، وہ روح ایک ساتھی کی خواہشمند تھی۔ اس نے ایک مرد اور عورت کو مربوط صورت میں بنایا پھر انہیں دو حصوں میں الگ کیا۔ مرد شوہر بن گیا اور عورت بیوی یعنی ابتداء میں مرد اور عورت ایک ہی جسم تھے۔ پھر ازدواجی تعلقات پیدا ہوئے جن کے نتیجے میں مخلوق پیدا ہوئی۔ پھر اس نے خیال کیا کہ ایک روح سے پیدا ہوتے ہوئے ازدواجی تعلقات کو قائم کرنا غلط بات ہے۔ اس لیے خود کو چھپا لیا اور گائے بن گئی۔ اس کا خاوند بیل بن گیا پھر صحبت سے گائے اور بیل پیدا ہوئے، پھر وہ گھوڑی بن گئی اور وہ گھوڑا، اور ان کے اختلاط سے گھوڑے پیدا ہوئے۔ اسی طرح تمام زندہ مخلوق پیدا ہوئی یہاں تک کے تمام کیڑے مکوڑوں کی بھی ایسے پیدائش ہوئی"۔ یہ عقیدہ یا سوچ انسانی تذلیل کیلئے کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ جو کائنات ارضی کا خالق ومالک ہے، اس نے اپنی مملکت میں حضرت انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اسلام کہتا ہے کہ:
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ(التین:4)" بے شک ہم نے آدمی کو سب سے اچھی صورت میں پیدا کیا۔" انسان ربِ تعالیٰ کی خصوصی تخلیق ہے اسے بہترین صورت میں پیدا کیا بلکہ اس میں اپنی روح پھونکی جیسا کہ قرآن میں ہے کہ:
فَإِذَاسَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوالَهُ سَاجِدِينَ(ص:72)" جب میں اسے پورے طور پر بنالوں، اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ"۔ یعنی آدم کو تعظیمی سجدہ کروا کر انسانی عظمت کو وقار کی دولت بخشتے ہوئے اشرف المخلوقات بنا دیا جبکہ اس کے برعکس ہندو مذہب کے مطابق روح حوا کی تھی، وہ تنہائی میں ڈر گئی تو پھر اس کی دلجوئی کی خاطر ایک مرد کو اس کیلئے پیدا کیا یعنی ایک جسم سے مرد اور عورت پیدا ہوئے جبکہ قرآن اس کے بارے میں ہماری رہنمائی ایسے کرتا ہے:
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ-اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ-اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات:13)

"لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر مخلوقات سے معزز و مکرم بنایا، چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا:
وَلَقَدْكَرَّمْنَابَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّوَالْبَحْرِوَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍمِّمَّنْ خَلَقْنَاتَفْضِيْلًا۠:(بنی اسرائیل:70)

بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا اور انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر بہت سی برتری دی۔

اسلام کی نظر میں بطور انسان کسی کو بھی کسی پر فضلیت حاصل نہیں ہے جبکہ ہندو مذہب میں ذات پات کے طبقاتی نظام نے اعلیٰ اور ادنیٰ کا معیار قائم ہے۔ اسلام نے عزت و قار اور بہتر ہونے کی وجہ تقوی کو قرار دیا ہے جبکہ ہندو مذہب میں عزت و قار اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو برہمن کے ہاں پیدا ہو جبکہ شودر کے ہاں پیدا ہونا ہی ذلت ورسوائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو تو اب بھی ملیچھ سمجھ کر دلتوں سے بھی بدتر سلوک کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کو 77 برس گزر گئے ہیں اور آج بھی جہاں انسانی تفریق کا یہ حال ہے تو خود دلت کو ہندو مذہب کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے ان سے یہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو اگر خاکم بدہن دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کی تخلیق نہ ہوتی تو مسلمانوں کا کیا حال ہوتا۔ ہمارے ہاں کے وہ ذہنی مریض یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان اکثریت کی بناء پر ایک بہتر زندگی گزار رہے ہوتے تو وہ اس بات سے ہی اندازہ لگالیں کہ مسلمان اور دلت مل کر ہندو ذہنیت کے مظالم سے چھٹکارہ پانے کیلئے دن رات دعائیں کر رہے ہیں۔ اگر ان حالات کے باوجود وہ پاکستان کے وجودِ مسعود کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کیلئے بہتر ہے کہ وہ اپنا بوریا بستر ہندو ماتا کے قدموں میں جا کر بچھالیں۔ اس خبر کو بھی پڑھ لیں کہ سندھ سے جو سو افراد پاکستان کو چھوڑ کر وہاں اپنے رشتہ داروں کے پاس منتقل ہو گئے تھے، ایک سال کی مسلسل تذلیل کے بعد انہیں پاکستان جنت معلوم ہونے لگ گیا اور وہ دوبارہ معافی و تلافی کے بعد واپس اپنے گاؤں میں آ گئے ہیں۔

مودی کی متعصب حکومت کیں آج بھی ہندوستان کے بعض علاقوں میں مسلمانوں پر اس قدر مظالم توڑے جا رہے ہیں کہ ظالم اور سفاک ہندو مسلمان خواتین اور معصوم بچوں کو بھی معاف نہیں کر رہے۔ جس کی وجہ سے مرد، عورتیں اور بچے بلبلا اٹھے ہیں کہ:

وَمَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿النساء:75﴾

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

اس دعا میں کمزور مسلمانوں کی مظلومیت کا نقشہ پیش کرنے کے ساتھ ان کی ہمدردی اور مدد کیلئے مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت واضح کی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی جہاد کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں۔ 1۔ دفاعی۔ 2۔ مظلوم مسلمان اور انسانیت کی مدد کرنا۔ 3۔ اللہ کے باغیوں کو سرنگوں کر کے پرچم اسلام کو سربلند رکھنا کیونکہ زمین وما فیہا اللہ کی ملکیت ہے لہٰذا باغی انسانوں کو سرنگوں کرنا اور رکھنا اللہ والوں کی ذمہ داری ہے۔ جہاں تک مظلوم انسانیت کی مدد کرنے کا معاملہ ہے دنیا میں دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان لازوال تاریخ رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی اغراض کی بجائے محض اللہ کی رضا اور انسانیت کی حمایت کیلئے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔

ہسپانیہ کی تاریخ گواہ ہے کہ جب عیسائی حکمران راڈرک نے اپنے ہی گورنر کی معصوم بچی کے ساتھ زیادتی کی تو گورنر نے مجبور ہو کر اپنے ہم منصب مسلمان ملک کے سرحدی گورنر موسیٰ بن نصیر کو خط لکھا جس کے جواب میں طارق بن زیاد نے اسپین پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں تقریباً 8 سو سال تک اسپین امن وامان کا گہوارہ بنا۔ ہسپانوی مورخ اسے ہسپانیہ کی تاریخ کا سنہری دور تصور کرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال سندھ میں جب مسلمان مسافروں پر داہر کے غنڈوں نے حملہ کیا تو ایک مسلمان بیٹی نے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو دہائی دی۔ حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو مظلوموں کی مدد کیلئے بھیجا جس سے تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان میں اسلام کا پھریرا بلند رہا اور اس ملک میں وحدت پیدا ہوئی۔ لوگوں کو سیاسی، علمی شعور ملنے کے ساتھ امن وسکون نصیب ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ اسی جہاد کی ترجمانی قادسیہ میں جو اس وقت ایرانی حکومت کا دارالحکومت تھا (البدایہ والنہایہ) میں حضرت ربیع (رح) نے رستم کے سامنے ان الفاظ میں کی تھی۔

إِنَّا قَدْأُرْسِلْنَالِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ إِلٰى نُوْرِ الْإِيْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ إِلٰى عَدْلِ الْإِسْلَامِ---(ہم خود نہیں آئے) ہمیں بھیجا گیا ہے تاکہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور ایمان میں لا کھڑا کریں۔ عوام الناس کو بڑے لوگوں کے جور وستم سے نکال کر (اسلام کے عادلانہ نظام میں زندگی گزارنے کا موقعہ فراہم کریں۔

آج کی نوجوان نسل کو یہ بتانا اس لئے ضروری ہے کہ انہیں "دو قومی نظریہ" کی حقیقت کا ادراک ہو سکے اور وہ مملکت خداداد پاکستان کے وجود کو اپنے لئے ایک نعمت سمجھ کر اس کی قدر کر سکیں۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللهِ لَاتُحْصُوْهَاؕ (النحل:18) اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے۔

بروز جمعۃ المبارک 24 ربیع الاول 1446ھ 27 ستمبر 2024ء

میں کون ہوں؟

عام طور پر ہیومن کا ترجمہ انسان کر کے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان تو بس انسان ہی ہوتا ہے، چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا مگر یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں بلکہ پیچیدہ ہے۔ درحقیقت ہر تہذیب (نظام زندگی) کا ایک اپنا مخصوص تصور انفرادیت ہوتا ہے۔ اس تصور انفرادیت کے تعین کی بنیاد اس سوال کا جواب ہے کہ "میں کون ہوں؟" (زندگی کا مقصد کیا ہے، خیر کیا ہے شر کیا ہے وغیرہ جیسے سوالات کا جواب اسی بنیادی سوال کے جواب سے طے پاتے ہیں)۔ بالعموم تاریخی طور پر اس سوال کا جائز مقبول عام جواب یہ رہا ہے کہ "میں عبد (مسلمان) ہوں" اور طویل عرصے تک اسی تصور انفرادیت کو انسانیت کا جائز اظہار سمجھا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ پچھلے ادوار میں اس کے برعکس جواب دینے والے افراد اور معاشرے بھی موجود رہے ہیں البتہ اکثریت معاشرے (جیسے تمام مذہبی معاشرے) اسی مذہبی تصور انفرادیت پر مبنی تھے۔

سترھویں اور 18 ویں صدی عیسوی کے یورپی معاشروں میں تحریک تنویر کے زیر اثر اس سوال کا ایک اور جواب عام ہونا شروع ہوا (جو آج ان معاشروں میں بہت راسخ ہو چکا) جس کے مطابق "میں عبد نہیں بلکہ آزاد اور قائم بالذات ہوں" (اس تصور ذات کی ابتداء ڈیکارٹ کے جملے "میں سمجھتا ہوں اس لئے لگتا ہے" سے ہوتی ہے، جس کے مطابق کائنات کی واحد ہستی جو اپنے ہونے کا جواز خود اپنے اندر رکھتی ہے نیز جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر اور منبع علم ہے وہ اکیلی ذات "میں" "یعنی ہوں")۔ اس آزاد اور قائم بالذات تصور ذات کو تنویری فکر میں "ہیومن" کہا جاتا ہے۔ ہیومن اپنی بندگی کی نفی اور صمدیت کا دعویٰ کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں ہیومن "اللہ کا باغی" تصور ذات یا انسان ہے۔

مشہور مغربی فلسفی فوکو کہتا ہے کہ "ہیومن" انسانی تاریخ میں پہلی بار سترھویں صدی میں پیدا ہوا۔۔۔۔ان معنی میں نہیں کہ اس سے قبل دنیا میں انسان نہیں پائے جاتے تھے اور نہ ہی ان معنی میں کہ یہ کوئی زیادہ عقل مند انسان تھا اور پہلے کے انسان جاہل وغیرہ تھے بلکہ ان معنی میں کہ اس سے قبل کسی انسانی تہذیب اور نظام فکر میں آزادی کو انفرادیت کے جائز اظہار کا مقصد سمجھا اور قبول نہیں کیا گیا (گویا یہ کفر والحاد کی ایک جدید شکل تھی)۔ اس سے قبل انسانیت کیلئے لفظ "مین کائنڈ" (اللہ کی رعایا و مخلوق) استعمال کیا جاتا تھا، ہیومینیٹی کا تصور سترھویں صدی میں وضع کیا گیا۔ ہیومن ازم کا ڈسکورس درحقیقت اسی تصور ہیومن سے نکلتا ہے جس کے مطابق انسانیت کی بنیادی صفت آزاد و قائم بالذات ہونا ہے اور عقل کا مطلب اس انسانی آزادی میں اضافے (یعنی انسان کو عملاً قائم بالذات بنانے) کو بطور مقصد حیات قبول کرنا ہے۔ ہیومینیٹی جدید مغربی الحاد کا نہایت کلیدی تصور ہے اور تنویری فکر سے برآمد ہونے والے مختلف مکاتب فکر (مثلاً لبرل ازم، سوشل ازم، نیشنل ازم وغیرہم) اسی تصور ھیومینیٹی کے مختلف نظریئے، تعبیرات وتوجیہات ہیں۔

جو لوگ تصورذات کے تعین میں ایمانیات کی بنیادی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ 'انسان تو بس انسان ہے" وہ انتہائی سطحی بات کرتے ہیں (زندگی کا مقصد، خیر وشر، علم، حق اور عدل کے تصورات، معاشرتی وریاستی نظم کی تشکیل وغیرہم اس سوال کا جواب تبدیل ہونے سے یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں)۔ آسان مثال سے سمجھئے کہ حضرت عیسٰیؑ بطور ایک معین شخصیت مسلمانوں اور عیسائیوں میں مشترک ہیں (کہ دونوں تاریخی طور پر ایک ہی مخصوص شخصیت کو عیسٰیؑ مانتے ہیں) مگر ان کے درمیان چودہ سو سال سے وجہ اختلاف "تصور عیسٰیؑ" ہے نہ کہ "شخصیت عیسٰیؑ" (یعنی ایک کے یہاں عیسٰیؑ ابن اللہ ہیں جبکہ دوسرے کے یہاں عیسٰیؑ رسول اللہ)۔ اگر کوئی یہ کہے کہ "عیسٰیؑ تو بس عیسٰی ہیں، مسلمان اور عیسائی بلاوجہ دست وگریباں ہیں" تو یقیناً وہ ایک غیر علمی بات کرے گا۔ اسی طرح ہیومن کو بھی انسان کہنا اور مسلمان کو بھی انسان کہنا ایسی ہی کنفیوژن کا شکار ہونا ہے، ظاہر ہے وہ انسان جو خود کو

اللہ کا بندہ اور وہ جو خود کو اللہ سمجھتا ہے بھلا کیسے یکساں زندگی (معاشرہ و ریاست) تعمیر کر سکتے ہیں؟

یہ آپ سے کہیں گے کہ "پہلے ہیومن (انسان) بنو بعد میں مسلمان" (یہ سیکولروں کی عوام الناس کو پھانسنے کی ایک دیرینہ خوشنما دلیل ہے)۔ آپ ان سے پوچھئے کہ "اچھا بتاؤ مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کا کیا مطلب ہے؟" دیکھئے مسلمان ہونے کا مطلب یہی ہے نا کہ "میں اصلاً و حقیقتاً اللہ کا بندہ ہوں۔" بتایئے کیا میری اس حقیقت سے ماوراء اور ما قبل بھی میری کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا آپ مجھ سے اقرار کروانا چاہتے ہیں؟
إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا۔ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (انسان:2-3)
ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔ (اور) اسے رستہ بھی دکھا دیا۔ (اب) وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

دراصل یہ بات کہنے والوں کی عظیم ترین اکثریت کو اس بات کا مطلب ہی معلوم نہیں ہوتا۔ "میں کون ہوں" فی زمانہ اس کے دو غالب جواب ہیں۔ ایک یہ کہ میں اللہ کا بندہ (مسلمان) ہوں، دوسرا یہ کہ میں آزاد و قائم بالذات ہوں۔ مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کی دعوت کا اصل مطلب اسی بات کا اقرار کروانا ہے کہ "میں اصلاً آزاد ہوں"۔ پھر یہ جو خود کو مسلمان وغیرہ سمجھا جاتا ہے تو یہ اس آزاد ہستی کے اپنے ارادے کے تحت اختیار کردہ اپنی ذات کے بارے میں کچھ تصورات ہیں جو اصل حقیقت نہیں، اصل حقیقت میرا وہ ارادہ ہے جو حقیقت تخلیق کرتا ہے۔
وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل:78)
اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور اُن کے علاوہ اور) اعضا بخشے تاکہ تم شکر کرو۔

یہ بات اچھی طرح، جی بہت ہی اچھی طرح، سمجھنا چاہئے کہ انسان ہونا میری اصل نہیں بلکہ "اللہ کا بندہ" ہونے کی ممکنہ صورتوں میں سے بس ایک صورت ہے۔ میرے وجود یعنی "ہونے" کی امکانی صورتیں یہ تھیں کہ میں درخت ہوتا، جانور ہوتا، پہاڑ ہوتا، پتھر ہوتا یا پھر فرشتہ و جن، مگر میں کچھ بھی ہوتا اپنے وجود کی ہر امکانی صورت میں اللہ کا بندہ (مخلوق) ہی ہوتا۔ اس کائنات میں میرے وجود کا ایسا کوئی امکان نہیں جہاں میں اصلاً اللہ کے بندے کے ماسواء کچھ اور بھی ہوتا۔ انسان ہونا میری اصل نہیں بلکہ میرے لئے ایک حادثہ ہے، ان معنی میں کہ اللہ نے جس حال میں چاہا مجھے پیدا کیا اور وہ مجھے انسان بنانے پر مجبور نہ تھا، یہ محض اس کا فضل ہے۔ پس یہ سوال کہ "اصلاً مسلمان ہو یا انسان" تو اس کا بالکل واضح جواب یہ ہے کہ اصلاً اور حقیقتاً میں اللہ کا بندہ (مسلمان) ہوں، انسان حادثاتی طور پر ہوں۔ میں لازماً "اللہ کے ساتھ ہونا" ہوں، نہ کہ اس سے ماوراء کوئی ہستی۔ اپنے انسان ہونے کو ڈیفائن کرنے کا اس کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا حوالہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں خود مختاریت کا دعویٰ کروں۔

"میں کون ہوں" اس سوال کا جواب میں جونہی اللہ کے حوالے کے بغیر دینے کی کوشش کرتا ہوں میں لازماً خود کو اللہ سے ماوراء و ما قبل وجود فرض کر لیتا ہوں اور یہی الحاد کی بنیاد ہے۔ اللہ کا وجود میرے شعور انسانیت سے ما قبل ہے، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اسی بات کا اقرار ہے۔ "مسلمان بننے سے قبل انسان بنو" اسی کلمے کا انکار ہے۔ (لاالہ الا الانسان)، پھر جب یہ واضح ہو چکا کہ "میری اصل انسان ہونا نہیں بلکہ اللہ کا بندہ (مسلمان) ہونا ہے" تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ایمان اور کفر کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے نیز یہ بھی کہ اللہ کا بندہ ہونا کیوں کر مسلمان ہونے کے ہم معنی ہے۔
وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (الشمس:7-10)
اور انسان کی اور اس کی جس نے اس (کے اعضا) کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس

(یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

جان لیں کہ اصلاً و حقیقتاً ہر انسان اللہ کا بندہ ہی ہے، چاہے وہ اس کا اقرار کرے یا انکار، کسی انسان کا اس حقیقت سے انکار کرنا کائنات میں اس کے حقیقی مقام کو بدل نہیں سکتا۔ اگر وہ زبان و دل سے اس حقیقت کا اقرار کر لے تو مؤمن و مسلم کہلاتا ہے اور اگر انکار کرے تو کافر۔ خوب جان رکھو کہ کافر کفر کر کے کسی نئی حقیقت کو دریافت نہیں کرتا بلکہ اپنی حقیقت کا انکار کرتا ہے، اسی لئے تو "کافر" (حقیقت کو چھپانے و جھٹلانے والا) کہلاتا ہے۔ پھر جب یہ واضح ہوا کہ اصلاً میں بندہ ہوں تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بطور انسان میں بندہ کیسے بنوں؟ تو اس کا جواب ہے:

"إِنَّ الدِّينَ عِندَاللهِ الإِسْلاَمُ" "یعنی اظہار بندگی کا واحد اور معتبر طریقہ تمہارے رب کے نزدیک صرف اسلام ہے نیز "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًافَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَفِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِين" اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا (العمران:85)۔

یعنی جس کسی نے اپنی انسانیت کے اظہار کیلئے اسلام کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار کیا تو ایسے طریقے سے ظاہر کی گئی انسانیت رب کے یہاں مقبول نہ ہو گی، چنانچہ میری انسانیت معتبر تب ہو گی جب میں اسے بندگی کے اظہار کا ذریعہ بناؤں اور بندگی کے اظہار کا طریقہ جاننے کا معتبر طریقہ صرف وہ پیغام ہے جسے اللہ نے اپنے آخری رسول ﷺ پر نازل کیا۔ اس ایک طریقے کے حوالے کے سواء اظہار بندگی کے سب طریقے مردود ہیں۔

جب یہ واضح ہوا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، تو اللہ کا یہ بندہ میں تنہائی (پرائیویٹ لائف) میں بھی ہوں اور لوگوں سے تعلقات قائم کرنے کے بعد (پبلک لائف میں) بھی۔ یہ عقلی مخمصہ کسی طور قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ تنہائی میں بطور انسان تو میں اور میری بیوی اللہ کے بندے ہیں لیکن جونہی ہم تعلق قائم چکا کر لیتے ہیں تو ہم اللہ کے بندے اور اس کے حکم کی اطاعت کے پابند نہیں رہتے۔ ایسی بات صرف ایسا ہی انسان قبول کر سکتا ہے جو عقلی طور پر قلاش ہو و ہو۔ میں اگر واقعی اللہ کا بندہ ہوں تو اپنی زندگی کی ہر حیثیت میں ہوں۔ اپنے سے باہر کسی غیر کو مخاطب کرنے کی میرے پاس اس کے سواء کوئی بنیاد حوالہ ہی نہیں نیز نہ ہی اللہ کے نازل کردہ پیغام سے باہر میرے پاس حقوق کے تعین کا کوئی ایسا دائرہ ہے کہ جس میں خود کو رکھ کر میں کسی سے ہم کلام ہو سکوں۔ میں جب بھی کسی کو خطاب کرتا ہوں تو اس بنیاد پر کرتا ہوں کہ اس بابت اللہ کا حکم مجھ سے کیا تقاضا کرتا ہے، میں جب بھی کسی غیر مسلم کو خطاب کرتا ہوں تو اسی حق کی طرف دعوت دیتا ہوں نہ کہ اس سے ماوراء حقوق کی کسی تفصیلات کے فریم ورک میں ان سے مکالمہ کرتا ہوں چنانچہ میں کسی غیر مسلم کا حق زندگی اس لئے نہیں مانتا کہ "ہر انسان کو بطور مجرد انسان "کچھ ایسے فطری حقوق حاصل ہیں جن کی پابندی مجھ پر لازم ہے، ہر گز بھی نہیں بلکہ ایسا اس لئے مانتا ہوں کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے اور جس کی پاسداری مجھ پر لازم ہے۔ حق کے تعین کا حق نہ تو میں اپنی ذاتی زندگی میں رکھتا ہوں اور نہ اجتماعی میں، "مُحَمَّدُ رَّسُولُ الله " کے اقرار کا یہی مطلب ہے۔

اب یہ جو "مسلمانیت" کے بجائے "انسانیت" کا حوالہ دیتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی اصل بات، جس کا خود ان میں سے بہت سوں کو بھی ادراک نہیں، آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔ میں اپنے انسان ہونے کے بارے میں مختلف بنیادی حوالے رکھ سکتا ہوں، مثلاً ایک یہ کہ میں اصلاً و سب سے پہلے راجپوت ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پنجابی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پاکستانی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً مزدور یا سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہوں، یا یہ کہ میں

اصلاً مسلمان، ہندو یا عیسائی ہوں۔ اپنی ذات کے ادراک کیلئے میں جو بھی حوالہ اختیار کرتا ہوں، اسی کی بقاو غلبے کیلئے جدوجہد کرنے کا اخلاقی جواز رکھتا ہوں۔

اب یہ آپ سے کہیں گے کہ تم اصلاً یہ سب نہیں ہو بلکہ یہ سب تو تمہاری اصل کا اظہار ہیں۔ اب آپ ان سے پوچھئے کہ بتاؤ پھر اصل میں "میں کیا ہوں؟" تو یہ آپ سے کہیں گے کہ اصل میں تم ایک آزاد و خود مختار (قائم بالذات) ہستی ہو جسے یہ حق ہے کہ وہ اپنے ارادے سے خیر کو متعین کرے۔ پس مسلمان ہونا یہ اصل نہیں بلکہ صرف اپنے ارادے کے تحت ایک خیر کو ڈیفائن کرلینا ہے۔ یہ واحد خیر نہیں بلکہ خیر کے لاتعداد تصورات میں سے بس ایک ہے۔ یعنی اللہ کا حوالہ چھوڑدو، زمین پر اپنے ارادے سے بنائے ہوئے خیر کے حوالوں کو اپناؤ، اسی کیلئے جدوجہد کرو۔ یہ ہے ان کے نزدیک انسان ہونے کا اصلی معنی، جس کا یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقرار کروانا چاہتے ہیں۔

ہیومن رائٹس "ہیومن" کے حقوق ہیں۔ ہیومن کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان ایک خود مختار و قائم بالذات وجود ہے۔ انسان کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنے والے کو ملحد کہا جاتا ہے۔ اس ملحد کا مفروضہ ہے کہ اصول عدل کے ادراک کیلئے لازم ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب سے انکار کرکے پہلے خود کو قائم بالذات وجود فرض کرے، یعنی "عدل کیا ہے" اس کا جواب معلوم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر شخص پہلے ملحد ہو جائے (لاک سے لے کر رالز تک سب ہیومنز کا یہی ماننا ہے)، ظاہر ہے اس الحادی پس منظر کے ساتھ جو اصول عدل اور حقوق کی تفصیلات طے کی جائیں گی وہ الحادی ہی ہوں گی۔ اس ملحد (ہیومن) کا اصرار ہے کہ عدل وانصاف انہی حقوق کا نام ہے جو ہم ملحدین نے طے کئے ہیں نیز دنیا کا ہر مذہب وروایت اسی قدر حق ہے جس قدر یہ ان اصولوں کی تصدیق کرتے ہوں لہٰذا دنیا کے تمام مذاہب وروایتوں کے حامل انسانوں پر لازم ہے کہ وہ انہی اصولوں کے مطابق فیصلے کریں۔ اگر کوئی مذہب یا فکر ان الحادی اصولوں کے طے کردہ حقوق کو معطل کرنے کی بات کرے تو یہ اسے جبر و ظلم قرار دیتے ہیں لیکن خود یہ ملحدین دنیا کے سب مذاہب اور روایتوں کے طے کردہ حقوق معطل کرکے ان پر بالجبر اپنے اصول مسلط کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں چونکہ ہیومن رائٹس الحادی فریم ورک کے طے کردہ اصول ہیں لہٰذا ہیومن رائٹس کے فروغ سے الحاد ہی کا غلبہ ہوتا ہے۔

آخری بات عقیدے کے جن چند اسباق کا یہاں ذکر کیا گیا انہیں خوب اچھی طرح سمجھ رکھنا چاہیے کیونکہ جدید الحاد نے عقیدوں میں جو اجاڑ پیدا کیا ہے اس کا سبب اسی نوع کے خوشنما دعوے واصطلاحات ہیں جنہیں دھر ادھر اکر لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اوپر جو تفصیلات پیش کی گئیں یہ سیکولر حضرات کے اس مقدمے کو رد کرنے اور اس کی غلطی واضح کرنے کیلئے پیش کی گئیں کہ معاشرے وریاست کی بنیاد اس قدر پر رکھنا چاہئے جو سب انسانوں میں مشترک ہو، چونکہ ہم اصلاً انسان ہیں نہ کہ مسلمان ہندو وغیرہ، تو معلوم ہوا کہ مذہب انسانوں کی بنیادی صفت اور قدر مشترک نہیں۔ اسی کلیدی دلیل (پہلے واصلاً انسان ہو یا مسلمان وہندو) کی بنیاد پر یہ لوگ مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے کا مقدمہ کھڑا کرتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہا گیا اسے سمجھ لیا جائے تو سیکولرڈسکورس کی بنیادی غلطی واضح ہو جائے گی۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ (عبس:18-22)

اُسے (اللہ نے) کس چیز سے بنایا؟ نطفے سے بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔ پھر اس کیلئے رستہ آسان کر دیا۔ پھر اس کو موت دی پھر قبر میں دفن کرایا۔ پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔

اب آیئے ان تمام دلائل کے بعد اپنے ارضِ وطن کے حالات پر ایک نگاہ دوڑاتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ معاشرے کی موجودہ ذہنیت کو کیسے بدلا جائے۔ پاکستان میں سول سروس برطانوی دور کی میراث ہے۔ اسے برطانوی راج کے نفاذ کیلئے انگریزوں نے تیار کیا تھا جو خود کو ہر حال میں عوام سے برتر خیال کرتی تھی لیکن نہ تو ہم اس نظام میں اصلاح کر سکے اور نہ ہی سیاستدانوں کا کوئی لائق تحسین کردار رہا ہے۔ موجودہ پاکستان اقتصادی لحاظ سے عالمی سطح پر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں، یہاں تک کہ خطے میں بھی تمام معاشرتی اشارے میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ شہریوں کیلئے اشرفیہ کے استعمال کردہ الفاظ توہین آمیز ہیں۔ ریاست اور شہریوں کے مابین ایک اچھی طرح سے طے شدہ معاشرتی معاہدہ کی ضرورت ہے جو حکم رانوں، مالکوں اور شہریوں کیلئے یکساں پابند ہو۔

پاکستان میں اکثر یہ دہائی دی جاتی ہے کہ ملک پر زیادہ عرصہ فوج نے حکمرانی کی لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ملک کی ترقی کا زیادہ دور انہی فوجی حکم رانوں کے دور کو گنا جاتا ہے۔ چین کی کامیابی کا ایک عنصر یہ ہے کہ حکمرانی میں زیادہ تر افراد ماہر ہیں۔ یہاں تک کہ چین کے موجودہ صدر کیمیکل انجینئر ہیں۔ برطانوی راج میں میرٹ پر سختی سے مشاہدہ کیا گیا۔ اب ہمارے پاس تمام سرکاری ملازمین کیلئے سیاسی تقرریوں اور سیاسی مجبوریاں ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگ اس تصور کی پیروی کرتے ہیں کہ معاشرہ میں عزت کا معیار ڈالر کے حصول میں ہے اور اس خواہش میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں رکھی جاتی اور ڈالر کی تلاش میں سرکاری ملازمین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ "ڈالر کی تلاش" کے بعد کیسے اہلیت، دیانت، انصاف کی محنت اور میرٹ کے فیصلوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں معاشرے کی ذہنیت کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔

زمینی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ غیبی مدد نہ اسپین کے وقت آئی، نہ خلافت عثمانیہ کو بچانے کیلئے آئی، نہ اسرائیل کا قیام روکنے کیلئے آئی، نہ بابری مسجد کے وقت آئی، نہ عراق اور شام کے وقت آئی، نہ میانمار کے وقت آئی، نہ گجرات کے وقت آئی، نہ کشمیر کیلئے آئی۔ پھر بھی گھروں اور مسجدوں میں بیٹھ کر غیبی مدد کی صدائیں دی جارہی ہیں؟ غیبی مدد جنگ بدر میں آئی جب 1000 کے مقابلے میں 313 میدانِ جنگ میں اُترے۔ غیبی مدد جنگ خندق میں آئی جب اللہ کے محبوب ﷺ نے پیٹ پر 2 پتھر باندھے اور خود خندق کھودی اور میدانِ جنگ میں اُترے۔ غیبی مدد افغانستان میں آئی جب بھوکے پیاسے مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں میدانِ جنگ میں اُترے۔

دنیا کا قیمتی لباس پہن کر، مال وزر جمع کر کے، لگژری ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں بیٹھ کر (انہی کافروں کی بنائی ہوئی مصنوعات زیر استعمال لا کر)، جُھک جُھک کر لوگوں کے ہاتھ چومنے کی خواہش لے کر، لوگوں کی واہ واہ کی ہنکار کی خواہشات لئے مسجدوں کے منبروں پر بیٹھ کر بددعائیں کر کے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ طاغوت کے نظام پر راضی اور پھر غیبی مدد کے منتظر؟؟؟؟؟ اللہ کی زمین پر اللہ اور اُس کے محبوب ﷺ کے نظام کے نفاذ کی جدوجہد کی بجائے صرف نعت خوانی، محفل میلاد یا تسبیح کے دانوں کو دس لاکھ بیس لاکھ گھما کر غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ آفاقی دین کو چند جزئیاتِ عبادت میں محصور و مقید کر کے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟

خود کو اور دوسرے مسلمانوں کو مجاہد بنانے کی بجائے مجاور بنا کر، خوب پیٹ بھر کر فربہ جسم لئے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ جہاد فی سبیل اللہ اور جذبہ شہادت سے دُور رہ کر اور دُور رکھ کر مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وجبر اور مصائب ومشکلات دیکھ کر اللہ دشمن کو غرق کردے، اللہ دشمن کو تباہ وبرباد کردے۔ یا اللہ مظلوموں کی مدد فرما۔ یا اللہ دشمنوں کو ہدایت عطا فرمادے اور اگر اُن کے نصیب میں ہدایت نہیں تو انہیں غرق کردے جیسی بددعاؤں پر اکتفاء کر کے سکوت اختیار کر لینے اور سکون سے نوالہ تر حلق سے نیچے اُتار کر پھر دوبارہ پیٹ بھر کر گہری نیند سونے والے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ یعنی سب کچھ اللہ کے ذمہ لگا کر اور خود کنارہ کشی اختیار کر کے غیبی مدد کے منتظر ہیں؟

میدان جہاد میں اُترنے سے ڈرتے اور کتراتے ہوئے آسمانوں سے فرشتوں کے نازل ہو کر مسلمانوں کی غیبی مدد کے منتظر ہیں؟ایسی صورت میں غیبی مدد نہیں صرف عذاب ہی آئے گا جو ہم ناعاقبت اندیش حکمران، بداندیش افسران، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، جھوٹ، کم تولنا، ملاوٹ، خودغرضی و دیگر معاشی و معاشرتی برائیوں کی شکل میں بھگت بھی رہے ہیں!خواب غفلت سے بیدار ہوں، علم، کردار و جہد مسلسل سے اپنے مہربان رب سے رجوع کریں اور مدد طلب کریں تب جا کر آپ اشرف المخلوقات کا مطلب سمجھ سکیں گے کہ "میں کون ہوں"۔

بروز ہفتہ 25 ربیع الاول 1446ھ 28 ستمبر 2024ء

اپنی باری کا انتظار

اس وقت عالمی میڈیا جو بھرپور اسرائیل کو اپنے دفاع میں لڑنے والا ملک بتا کر اس کے ہونے والے مظالم پر پردہ ڈال رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کو مسلم کشی کا ٹھیکہ دیکر اپنے اپنے ملکوں میں نوجوان نسل کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا جاسکے کیونکہ جب سے فرانس میں آبادی کے تناسب سے یہ رپورٹیں شائع ہونی شروع ہوئی ہیں کہ 2050 تک موجودہ انتخابی عمل کی بناء پر ہی مسلمان فرانس میں اس قدر اکثریت میں ہوں گے کہ ان کو حکومت میں آنے سے روکنا مشکل ہو جائے گا اور اس کے بعد دیگر یورپی ممالک میں بھی اس سلسلے کو پھیلنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہو گی۔ آج غزہ فلسطین کے بعد لبنان کے معاملے کو اسی تناظر میں دیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

لبنان ایک ایسا ملک ہے جہاں مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کے مقابلے میں رائے کے اظہار کی کافی زیادہ آزادی ہے جس کی وجہ سے حزب اللہ کی حمایت یا اُس کی مخالفت عوامی اور نجی سطح پر گفتگو کا ایک اہم نکتہ رہتی ہے۔ حزب اللہ، اُس کے سیاسی اثر و رسوخ اور اُس کے فوجی ہتھیاروں کے بارے میں کوئی گرما گرم مباحثے بھی پڑھنے سننے کو ملتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت لبنان کی کمزور فوج کے مقابلے میں حزب اللہ ہی ایک ایسی تنظیم ہے جو اسرائیل کے خلاف برسرپیکار ہے اور اسرائیل کو سب سے زیادہ ٹف ٹائم بھی اسی تنظیم کی طرف سے مل رہا ہے۔ حزب اللہ کی عسکری طاقت کے بارے میں بہت سے افراد کا خیال ہے کہ ایک کمزور فوج کی وجہ سے حزب اللہ کا طاقتور ہونا اور طاقت کے مزید حصول کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

اسرائیل نے لبنان پر سب سے پہلے 1982 میں حملہ کیا تھا جس کے بعد وہ 2000 تک جنوبی لبنان کے چند حصوں پر آج بھی قابض ہے۔ لبنان میں حزب اللہ کی عسکری فوج وہ واحد قوت ہے جو گذشتہ دہائیوں میں مؤثر طریقے سے اسرائیلی افواج کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ لبنانی فوج غیر منظم ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور، پرانے اور محدود ہتھیاروں سے لیس ہے اور اسلحے اور گولہ بارود کیلئے امریکا اور دیگر مغربی ممالک پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے۔ اس صورتحال کے باعث لبنان میں بہت سے وہ لوگ جو عام طور پر حزب اللہ کے ساتھ ہمدردی نہیں بھی رکھتے، وہ بھی اس کی حمایت کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک حزب اللہ کے اہم سیاسی حلیفوں میں سے ایک اُس وقت کی سب سے بڑی مسیحی جماعت، فری پیٹریاٹک موومنٹ تھی۔ گذشتہ کئی برسوں سے حزب اللہ اور فری پیٹریاٹک موومنٹ کے درمیان ایک دوسرے کی حمایت کرنے کا معاہدہ تھا۔ اس سیاسی اتحاد سے جہاں فری پیٹریاٹک موومنٹ کو ایک قابل قدر شیعہ سیاسی جماعت کا ساتھ ملا وہیں حزب اللہ نے ایک مسیحی سیاسی حمایت حاصل کی، ایک ایسی مسیحی سیاسی جماعت جو حزب اللہ سے فوری طور پر تخفیف اسلحہ کا مطالبہ نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ اب دونوں گروہوں کے درمیان یہ سیاسی معاہدہ ختم کروانے میں غیر ملکی قوتوں کا بہت بڑا عمل دخل ہے تاکہ حزب اللہ کو مزید کمزور کرکے لبنان سے اس کے وجود کو ختم کیا جاسکے اور لبنان کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کرکے اسے مزید کمزور کرکے اپنی ایک باجگزار مسیحی ریاست کا قیام وجود میں لایا جائے لیکن اسرائیلی حملوں کے بعد رونما صورتحال سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ لبنان میں مختلف گروہ کس طرح مذہبی خطوط پر اتحاد بنا سکتے ہیں اور ہر آنے والا قدم حزب اللہ کی حمائت کیلئے نرم گوشہ پیدا کر رہا ہے اور اسرائیل کیلئے ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے عالمی قوتوں کے شیطانی دماغ میں پلنے والا مکروہ منصوبہ بھی شکست سے دوچار نظر آتا ہے۔

لبنان پر شدید فضائی حملوں سے نمایاں طور پر لگ رہا ہے کہ حزب اللہ کو نشانہ بنانے کی آڑ میں لبنان کی تقسیم کے فارمولے پر مزید بڑھاوا دینے پر عمل

درآمد ہو رہا ہے۔ اسرائیلی جیٹ طیاروں نے لبنان کے جنوب اور وادی البقاع پر بمباری کی تو نیتن یاہو نے لبنانی عوام کے نام ایک پیغام میں کہا کہ "اسرائیل کی جنگ آپ کے ساتھ نہیں ہے، یہ حزب اللہ کے ساتھ ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا نیتن یاہو کے اس مکارانہ بیان کے بعد لبنان میں اسرائیل کے مظالم کے پس منظر میں لبنان میں وجود میں آنے والا فطری اتحاد کار دعمل کیا ہوتا ہے اور حزب اللہ لبنان کے اندر کتنی حمایت برقرار رکھ سکتی ہے، اس کا دارومدار اس ایک اہم عنصر پر ہو سکتا ہے کہ آیا سرحد پار بحران بڑھتا یا پھیلتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لبنان میں ہمدردیوں، دشمنیوں اور سیاسی اتحادوں کا پہلے سے موجود پیچیدہ جال حالیہ تنازع اور بحران کے دوران مزید تبدیل ہو رہا ہے تاہم موجودہ صورتحال میں لبنان میں بہت سے لوگوں اور گروہوں نے اپنے اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے افراد جنہوں نے غزہ کی حمایت میں اسرائیل کے خلاف حملے شروع کرنے کے حزب اللہ کے فیصلے پر تنقید کی تھی اور حزب اللہ پر ملک کو ایک سنگین بحران میں گھسیٹنے کا الزام لگایا تھا، وہ بھی موجودہ صورتحال میں اظہار یکجہتی کرتے دکھائی دیے ہیں۔

لبنان میں واکی ٹاکیز، پیجر اور وائرلیس آلات پھٹنے کے نتیجے میں درجنوں افراد ہلاک، زخمی یا معذور ہوئے تھے اور حزب اللہ نے اِس کا الزام اسرائیل پر عائد کیا تھا تاہم فی الحال اسرائیل نے اِن حملوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے لیکن واضح شواہد کے مطابق اسرائیل ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ حزب اللہ کیلئے یہ حمایت جنوبی لبنان اور وادی البقاع پر بڑے پیمانے پر اسرائیلی فضائی حملے کے آغاز کے بعد اور بیروت کے ایک بہت پُر ہجوم جنوبی مضافاتی علاقے دحیہ کو نشانہ بنانے کے بعد مزید تیز ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے عام شہریوں کی ہلاکت ہوئی ہے جن میں بہت سے بچے ہیں۔ ان حملوں کے بعد بہت سے لوگوں نے وہاں سے نقل مکانی بھی کی ہے یہ حزب اللہ کیلئے ایک فطری حمایت ہے۔

حال ہی میں رخصت ہونے والے امریکی صدر جو بائیڈن نے اقوام متحدہ میں اپنی حالیہ تقریر میں ایک مرتبہ پھر خطے میں دوریاستی حل کی تجویز پیش کرتے ہوئے اپنی منافقت کا اظہار کیا ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ خطے میں اس بربادی کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ خود امریکا کا ہے اور اس کے اتحادی بھی امریکا کی ہاں میں ہاں ملانے کو اسرائیل کی پشت پر کھڑے ہیں۔ اب مغربی استعمار کی بھرپور کوشش ہے کہ ہر حال میں لبنان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن خود مغربی تجزیہ نگار اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ داخلی تقسیم کو موجودہ صورتحال میں ایک لمحے کے لیے ایک طرف رکھنا چاہیے کیونکہ اس کے بعد پیش آنے والی تباہی کو روکنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ خطے میں یہ خطرہ بھی ابھر کر سامنے آرہا ہے کہ معاملہ لبنان کی تقسیم پر ختم نہیں ہو گا بلکہ اس کے فوری بعد اردن کی طرف رخ پھیرا جائے گا اور اسرائیل اپنی برسوں سے طے شدہ توسیع پر عملدرآمد کرتا ہوا "گریٹر اسرائیل" پر عمل پیرا ہے۔ سوال یہ ہے کہ خطے میں موجود دیگر مسلم ممالک کب تک سیاسی مصلحتوں کا شکار بن کر مغربی ممالک کے لے پالک بدمعاش اسرائیل کو نکیل ڈالنے کیلئے اپنی باری کا انتظار کریں گے۔

بروز منگل 28 ربیع الاول 1446ھ 29 ستمبر 2024ء

گریٹر اسرائیل کا منصوبہ: تاریخ، سیاست اور حقائق

میرے گزشتہ کالم میں "گریٹر اسرائیل" کے تذکرہ کے بعد بے شمار پیغامات موصول ہوئے جس میں نوجوانوں کی اکثریت نے اس کی مزید تفصیل کا مطالبہ کیا اور کئی قارئین اس کو اسرائیلی کی بے مہار طاقت اور پروپیگنڈہ کی برتری کیلئے ایک افسانوی کہانی قرار دیتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ایک لکھنے والے کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مقدور بھر تحقیق کے بعد اپنے قارئین کو معلومات بہم پہنچائے جس کیلئے یقیناً قارئین کی آراء بھی اپنا ایک مضبوط مقام رکھتی ہیں۔ پہلی مرتبہ گریٹر اسرائیل کا تذکرہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سامنے آیا تھا لیکن اسرائیل کی طرف سے اس پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی لیکن اس کی تردید کبھی سامنے نہیں آئی لیکن گزشتہ دو دہائیوں سے باقاعدہ یہودی اس مذموم منصوبے کی تائید میں لکھنے کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا پر بھی گریٹر اسرائیل کا تذکرہ کھل کر رہے ہیں جس کا رواں برس جنوری میں اسرائیلی مصنف "ایوی لپکن" کا انٹرویو عالمی طور پر بڑا وائرل ہوا جس میں اس نے کھل کر "گریٹر اسرائیل" کے منصوبے پر اپنے بیمار ذہن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "فرات کے دوسری جانب کرد ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ ہمارے پیچھے بحیرہ روم ہے اور ہمارے آگے کرد۔۔۔ لبنان کو اسرائیل کے تحفظ کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم مکہ اور مدینہ اور طورِ سینا پر بھی قبضہ کریں گے اور ان جگہوں کو پاک کریں گے"۔ "ایک دن آئے گا جب ہماری سرحدیں لبنان سے لے کر سعودی عرب کے عظیم صحراؤں سے ہوتی ہوئی بحیرہ روم سے لے کر نہرِ فرات (عراق) تک پھیلی ہوں گی"۔

گریٹر اسرائیل کے تصور کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب غزہ میں زمینی کاروائی کے دوران اسرائیلی فوجیوں کے یونیفارم پر "گریٹر اسرائیل" کے نقشہ کے بیج پہن رکھے تھے جبکہ انتہائی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی وزراء کی طرف سے "دا پرومسڈ لینڈ، جس کا وعدہ کیا گیا ہے" کے نقشے میں اردن، فلسطین، لبنان، شام، عراق اور مصر کے کچھ حصوں پر قبضہ کرنا شامل ہے۔ اسرائیل میں بہت سے یہودی اس خطے کو "ایرٹز اسرائیل، یا لینڈ آف اسرائیل" کے نام سے جانتے ہیں اور یہ اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے کہیں بڑا جغرافیائی علاقہ ہے۔ یاد رہے کہ گریٹر اسرائیل کا تصور کوئی نیا خیال نہیں مگر یہ تصور کہاں سے آیا اور "دا پرومسڈ لینڈ" میں کون کون سے علاقے شامل ہیں، یہ جاننے کیلئے ہمیں کئی سو سال پیچھے جانا پڑے گا۔

گزشتہ برس اکتوبر میں حماس اور اسرائیل کے درمیان کھلی جنگ ابھی ختم نہیں ہو پائی کہ اسرائیلی جارحیت کا شکار لبنان کے بعد اب یمن بھی ہو گیا ہے جبکہ اسرائیل کے ٹارگٹ حملوں میں نئے منتخب ایرانی صدر کی تقریبِ حلفِ وفاداری میں شرکت کیلئے آنے والے حماس کے لیڈر اسمٰعیل ہانیہ کی شہادت کے بعد خطے میں ایک نئی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا اور اب لبنان میں حزب اللہ کے مشہور رہنماء حسن نصر اللہ کے ساتھ اکیر کئی اہم رہنماؤں کو شہید کر دیا گیا جس میں پاسداران انقلاب کے ایک جنرل بھی شامل ہیں۔ اقوام متحدہ میں امریکا سمیت کئی مغربی ممالک نے دنیا کی اشک شوئی کیلئے جنگ بندی کا تذکرہ تو ضرور کیا لیکن جواب میں اسرائیل کی کاروائیوں میں مزید شدت نظر آ رہی ہے جس کے بعد "گریٹر اسرائیل" کی گونج میں بھی اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔

صیہونیت کے بانی تھیوڈور ہرزل کے مطابق "پرومسڈ لینڈ" یا گریٹر اسرائیل کے نقشے میں مصر میں دریائے نیل سے لے کر عراق میں نہرِ فرات تک کے علاقے شامل ہیں یعنی فلسطین، لبنان، اردن، عراق، ایران، شام، مصر، ترکی اور سعودی عرب بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ ہوں گے۔ 1947ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین کو دو الگ الگ یہودی اور عرب ریاستوں میں تقسیم کرنے کی منظوری دی اور بیت المقدس کو ایک بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ اس کے

بعد اسرائیلی سیاستدان اور سابق وزیر اعظم مینیچیم بیگن نے کہا تھا کہ "فلسطین کی تقسیم غیر قانونی ہے۔یروشلم ہمارادارالحکومت تھااور ہمیشہ رہے گااورایرٹزاسرائیل کی سرحدوں کو ہمیشہ کیلئے بحال کیا جائے گا"۔

اخبار ٹائمز آف اسرائیل میں "زایونزم 2.0: تھیمز اینڈ پر وپوزلز آف ریشیپنگ ورلڈ سیویلائزیشن" کے مصنف ایڈرئن سٹائن لکھتے ہیں کہ گریٹر اسرائیل کا مطلب مختلف گروہوں کیلئے مختلف ہے۔اسرائیل میں اور ملک سے باہر رہنے والے یہودیوں کیلئے گریٹر اسرائیل کی اصطلاح کا مطلب مغربی کنارے (دریائے اردن) تک اسرائیل کی خود مختاری قائم کرنا ہے۔اس میں بائبل میں درج یہودیہ، سامرہ اور ممکنہ طور پر وہ علاقے شامل ہیں جن پر 1948 کی جنگ کے بعد قبضہ کیا گیا۔اس کے علاوہ اس میں سینائی، شمالی اسرائیل اور گولان کی پہاڑیاں شامل ہیں۔

اس حوالے سے مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال پر گہری نظر رکھنے والی اور واشنگٹن میں مقیم پالیسی تجزیہ کار تقیٰ نصیرات کے مطابق "گریٹر اسرائیل کا تصور اسرائیلی معاشرے میں رچابسا ہے اور حکومت سے لے کر فوج تک اسرائیلی معاشرے کے بہت سے عناصر اس کے علمبر دار ہیں۔اسرائیلوں کا ماننا ہے کہ اسرائیل بائبل میں درج حوالوں اور تاریخی اعتبار سے ان زمینوں کا حقدار ہے جو نہ صرف "دریا سے سمندر تک" بلکہ "دریا سے دریا تک" پھیلی ہوئی ہیں۔یعنی دریائے فرات سے دریائے نیل تک اور ان کے درمیان تمام علاقے۔

تقیٰ نصیرات کے مطابق اگرچہ گریٹر اسرائیل کے تصور کے پیچھے اصل خیال یہی ہو سکتا ہے مگر آج کے اسرائیل میں ایک زیادہ حقیقت پسندانہ سوچ یہ ہے کہ اس میں اسرائیل کی سرحدوں سے باہر کے وہ علاقے مغربی کنارے کے علاقے، غزہ اور گولان کی پہاڑیاں بھی شامل ہیں جن پر اس نے طویل عرصے سے قبضہ کر رکھا ہے۔تاہم برطانیہ کی برمنگھم یونیورسٹی میں مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر اور "کنگ فیصل سینٹر فار ریسرچ اینڈ اسلامک سٹڈیز" کے ایسوسی ایٹ فیلو عمر کریم گریٹر اسرائیل کو "محض ایک افسانوی تصور" مانتے ہیں۔یہودی مذہب کے مطابق گریٹر اسرائیل سے مراد مشرقِ وسطیٰ میں وہ تمام قدیمی علاقے ہیں جو سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے اور جہاں یہودی آباد تھے۔جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر آئے تھے تو اس وقت ان کا مرکز فلسطین تھا جہاں آ کر وہ آباد ہوئے، اسرائیلی حکومت اسے آج بھی جودیہ صوبے کا حصہ مانتی ہے اور اس کے علاوہ گریٹر اسرائیل میں وہ تمام علاقے شامل ہیں جہاں جہاں یہودی آباد تھے۔

عمر کا ماننا ہے کہ گریٹر اسرائیل ایک ایسی فینٹیسی ہے جو پریکٹیکل نہیں، مگر یہودیوں سے زیادہ صیہونی سیاست میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے۔" عملی طور پر اسرائیلی، فلسطین کے تمام مقبوضہ علاقوں سمیت مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کو اپنا حصہ مانتے ہیں لیکن اگر صرف "فینٹیسی" کی بات کی جائے تو گریٹر اسرائیل میں جزیرہ نما عرب یعنی آج کے سعودی عرب، عراق، اردن، مصر کے کچھ علاقے اس میں شامل ہیں۔"داپرومسڈ لینڈ" کے متعلق عمر کریم بتاتے ہیں کہ جب حضرت یوسف کے دور میں یہودی مصر میں آباد ہوئے تب ان کی حکمرانی فلسطین سے لے کر بلادِ شام (آج کا شام) اور فرات کے کچھ علاقوں تک تھی اور عرب ریاستیں نہ ہونے کے باعث ان کا اثر ورسوخ کئی علاقوں تک تھا اور گریٹر اسرائیل کا تصور یہیں سے آیا ہے کہ "بنی اسرائیل کی اولاد جہاں جہاں پلی بڑھی ہے وہ سب علاقے ہمارے ملک کا حصہ ہوں۔ عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے اور اب گریٹر اسرائیل کا مطلب صرف مقبوضہ علاقے ہیں جن میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں سمیت مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ شامل ہیں۔

2023 میں دائیں بازو کے اسرائیلی وزیر بیزلیل سموٹریچ کے پیش کردہ "گریٹر اسرائیل" کے نقشے میں تو اردن بھی شامل تھا جس کے باعث سفارتی تنازع

کھڑا ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ اسرائیلی وزیر نے پیرس میں ایک تقریر کے دوران گریٹر اسرائیل کا ایک نقشہ پیش کیا تھا جس میں اردن اور مقبوضہ مغربی کنارے کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ اردن نے بیز لیل پر دونوں ممالک کے درمیان امن معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگاتے ہوئے شدید احتجاج کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سموتریچ ہو یا بین گویر، جن حلقوں کی وہ نمائندگی کرتے ہیں وہ اسی تصور کو اسرائیل کا جائز مستقبل سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اسی تصور کا استعمال کرتے ہوئے نیتن یاہو کی موجودہ حکومت میں غیر قانونی اسرائیلی آبادکاروں کو مسلح کرنے، ان کی حمایت اور تحفظ فراہم کرکے اسے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ یہ غیر قانونی اسرائیلی آبادکار زبردستی فلسطینیوں کے زیتون کے باغوں کو جلا کر، انہیں ان کے گھروں سے بے گھر کرکے اور ڈرادھمکا کر انہیں اپنی حفاظت کیلئے بھاگنے پر مجبور کر رہے ہیں اور مغربی کنارے میں نئی بستیاں قائم کر رہے ہیں۔ حماس کے اسرائیل پر کیے گئے 7/ اکتوبر والے حملوں کے بعد ان عناصر (غیر قانونی مسلح اسرائیلی آبادکاروں) نے نمایاں اثرورسوخ اور طاقت حاصل کرلی ہے اور وہ اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) اور نتن یاہو کے وزرا کی حفاظت میں اس ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ اکثر انہیں "غیر ریاستی عناصر" پکارا جاتا ہے لیکن انھیں کچھ بھی پکار لیں، حقیقت یہی ہے کہ انہیں براہ راست وزیر اعظم نتن یاہو کی حمایت حاصل ہے جس نے اس سال جولائی میں 5300 نئی بستیوں کے قیام کی منظوری دی تھی۔

یاد رکھیں! کسی بھی قوم میں انتہاپسند ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں جیسے اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کی صہیونی افراد کے ہیں"۔ اسرائیل کی ریاست قائم ہونے کے بعد یہودیوں کو ایک مذہبی ریاست کا تصور دوبارہ سے ملا ہے کیونکہ پہلے یہودی جہاں بھی آباد تھے یا تو وہ اقلیت میں تھے یا ان ملکوں کے شہری تھے۔ پہلی مرتبہ پاکستان کی طرح انہیں اسرائیل کی صورت میں ایک مذہبی ریاست کا تصور ملا ہے جہاں یہودی مذہب ہی ان کی قومیت کی بنیاد بنا اور "یہی سے اس بحث نے جنم لیا کہ چونکہ اب ہم نے اپنی مذہبی ریاست قائم کرلی ہے لہٰذا اب ہم اسے روایتی حدوں تک لے کر جائیں گے"۔

آج کے اسرائیل میں بہت کم افراد "جو انتہائی اقلیت میں ہیں" وہ ایسی باتیں کرتے ہیں تاہم ان کا ماننا ہے کہ عملی طور پر یہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ اسرائیل کے اردن جیسے ہمسایہ ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات ہیں جن کا مطلب ہے کہ وہ ان ممالک کی سرحدی حدود کو تسلیم کرتا ہے"۔ لیکن زمینی حقائق اسرائیلی ظالم وسفاک حکمرانوں پر اس لئے یقین نہیں کرسکتے کہ سفارتی تعلقات تو مصر، اردن کے ساتھ بھی ہیں لیکن اس کے باوجود آج تک ان کے علاقوں پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ موجود ہے۔ عرب امارت اور گلف کے ساتھ بھی اسرائیل کے سفارتی تعلقات قائم ہیں اور سعودی عرب کے ساتھ بھی ان کے پہلے سے کہیں زیادہ خوشگوار تعلقات ہیں۔۔ اور ملک کی تیسری جانب شام کے ساتھ بھی اسرائیل کا صرف گولان ہائٹس کا تنازع ہے اور اس کے علاوہ دونوں ممالک کے بیچ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی اور عملی طور پر گریٹر اسرائیل کے قیام کی باتیں محض خیالی ہیں اور اسرائیل میں سنجیدہ سیاست دان اور تجزیہ کار اس بارے میں کبھی بات کرتے نظر نہیں آتے تاہم یہ فینٹسی ان طبقات میں ضرور موجود ہے جو ایک طرح سے پوری دنیا میں یہودیوں کی نشاطِ ثانیہ کا تصور رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسرائیل "گریٹر اسرائیل" کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہے تو مغرب کا اس پر کیا ردِ عمل ہوگا؟ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں اب تک مغرب، خاص طور پر امریکا نے زمینی حقائق کی تبدیلی اور اسرائیلی بستیوں کی توسیع کے حوالے سے کمزور ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس سال کے شروع میں جب اسرائیل نے کچھ پرتشدد آبادکاروں کو بستیاں قائم کرنے کی منظوری دی تو "بائیڈن انتظامیہ نے بہت نپے تلے انداز میں ان کی مذمت کی تھی"۔

مغرب میں اسرائیل کے حمایتی ممالک کی طرف سے ان اقدامات پر کوئی سنگین ردِ عمل سامنے نہیں آیا، لہٰذا ایک طرح سے مغربی ممالک کی جانب سے اسرائیل کو "گریٹر اسرائیل" کے خواب کو پورا کرنے کیلئے گرین لائٹ مل گئی ہے اور بااثر اسرائیلی لیڈروں کی ایک بڑی تعداد اس خواب کی تعبیر میں لگی ہے تاہم گریٹر اسرائیل کا قیام نہ مغرب اور نہ مغرب میں رہنے والے یہودیوں کو قابلِ قبول ہوگا۔ جب 1947 میں یہودیوں کیلئے اس ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت یہی خیال تھا کہ پوری دنیا میں انہیں استحصال کا سامنا رہا ہے لہٰذا انھیں ایک الگ ملک ملنا چاہیے جہاں وہ اس طرح کے استحصال سے بچ کر زندگی گزار سکیں اور تمام مغربی ممالک اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں آج بھی مغربی کنارہ اور غزہ کو مقبوضہ علاقے کہا جاتا ہے اور اسے امریکا اور برطانیہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کے بارے میں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اس خیالی منصوبے کی بات تو ایک طرف، ان مقبوضہ علاقوں کے علاوہ گولان ہائٹس جہاں اسرائیل 1967 سے قابض ہے، اسے بھی تمام مغربی ممالک اور بین الاقوامی ادارے مقبوضہ علاقہ مانتے ہیں۔ اس لئے "گریٹر اسرائیل" کی نہ تو کوئی قانونی حیثیت ہے اور نہ اسرائیل کی پاس اتنی فوجی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے منصوبے کو مستقبل میں عملی جامہ پہنا سکے لیکن فرض کریں "اگر اسرائیل ایسی کوئی کوشش کرتا بھی ہے تو مغرب کی سیاسی وفوجی اجازت اور مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں ہو سکتا"۔ ایک طبقہ یہاں پاکستان کے ان فراد کے بارے میں اپنا بغض کا اظہار کرتے ہوئے اسرائیل کے اس مذموم ارادے کی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ "گریٹر اسرائیل" محض ایک فینٹیسی ہے جو مختلف شدت پسند گروہوں کیلئے "سیاسی لائف لائن" کا کام کرتی ہے اور ان کے نظریات کو زندہ رکھنے میں اور ان کیلئے معاشرے میں اپنی اہمیت دکھانے میں کارگر ہوتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے پاکستان میں کچھ لوگ خلافت اور دنیا بھر پر راج کرنے کا تصور رکھتے ہیں۔

ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیئے زمینی حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اتنا ہی عرض کروں گا کہ افغانستان میں روس کی شکست کے فوری بعد "ون ورلڈ آرڈر" کے خالق امریکا کے سابقہ خارجہ سیکرٹری "ہنری کیسنجر" کے اس بیان کو ضرور ذہن میں یاد کر لیں جس میں اس نے واضح طور کہا تھا کہ روس کو امریکا کے مقابلے میں بطور عالمی طاقت کے شکست دینے کے بعد "مذہب اسلام، مسلمان" ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے جس سے نمٹنا انتہائی ضروری ہے"۔ یہ وہی ہنری کیسنجر ہے جس کو چین سے ملانے کیلئے ایک اہم کردار ادا کیا تھا لیکن 1971ء میں ان کی ساری ہمدردیاں ہمارے دشمن بھارت کے ساتھ تھیں۔ یہ وہی کیسنجر ہیں جن پر یہ بھی الزام ہے کہ ان کی پالیسیوں کے سبب کمبوچیا اور لاؤس پر بے تحاشا بمباری کی گئی۔

انہوں نے چلی میں صدر آلندے کی منتخب مارکسسٹ حکومت کا تختہ الٹوانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ افریقا اور لاطینی امریکا میں امریکا نواز فوجی آمریتوں کی حمائیت کی۔ مشرقی تیمور پر انڈونیشیا کے جبری قبضے کو تسلیم کیا۔ بھٹو کو ایٹمی ہتھیاروں کا منصوبہ ترک کرنے، ایٹمی پروگرام کو یکسر ختم نہ کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ کہا جاتا ہے کہ کیسنجر کا عملیت پسند سفاک سیاست کا نظریہ اس دنیا میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت کا سبب بنا اور بعد ازاں کیسنجر کے سفارتی شاگردوں نے اس عمل کو اور سیقل کیا۔ انہوں نے 1977ء میں کہا کہ اسرائیل کا تحفظ تمام آزاد انسانوں کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ مرنے سے 3 ماہ پہلے اسرائیلی اخبار ماریف کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا "میں ایک یہودی ہوں۔ اس حیثیت میں آلِ یہود اور اسرائیل کی بقا میرا ذاتی مسئلہ ہے"۔ 2014ء میں عالمی جیوش کانگریس نے ہنری کیسنجر کی غیر معمولی صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں صیہونی نظریے کے بانی کے نام پر قائم تھیوڈور ہرزل ایوارڈ سے نوازا۔ اس موقع پر اسرائیلی صدر آئزک ہرزوگ نے اسرائیل کیلئے ہمدردی اور محبت رکھنے کیلئے ہنری کیسنجر کو سراہا۔

صیہونیت کے بانی تھیوڈور ہرزل کے مطابق یہودیوں کی ارضِ موعود میں لبنان، شام، عراق، سعودی عرب، مصر اوراردن کے علاوہ ایران اور ترکی کے علاقے بھی شامل ہوں گے۔ اقوامِ متحدہ نے 1947 میں فلسطین کو یہودی اور عرب ریاست میں تقسیم کر کے بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر قرار دیا تھا مگر سابق اسرائیلی وزیرِاعظم بیگن کا کہنا تھا کہ فلسطین کی یہ تقسیم غیر قانونی ہے، بیت المقدس یہودیوں کا ہے اور یہودیوں ہی کا رہے گا۔ اسرائیل میں ہر دور میں گریٹر اسرائیل کے تصور کو پروان چڑھایا گیا ہے۔ اسرائیلی یہودیوں کو باور کرایا گیا ہے کہ آسمانی کتب میں جن علاقوں کا ذکر ہے وہ سب کے سب اُن کے ہیں اور ایک گریٹر اسرائیل میں شامل ہوں گے۔ ان تمام حقائق کے باوجود اگر مسلم حکمران اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں تو کبوتر آنکھیں بند کر کے بلی کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

بروز بدھ 29 ربیع الاول 1446ھ 2 اکتوبر 2024ء

پاکستان کا مقدمہ

ملک کے تمام ایئر پورٹس کو آؤٹ سورس کرنے کا عمل تقریباً پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور کبھی بھی اس کا اعلان ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ایئر لائن کا بیڑی غرق کیا اور غیر ملکوں میں ملک کیلئے زر مبادلہ کمانے والوں کو دربدر کر دیا اور اب بھلا ہمیں ان ایئر پورٹس کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو بھی گروی رکھ کر کام چلاتے ہیں، کچھ اپنی بھی چاندی ہو جائے گی۔

ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ دوسرے ملکوں میں یہی طریقہ کار فرما ہے، بھئی دوسرے ملکوں کی اور بھی بہترین پریکٹس ہے، اس پر تو آپ عمل نہیں کرتے۔ آپ پی آئی اے بیچ رہے ہیں، 19 ہزار ایکڑ پر محیط کھربوں روپے مالیت کی کراچی اسٹیل مل کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ رہے ہیں، بندر گاہوں کا سودہ ہو رہا ہے، نیشنل بینک کی فروخت کا سلسلہ بھی چل رہا ہے، سول ایوی ایشن بیچ رہے ہیں، امریکا اور برطانیہ میں جو پاکستانی اثاثے ہیں، انہیں بیچ رہے ہیں، قوم کو بتانا تو ایک طرف، آپ نے تو پارلیمنٹ کو بھی ربر اسٹیمپ بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ اپنی پارلیمنٹ پر جعلی برتری کی بنیاد پر سارا ملک بیچنے پر تل گئے ہیں۔ ابھی ایک آئینی ترامیم کا سونامی ڈبونے کیلئے تیار تھا لیکن مولانا نی اقلیت میں ہوتے ہوئے بالکل ویسا ہی اپنا وزن دکھایا جیسی کہ ان کے والد مرحوم نے صوبہ میں تیسیر مگر اقلیتی جماعت ہونے کے باوجود صوبہ کی وزارتِ اعلیٰ کو یقین بنا دیا تھا یا جیسے پنجاب میں پرویز الٰہی صاحب نے صرف دس سیٹوں کی بدلوت پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کو اپنے گھر کی داسی بنا کر رکھ دیا تھا۔ پچھلے کئی برسوں سے قوم کے ساتھ یہ کھلواڑ ہو رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ قوم سے یہ کیا مذاق ہو رہا ہے۔ پچھلی سات دہائیوں سے خبریں سن رہا ہوں کہ ملک شدید خطرے میں ہے لیکن جن کی وجہ سے خطرے میں ہے، ان سے کوئی بازپرس کرنے والا کوئی نہیں۔

ایک اور مسئلے کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ بھی بہت اہم ہے:

آپ خود انٹرنیٹ پر جا کر تحقیق کر لیں کہ اس وقت دنیا کے تین بڑے ممالک جو سی فوڈ ساری دنیا کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ ان میں ایک ویتنام ہے جن کا سمندر گوادر سے کہیں چھوٹا ہے، وہ 10 / ارب کا "سی فوڈ" ایکسپورٹ کرتا ہے اور ہم گوادر سے کتنا ایکسپورٹ کر رہے ہیں، اس کا تخمینہ شرم دلانے کیلئے بھی کافی ہے جبکہ ہم تھوڑی توجہ کے بعد 12 / ارب کا "سی فوڈ" آسانی سے ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔ ویتنام نے اپنے سمندر میں 45 لاکھ افراد کو روزگار مہیا کیا ہے اور ہم نے کتنے افراد کو روزگار مہیا کیا ہے اس کا جواب بھی ان کے پاس نہیں ہے؟ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تو بے تحاشہ نعمتوں سے نوازا ہے جس کو یہ چند مقتدر حضرات اپنی اپنی باری پر خوب لوٹ کر اپنا اپنا سرمایہ غیر ملکی بینکوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ رب تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے باوجود ہم حکومتوں کی نااہلی، انتظامیہ کی جاری کرپشن کی بناء پر قرضوں کے کوہِ ہمالیہ کے نیچے دبے ہوئے سسک رہے ہیں اور قوم کو مہنگائی جیسے ظالم جن کے حوالے کر کے ان کا خون چوس رہے ہیں۔ ہمارا وزیر اعظم ایک غیر ملکی خاتون کو انٹرویو دیتے ہوئے فقیروں کی طرح ساری دنیا سے جس انداز سے مدد طلب کر رہا ہے، اس کو سن کر انہیں تو شائد شرم نہیں آئی لیکن ہم جیسے افراد جو ملک سے باہر بیٹھے اپنی تیئں ملک کو اب بھی زرمبادلہ ارسال کر رہے ہیں، انہیں بھی شرم آنا شروع ہو گئی ہے۔ کیا آپ کو دنیا بھر میں ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے کہ پاکستان میں ایک آدمی اپنی تنخواہ سے ٹیکس ادا کر کے باقی ماندہ وصول کرتا ہے اور اب اس ٹیکس کی ادائیگی کے بعد سال بھر کے بعد اس کی کمائی پر پھر سے ٹیکس ادا کرنا ہو گا یعنی ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ایک اور الگ سے ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے۔

اب ایک اور ظلم بھی سن لیں۔ پاکستان میں اس وقت 22 / اعشاریہ دو / ارب ٹن کے قدرتی معدنی ذخائر موجود ہیں۔ صرف کھیوڑہ کی نمک کی کان کا ذکر کر دیتا ہوں، اس وقت ہم اس سے سالانہ 3 لاکھ 70 ہزار ٹن نمک نکال رہے ہیں۔ آپ کیلئے اور آپ کے تمام ناظرین کیلئے اس کی تفصیلات بڑی دلچسپ ہوں گی، اس کے ذخائر جہلم سے لیکر میانوالی کالاباغ اور کوہاٹ بہادر خیل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی پوری لمبائی 300 کلومیٹر، چوڑائی 30 کلومیٹر اور گہرائی اس کی 2400 فیٹ ہے، یہ سارا علاقہ مکمل طور پر گلابی نمک سے لبریز ہے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ گلابی نمک پورے کرہ ارض پر صرف پاکستان میں میسر ہے اور یہ نعمت صرف اللہ نے پاکستان کو عطا کی ہے۔ یہ کتنی بڑی نعمت ہے، اللہ نے ہمیں کس قدر نوازا ہے، اسی لئے ساری دنیا میں اسے پنک گولڈ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں نے اس واقعہ سنانے سے پہلے ایک ظلم کا لفظ بولا تھا جو کہ ٹھیک نہیں بلکہ ہم سے ان گنت ظلم ہو رہے ہیں، اب میں پوری ذمہ داری اور دلائل کے ساتھ اس ظلم کی مختصر طور پر نشاندہی کر دیتا ہوں۔

پہلا ظلم تو یہ ہے کہ پاکستان کا ازلی دشمن بھارت اس گلابی نمک کو ساری دنیا میں اپنے نام سے فروخت کر رہا ہے۔ ہم ابھی تک "جغرافیائی ایڈینٹیکل" کے تحت اپنے اس قیمتی خزانے کو رجسٹر کروا کر اس کو پروٹیکٹ نہیں کروا سکے۔ جغرافیائی ایڈینٹیکل قانون کے تحت یہ نمک صرف پاکستان سے نکلتا ہے، اس لئے کوئی اور ملک ہمارے اس قیمتی اثاثے پر اپنا لیبل نہیں لگا سکتا، آخر ہماری کیا مجبوری یا نالائقی ہے کہ ہم ابھی تک اس کی رجسٹریشن میں ناکام کیوں ہیں؟ کیا اس کے پیچھے کوئی یہ راز تو نہیں کہ اندر کھاتے کچھ افراد اس کا کمیشن بنا رہے ہیں؟

دوسرا ظلم یہ ہو رہا ہے کہ روایتی کان کنی کے موجودہ خطرناک طریقہ نے جہاں نمک نکالنے والے افراد کی زندگیوں کو داؤ پر لگایا ہوا ہے، وہاں بے تحاشہ نمک ضائع ہو رہا ہے۔ میں یہاں آپ کے ناظرین کیلئے گزشتہ برس 14 مئی 2023ء میں ڈان میں شائع ہونے والی اس خبر کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانہ میں ہمارے موجودہ سفیر مسعود سے ایک امریکی فرم نے ملاقات کر کے صرف گلابی نمک میں ابتدائی طور پر 20 کروڑ ڈالر کی فوری سرمایہ کاری کی پیشکش کی جو بعد ازاں بڑھ کر 100 کروڑ ڈالر تک جا سکتی ہے۔ امریکی فرم نے یہ بھی بتایا کہ جدید ٹیکنالوجی کے تحت ہم 2030ء تک سالانہ ایک کروڑ ٹن تک گلابی نمک کی پیداوار بڑھا سکتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ عالمی ماہرین کے مطابق دنیا کا یہ واحد منفرد نمک ہے جس میں بے تحاشہ قدرتی آیوڈین شامل ہے جو نہ صرف کھانے میں بلکہ مختلف ادویات اور محفوظ خوراک میں استعمال ہو سکتا ہے جو صحت کیلئے انتہائی مفید ہے پھر یہ گلابی نمک مختلف مصنوعات میں استعمال ہو سکتا ہے اور اس کی اپنی قدرتی خوشبو ہے جو مختلف غذائی اجناس کو نہ صرف محفوظ بلکہ اس کی روایتی بدبو سے بھی پاک کر دیتا ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کرپٹ افراد کی بدبو دور نہیں ہو سکی۔

میں آج بڑی دلسوزی کے ساتھ آپ سب کے سامنے پاکستان کا مقدمہ رکھ رہا ہوں کہ ہمارا ملکی بیش بہا قیمتی خزانہ لوٹا جا رہا ہے، میں آپ کے توسط سے پاکستان کے اس تمام اشرافیہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے 20 بڑے ممالک جو نمک ایکسپورٹ کر رہے ہیں، پاکستان کا نام اس میں کیوں شامل نہیں؟ دوسرا یہ کہ پاکستان نے ابھی تک انڈیا کے اس غیر قانونی کام کو روکنے کیلئے کوئی اقدامات کیوں نہیں اٹھائے؟ یہ سوال اب تک آنے والی سب حکومتوں سے ہے کہ وہ بھی اپنے اس مجرمانہ فعل کا حساب دیں؟

تیسرا یہ کہ ہم نمک نکالنے والے کانکنوں کی زندگیوں اور صحت کو جولاحق خطرات ہیں، اس پر اب تک کوئی توجہ کیوں نہیں دی گئی۔ موجودہ طریقہ کار کے مطابق جو نمک ضائع ہو رہا ہے، اس کے تدارک کیلئے حکومت کیوں سو رہی ہے؟ آخر ہم اپنے قیمتی ذخائر کو بچانے کیلئے کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے میں ہم کیوں سستی کر رہے ہیں اور اس کی ناکامی کا آخر کون ذمہ دار ہے؟ کیا یہ بڑے بڑے اشرافیہ کے مگرمچھ اپنے جاری کاروبار میں ایسی سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ یہ قومی دولت ہے جس کے مالک عوام ہیں، اس لئے عوام کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان پر اس وقت کیا مظالم ہو رہے ہیں جس کی وہ بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔

حکومت کا ایک وزیر ڈی ایچ اے کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جب ویٹر سے کھانے کا بل طلب کیا تو اس نے سامنے میز پر بیٹھے ایک فرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے آپ کا سارا بل ادا کر دیا ہے۔ موصوف وزیر نے نوجوان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بل کی ادائیگی کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے کہ آپ منسٹر ہیں۔ منسٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اقرار کر لیا۔ اس سے پیشتر کہ منسٹر کچھ اور کہتا تو اس نوجوان نے برملا کہا: جہاں آپ کے بجلی، گیس اور فون کے بل بھی ہم ہی دیتے ہیں، آپ کی حفاظت کیلئے ساتھ آنے والی پولیس گارڈز کی تنخواہیں بھی ہماری جیب سے جاتی ہیں تو کھانے کا بل بھی سہی!

بروز جمعتہ المبارک یکم ربیع الآخر1446ھ 4اکتوبر2024ء

ایران-اسرائیل تنازع:عالمی چیلنج

گزشتہ کئی برسوں سے ایران پر حملہ کرنے کیلئے اسرائیل بہانے تلاش کر رہا تھا اور بالخصوص گزشتہ سال 7 / اکتوبر سے غزہ میں جس درندگی کا وہ اظہار کر رہا ہے، وہ مسلسل ایران کو اس جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک طویل عرصے سے ایران کو اشتعال دلانے کیلئے اس کے ایٹمی پروگرام پر حملوں کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا جس میں بالآخر اسرائیل کامیاب ہو گیا ہے۔ اس سے قبل رواں برس اپریل کے آغاز میں ایران کے پاسدارانِ انقلاب کے دو سینیئر کمانڈر شام کے دارالحکومت دمشق میں ایران کے قونصل خانے پر ہونے والے میزائل حملے میں ہلاک ہوئے تھے۔ اسرائیل کی جانب سے اس حملے کی بھی ذمہ داری قبول نہیں کی گئی تھی تاہم عام خیال یہی ہے کہ اس حملے کے پیچھے اسرائیل ہی تھا۔

ایرانی دارالحکومت تہران میں رواں برس 31 جولائی ایرانی وقت کے مطابق دو بجے حماس کے سیاسی رہنما اسماعیل ہنیہ کو ان کے ذاتی محافظ کے ساتھ ایرانی صدر مسعود پزشکیان کی حلفِ وفاداری کی تقریب میں شرکت کے بعد فوج کے زیر انتظام ایک مہمان خانے پر میزائل حملے میں شہید کر دیا گیا تھا اور اب 27 ستمبر 2024ء کو اسرائیلی میزائل حملے میں حزب اللہ کے انتہائی مقبول رہنماء 64 سالہ حسن نصر اللہ و دیگر ساتھیوں سمیت ایرانی پاسدارانِ انقلاب کے جنرل عباس نیلفروشان کی شہادت کے بعد ایران کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے پر بالآخر منگل جو یہودیوں کے نئے سال کا پہلا دن تھا، کی شب اسرائیل پر صرف 4 سو سیکنڈ میں 200 بیلیسٹک ایرانی میزائل حملوں کی بارش نے دنیا بھر کی نظریں ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ پر مرکوز کر دی ہیں جہاں ایک خونیں تنازع اب ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔

یاد رہے کہ سٹاک مارکیٹس سے لے کر عالمی امور پر نظر رکھنے والے تجزیہ کاروں تک سب ہی مشرقِ وسطیٰ کی تازہ صورت حال اور فریقین کے اگلے قدم کے حوالے سے پیشگوئی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس سب کے بیچ دنیا کی تین بڑی طاقتیں امریکہ، چین اور روس اس تنازع کا حل تلاش کرنے میں بدستور ناکام دکھائی دیتی ہے۔ سات اکتوبر کے حملوں کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں بڑھنے والی کشیدگی اب غزہ، لبنان اور یمن کے بعد ایران تک پھیلتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور اسرائیلی حملوں میں اب تک حماس اور حزب اللہ کے سینیئر رہنماؤں سمیت ہزاروں افراد مارے جا چکے ہیں۔ اس جنگ کے دوران اسرائیل اپنے دشمنوں بشمول حزب اللہ، حماس اور ایران کے خلاف کامیاب کارروائیاں کرتا ہوا نظر آیا ہے۔ گزشتہ ہفتے لبنان میں اسرائیلی حملوں میں حزب اللہ کے سربراہ حسن نصر اللہ سمیت تنظیم کے متعدد رہنما بھی مارے گئے تھے اور ان کے علاوہ حزب اللہ کے متعدد سینیئر رہنما بھی ہلاک ہو چکے ہیں اور اب تو اسرائیل کے دفاع کیلئے سینہ ٹھونک کر امریکا بھی میدان میں اتر آیا ہے اور یقیناً امریکا کے اتحادی بھی اسرائیل کی پشت پناہی کرتے ہوئے حزب اللہ، حماس اور ایران کے خلاف کارروائیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

بظاہر تو امریکہ، برطانیہ اور یورپی یونین میں شامل متعدد ممالک نہ صرف غزہ بلکہ لبنان میں بھی جنگ بندی کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن یہ کوششیں تاحال کارگر ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ امریکہ سمیت متعدد ممالک کو یہ اندیشہ ہے کہ غزہ اور لبنان میں لڑی جانے والی جنگ پورے مشرقِ وسطیٰ میں پھیل سکتی ہے۔ گزشتہ ہفتے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران امریکی صدر جو بائیڈن نے کہا تھا کہ 'باقاعدہ جنگ کسی کے بھی مفاد میں نہیں۔ اس مسئلے کا سفارتی حل اب بھی ممکن ہے، بلکہ کثیر المیعاد سیکیورٹی کو یقینی بنانے کا راستہ بھی یہی ہے لیکن تمام تر اپیلوں کے باوجود اسرائیل نے غزہ اور لبنان میں اپنے حملے جاری رکھے ہوئے ہیں اور اب ایران کے حملے کے بعد اس کی جانب سے ایک بار پھر ایران پر حملے کی دھمکی دی ہے۔

سات اکتوبر 2023 کے بعد سے جہاں غزہ پر اسرائیل کی مسلسل بمباری کے نتیجے میں غزہ کی وزارت صحت کے مطابق اب سات اکتوبر 2023 کے بعد سے جہاں غزہ پر اسرائیل کی مسلسل بمباری کے نتیجے میں غزہ کی وزارت صحت کے مطابق اب تک کم از کم 40,602 افراد شہید ہو چکے ہیں جبکہ 93,855 افراد زخمی ہیں جبکہ لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں وہیں ستمبر 2024 میں لبنان پر اسرائیلی فضائی حملوں میں مارے جانے والوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ دوسری جانب غزہ کی پٹی میں گذشتہ ایک سال سے زائد عرصے میں حماس کے خلاف کی گئی زمینی کارروائیوں کے دوران اسرائیل کے درجنوں فوجی ہلاک و زخمی ہوئے ہیں جبکہ حزب اللہ کی جانب سے سات اکتوبر کے بعد سے اسرائیل پر راکٹس داغے جانے کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے اور اسرائیلی وزیر اعظم کا دعویٰ ہے کہ گذشتہ ایک برس کے دوران حزب اللہ کی جانب سے اسرائیل کے مختلف علاقوں پر مجموعی طور پر آٹھ ہزار سے زیادہ راکٹ داغے جا چکے ہیں۔ یمن کے حوثی جنگجو بھی غزہ جنگ کے آغاز کے بعد سے بحیرۂ احمر میں اسرائیل آنے اور جانے والے بحری جہازوں کو نشانہ بناتے آئے ہیں۔

اس سے قبل رواں برس اپریل کے آغاز میں ایران کے پاسداران انقلاب کے دو سینیئر کمانڈر شام کے دارالحکومت دمشق میں ایران کے قونصل خانے پر ہونے والے میزائل حملے میں ہلاک ہوئے تھے۔ اسرائیل کی جانب سے اس حملے کی بھی ذمہ داری قبول نہیں کی گئی تھی تاہم عام خیال یہی ہے کہ اس حملے کے پیچھے اسرائیل ہی تھا۔

گذشتہ دنوں اقوام متحدہ میں اسرائیلی وزیر اعظم نتن یاہو کا کہنا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں یہ تمام تر اقدامات اپنے دفاع میں کر رہا ہے۔ اسرائیل امن کا خواہاں ہے۔۔۔ مگر پھر بھی ہمیں وحشی دشمنوں کا سامنا ہے جو ہماری تباہی چاہتے ہیں، اور ہمیں ان کے خلاف اپنا دفاع کرنا چاہیے۔ نیتن یاہو نے ایران پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل ایران سے درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے سات مختلف محاذوں پر اپنا دفاع کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنے خطاب کا اختتام کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’اسرائیل یہ جنگ جیتے گا کیونکہ یہ جنگ جیتنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔

دوسری طرف لبنان کا محاذ گرم ہونے سے قبل امریکہ اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگ بندی کروانے کے لیے مذاکرات کی کوشش بھی کرتا رہا ہے، تاہم یہ مذاکرات تاحال تعطل کا شکار ہیں لیکن ابھی بھی وزیر اعظم بنیامین نتن یاہو کی جانب سے جاری ہونے والے بیانات کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ جنگ بندی کے مطالبات اور سفارتی کوششوں کا اسرائیل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا لیکن عالمی تجزیہ نگار امریکا کے ایسے بیانات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ابھی بھی نیتن یاہو کی جانب سے جاری ہونے والے بیانات کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ جنگ بندی کے مطالبات اور سفارتی کوششوں کا اسرائیل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔

پیر کو سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر شیئر کیے گئے ایرانی عوام کے نام تین منٹ کے ویڈیو پیغام میں اسرائیلی وزیر اعظم کا کہنا تھا کہ ’مشرقِ وسطیٰ میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اسرائیل نہیں پہنچ سکتا، کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ہم اپنے لوگوں اور ملک کی حفاظت کے لیے نہیں جا سکتے۔‘ انھوں نے ایرانی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا کہ ’ہر گزرتے لمحے کے ساتھ (ایرانی) حکومت معزز فارسی عوام کو تباہی کے قریب لے جا رہی ہے۔‘ نیتن یاہو نے مزید کہا جب ایران ’بالآخر آزاد ہو جائے گا‘ تو سب کچھ بدل جائے گا اور دونوں قومیں امن سے رہ سکیں گے۔ اسرائیلی وزیر اعظم کا کہنا تھا کہ ’جنونی ملاؤں کو اپنی امیدیں اور خواب کچلنے نہ دیں، آپ بہتری کے مستحق ہیں۔ ایرانی عوام جان لیں کہ اسرائیل آپ کے ساتھ کھڑا ہے۔ ہم ساتھ مل کر خوش حال اور پُرامن مستقبل دیکھیں گے۔‘

ایران کے میزائل حملوں کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی تین بڑی طاقتیں آخر اس تنازع میں شامل فریقوں کو فائر بندی پر رضامند کیوں نہیں کر پا رہیں اور امریکا کے علاوہ روس اور چین جیسی عالمی طاقتیں اس معاملے پر کوئی مؤثر کردار کیوں ادا نہیں کر پا رہیں؟

مشرقِ وسطیٰ اور بین الاقوامی خارجہ پالیسی پر نظر رکھنے والے ماہرین اور تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ امریکا، روس اور چین جیسے ممالک کے درمیان عدم تعاون اور امریکا کی اندرونی سیاست کچھ ایسے عوامل ہیں جس کے سبب اسرائیل کو جنگ بندی کیلئے قائل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ کیا امریکا، چین اور روس کے درمیان اختلافات اسرائیل کو روکنے میں ناکامی کی وجہ ہیں؟ یا اس خطے میں چین کا بڑھتا ہوا معاشی اثر و رسوخ روکنا مقصود ہے؟ کیونکہ اس خطے میں چین نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایران اور سعودی عرب کے درمیان یمن میں جاری ایک تلخ جنگ کو ختم کرانے میں ایک اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے جو یقیناً امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں کیلئے سراسر جہاں ایک خسارہ کی شکل اختیار کر گیا ہے وہاں ایران پر عالمی پابندیوں کے باوجود چین 27 مارچ 2021ء میں ایران کے ساتھ اسٹریٹیجک تعاون کے 25 سالہ معاہدے پر دستخط کئے ہیں۔ یہ طویل المدتی معاہدہ امریکی پابندیوں کی وجہ سے شدید مشکلات کے شکار ایران کو درپیش کئی متنوع اقتصادی امور کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے اپنی ضرورت کا وافر تیل ایران سے خرید تا ہے۔

چین کے ساتھ کیا جانے والا یہ معاہدہ ایران کیلئے کسی بڑی عالمی طاقت کے ساتھ کیا گیا پہلا طویل المدتی سمجھوتہ ہے۔ اس سے قبل 2001ء میں ایران نے روس کے ساتھ بھی زیادہ تر جوہری توانائی کے شعبے میں تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے مگر اس معاہدے کی مدت صرف دس سال تھی۔ بعد میں اس معاہدے میں دو مرتبہ پانچ پانچ سال کیلئے توسیع کر دی گئی تھی، اس طرح اس روسی ایرانی سمجھوتے کی مجموعی مدت بیس سال ہو گئی تھی۔

چین اور ایران کے باہمی تعلقات میں کافی زیادہ گرمجوشی پائی جاتی ہے اور 2019ء میں دونوں ممالک نے روس کے ساتھ مل کر شمالی بحر ہند میں کی جانے والی مشترکہ بحری مشقوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ بیجنگ اور تہران کے باہمی تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ حالیہ برسوں میں دونوں کے مابین تجارت کا سالانہ حجم تقریباً 20 بلین ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ قبل ازیں 2014ء میں اس تجارت کی سالانہ مالیت تقریباً 52 بلین ڈالر رہی تھی مگر پھر ایران کے خلاف امریکی پابندیوں اور عالمی منڈیوں میں تیل کی بہت کم ہو جانے والی قیمتوں کے باعث یہ حجم کم ہو گیا تھا۔ اس لئے کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالیہ جنگ بندی میں کسی بھی صورت میں چین کی جنگ بندی میں کسی بھی کوشش کو امریکا کامیاب نہیں ہونے دے گا اور یوکرین جنگ کی بناء پر روس کے راستے میں بھی امریکا سب سے بڑی رکاوٹ بنے گا۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اگر ایک طرف امریکا مشرقِ وسطیٰ میں کسی بڑی جنگ کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف بطور اتحادی جہاں وہ اسرائیل کو عسکری طاقت بڑھانے کیلئے اربوں ڈالر فراہم کر رہا ہے وہاں اس نے اپنی تمام فورسز کو اسرائیل کے دفاع کا حکم دے دیا ہے گویا امریکا تو اس جنگ میں ایک فریق بن گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے جنگ بندی کے حالیہ بیانات کی قلعی کھل کر سامنے آگئی ہے۔ گذشتہ ہفتے اسرائیل نے کہا تھا کہ امریکا کی جانب سے آٹھ ارب 70 کروڑ ڈالر کا امدادی پیکج ملا ہے تاکہ وہ اپنی عسکری مہمات کو جاری رکھ سکے۔

چینی تھنک ٹینک تائیہی انسٹٹیوٹ کے سینیئر فیلو اینار تانجین کہتے ہیں کہ 'ایک طرف امریکہ جنگ بندی کی بات کرتا ہے لیکن دوسری جانب وہ (اسرائیل کو) اسلحہ، گولہ بارود اور انٹیلیجنس سپورٹ فراہم کر رہا ہے جس کا استعمال خواتین اور بچوں سمیت ہزاروں عام شہریوں کے قتل کے لیے کیا جا رہا ہے۔' امریکہ اب تو جنگ بندی کی بات کر رہا ہے لیکن ماضی میں اس کی جانب سے اقوامِ متحدہ میں جنگ بندی کی قراردادوں کو ویٹو بھی کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے امریکی محکمہ خارجہ کی برطانوی نمائندہ مارگریٹ میکلوئیڈ نے عالمی میڈیا کو بتایا کہ 'ہم نے اُسی قرارداد کی مخالفت کی جس میں حماس کی دہشتگردی کو نظر انداز کیا گیا یا جس میں اسرائیل کے حقِ دفاع کو نظر انداز کیا گیا۔'

دوسری جانب روس اور چین جیسی دیگر بڑی طاقتیں بیانات کی حد تک تو ایسے حملوں کی مذمت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جن سے خطے میں کشیدگی بڑھنے کا امکان ہو لیکن اُن کی جانب سے اب تک کوئی عملی اقدامات دیکھنے میں نہیں آئے۔ حالیہ برسوں میں دُنیا بھر میں چین کا اثرورسوخ بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے۔ اس اثرورسوخ کی مثال گذشتہ برس چین کی کوششوں کے باعث تقریباً سات برسوں بعد ایران اور سعودی عرب کے تعلقات بحال ہونے کے علاوہ خطے میں سب سے بڑے معاشی پارٹنر کے ہیں اور شدید ترین سرحدی تنازعہ کے باوجود انڈین خبر رساں ایجنسی پی ٹی آئی کے مطابق یہ دوطرفہ تجارت جو 2001 میں 1.83 / ارب امریکی ڈالرز تھی وہ رواں سال کے 11 ماہ میں بڑھ کر 123 / ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔

لیکن لبنان میں اسرائیلی حملے میں حسن نصر اللہ سمیت حزب اللہ کی متعدد سینیئر رہنماؤں کی ہلاکت کے بعد عالمی سیاست میں چین کی خارجہ پالیسی میں احتیاط اور اعتدال کا یہ حال ہے کہ اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ لبنان کی خود مختاری اور سکیورٹی کی 'خلاف ورزی' کی مخالفت کرتا ہے اور عام شہریوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کی مذمت کرتا ہے۔ چین کی وزارتِ خارجہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ لبنان اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی غزہ میں تنازع کے سبب بڑھی ہے اور یہ کہ چین کو خطے میں بڑھتے تناؤ پر تشویش ہے۔ 'چین تمام متعلقہ فریقین خصوصاً اسرائیل سے درخواست کرتا ہے کہ وہ صورتحال کو درست کرنے کے لیے اقدامات اُٹھائیں اور اس تنازع کو بے قابو ہونے سے روکیں۔' دوسری جانب روس ہے جو کہ اس خطے میں ایران کا اہم اتحادی بھی ہے۔ اس کا بھی اس تنازع میں حل کے لیے کوئی مؤثر کردار تاحال نظر نہیں آیا ہے، تاہم مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال پر اس نے بھی مذمت کی ہے۔ پیر کو کریملن کے ترجمان دمتری پیسکوف کی جانب سے جاری ایک بیان میں کہا گیا تھا کہ روس حزب اللہ کے سربراہ کی ہلاکت کی مذمت کرتا ہے اور یہ کہ اس کے سبب مشرقِ وسطیٰ میں بڑی جنگ کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ روس ایسی تمام کارروائیوں کی مذمت کرتا ہے جس کے سبب خطے کی صورتحال مزید کشیدگی کا شکار ہو جائے۔

امریکی تھنک ٹینک سٹمسن سینٹر کی فیلو باربرا اسلاون کے مطابق 2022 میں روس کے یوکرین پر حملے اور روس پر امریکی پابندیوں کے بعد دونوں ممالک کے تعلقات انتہائی بگڑ چکے ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ چین اور امریکہ کے تعلقات میں موجودہ سرد مہری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں اور ایسے میں چین کیوں مشرقِ وسطیٰ میں تنازع کے خاتمے کے لیے امریکہ کے ساتھ تعاون کرے گا؟ اس حوالے سے اینار تانجین کہتے ہیں کہ 'چین اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ امریکہ کو یا جوہری طاقت کے حامل اسرائیل کو ڈکٹیٹ کر سکے۔' 'چین نے ہمیشہ ہی جنگ بندی کا مطالبہ کیا ہے اور ایسے مذاکرات کی حمایت کی ہے جس سے (اسرائیل اور فلسطین کے مسئلہ کا) دو ریاستی حل ممکن ہو سکے۔' خیال رہے دہائیوں سے یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ اسرائیل کے پاس جوہری ہتھیار موجود ہیں لیکن اس کی جانب سے کبھی اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی گئی لیکن چین کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ایٹمی قوت کو ڈکٹیٹ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے، کیا کبھی پاکستان کے مقتدر حلقوں نے اللہ کی عطا کردہ اس نعمت کے فوائد کے بارے میں سوچا ہے۔

امریکہ میں رواں برس نومبر میں صدارتی انتخابات کا انعقاد ہونے جارہا ہے جس میں امریکی نائب صدر کملاہیرس اور ریپبلکن امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ کے درمیان کانٹے کا مقابلہ متوقع ہے۔ سٹمسن سینٹر سے منسلک باربر اسلاون کہتی ہیں کہ بائیڈن انتظامیہ اسرائیل حامی مؤقف رکھتی ہیں۔'ہم سب کو معلوم ہے کہ جو بائیڈن اسلحے کی فراہمی کو محدود کرکے اسرائیل پر اصل دباؤ ڈالنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ کا شکار رہے ہیں۔'جو بائیڈن کی طرف سے اسرائیل کی سلامتی کی مکمل ذمہ داری کا بیان باربرا کے بیان کی کھلی تائید بھی کرتا ہے۔ اب جب امریکی الیکشن صرف چند ہی ہفتے دور ہے تو میرا انہیں خیال کہ بائیڈن یا کملاہیرس دونوں اسرائیل کے مخالف سخت فیصلوں کی تجویز کریں گے کیونکہ اس سے ٹرمپ کو دوبارہ صدر بننے میں مدد مل سکتی ہے۔'خیال رہے بطور صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے 2017 میں یروشلم کو اسرائیلی دارالحکومت تسلیم کرلیا تھا جس پر متعدد ممالک نے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ تاہم باربرا کہتی ہیں کہ 'اگر کملاہیرس جیت جاتی ہیں تو کیا پتا ہمیں غزہ اور لبنان میں جنگ بندی کے لیے امریکی دباؤ بڑھتا ہوا نظر آئے۔ لیکن اس سب کا دارومدار اس پر ہو گا کہ اسرائیل اور ایران اس تنازع کے موجودہ مرحلے میں کہاں لکیر کھینچتے ہیں۔

لبنان میں حسن نصر اللہ کی ہلاکت کے بعد ایران کی وزارت خارجہ کے ترجمان نصیر کنعانی نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ایران لبنان یا غزہ میں اپنی فورسز نہیں بھیجے گا۔ ایران کی رضاکار فورسز کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لبنان اور فلسطینی علاقوں میں موجود فائٹرز جارحیت کے خلاف اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں۔ دوسری جانب امریکی حکام بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ بندی کیلئے امریکی کوششیں ابھی تک ناکافی ہیں۔ امریکی محکمہ خارجہ کی برطانوی نمائندہ مارگریٹ میکلوئیڈ کے مطابق 'جب تک جنگ بندی نہیں ہوگی تب تک میں یہ نہیں کہوں گی کہ امریکی حکومت نے کافی کام کیا ہے۔'ہم سمجھتے ہیں وہ تنازع جو اسرائیل اور حماس کے درمیان میں ہو رہا ہے وہ سفارتکاری سے حل ہونا چاہیے۔ انہوں نے اسرائیل اور لبنان سے آنے والی خبروں کو 'تشویشناک' قرار دیتے ہوئے کہا کہ سات اکتوبر کے بعد امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن مشرقِ وسطیٰ کے گیارہ دورے کر چکے ہیں کیونکہ امریکا کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ سفارتکاری سے حل ہو"۔ لیکن جنگ کے بڑھتے ہوئے شعلے جس تیزی کے ساتھ عالمی امن کو تباہ کرنے کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں، یہودی نژاد امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن کے گیارہ دوروں کا ہی نتیجہ ہے۔

یاد رہے کہ ایران کی جانب سے اسرائیل پر حملے ایک ایسے وقت میں کیے گئے ہیں جبکہ لبنان پر فضائی حملوں کے ساتھ ساتھ اسرائیل زمینی حملے کا آغاز بھی کرچکا ہے اور اس نے شام اور یمن پر بھی فضائی حملوں کا آغاز کردیا ہے۔ ایسے میں کیا خطے میں ایک نئی اور بڑی جنگ چھڑ سکتی ہے اور کیا ایران اور اسرائیل کے درمیان براہِ راست کھلی جنگ خطے کے دوسرے ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے جن کا کردار بظاہر غیر جانب ہی نظر آرہا ہے جبکہ ایران نے برملا ان ملکوں کو اسرائیل کا حامی قرار دیتے ہوئے خوفناک نتائج کی دھمکی بھی دی ہے؟

بروز ہفتہ 2 ربیع الآخر 1446ھ 5 اکتوبر 2024ء

امریکی پابندیوں کا اثر: چین اور پاکستان کا جوابی ردعمل

دشمن کے میزائل دفاعی نظام کو ناکام بنانے کی صلاحیت رکھنے والے ایم آئی آروی میزائل میں کئی وار ہیڈز ہوتے ہیں جو ایک ساتھ مختلف اہداف کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں جبکہ ایم اے آروی میں صرف ایک وار ہیڈ ہوتا ہے لیکن یہ ہدف تک پہنچنے سے پہلے اپنی دشمن کے دفاعی نظام کو کنفیوژ کرنے کیلئے اپنی سمت تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے یہ سب سے بہترین صلاحیتوں کے میزائل ہیں جس میں بتدریج مزید اپ گریڈیشن ہو رہی ہے ۔امریکی محکمہ خارجہ نے پاکستان سمیت چینی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سمیت اور کئی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ وہ پاکستان کے بیلسٹک میزائل پروگرام کیلئے آلات اور ٹیکنالوجی کی فراہمی میں ملوث ہیں جبکہ پاکستان نے اس امریکی اقدام کو 'سیاسی' اور 'جانبدارانہ' قرار دیا ہے۔

امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان میتھیو ملر نے 12 / ستمبر 2024ء کو پریس بریفنگ میں کہا کہ "امریکا مہلک ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں ملوث نیٹ ورکس کے خلاف کارروائی کرکے بین الاقوامی عدم پھیلاؤ کے نظام کو مضبوط کرنے کیلئے پر عزم ہے، پاکستان کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل پروگرام کے بارے میں امریکا کے خدشات کئی سالوں سے "واضح اور مستقل" ہیں اس لئے آرمز ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ (اے ای سی اے) اور ایکسپورٹ کنٹرول ریفارم ایکٹ (ای سی آر اے) کے تحت چین کے تین اداروں، ایک چینی شخصیت اور ایک پاکستانی ادارے پر بیلسٹک میزائل کے پھیلاؤ کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے پابندیاں عائد کر رہا ہے۔ پاکستانی ادارے نیشنل ڈویلپمنٹ کامپلیکس (این ڈی سی) کو شاہین تھری اور ابابیل میزائل سسٹمز اور ممکنہ طور پر اس سے بھی بڑے سسٹمز کیلئے راکٹ موٹرز کی جانچ کیلئے آلات کی خریداری کے سلسلے میں بیجنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف آٹومیشن فار مشین بلڈنگ انڈسٹری (آر آئی اے ایم بی) بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اوران کی ترسیل میں ملوث اور ان کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے جس کی بناء پر چین کی دیگر کمپنیوں "ہوبئی ہوا چانگدا انٹیلیجنٹ ایکوپمنٹ، یونیورسل انٹر پرائز، ژیان لونگدے ٹیکنالوجی ڈویلپمنٹ اور پاکستانی کمپنی انوویٹیو ایکوئپمنٹ بھی پابندیوں کی فہرست میں شامل ہیں جبکہ امریکی پابندیوں کی زد میں آنے والے چینی شخص کا نام لوو ڈونگی ہے۔

محکمہ خارجہ کے ترجمان کے مطابق پاکستان کے بیلسٹک میزائل پروگرام کی مخالفت امریکی پالیسی کا حصہ رہی ہے حالانکہ پاکستان امریکا کا طویل المدت سے شراکت دار رہا ہے تاہم اب بھی کچھ معاملات میں دونوں ممالک کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں "جہاں ہمارے درمیان اختلاف ہو گا، تو ہم اپنی قومی سیکیورٹی کی خاطر ان اختلافات پر عمل کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے"۔ دنیا جانتی ہے کہ ماضی میں بھی امریکا اپنے مفادات کے حصول کیلئے دباؤ ڈالنے کیلئے شک کی بنیاد پر ایسے کئی الزامات لگا کر ایسی فہرستیں بناتا رہتا ہے جبکہ خطے میں اپنے نئے غلام مودی کو وسیع بنیادوں پر ٹیکنالوجیز و پرزہ جات اور سول ایٹمی کلب کی تمام مراعات عنائت کرکے خود اپنی دہرے معیار پر بھی کاربند ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ انڈیا اور اسرائیل جو عدم پھیلاؤ کے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا جھوٹا دعوی کرتے ہیں لیکن وہ امریکا کی ناک کے نیچے جدید فوجی ٹیکنالوجیز کی فراہمی کے معاملے میں ہمیشہ لائسنس کی شرائط نظر انداز کر چکے ہیں جبکہ دوہرے معیار اور امتیازی رویہ عالمی عدم پھیلاؤ کے خلاف کام کرنے والی حکومتوں کی ساکھ کو نقصان پہنچاتے ہیں، فوجی عدم توازن میں اضافہ کرتے ہیں اور بین الاقوامی امن و سلامتی کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔
اس سے قبل امریکا نے رواں برس اپریل میں چین کی تین اور بیلاروس کی ایک کمپنی جبکہ اکتوبر 2023 میں پاکستان کو بیلسٹک میزائل پروگرام کے پرزہ جات اور سامان فراہم کرنے کے الزام میں چین کی تین مزید کمپنیوں پر اسی طرح کی پابندیاں عائد کی تھیں۔ اس کے علاوہ دسمبر 2021 میں امریکی

انتظامیہ نے پاکستان کے جوہری اور میزائل پروگرام میں مبینہ طور پر مدد فراہم کرنے کے الزام میں 26 نومبر 2021ء کو 13 پاکستانی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ پاکستان کا وہ میزائل پروگرام جو حالیہ امریکی پابندیوں کا نشانہ بن رہا ہے، وہ کیا ہے؟ اس میں کون کون سے میزائل شامل ہیں اور امریکا کو ان سے کیا خدشات ہیں؟ آج ہم یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ امریکی پابندیوں کی زد میں آنے والا پاکستانی میزائل پروگرام آخر ہے کیا اور حالیہ امریکی پابندیاں پاکستان کے میزائل پروگرام کو کیسے متاثر کر سکتی ہیں۔

پاکستان کا وہ میزائل پروگرام جس کا تذکرہ امریکی خارجہ کے اعلامیے میں کیا گیا اس میں میڈیم رینج یا درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے بلیسٹک میزائل شاہین تھری اور ابابیل شامل ہیں جو "ملٹیپل ری انٹر وہیکل" یا ایم آروی میزائل کہلاتے ہیں۔ عالمی ماہرین کا ماننا ہے کہ پاکستان کے میزائل ہتھیاروں میں یہ سب سے بہترین صلاحیتوں والے میزائل ہیں۔ پاکستان نے 2017 میں ابابیل میزائل کا پہلا تجربہ کرنے کے بعد گذشتہ برس 18 / اکتوبر 2023 کو بھی زمین سے زمین پر درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے ابابیل میزائل کی ایک نئی قسم کا تجربہ کیا تھا جس کے بعد رواں برس 23 مارچ کو پاکستان ڈے پریڈ کے موقع پر پہلی مرتبہ اس کی نمائش کی گئی۔

کینبرا آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی میں سٹریٹیجک اور ڈیفنس سٹڈیز کے مطابق یہ جنوبی ایشیا میں پہلا ایسا میزائل ہے جو 2200 کلومیٹر کے فاصلے تک متعدد وار ہیڈز یا جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مختلف اہداف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ دفاعی ماہرین کے مطابق ابابیل میزائل تین یا اس سے زائد نیوکلیئر وار ہیڈز یا جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایم آروی میزائل سسٹم ہے جو دشمن کے بیلسٹک میزائل ڈیفنس شیلڈ کو شکست دینے اور بے اثر کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس میزائل میں موجود ہر وار ہیڈ ایک سے زیادہ اہداف کو نشانہ بنا سکتا ہے تاہم اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ میزائل ایسے ہائی ویلیو اہداف، جو بیلسٹک میزائل ڈیفنس (بی ایم ڈی) شیلڈ سے محفوظ بنائے گئے ہوں، کے خلاف پہلی یا دوسری سٹرائیک کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایم آروی میزائل کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر ہدف کے قریب پہنچنے پر ان کے خلاف مخالف سمت میں میزائل ڈیفنس شیلڈ یا بیلسٹک میزائل سسٹم موجود ہو تو وہ انہیں کنفیوز کر سکتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ایک فاسٹ بالر گیند کو سوئنگ کرتا ہے جس میں وہ بیٹسمین کے ڈیفنس کو توڑنے کیلئے اپنی رفتار کے ساتھ سوئنگ اور سیم پر بھی انحصار کرتا ہے۔ ایم آئی آرویز میزائل میں کئی وار ہیڈز ہوتے ہیں جو آزادانہ طور پر پروگرامڈ ہوتے ہیں اور آزادانہ طور پر ہی اپنے اپنے اہداف کی جانب جاتے ہیں اور ہر ایک کا فلائٹ پاتھ یعنی فضائی راستہ مختلف ہوتا ہے۔ انڈیا تقریباً ایک دہائی سے بھی زائد عرصے سے بلیسٹک میزائل سسٹم پر کام کر رہا ہے اور وہ نا صرف اس کے تجربات کرتے رہتے ہیں بلکہ عوامی سطح پر اس کے بارے میں بات بھی کرتے ہیں۔

انڈیا نے حال ہی میں پہلے ایم آروی میزائل اگنی فائیو کا ایک سے زائد وار ہیڈز کے ساتھ تجربہ کیا ہے۔ یہ انٹر کونٹی نینٹل بیلسٹک میزائل ہے جس کی رینج کم از کم 5000-8000 کلومیٹر ہے، اس کے علاوہ انڈیا کا "اگنی پی" بھی ایم آروی ہے جس کی رینج 2000 کلومیٹر تک ہے جبکہ پاکستانی ابابیل کی رینج محض 2200 کلومیٹر ہے اور یہ پوری دنیا میں سب سے کم رینج تک مار کرنے والا ایم آروی ہے لیکن امریکا کو پاکستان کا اپنے دفاع میں یہ میزائل جرم لگتا ہے حالانکہ ابابیل صرف اور صرف انڈیا کا مقابلہ کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا ہے لیکن اب امریکا کو 2021 سے شاہین تھری میزائل جس کی رینج 2740 کلومیٹر ہے، اس سے بھی تشویش ہے۔

دراصل ابابیل شاہین تھری میزائل کی اگلی جنریشن ہے۔ شاہین تھری کے تجربے کے وقت نیشنل کمانڈ اتھارٹی کے مشیر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد احمد

قدوائی نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "یہ میزائل صرف اور صرف انڈیا کا مقابلہ کرنے کیلئے بنایا گیا ہے اور اس کا مقصد انڈیا میں اہم سٹریٹجک اہداف (خاص طور پر انڈمان اور نیکوبار جزیروں اور مشرق میں وہ مقامات جہاں ان کی نیوکلئیر سب میرین بیسز تعمیر کی جا رہی ہیں) کو نشانہ بنانا ہے تاکہ انڈیا کو چھپنے کیلئے کوئی جگہ نہ مل سکے اور یہ غلط فہمی نہ رہے کہ انڈیا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں وہ کاؤنٹر یا پہلی سٹرائیک کیلئے اپنے سسٹمز چھپا سکتے ہیں اور پاکستان ان مقامات کو نشانہ نہیں بنا سکتا"۔

انڈیا کے وزیر دفاع رجنات سنگھ سمیت انڈین عہدیدار کئی مواقع پر ایسے بیانات دیتے آئے ہیں جن میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ "انڈیا نے ایسی صلاحیتیں حاصل کر لی ہیں جو اسے پاکستان کے خلاف قبل از وقت حملہ کرنے کے قابل بناتی ہیں"۔ سپر سونک براہموس میزائل جو نیوکلئیر ہتھیار سے لیس ہے اور اس کے علاوہ انڈیا بہت سے ایسے سسٹمز بنا رہا ہے جو پہلی سٹرائیک کیلئے زمین، فضا اور سمندر سے بھی لانچ ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ 2022ء میں ایک براہموس میزائل پاکستان میں آگرا تھا جس کے بارے میں انڈین وزارت دفاع کی جانب سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کی حدود میں گرنے والا براہموس میزائل حادثاتی طور پر انڈیا سے فائر ہوا تھا۔ اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ "انڈیا براہموس کو پاکستانی سٹریٹجک فورسز اور کمانڈ اینڈ کنٹرول کے خلاف روایتی

کاؤنٹر فورس (پہلی) سٹرائیک کیلئے استعمال کر کے انڈیا یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم نے تو محض روایتی حملہ کیا ہے لیکن اس طرح کی روایتی سٹرائیک کو پاکستان کی طرف سے پہلا جوہری حملہ تصور کیا جائے گا"۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ کسی ایسے حملے کو روکنے اور جوابی کاروائی کیلئے پاکستان مکمل طور پر تیار ہو اور یہ اسی صورت ممکن ہے اگر پاکستان دشمن کو دکھانے کیلئے اپنی صلاحتیوں کا اظہار کرتا رہے اور اسی مقصد سے پاکستان نے شاہین تھری اور ابابیل جیسے نیوکلئیر وارہیڈز بنائے ہیں اور ان کی نمائش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ امریکا کو ان میزائلوں پر کیا تشویش ہے۔ امریکی وزارتِ خارجہ کے بیان میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ "آر آئی اے ایم بی نے شاہین تھری اور ابابیل میزائل سسٹمز اور "ممکنہ طور پر اس سے بھی بڑے سسٹمز" کیلئے ڈائیامیٹر راکٹ موٹرز کے ٹیسٹ اور آلات کی خریداری کے سلسلے میں پاکستان کے ساتھ کام کیا ہے"۔ "ممکنہ طور پر اس سے بھی بڑے سسٹمز" کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسی میزائل کی اگلی جنریشن پر کام ہو رہا ہے۔ ابابیل کا پہلا ٹیسٹ جنوری 2017 میں ہوا تھا اور اس کے بعد ابابیل کا دوسرا تجربہ چھ سال بعد گزشتہ برس اکتوبر 2023 میں ہوا، اور ان چھ سالوں کے دوران این ڈی سی میں اس ٹیکنالوجی پر مسلسل کام ہوتا رہا ہے۔ امریکا سمجھتا ہے کہ شاہین تھری تو پہلے سے آپریشنل تھا لیکن ابابیل کے دوسرے تجربے کے بعد جب مارچ میں اسے پریڈ میں دکھایا گیا تو اس کے بعد شاہین تھری اور ابابیل زیادہ نظروں میں آئے کیونکہ اس نمائش کا مطلب تھا کہ پاکستان اس مرحلے تک پہنچ چکا ہے جہاں اس پر ریسرچ اور ڈویلپمنٹ مکمل ہو چکی ہے اور ابابیل اب آپریشنل ہے۔ امریکی تشویش کی اصل وجہ یہ وہ خدشہ ہے کہ پاکستان اس کے زیادہ سے زیادہ صلاحتیوں والے ورژن پر کام کر رہا ہے۔

امریکی تشویش کی ایک اور وجہ ابابیل تھری سٹیج میزائل سسٹمز بھی ہیں اور موبائل لانچر والا سسٹم ایک بہت اہم صلاحیت ہے کیونکہ کسی بھی سرپرائز حملے کی صورت میں یہ سسٹم نا صرف بڑی آسانی سے مختلف مقامات پر کیموفلاج کیے جا سکتے ہیں بلکہ انہیں با آسانی ایسی جگہ بھی لے جایا جا سکتا ہے جہاں

دشمن کو ان کا پتہ نہ چل سکے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ کوئی بھی تھری سٹیج میزائل سسٹم، زیادہ رینج والے سسٹم کی بنیاد بن سکتا ہے۔

ابابیل کے پہلے اور دوسرے ٹیسٹ کے درمیان چھ سال کا وقفہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان اب مقامی طور پر اس ٹیکنالوجی پر کام کر رہا ہے۔ امریکا کے مطابق اگر چین سے ہی ساری ٹیکنالوجی لے رہے ہوتے تو چھ سال کا انتظار کیوں کرتے؟ یقیناً اس سسٹم میں کوئی ایسی نئی ڈویلپمنٹ ہوئی ہے جس نے امریکی تشویش میں اضافہ کیا ہے کہ شاید پاکستان مزید صلاحیتیں حاصل کر رہا ہے اور مستقبل میں ان نیوکلیئر صلاحیتوں والے میزائلوں کے بہتر ورژن زیادہ بڑے وار ہیڈز لے جاسکتے ہیں اور ابابیل شاید تین سے زیادہ وار ہیڈز لے جانے کی صلاحیت حاصل کر لے۔ یاد رہے اپریل میں ان سسٹمز کے موبائل لانچرز پر پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ امریکا کی جانب سے جاری کردہ فیکٹ شیٹ میں کہا گیا تھا کہ بیلاروس میں قائم منسلک وہیل ٹریکٹر پلانٹ نے پاکستان کو بیلسٹک میزائل پروگرام کیلئے خصوصی گاڑیوں کے چیسس فراہم کیے ہیں۔

امریکی پابندیوں میں پاورفل راکٹ موٹرز کا بھی تذکرہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکا کو ابابیل کی طویل رینج کے علاوہ پاکستان کے سپیس پروگرام پر بھی تشویش ہے۔ یاد رہے اپریل کی فیکٹ شیٹ میں چین کی گرانیکٹ کمپنی لمیٹڈ پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ یہ کمپنی پاکستان کی خلائی تحقیق کے ادارے "سپارکو" کے ساتھ مل کر راکٹ موٹروں کی جانچ پڑتال میں معاون آلات کی فراہمی میں ملوث پائی گئی ہے اور مزید یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ یہی کمپنی پاکستان کو بڑی راکٹ موٹرز آزمانے کیلئے پرزے فراہم کرتی رہی ہے۔ امریکا کو فکر ہے کہ پاکستان اپنا مقامی سپیس لانچ وہیکل نہ بنالے اور پاکستان پہلے سے 2047 سپیس پروگرام کا وژن رکھتا ہے۔ نیوکلیئر ڈیٹیرنس کیلئے سپیس پروگرام میں صلاحیتیں حاصل کرنا بہت اہم ہیں جو آپ کو ہدف کو درست نشانہ بنانے اور دفاعی نگرانی وغیرہ کے قابل بناتا ہے۔ اس طرح پاکستان فوجی اور سویلین مقاصد کیلئے اپنا سپیس وہیکل لانچ کر کے اپنے انٹر کونٹی نینٹل بیلسٹک میزائل کو فائر کرنے کی صلاحیت حاصل کر لے گا۔

حالیہ پابندیاں کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ 70 کی دہائی سے جاری ہے جب انڈیا کے میزائل پروگرام (جس کیلئے وہ روسی اور کئی دوسرے ذرائع سے مدد حاصل کر رہا تھا) کے جواب میں پاکستان نے اپنا میزائل پروگرام شروع کیا اور ہمیشہ سے چین کے ساتھ قریبی تعلقات بھی رہے۔ چین اور پاکستان کی کمپنیوں اور افراد پر لگائی گئی ان پابندیوں کا دونوں ملکوں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ پاکستانی ادارہ نیشنل ڈویلپمنٹ کامپلیکس (این ڈی سی) میزائل ٹیکنالوجیز کیلئے مغرب پر انحصار نہیں کرتا لہٰذا اس پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شمالی کوریا کی مثال آپ کے سامنے ہے، جس پر کتنی پابندیاں لگیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا جبکہ پاکستان کا میزائل پروگرام تو مکمل طور پر مقامی ہے، اس کا انحصار مقامی وسائل اور مہارت پر ہے اور یہ امریکی پابندیوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوگا۔

اس طرح کے امریکی اقدامات افسوسناک ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ علاقائی تزویراتی حقائق سے جدا ہیں جیسے کہ ملک کی حفاظت وسکیورٹی اور انڈین میزائلوں کی بڑھتی ہوئی بین البراعظمی حدود جو علاقائی اور عالمی امن، سلامتی اور استحکام کیلئے بڑھتے ہوئے خطرات ہیں۔ امریکی محکمہ خارجہ کے بیان میں ایم ٹی سی آر (میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول ریجیم) کا بھی ذکر ہے، یہ میزائل ٹیکنالوجی کی برآمد پر کنٹرول رکھنے والے ممالک کا گروپ ہے۔ اس حوالے سے پاکستان اور چین دونوں نے ایم ٹی سی آر پر دستخط نہیں کیے مگر اس کے بغیر بھی چین اور پاکستان دونوں اس کا پاس کرتے ہیں اور کوئی ایسا سسٹم برآمد نہیں کیا گیا جس کی رینج 300 کلومیٹر سے زیادہ ہو مگر اس اقدام کی تعریف کرنے کی بجائے یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اور چین آپس میں تعاون کر

رہے ہیں۔ اگر مسئلہ دونوں ملکوں کے تعاون سے ہے تو دوسری طرف انڈیا کا سارا میزائل پروگرام روس کے تعاون اور مدد سے بنا ہے اور اب امریکا اور اس کے اتحادی اس کی برملا مدد کر رہے ہیں جن میں اسرائیل سب سے بڑا معاون ہے۔ اس کی مثال انڈیا کا براہموس میزائل ہے، جب ابتدا میں روس سے یہ ٹیکنالوجی لی گئی تو اس کی رینج 290 کلومیٹر تھی مگر اب انڈیا اسے 800 کلومیٹر تک لے جا چکا ہے اور اسرائیل کی مدد سے اس کے ہائپر سانک ورژن پر بھی کام ہو رہا ہے مگر یہاں ایم ٹی سی آر کی بات نہیں کی جاتی۔

یاد رہے ایم ٹی سی آر میں 300 کلومیٹر سے زیادہ رینج والے میزائل کی برآمد پر پابندی ہے اور 500 کلو سے زیادہ کے وار ہیڈز کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت انڈیا کا اگنی فائیو جس کی رینج 5000-8000 کلومیٹر ہے اور یہ تین سے پانچ اور شاید اس سے بھی زیادہ وار ہیڈز لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انڈیا ایٹمی آبدوزوں پر لگانے کیلئے بھی اس کے ورژن تیار کر رہا ہے جبکہ پاکستان کے پاس تو کوئی ایٹمی آبدوز نہیں ہے، پاکستان کی کوششیں جنوبی ایشیا میں سٹریٹیجک استحکام برقرار رکھنے کیلئے ہیں اور پاکستان کے تحمل کی تعریف کرنے کی بجائے اس پر پابندیاں عائد کرنے سے امریکا کا اپنا چہرہ داغدار ہوا ہے۔

پاکستان کا انڈیا کے جواب میں تیار کی گئیں ٹیکنالوجیز سے امریکا کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہونا چاہیے تاہم اصل بات یہ ہے کہ امریکا کے نزدیک انڈیا "کواڈ" کا سب سے اہم رکن ہے۔ اس نے امریکی اور مغربی ممالک کے تعاون سے مغربی ممالک کے ہر تھنک ٹینک میں اپنے لوگوں کو شامل کر رکھا ہے جو مقامی عوام اور حکومتوں کی رائے عامہ بنانے پر بہت اثر رکھتے ہیں۔ یاد رہے "کواڈ" چار ممالک کا گروپ ہے جس میں انڈیا، آسٹریلیا، جاپان اور امریکا شامل ہیں ۔امریکا کی مختلف بین الاقوامی مقامات پر جیوسٹریٹیجک دلچسپیاں ہیں جیسے یوکرین روس، مشرقِ وسطیٰ اور تائیوان چین وغیرہ کی صورتحال ہے اور اسی باعث اس نے مختلف جگہوں پر ان ملکوں سے مختلف وعدے کر رکھے ہیں اور جنوبی ایشیا کے خطے میں چین کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کیلئے "کواڈ" بنایا ہے۔

چین کے ساتھ کشیدگی بھی پاکستان کے میزائل پروگرام پر پابندی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ امریکی پابندیوں کا محور بنیادی طور پر پاکستان کی بجائے چینی کمپنیاں ہیں، تاکہ بیجنگ کو مجبور کر کے اس پر معاشی دباؤ ڈالا جائے۔ کیا ٹرائیکا (امریکا، اسرائیل، انڈیا) اس میں کامیاب ہو سکیں گے جبکہ زمینی حقائق اس خطے سے امریکا کو بے دخلی کا بڑا واضح پیغام دے چکے ہیں!

بروز سوموار 4 ربیع الآخر 1446ھ 7/ اکتوبر 2024ء

"طوفان سے قبل خاموشی"

مشرقِ وسطیٰ میں ایران کے اسرائیل پر حالیہ بیلسٹک میزائل حملوں کے بعد خطے میں "طوفان سے قبل خاموشی" جیسا ماحول ہے۔ایک جانب اسرائیل کے ردِ عمل کا انتظار تو دوسری جانب اسرائیل پر حملے کے حوالے سے امریکی صدر جو بائیڈن سے سوال پوچھے جا رہے ہیں جبکہ امریکی انتخابات کی گہما گہمی نے بھی عجیب صورتحال پیدا کر رکھی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ امریکا کا اسرائیل سے قریبی اتحاد اور خطے میں تاریخی کردار ہونے کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ میں موجود اس کی افواج بھی ہیں۔اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ خطے میں اسرائیل کا کردار امریکا کے سپاہی کا ہے جو امریکی مفادات کے بدلے میں ضرورت سے زیادہ امریکا سے اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔

منگل کی شب ایران کے اسرائیل پر میزائلوں کی بارش کے متعلق امریکا نے اسرائیل کو پیشگی اطلاع کر دی تھی۔صدر بائیڈن سمیت دیگر اہم امریکی عہدیدار اس صورتحال کا وائٹ ہاؤس کے سچویشن روم میں براہِ راست جائزہ لے رہے تھے۔امریکا نے ان حملوں کے بعد فوری ردِ عمل دیتے ہوئے انہیں "ناقابلِ قبول" قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ امریکی جنگی بحری جہازوں نے متعدد "ایرانی میزائلوں کو نشانہ بنایا"۔صدر بائیڈن نے پہلے ہی مشرقِ وسطیٰ میں فوجیں بڑھانے کا حکم دے رکھا ہے اور اس سے قبل ستمبر کے اواخر میں مشرقی بحیرۂ روم میں امریکی طیارہ بردار بحری جہاز 'یو ایس ایس ہیری ایس ٹرومن' بھیجا گیا تھا جو اس ہفتے کے اختتام تک اپنی پوزیشن سنبھال لے گا۔

امریکی محکمہ دفاع کے مطابق امریکا کے 40 ہزار سے زیادہ فوجی مشرقِ وسطیٰ میں مختلف ممالک میں تعینات ہیں لیکن امریکی افواج اپنے ملک سے ہزاروں میل دور مشرقِ وسطیٰ میں اتنی بڑی تعداد میں کیوں موجود ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اس تنازع کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کیلئے اہم ہے۔اس کیلئے ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت امریکی فوج کہاں کہاں موجود ہے اور ان کی موجودگی سے خطے میں طاقت کے توازن پر کیسے فرق پڑتا ہے۔

دراصل امریکا کی اس خطے میں موجودگی 1940 کی دہائی سے خلیج فارس میں رہی ہے اور اس میں 2001 کے ورلڈ ٹریڈ حملوں کے بعد بڑا اضافہ دیکھنے میں آیا۔امریکا نے 1945 میں سعودی شہر "دہران" میں اس خطے میں اپنا پہلا فضائی اڈہ بنا لیا تھا۔امریکی محکمۂ دفاع کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں لگ بھگ 40 ہزار امریکی فوجی موجود ہیں۔سات اکتوبر سے پہلے امریکا کے مشرقِ وسطیٰ میں 34 ہزار کے لگ بھگ فوجی تھے مگر گزشتہ ایک سال کے دوران چھ ہزار فوجیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔امریکی محکمہ دفاع کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں سب سے بڑا امریکی اڈہ العدید ایئر بیس ہے جو قطر میں ہے اور 1996ء میں بنایا گیا تھا۔قطر کے علاوہ بحرین، کویت، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، شام، اردن، مصر، قبرص اور عراق میں بھی امریکی فوجی موجود ہیں۔امریکا کے کویت میں بھی متعدد فوجی اڈے ہیں جبکہ سعودی عرب میں بھی اس کے دو اڈے ہیں۔سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات، عمان، کویت، اردن اور بحرین امریکا کی جانب سے فراہم کیے گئے تحفظ کا بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔آپ حیران نہ ہوں کہ اب بھی عراق میں اب بھی امریکا کے دو ہزار سے زیادہ اہلکار موجود ہیں جو "عین الاسد ایئر بیس اور یونین تین" جیسی سہولیات کے ارد گرد تعینات ہیں۔

امریکی پالیسی دستاویزات کے مطابق امریکی فوجی مختلف وجوہات کی بنا پر مشرقِ وسطیٰ میں تعینات کیے گئے ہیں اور شام کے علاوہ وہ ہر ملک کی حکومت کی اجازت سے وہاں موجود ہیں۔بتایا جا رہا ہے کہ عراق اور شام جیسے ملکوں میں امریکی فوجیں دولتِ اسلامیہ کے خلاف لڑنے کیلئے موجود ہیں۔یہاں

امریکی فوجی مقامی فورسز کو تربیت بھی دیتے ہیں لیکن عجب طرفہ تماشہ ہے کہ خود سابقہ خارجہ سیکرٹری ہیلری کلنٹن خود اس بات کا اعتراف کر چکی ہیں کہ "دولت اسلامیہ" کی تشکیل اوران کی مکمل تربیت امریکا نے اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے کی تھی اور انہیں باقاعدہ اسرائیل میں ان کو تربیت بھی دی گئی تھی۔

امریکا کے ایک اہم اتحادی ملک اردن میں سینکڑوں امریکی ٹرینرز ہیں جہاں وہ سال بھر وسیع مشقیں کرواتے ہیں۔ امریکا کا "ٹاور 22" فوجی اڈہ اردن میں شمال مشرقی مقام پر واقع ہے جہاں اردن کی سرحدیں شام اور عراق سے ملتی ہیں۔ رواں سال 28 جنوری کو اس اڈے پر ایک ڈرون حملے میں امریکی آرمی ریزرو کے تین فوجی ہلاک ہوئے تھے جس کا الزام واشنگٹن نے ایرانی حمایت یافتہ عراقی ملیشیا کتائب حزب اللہ پر لگایا تھا۔

فوجی اڈوں اور فوجیوں کی موجودگی کے علاوہ بحیرہ احمر، خلیج عمان اور بحیرہ روم میں امریکی بحریہ موجود ہے۔ امریکی محکمہ دفاع کے مطابق یہاں دو مزید امریکی طیارہ بردار جنگی بحری جہاز بھی موجود ہوں گے۔ یو ایس ایس ابراہم لنکن پہلے ہی خلیج عمان کے قریب موجود ہے جبکہ یو ایس ایس ٹرومین نے بحیرۂ روم کے پانیوں میں پوزیشن سنبھال لی ہے۔ یوں خطے میں امریکی برّی، بحری، اور فضائی تینوں افواج موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر امریکی فوجی ہزاروں میل دور خطے میں کیوں موجود ہیں؟ دراصل دہائیوں سے امریکا کی جانب سے مشرقِ وسطیٰ میں ہزاروں میل دور اپنی افواج بٹھانے کے پیچھے متعدد وجوہات ہیں۔ ایشیا اور شمالی افریقا کے بیچ میں موجود مشرقِ وسطیٰ قدرتی وسائل سے مالامال ہے اور اس کی عالمی نقشے پر ایک اہم پوزیشن اسے دوسرے ممالک کی خارجہ پالیسی خاص کر امریکا کی خارجہ پالیسی کیلئے اہم ثابت ہوتی رہی ہے۔

1938 میں سعودی عرب کے مشرقی شہر دہران سے تیل کا کنواں دریافت ہونے کے بعد سے تیل کی عالمی معیشت میں قدر میں دن بدن اضافہ دیکھنے کو ملا۔ اس کی تصدیق کرتے ہوئے برطانوی یونیورسٹی ایس او اے ایس میں ڈیولپمنٹ سٹڈیز کے پروفیسر گلبرٹ ایشکر نے عالمی میڈیا کو بتایا کہ 'تیل کو جب عالمی معیشت میں اہمیت ملی تو ظاہر ہے کہ اس کی سٹریٹیجک اہمیت بھی بڑھ گئی۔ امریکا ایسا یہاں دیگر یورپی ممالک اور چین کے مشرقِ وسطیٰ کے تیل تک رسائی پر نظر رکھنے کیلئے بھی اپنی موجودگی ضروری سمجھتا ہے تاہم چند دیگر اہم عوامل بھی ہیں۔ برطانیہ کے پالیسی انسٹیٹیوٹ چیٹھم ہاؤس میں ایسوسی ایٹ فیلو ڈاکٹر لینا خطیب کے مطابق "اکثر افراد یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ امریکا اس خطے میں صرف تیل کی وجہ سے ہے حالانکہ اس حوالے سے امریکا خود کفیل ہے اور 2022 میں تیل کی سب سے زیادہ پیداوار امریکا میں ہوئی تھی، جو اس سال سعودی عرب سے 30 فیصد زیادہ تھی۔ پروفیسر گلبرٹ کے مطابق امریکا ایسا یہاں دیگر یورپی ممالک اور چین کے مشرقِ وسطیٰ کے تیل تک رسائی پر نظر رکھنے کیلئے بھی کر سکتا ہے۔ تاہم چند دیگر اہم عوامل بھی ہیں۔

خیال رہے کہ مشرقِ وسطیٰ روس اور امریکا کی سرد جنگ کا شکار رہا ہے اور امریکا میں یہ سوچ آج بھی موجود ہے کہ وہ جہاں بھی خلا چھوڑے گا اسے روس پر کرلے گا تاہم تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں کیونکہ امریکی صدر ہیری ٹرومین نے 1948ء میں معاہدے کے 12 منٹ بعد ہی اس پر دستخط کرنے کا جواز یہ بتایا کہ یہودیوں کے ساتھ جو کچھ بھی دوسری عالمی جنگ کے دوران ہوا وہ غلط تھا اور وہ اسے اپنا حق سمجھتا ہے کہ وہ یہودیوں اوران کے ایک علیحدہ خودمختار ریاست کے خواب کو پورا کرے۔ "دراصل امریکا نے دنیا میں خود کو ایک "عالمی پولیس مین" کا کردار سونپ رکھا ہے اور کیونکہ مشرقِ وسطیٰ ایک اہم خطہ ہے جہاں سے عالمی بحری تجارتی راستے گزرتے ہیں۔

14 مئی، 1948ء کو ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا اور اس کی تشکیل کے بعد امریکا، برطانیہ، فرانس، چین نے اس کو تسلیم کر لیا۔ انڈیا

کے اسرائیل کے ساتھ خفیہ تعلقات تو شروع دن سے تھے لیکن اس نے 1992ء میں اس کو باقاعدہ تسلیم کیا جبکہ یو اے ای، ترکی کے علاوہ دیگر تین اور مسلم ممالک نے اسرائیل کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور سعودی عرب نے 2018ء میں سفر کی اجازت دے رکھی ہے۔

اسی طرح 2001 کے ستمبر 11 کے حملوں کے بعد جب امریکا نے عراق پر بھی حملے کا فیصلہ کیا تو ایک لاکھ سے زیادہ فوجیوں کو عراق جنگ میں بھیجا گیا تھا تاہم امریکی قبضے کے بعد پیدا ہونے والی غیر یقینی صورتحال نے نام نہاد دولتِ اسلامیہ کو جنم دیا جس کے قیام کے بارے میں امریکی سیکرٹری ہنری کلنٹن کا اعتراف بھی موجود ہے اور یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ اس تنظیم نے صرف اسلامی ملکوں کے خلاف ہی محاذ گرم کر رکھا ہے۔اس کے علاوہ امریکا کا بڑا حریف ایران بھی اسی خطے میں موجود ہے۔ایک معروف امریکی تھنک ٹینک کے مطابق امریکا کے معاشی، سیاسی اور عسکری ایسٹس مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہیں جن کی حفاظت کیلئے اسے یہاں فوجیوں کی ایک مخصوص تعداد رکھنا ضروری ہے۔خطے میں متعدد فضائی اڈوں سے امریکا جب چاہے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے اور اکثر موقعوں پر کچھ نہ کیے بغیر بھی صورتحال پر اثر انداز ہوتا ہے اور امریکا اپنے ان اقدام کو جائز قرار دینے کیلئے خطے میں چین اور روس کے بڑھتے اثر ورسوخ کو الزام دیتا ہے۔

امریکا کی خطے میں عسکری موجودگی ہی کی وجہ سے اسرائیل اپنی بے مہار طاقت کے استعمال سے ساری دنیا کیلئے ایک خطرہ بن چکا ہے۔اس حوالے سے واشنگٹن میں پالیسی انسٹیٹیوٹ ولسن سینٹر میں مڈل ایسٹ پروگرام کے کوارڈینیٹر یوسف کین کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں امریکی موجودگی طاقت کا توازن اسرائیل کے حق میں کرنے میں چار طریقوں سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ایک تو امریکی سیاسی حمایت اسرائیل کی کسی بھی قسم،خاص کر عالمی اداروں میں اس کی کارروائیوں کو جائز قرار دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دوسرا امریکا کی خطے میں موجودگی کی وجہ سے مقامی اور خطے میں موجود تنازعات کو محدود کرنے میں مدد ملتی ہے اور شام جیسے ممالک جو سالوں سے تنازعات کا شکار تھے،میں استحکام آتا ہے اور اسرائیل کو مزید آزادی ملتی ہے"۔ تیسرا یہ کہ اسرائیلی اور امریکی مفادات خاص کر معاشی اعتبار سے ایک جیسے ہیں،اور آخری یہ کہ اسرائیل کو امریکا کی موجودگی کے باعث تحفظ ملتا ہے،انٹیلیجنس شیئر ہوتی ہے اور سٹریٹیجک سپورٹ ملتی ہے"۔

امریکا کی بین الاقوامی پالیسی پر گہری نظر رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ "اسرائیل ایک چھوٹی ریاست ہے اور چھوٹی ریاستوں کا ایک مسئلہ ان کی "سٹریٹیجک ڈیپتھ"کی کمی ہوتی ہے یعنی ان کے پاس خطے میں اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنے کیلئے وہ وسعت نہیں ہوتی جو بڑی طاقتوں کے پاس ہوتی ہے۔امریکا کی مشرقِ وسطیٰ میں موجودگی ایران اور اس کے حمایت یافتہ گروہوں یعنی پراکسیز کیلئے ایک ڈیٹیرنس (یعنی ڈر پیدا کرنے کیلئے) ہے۔امریکی بحری بیڑے خطے میں بحیرۂ احمر، بحیرۂ روم اور بحر ہند میں بھی موجود ہیں اور یہ ایک مربوط نیٹ ورک ہے۔اسی وجہ سے ایران جب بھی حملہ کرتا ہے تو امریکا کو اس بات کا فوری علم ہو جاتا ہے اور وہ اسرائیل کو اس حوالے سے خبردار کر دیتا ہے یا وہ خود بھی ان میزائلوں کو روک دیتا ہے"۔

امریکا رواں صدی میں مشرقِ وسطیٰ میں عراق اور شام کی جنگ میں براہ راست جبکہ متعدد جنگوں میں بالواسطہ یعنی پراکسی کردار ادا کرتا آیا ہے تاہم تجزیہ کاروں کے نزدیک ماضی کے تجربے کو دیکھتے ہوئے امریکا اب مشرقِ وسطیٰ میں کسی بڑی جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہے گا۔امریکا کا قومی مفاد تو یہی ہے کہ یہ

جنگ طویل نہ ہو اور یہیں تک محدود ہو جائے۔ ایرانی بھی "سٹریٹیجک صبر" کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جو ایک غیر اعلانیہ معاہدہ تھا اسرائیل اور ایران کے درمیان کہ وہ ایک دوسرے کی پراکسیز پر تو حملہ کر سکتے ہیں لیکن ایک دوسرے پر براہ راست نہیں اور امریکا چاہے گا کہ یہ توازن برقرار رہے۔ تاہم نیتن یاہو نے اپنا اور اسرائیل کا مفاد دیکھا، امریکا کا نہیں اور اس نے امریکا میں الیکشن سیزن کو جنگ کو وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا ہے جبکہ اسے معلوم ہے کہ اسے امریکا میں ڈیموکریٹ اور ریپبلکن دونوں ہی طرف سے حمایت ملے گی، اور جیسے ہی نئی امریکی حکومت آئے گی، تو خاص کر ڈیموکریٹس کے پاس اسرائیل کو روکنے کا مینڈیٹ ہو گا جبکہ ٹرمپ نے تو اسرائیل کو ایران کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کا عندیہ بھی دیا ہے۔ اگر امریکا کی قومی سلامتی کے دستاویزات دیکھیں تو اس کا سٹریٹیجک مقصد اس وقت تیزی سے ترقی کرتے چین کو قابو کرنا ہے، تو ہر وہ مسئلہ جو اس سے ان کا دھیان ہٹاتا ہے وہ دراصل ان کے قومی مفاد میں نہیں ہے۔ یاد رہے کہ چین امریکا کیلئے جتنا بھی اہم کیوں نہ ہو لیکن امریکا ہمیشہ دنیا میں ایسے مواقعوں کی تلاش میں رہے گا جہاں اسے اپنا اثر ورسوخ دکھانے کا موقع مل سکے۔

یہ صورتحال تبدیل بھی ہو سکتی ہے لیکن اس وقت امریکا پوری طرح سے اسرائیل کے پیچھے کھڑا ہے اور جب تک ایسا رہے گا اسرائیل کو اپنا نسلی قوم پرست (ایجنڈا) اور اپنا اثر ورسوخ بڑھانے جیسے اہداف کو حاصل کرنے میں مدد ملتی رہے گی۔ انسٹیٹوٹ فار سوشل پالیسی اینڈ انڈرسٹینڈنگ کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے مطابق "روس اور چین کے کڑے مقابلے کے باوجود امریکا اب بھی مشرقِ وسطیٰ میں موجود وہ واحد عالمی طاقت ہے جس کا یہاں اثر ورسوخ ہے اور وہ اسے خطے میں توازن کو اسرائیل کے حق میں پلٹنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ امریکا خطے میں زیادہ تر ممالک پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور وہ اس چھوٹ کو ضرورت پڑنے پر اسرائیل کی حفاظت کیلئے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا کا فوجی اور معاشی اثر ورسوخ اور اس کی جانب سے اسرائیل کی عوامی اور ذاتی حمایت کے بعد امریکا کا کردار اسرائیل کو بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت دیتا ہے۔

قارئین کو یاد دلانے کیلئے یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ 13 / اگست 2024 کو پینٹاگون کے پریس سیکریٹری ایئر فورس میجر جنرل پیٹ رائڈر نے نیوز کانفرنس کے دوران کہا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سفارت کاری کیلئے ابھی بھی وقت ہے تاہم امریکی فوجیں امریکی سینٹرل کمانڈ کے ذمہ داری کے علاقے میں ڈیٹرنس اقدام کے طور پر منتقل ہو رہی ہیں۔ انہوں نے امریکی فوجیں امریکی سینٹرل کمانڈ کے ذمہ داری کے علاقے میں ڈیٹرنس اقدام کے طور پر منتقل ہو رہی ہیں۔ فضائیہ نے "ایف 22 ریپٹر" طیاروں کو خطے میں منتقل کر دیا ہے اور امریکی بحریہ "یو ایس ایس" ابراہم لنکن کیریئر اسٹرائیک گروپ کو "ایف 35 سی" لائٹنگ کو بھی متعین کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گائیڈڈ میزائل آبدوز یو ایس ایس جارجیا بھی کسی بھی ہنگامی حالت کیلئے تیار ہیں۔

رائڈر نے کہا کہ آج سینٹ کام کے علاقے میں تقریباً 40,000 امریکی سروس ممبران اس کے علاوہ موجود ہیں جو مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ سکریٹری آف ڈیفنس لائیڈ جے آسٹن اسرائیلی وزیر دفاع یوو گیلنٹ اور خطے کے دیگر شراکت داروں کے ساتھ تقریباً روزانہ رابطے میں ہیں۔ آسٹن نے اسرائیلی رہنما گیلنٹ کو اسرائیل کے دفاع کیلئے ہر ممکن قدم اٹھانے کیلئے امریکی عزم کا پورا یقین بھی دلایا ہے۔ بڑھتے ہوئے علاقائی تناؤ کی روشنی میں پورے مشرقِ وسطیٰ میں امریکی فوجی قوت کے انداز میں ہونے والی یہ تبدیلیاں امریکی فورس کے تحفظ کو بہتر بنانے، اسرائیل کے دفاع کیلئے ہماری حمایت کو بڑھانے، اور اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کی گئی ہیں کہ امریکا مختلف قسم کے ہنگامی حالات کا جواب دینے کیلئے تیار ہے۔

ایران اور ایرانی حمایت یافتہ گروپوں نے اسرائیل پر حملہ کرنے کی دھمکی دی ہے اور امریکا ان دھمکیوں کو سنجیدگی سے لینا چاہیے لیکن ہماری توجہ کشیدگی

کو کم کرنے، جنگ بندی کو فعال کرنے اور یرغمالیوں کی واپسی پر ہے۔ امریکا مشرق وسطیٰ میں ایک وسیع، علاقائی جنگ کو روکنا چاہتا ہے۔ کوئی بھی بڑھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا، کوئی بھی وسیع تر علاقائی تنازعہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ لہذا، امید ہے کہ ہم خود کو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی حالت میں نہیں پائیں گے لیکن اگر ہمیں اسرائیل کے دفاع میں ضرورت پڑی تو ہم کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایران نے تو پینٹاگون کے پریس سیکریٹری ایئر فورس میجر جنرل پیٹ رائڈر کی نیوز کانفرنس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکا اس خطے میں اسرائیل کو کھلی چھٹی دیکر کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایران نے تو امریکی جنرل رائڈر کی پریس کانفرنس کے 50 دن بعد اسرائیل پر میزائل حملہ کیا لیکن اس دوران اسرائیل کی بڑھتی ہوئی درندگی کو امریکا نے لگام کیوں نہیں دی؟

بروز بدھ 6 ربیع الآخر 1446ھ/9 اکتوبر 2024ء

اسرائیل: امریکا کا کرائے کا سپاہی

یہ سوچ بہت عام ہے کہ یہودی یا اسرائیلی اس قدر چالاک اور ذہین قوم ہے کہ امریکا جو اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے بظاہر اسرائیل کی مرضی کے کچھ بھی نہیں کرتا یا کر سکتا۔ پوری دنیا کی معیشت پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ میڈیا پر کوئی موضوع یا خبر ان کی مرضی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ امریکا میں کوئی شخص کانگریس کا ممبر یا امریکا کا صدر یہودی لابی کے پیسے اور سیاسی مدد کے بغیر نہیں بن سکتا، یہ تاثرات اس وقت اور مضبوط ہو جاتے ہیں جب امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی حمایت میں نہ تو کسی مخالفت کی پرواکرتا ہے اور نہ ہی اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو توڑنے میں شرم محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فری میسنز کی کہانیاں، اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں، فوج اور کمانڈوز کی طاقت کے قصے ایسا تاثر پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ یقین ہونے لگتا ہے جیسے دنیا کی اصل طاقت تو ایک چھوٹی سی قوم یہود ہے جس نے امریکا یورپ اور دنیا کی تمام بڑی قوموں کو قابو کر رکھا ہے۔ دنیا میں جو بھی فساد ہوتا ہے اس کے پیچھے یہود کا ہاتھ ہوتا ہے اور مسلمانوں پر ہونے والے تمام مظالم کے ذمہ دار یہودی ہیں۔ اس تاثر کے نتیجے میں مسلمانوں میں یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ اصل برائی امریکا یا اس کا استعماری نظام سرمایہ داریت نہیں بلکہ اسرائیل یا یہود ہیں۔ اگر ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا جائے تو مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ دوبارہ بحال کر لیں گے۔

مسلمان پر اللہ نے یہ لازم کیا ہے کہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کریں، ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا﴿الفتح:28﴾ "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔ اس عمل کی انجام دہی کیلئے ضروری ہے کہ ہم دنیا کی سیاست کو سمجھیں، طاقت کے مراکز اور مسائل کی جڑ کی صحیح نشاندہی کریں۔ اگر ہم نے اپنے دشمن کا صحیح تعین نہ کیا تو ہماری توانائی غلط ہدف پر ضائع ہو جائے گی اور حقیقی دشمن مزید طاقتور ہو جائے گا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سپر پاور اس ملک کو کہا جاتا ہے جس کی مرضی کے مطابق دنیا کے تمام یا بیشتر معاملات چلتے ہوں۔ اس وقت امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور اس لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی معاملے میں اس کی مرضی کو چیلنج کرنے والی کوئی دوسری طاقت موجود نہیں ہے۔ امریکا کی معیشت دنیا کی معیشت کا 17 فیصد ہے۔ امریکا کا دفاعی بجٹ روس چین، برطانیہ اور فرانس کے کل دفاعی بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اسرائیل جو کہ سپر پاور نہیں اپنا تحفظ امریکی فوجی اور سیاسی مدد کے بغیر کر نہیں سکتا، جس کی معیشت ہر سال امریکی امداد کی محتاج ہو وہ کس طرح امریکا کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ یا پھر یہ کہ اسرائیل کی طاقت کے تمام قصے بے بنیاد ہیں۔

عموعی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امریکا کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی اسرائیل کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو مضبوط کرنے یا اپنے مفادات حاصل کرنے کیلئے فوجی بغاوتوں اور آمر حکمرانوں کی حمایت کرتا ہے اور کبھی جمہوری قوتوں کی، کسی ملک کے خلاف پابندیاں لگاتا ہے تو کسی ملک کو امداد دیتا ہے، کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین نافذ کروانے کیلئے سیاسی اور فوجی اثر ورسوخ استعمال کرتا ہے تو کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، اب امریکا کے ان اعمال کا یہ جواز پیش کرنا کہ ایسا وہ صرف اور صرف اسرائیل کے دباؤ کی وجہ سے کرتا ہے، غلط ہوگا۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکا افریقی ممالک لاطینی امریکا اور مشرق بعید میں بھی اپنے مفادات کے حصول کیلئے ایسے ہی تمام اقدامات اٹھاتا ہے جیسا کہ وہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں کرتا ہے۔ اگر امریکا مشرق وسطیٰ کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی

اقدامات کرتا ہے جہاں کوئی اسرائیلی مفاد نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکا اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی من مانی مرضی سے پالیسیاں بناتا ہے چاہے جن سے دوسرے اتفاق نہ کرتے ہوں۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکا کئی بین الاقوامی امور میں جن کا اسرائیل کی سلامتی یا مفادات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، پوری دنیا کی رائے کی مخالفت کرتا ہے چاہے اس وجہ سے اس کو پوری دنیا میں شدید تنقید کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ پوری دنیا نے زیر زمین بارودی سرنگوں کے خاتمے بین الاقوامی عدالت برائے جنگی جرائم کے قیام اور دنیا میں بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کو روکنے کیلئے ان پر دستخط کیے لیکن امریکا نے ان معاہدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس تجزیے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ امریکا مشرق وسطیٰ میں بھی ایسے اقدامات اس لیے کرتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ اس کے مفاد میں ہوتے ہیں نہ کہ اس وجہ سے کہ اس پر اسرائیل کا کوئی دباؤ ہوتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ امریکا میں موجود تمام یہودی اسرائیل کی حمایت میں ایک ہو کر امریکا پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ یہ تصور معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے جہاں امریکا میں یہودیوں کی ایک بڑی تنظیم "امریکا اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی" اور اس سے منسلک درجنوں ایسی یہودی تنظیمیں ہیں، ان میں ایسی معروف تنظیمیں (امریکنز فار پیس ناؤ، اسرائیل پالیسی فورم، برٹ زیڈک وی، شیڈو) ہیں جو امریکی کانگرس پر اسرائیل کے حق میں پالیسیاں بنانے کیلئے دباؤ ڈالتی ہیں جو بظاہر اسرائیل کے وجود کے خلاف تو نہیں ہیں لیکن اسرائیل کی یہودی آباد کاروں کے حوالے سے پالیسی، نئے علاقوں پر قبضہ کرنے، دیوار کھڑی کرنے اور امریکا کی اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی شدید مخالفت بھی کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کانگریس کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت کو اپنے حلقوں سے جیتنے کیلئے نہ تو یہودی ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پیسوں کی۔

ایسے تمام اراکین کانگرس جو کہ اسرائیلی پالیسیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں ان کا تعلق ان علاقوں سے ہوتا ہے جو ان کے محفوظ ترین حلقے ہوتے ہیں اور وہ وہاں سے کئی دہائیوں سے جیتتے آرہے ہوتے ہیں مثلاً امریکی اسپیکر کانگریس نینسی پلوسی جو کہ اسرائیل کی کھل کر حمایت کرتی تھی، ہر دفعہ 80 فیصد سے زائد ووٹ لے کر منتخب ہو جاتی تھیں۔ یہ کہنا کہ یہودی لابی بہت مالدار ہے اور پیسے استعمال کر کے امریکی اراکین کانگرس پر دباؤ ڈالتے ہیں، بالکل غلط مفروضہ ہے پیسوں کے لحاظ سے سب سے طاقتور لابی امریکا میں دفاعی یا اسلحہ بنانے والے اداروں، تیل کی کمپنیوں اور ادویات بنانے والے اداروں کی ہے صرف "اے آئی پی اے سی" اور "لاک ہیڈ مارٹن" اپنے اداروں کی لابنگ پر "نارتھ گرومین اور "جنرل الیکٹرک بوئنگ" کے مقابلے میں بالترتیب سات اور پانچ گنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی طرح کی لابنگ کا خرچہ اور دوسرے ایسے کئی اداروں سے بہت کم ہے جو دفاعی صنعت سے منسلک ہیں۔

امریکا میں یہودیوں کی آبادی 5 فیصد سے بھی کم ہے اس میں سے بھی جب ایک معقول تعداد اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی مخالفت کرتی ہو۔ یہودی ووٹ امریکا کے 99 فیصد سے زیادہ حلقوں میں کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں، دولت کی بنیاد پر یہودیوں سے زیادہ مضبوط لابیز موجود ہوں تو ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ دو یا تین فیصد یہودی امریکا انتظامیہ پر کتنا زور ڈال سکتے ہیں؟ ان تمام حقائق کے باوجود اگر ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا اسرائیل کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتا تو میں یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ یہ بھی خیال ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔

کسی بھی امریکی صدر نے جب یہ دیکھا کہ اسرائیل لابی کی طرف سے جس پالیسی کو اپنانے کیلئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے وہ امریکی مفاد میں نہیں تو امریکی صدر نے ہمیشہ اسرائیل کو مجبور کر دیا کہ وہ امریکی پالیسی کو اختیار کرے۔ 1956ء میں جب اسرائیل برطانیہ اور فرانس نے نہر سوئز پر قبضہ کرنے کیلئے جنگ کا

آغاز کیاتواس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور نے اس جنگ پر شدید ناراضی کا اظہار کیااور اسرائیل کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مصری علاقوں سے قبضہ ختم نہ کیاتوامریکامیں اسرائیلی بونڈزاور نجی طور پر اسرائیل بھجوائی جانے والی، رقوم پر ٹیکس کی چھوٹ ختم کر دی جائے گی۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے اسرائیل کو یہ دھمکی اس وقت دی تھی جب صرف چند ہفتوں بعد امریکامیں صدارتی انتخابات ہونے جارہے تھے۔ امریکی صدر آئزن ہاور کی اس دھمکی کے نتیجے میں اسرائیل نے چند مہینوں میں تمام مصری علاقے خالی کر دیئے۔

اسی طرح جب 1978ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیااور دریائے لیتانی تک آگیاتوامریکی صدر جمی کارٹر نے اسرائیل کو امداد بند کرنے کی دھمکی دیکر مجبور کر دیا کہ وہ لبنان کی سرحد میں چند کلومیٹر تک محدود رہے۔ اس کے بعد اگلے امریکی صدر رونالڈ ریگن نے 1981ء میں "اے آئی پی اے سی" کے بھرپور دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے فوکس طیارے سعودی عرب کو بیچے۔

اس کے 10 سال بعد بش سنئیر نے "اے آئی پی اے سی" کے بھرپور دباؤ کا کامیابی سے مقابلہ کیااور اسرائیل کی ناک رگڑتے ہوئے 10 / ارب کا قرضہ جاری نہیں کیاجب تک مشرقِ وسطیٰ میں امریکی امن منصوبے کی راہ میں رکاوٹ "یزٹحاک شمیر" کو شکست نہیں ہوگئی کیونکہ یہ امریکی منصوبے میں رکاوٹ تھا۔

2004ء میں بش جونیئر نے اسرائیل کو نہ صرف چین سے اس معاہدے کو توڑنے پر مجبور کر دیا جس کے تحت اسرائیل نے طیاروں کو جدید بنایا تھابلکہ اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل "آموس یارون" کو بھی استعفیٰ دیناپڑا۔ اسی طرح اسرائیل پچھلے کئی سالوں سے امریکا کو ایران پر حملے کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہاہے لیکن نہ صرف یہ کہ امریکااس کی اس خواہش کو پورا نہیں کر رہابلکہ امریکانے اسرائیل کو بھی سختی سے ایران پر کسی بھی قسم کے حملے سے روک دیا ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود آخر امریکا کیوں اسرائیل کی اس قدر حمایت کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ امریکا ایک نظریاتی ریاست اور دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ امریکا جو بھی فیصلے کرتا ہے اپنی ضرورت اور مفادات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام تجارتی بحری قافلے اس کے بحری علاقوں سے گزرتے ہیں، دنیا کے 66 فیصد سے زائد تیل و گیس کے ذخائر اس علاقے میں موجود ہیں اور ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ علاقے مسلم اکثریتی آبادی رکھتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے سابق برطانوی وزیر اعظم ہنری کیمپ بل (بینر مین) کا ایک ہی تبصرہ کافی ہے:

"یہاں پر وہ لوگ (مسلمان) رہتے ہیں جو اس زبردست علاقے اور اس زمین میں موجود ذخائر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کی زمین انسانی تہذیب اور مذاہب کا گہوارہ ہے، ان لوگوں کا عقیدہ زبان، تاریخ اور جذبات ایک سے ہیں۔ کوئی قدرتی رکاوٹ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی اور اگر کبھی جدا ہو بھی جائیں تو یہ دوبارہ ایک مملکت میں ضم ہو جائیں گے۔ پھر یہ دنیا کی قسمت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور یورپ کو باقی دنیا سے کاٹ دیں گے۔ ان وجوہات کو سنجیدگی سے لیاجائے تو ضروری ہے کہ ایک بیرونی اکائی کو اس قوم کے دل میں پیوست کر دیاجائے تاکہ اس قوم کی صلاحیتوں کو کبھی نہ ختم ہونے والی جنگوں میں ضائع کر دیاجائے۔ یہ بیرونی اکائی مغرب کیلئے ایک ایسے پلیٹ فارم کا کام بھی کرے گی جہاں سے وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو انجام دے سکے گا"۔

یہ ہیں وہ بنیادی وجوہات جن کی بنا پر پہلی جنگ عظیم کے بعد اس وقت کی سپر پاور برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں یہودی مملکت کی کوششوں کا آغاز کیا اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکا سپر پاور بن گیا تو اس کے مفاد کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اسرائیل کی ریاست قائم کی جائے اور اس کو مضبوط بنایا جائے۔ اسرائیلی ریاست کے ذریعے اس علاقے کو مسلسل جنگوں میں مبتلا رکھا جاتا ہے جس سے ایک طرف امریکی اسلحے کی فیکٹریاں چلتی رہتی ہیں تو دوسری طرف ان ممالک کی کمزوری کے سبب امریکا ان ممالک میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھاتا اور برقرار رکھتا ہے۔

دنیا کی واحد سپر پاور امریکا ہے جو سرمایہ داریت کے نظریے کا علم بردار ہے۔ مسلمانوں اور اسلام کا حقیقی دشمن یہودی یا اسرئیلی ریاست نہیں بلکہ امریکا اور سرمایہ داریت کا نظام ہے، اسرائیل تو محض امریکی مفادات کو پورا کرنے والا ایک کھلاڑی ہے۔ اس کھلاڑی کی یہ جرأت اور طاقت نہیں ہوسکتی کہ وہ وقت کی واحد طاقت کو اپنے مفادات کے مطابق چلاسکے۔ اسرائیل کی اس حقیقت کو ایک اسرائیل استاد اور امن کیلئے کام کرنے والے کارکن نے اس طرح سے بیان کیا ہے: اسرائیل اپنے قبضوں کو اس لیے برقرار رکھ پاتا ہے کیونکہ وہ مغرب خصوصاً امریکا کے استعماری مفادات کو پورا کرنے کیلئے تیار رہتا ہے اور حقیقت میں اب اسرائیل امریکا کا ایک آزمودہ سپاہی بن چکا ہے۔ سابق امریکی وزیر خارجہ الیگزینڈر ہیگ نے اسرائیل کے متعلق بڑا اہم بیان دیا تھا: اسرائیل امریکا کا واحد سب سے بڑا بحری و ہوائی بیڑہ ہے جو ڈوب نہیں سکتا۔

تاریخی اعتبار سے یہود اپنی سازشوں، مال واسباب اور سیاسی اثر ورسوخ کے باوجود کبھی بھی اپنے سیاسی اہداف بغیر کسی بیرونی طاقت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کرسکے۔ پچھلے چودہ سو سال میں یہود عباسی خلافت، عثمانی خلافت، اسپین کی اموی حکومت، یورپ اور امریکا میں معاشی لحاظ سے ہمیشہ خوش حال رہے ہیں لیکن کبھی بھی کسی علاقے میں یہود کوئی قابل ذکر سیاسی مقام نہیں بنا سکے۔ ریاست مدینہ میں بنو قریضہ، بنو ناصر، بنو قینو قاہ اور خیبر کے یہود اپنی معاشی سیاسی اور فوجی قوت کے باوجود کبھی بھی مدینہ کی ریاست کو براہ راست چیلنج نہیں کرسکے بلکہ ہمیشہ قریش مکہ کی مدد کا انتظار کرتے تھے اور آخر میں اپنی سازشوں اور وعدہ خلافیوں کی بناء پر ان کو بے دخل ہونا پڑا۔

یہود یورپ میں ہمیشہ دوسرے درجہ کے شہری رہے اور جب کسی حکمران نے ان پر ظلم وستم کرنا چاہا تو ان کی معاشی طاقت کبھی کام نہ آئی۔ جب عثمانی خلافت اپنے کمزور ترین دور سے گزر رہی تھی تو یہودیوں نے خلیفہ عبد الحمید دوئم کو اس بات کی پیش کش کی کہ اگر انہیں فلسطین کی زمین دے دی جائے تو خلافت عثمانہ کے تمام قرض وہ ادا کردیں گے لیکن اپنی معاشی قوت اور خلافت کی کمزوری کے باوجود یہود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

وہ قوم جو پچھلے ڈھائی ہزار سال سے اپنی تمام تر سازشی ذہنیت اور مال واسباب کے باوجود دربدر تھی، بالآخر برطانوی وزیر اعظم ہنری کیمپ بل کی وفات کے چالیس سال بعد اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے برطانیہ عربوں کے سینے میں خنجر گھونپ کر فلسطین میں اسرائیل مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خطے میں اسرائیل کا قیام اس وجہ سے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے منقسم رکھنے اور خطے میں اپنے مفادات کے مستقل حصول کیلئے یہ ضروری ہے کہ یہود کو ایک ریاست کی شکل میں طاقت دی جائے۔ اللہ سورہ آل عمران میں یہود کیلئے فرماتے ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ، ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿111-112﴾

"یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں

سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمّہ یا انسانوں کے ذمّہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔﴿111-112﴾

اللہ نے قوم یہود پر ہمیشہ ہمیشہ کی ذلت مسلط کر دی ہے۔ یہود سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے کبھی بھی مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں رہے، آج اگر یہود مسلمانوں پر غالب ہیں تو صرف اپنے استعماری آقا امریکا کی قوت کی وجہ سے۔ ہم مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ امریکا دانستہ اس نظریے کو فروغ دیتا ہے کہ یہودی لابی اس قدر طاقتور ہے کہ امریکا جیسی طاقت بھی اس کے آگے مجبور ہو جاتی ہے، اس بات کو فروغ دینے سے امریکا دو فائدے حاصل کرتا ہے۔

1۔ وہ مسلمانوں کی امریکا سے نفرت کا رخ یہود کی طرف موڑ دیتا ہے۔

2۔ مسلمان اسرائیل کو اپنا اصل دشمن سمجھ کر صرف اسرائیلی قوت کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں، اس طرح نہ تو امریکا ختم ہوتا ہے اور نہ ہی اسرائیل، امریکا غدار مسلم حکمرانوں کے ذریعے اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ اسرائیل کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوجی قوت منتشر رہے اور پھر یہ مسلم افواج آپس میں بھی قومیت اور وطنیت کی کفریہ بنیادوں پر لڑتی رہیں، مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ جب تک وہ اپنی گردنوں پر مسلط غدار امریکی ایجنٹ حکمرانوں سے نجات حاصل نہیں کرتے امریکا اور اس کے سرمایہ داری نظام سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔

یہاں یہ بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ یہاں امریکا اور اسرائیل حکومتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح اسلامی حکومتیں مسلم عوام کی خواہشات کی علمبردار نہیں بلکہ اسی طرح مغرب اور امریکا کی حکومتیں بھی یہاں کے عوام کی مکمل خواہشات کی آئینہ دار نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ جب امریکا، برطانیہ اور ان کے دیگر اتحادیوں نے عراق پر حملہ کرنے کا اعلان کیا تو یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑا "ملین افراد" کا مظاہرہ برطانیہ میں ہوا جہاں ہر مکتبہ فکر کے افراد نے اس حملے کی بھرپور مخالفت کی اور آج بھی آئے دن برطانیہ، یورپ اور امریکا میں ہزاروں افراد سڑکوں پر بے گناہ فلسطینیوں کے قتل عام روکنے کیلئے سراپا احتجاج ہیں لیکن یہاں بھی سب سے بڑی رکاوٹ اس سرمایہ داری نظام کی پیدا کردہ جمہوری نظام ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ دنیا میں جاری اس ظلم و ستم کے خلاف جو ادراک پیدا ہو رہا ہے، اس کو فوری طور پر بہتر اور جاری جمہوری انداز میں حاصل کرنے کیلئے یہاں کی تمام سیاسی جماعتوں میں عملاً شمولیت اختیار کی جائے اور سیاسی سفر میں قانون ساز اداروں میں پہنچ کر حق و صداقت کیلئے قانون سازی میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔

یقیناً ایک دن ضرور آئے گا کہ جب مظلوم کو انصاف ملے گا اور یہی افراد جو آج سڑک پر دنیا میں ہونے والے اسرائیلی، امریکی جارحیت کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہے ہیں، وہ آئندہ انتخابات میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر امیدوار سے یہ وعدہ ضرور لیں گے کہ وہ پارلیمنٹ میں جا کر ایسی قانون سازی کریں جن کی بنیاد پر ہر ظالم کو لگام ڈالی جاسکے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی پوری ہو گی جس کے تحت مسلمان بیت المقدس پر قابض یہودیوں کو چن چن کر جہنم رسید کریں گے اور وہ ان یہودیوں کے ظلم و ستم کا آخری دن ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قال رسول الله ﷺلاتقوم الساعة حتى يقاتل المسلمون اليهود فيقتلهم المسلمون حتى يختبئ اليهودي من وراء الحجر و الشجر فيقول الحجر و الشجر يامسلم ياعبدالله هذا يهودي خلفي فتعال فاقتله إلا الغرقد فإنه من شجر اليهود(مشكوٰة المصابيح حديث: (5318)

مسلمان یہودیوں سے لڑیں گے اور پھر ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ ایک یہودی کسی پتھر یا درخت کے پیچھے پناہ لے گا تو وہ پتھر یا درخت پکارے گا، اے مسلم اے اللہ کے بندے یہ یہودی میرے پیچھے ہے، آؤ اور اسے قتل کرو۔

کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی تو نہیں، بس نام رہے گا اللہ کا!

بروز جمعتہ المبارک 8 ربیع الآخر 11 / اکتوبر 2024ء

خون کی ندیاں بہانے میں ہوئیں صدیاں تمام

تاریخ کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جو ثقافت یا تہذیب تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اس کے رجحانات بھی عالمی رجحانات بن کر رہ جاتے ہیں۔اس وقت مغرب ہر اعتبار سے دنیا پر چھایا ہوا ہے۔علمی، فنی، معاشی، مالیاتی اور عسکری برتری کے حامل مغرب کے اذہان پر جنگ چھائی ہوئی ہے۔یہی سبب ہے کہ دنیا بھر میں جنگ کا ماحول ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔سب جانتے ہیں کہ جنگ ایک ایسی جہنم ہے جس کے ہاتھوں سب کچھ ۔فلموں میں، ڈراموں میں، گیمز میں، کتابوں میں، گانوں میں ہر جگہ برباد ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود پھر بھی جنگ سے اس کا جی بھرتا ہے نہ پیٹ جنگ وجدل سے رغبت کا ماحول دکھائی دے رہا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جنگ مغرب کی ثقافت کا جزوِ لاینفک ہو کر رہ گئی ہے۔

جنگ کو پسند کرنے والی ذہنیت پیدا کرنے اور پروان چڑھانے پر بہت توجہ دی جارہی ہے۔عنفوان شباب ہی سے جنگ کو پسند کرنے کا رجحان مغرب کے عام فرد کے ذہن میں جنم لے چکا ہوتا ہے۔کھلونا بندوقیں، ماڈل ٹینک اور بورڈ گیمز جنگ کو ذہنی ساخت کا اندرونی یا کلیدی حصہ بنا کر اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ مغرب کے باسی زندگی بھر جنگ کو اپنے نظام اور زندگی دونوں کا لازمی حصہ تصور کریں۔

آج دنیا بھر میں جنگ وجدل سے بھرپور وڈیو گیمز بہت مقبول ہیں۔مغربی معاشروں سے ہٹ کر بھی کروڑوں بچے یہ وڈیو گیم دیکھ دیکھ کر جنگ کو اپنے مزاج میں شامل کرتے جارہے ہیں۔قتل وغارت دیکھ دیکھ کر ذہن کی کیا حالت ہو جایا کرتی ہے، اس کا اندازہ کچھ انہی کو ہو سکتا ہے، جن کی پوری زندگی جنگ وجدل میں گزری ہو۔مغرب اپنی نئی نسل میں جنگ پسندی کو ایک رجحان کی حیثیت سے پروان چڑھا رہا ہے۔نئی نسل قتل وغارت دیکھنے اور پھر سہنے کی عادی سی ہو کر رہ گئی ہے۔جنگ وجدل کے ماحول پر مبنی وڈیو گیم بچوں کے ذہن میں جنگ پسندی کے رجحان اور قتل وغارت سے رغبت کو کیل کی طرح ٹھونک دیتے ہیں۔

مغرب اور خاص طور پر امریکا کی ثقافت جنگ پسندی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ان کے ادراک اور فکر پر جنگ وجدل سے رغبت اس بری طرح سوار ہے کہ اب اس کے بغیر زندگی بسر کرنے کا تصور بھی محال ہے۔جنگ وجدل سے رغبت نے ان کی اقدار کی ساخت میں بھی شدید منفی اثرات مرتب کر دیئے ہیں۔امریکا کیلئے جنگ ایک ایسی حقیقت ہے جو کہیں اور واقع ہو رہی ہو، اگر امریکا کسی جنگ میں براہِ راست شریک ہو تب جنگ اس کی سرزمین سے بہت دور لڑی جارہی ہوتی ہے۔امریکا کی بنیادی حکمت عملی یہ ہے کہ جنگ دوسروں کو لڑنی چاہیے اور اس جنگ کو جاری رکھنے میں مدد دینے کیلئے ہتھیار امریکی ہونے چاہئیں! امریکی سیاستدان اور ووٹر ہتھیاروں کے حوالے سے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں مگر ریاستی ڈھانچہ اور پالیسی سازی کا عمل کچھ اس قسم کا ہے کہ بات بنتی نہیں، دال گلتی نہیں۔

امریکا جنگ کو ہوا دینے کا الزام ہمیشہ دوسروں پر عائد کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ پسندی کی ذہنیت کو عام کرنے میں خود اسی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔امریکا ہی نے اپنی پالیسیوں کی مدد سے دنیا بھر میں جنگ کو ہوا دی ہے۔کئی خطوں کو جنگ وجدل کی دلدل میں امریکا ہی نے پھنسایا ہے اور یورپ نے اس معاملے میں اس کیلئے معاون کا کردار ادا کیا ہے۔اس وقت دنیا بھر میں جو خانہ جنگیاں برپا ہیں ان کی غالب اکثریت کیلئے امریکی پالیسیاں اور اقدامات ذمہ دار ہیں۔یورپ بھی بہت کچھ کرتا ہے اور مزید بہت کچھ کر سکتا ہے مگر مغرب کے بیشتر اقدامات امریکا کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔وہ صورتِ حال کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔جب ایسا ہے تو پھر کسی بھی بڑی خرابی کی ذمہ داری بھی امریکا ہی کو قبول کرنی چاہیے۔

جنگ کو ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے قبول کرنے کیلئے ذہن تیار کرنے میں مغربی میڈیا نے خاصا نمایاں اور بھیانک کردار ادا کیا ہے۔ امریکا اور یورپ کے بیشتر میڈیا آوٹ لیٹس جنگ کو ایک ایسی ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو قوم قبول کرلے۔ جنگ وجدل کی کوریج کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ لوگ قتل وغارت کے مناظر کو بھی بخوشی قبول اور ہضم کرلیں۔ جنگ کو ایک ناپسندیدہ اور تباہ کن حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے قابل قبول اور بہت حد تک کام کی چیز بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ مغربی میڈیا کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جنگ کی کوریج دیکھتے ہوئے لوگ بے مزا نہ ہوں۔

جو لوگ جنگ لڑتے ہیں اور اسے بھگتتے ہیں وہ زندگی بھر کیلئے ذہن اور جذبات کی سطح پر عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگ کسی بھی معاشرے کو کس حد تک برباد کر دیتی ہے مگر ان کے پاس طاقت ہے نہ آواز، وہ اگر چاہیں بھی تو جنگ کے خلاف ذہن سازی نہیں کرسکتے۔ ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ معاشرہ ان لوگوں سے کچھ سننے کیلئے تیار بھی نہیں جو جنگ کے تباہ کن نتائج اچھی طرح جانتے ہی نہیں بلکہ بھگت بھی چکے ہیں ۔ عوام کسی بھی جنگ کو اسی طرح دیکھتے ہیں، جس طرح وہ انہیں دکھائی جاتی ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو بن غازی (لیبیا) کے حوالے سے مائیکل بے نے ”13 گھنٹے“ اس طور پیش کی کہ دھماکے، جو کسی بھی جنگ میں سب سے خطرناک حقیقت ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے "کول" یعنی قابل قبول ہو جاتے ہیں

گزشتہ ایک برس سے غزہ اور دیگر علاقوں پر روزانہ کی بنیاد پر بمباری اور اس کے نتیجے میں زندہ انسانوں کے جس طرح پرخچے اڑائے جارہے ہیں، ہسپتالوں تک کو نہیں بخشا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں شدت پیدا ہونے کا امکان بڑھتا جارہا ہے اور امریکا نہ صرف اس کی مکمل پشت پناہی کررہا ہے بلکہ انتخابی مہم میں دونوں امیدوار اسرائیل کی مکمل حمائت کررہے ہیں۔ ٹرمپ کا یہ بیان کہ "اسرائیل کو فوری طور پر ایران کے ایٹمی پروگرام پر حملہ کرکے اسے تباہ کر دینا چاہئے" کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ اقتدار کے حصول کیلئے اس سارے خطے کو ملیامیٹ کر دینا ان کا مشن ہے۔ یاد رہے کہ اسرائیل گزشتہ ایک سال میں اس علاقے کی آبادیوں پر 80 ہزار ٹن بارود برساچکا ہے جو عالمی جنگ میں استعمال ہونے والے گولہ بارود سے کہیں زیادہ ہے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

امریکی فوج اب بھی یہی چاہتی ہے کہ جنگ کو ایک بھرپور رجحان کی حیثیت حاصل رہے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کیلئے اخبارات وجرائد اور ٹی وی چینلز کے ساتھ ساتھ ہالی وڈ کی فلموں سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ نئے ہتھیاروں کی تیاری کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ بہت سی فلموں کے ذریعے نئے ہتھیاروں اور ان کی ٹیکنالوجی کا پرچار کیا جارہا ہے۔ مقصد باقی دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ اگر وہ آج کی دنیا میں جینا چاہتی ہے تو جدید ترین ہتھیار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جنگ پسندی کے رجحان کو پروان بھی چڑھانا ہو گا۔

امریکا اور یورپ نے اب تک دفاعی ٹیکنالوجی کے نام پر انتہائی خطرناک ہتھیار تیار کرنے پر غیر معمولی توجہ دی ہے اور پھر بہت سے خطرناک ہتھیار دنیا بھر میں فروخت بھی کئے ہیں۔ امریکی فوج تو اس جنون میں مبتلا رہی ہے کہ اس کے پاس انتہائی خطرناک ہتھیار ہوں اور اس معاملے میں کوئی بھی اس کے پاس سے ہو کر گزرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ یہ سارا تماشا ووٹروں کے ادا کردہ ٹیکس کی مدد سے برپا کیا گیا ہے۔ تعلیم اور صحت کے اداروں کی ضرورت ہے مگر اس طرف متوجہ ہونے کی کسی کو توفیق نہیں۔ منتخب ایوانوں میں بھی یہ نکتہ کم لوگ اٹھاتے ہیں۔ سب کچھ قومی سلامتی کو بچانے کی چوکھٹ پر قربان کر دیا گیا ہے۔ قدم قدم پر سیکیورٹی رسک کا رونا رو کر شہریوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے بنیادی مسائل کے حل کیے جانے سے کہیں اہم

ملک کا بر قرار رہنا ہے، ملک ہو گا تو ان کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ ہتھیاروں کو اپ گریڈ کرنے اور نئے ہتھیاروں کی تیاری کے حوالے سے تحقیق و ترقی کی مد میں خطیر رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ کوئی خطرہ سامنے ہو یا ابھر رہا ہو تو ٹھیک ورنہ نئے خطرات پیدا کر کے پروان چڑھانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور جیسے ہی کوئی بیرونی خطرہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، نئے ہتھیاروں کی تیاری اور پہلے سے موجود ہتھیاروں کی اپ گریڈیشن کیلئے مختص کی جانے والی رقوم میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ویسے تو خیر پورے یورپ کو امریکی نائن الیون کے بعد خاصے دشمن میسر آ گئے ہیں مگر امریکا اس معاملے میں خاص طور پر خود کفیل ہے اور ان میں سے بیشتر خود امریکی پالیسیوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں کو چلانے کیلئے ہر وقت کوئی بڑا دشمن یا مخالف میکانزم موجود رکھا جاتا ہے۔ امریکی سیاستدان دشمنوں کی تعداد میں اضافہ دکھانے کیلئے اگر کوئی بھرپور اور حقیقی دشمن نہ ہو تو فرضی دشمن کھڑا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جس کیلئے دہشتگرد گروپوں کی درپردہ افزائش سے گریز نہیں کیا جاتا تاکہ امریکا کیلئے دنیا بھر میں کارروائیاں کرنے کا جواز باقی رہے۔ چند عشروں کے دوران امریکا نے کئی دہشتگرد گروپ کھڑے کیے ہیں اور ان سے بھرپور کام بھی لیا ہے۔ آپ نے بھی غور تو کیا ہو گا کہ انتخابی مہم کے دوران وہی امیدوار سب سے زیادہ مقبولیت اور پھر کامیابی بھی حاصل کرتا ہے جو ملک و قوم کے دفاع پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ جو دفاع پر زیادہ زور دیتا ہے اسی کو محب وطن سمجھا جاتا ہے۔

امریکا اور یورپ میں ہتھیاروں کی صنعت کیلئے بہت سی مشکلات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کسی بھی حریف میں اتنی قوت نہیں کہ امریکا اور یورپ کی سرزمین پر حملہ کرے اور جنگ کو وہاں تک مرتکز رکھے۔ جب کسی حریف میں اتنا دم ہے ہی نہیں تو پھر ہتھیاروں کی صنعت چلتی رکھنے کا جواز کیا ہے؟ بس یہی وہ نکتہ ہے جس پر اہلِ مغرب غور کرنے اور اس حوالے سے عملی طور پر کچھ کرنے کیلئے تیار نہیں۔ دور نہ جائیں، اسی مثال کو لے لیں کہ امریکا اب تک دنیا کے 36 ممالک میں جارحیت کا مرتکب ہوا ہے اور کسی ایک بھی ملک میں نہ صرف بری طرح ناکام ہوا ہے بلکہ انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ راہِ فرار اختیار کرنا پڑی ہے۔ ویتنام اور افغانستان میں بیس بیس سال تک آگ و خون کا کھیل کھیلتا رہا لیکن ویتنام سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اس کی فوج کو ہیلی کاپٹروں سے لٹک کر بھاگنا پڑا لیکن اس کے باوجود 30/ اگست 2021ء کو افغانستان کے کمبل سے جان چھڑائی تھی لیکن امریکی جنگی مافیا نے 24 فروری 2022ء کو یوکرین کی جنگ میں کود پڑا اور ابھی تک جنگ جاری ہے۔ پرنسٹن محققین کے مطابق "پچھلے دو سالوں میں جوہری جنگ کا خطرہ ڈرامائی طور پر بڑھ گیا ہے کیونکہ امریکا اور روس نے جوہری ہتھیاروں پر قابو پانے کے طویل معاہدوں کو ترک کر دیا ہے، نئی قسم کے جوہری ہتھیار تیار کرنا شروع کر دیے ہیں اور ان حالات کو بڑھا دیا ہے جن میں وہ جوہری ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔

امریکی جارحانہ پالیسیوں کے مطابق امریکا اب بھی چاہتا ہے کہ بعض شر پسند گروپ مستحکم رہیں اور میدان سے نہ بھاگیں، انہیں کسی نہ کسی طور زندہ اور توانا رکھنے پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ ان گروپوں ہی کے دم سے امریکا کیلئے امکانات کی دنیا بھی اب تک جوان ہے۔ امریکا اور یورپ دونوں ہی نے دہشتگردی برپا کر کے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ امریکی پالیسیوں کی کوکھ سے خرابیوں نے جنم لیا ہے۔ ان خرابیوں کے ردعمل میں جو گروپ امریکا

کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کی درپردہ معاونت کرکے امریکا نے یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسے نادیدہ دشمن یعنی دہشت گردوں کا سامنا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ امریکا نے نائن الیون کے فوری بعد پاکستان کو "پتھر کے دور میں بھیجنے" کی دھمکی دیکر ہر قسم کی زمینی مدد کے حصول کے بعد صرف ایک ماہ میں افغانستان پر 57 ہزار فضائی حملے کرکے اسے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی وفاؤں کا یہ بدلہ دیا کہ افغانستان میں اپنی موجودگی میں پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کو وہاں پاکستان کے خلاف دہشتگردی کیلئے فری ہینڈ مہیا کر دیا اور آج تک بھارت امریکا و مغرب کی پشت پناہی سے ان دہشتگرد پراکسیز کی مکمل معاونت کر رہا ہے تاکہ پاکستان چین کے تعاون سے مکمل ہونے والے "سی پیک" کو ختم کر دے۔

12 / اگست 2016ء کو ریپبلکن ڈونلڈ ٹرمپ نے براک اوباما اور ہلیری کلنٹن کو دولتِ اسلامیہ کے "شریک بانی" قرار دیتے ہوئے اپنے اس دعوے کی تردید کی کہ وہ عسکریت پسند گروپ کے عروج کے ذمہ دار ہیں۔ عرب ممالک کے سیال مادے سے اکٹھی کی گئی بے پناہ دولت جو امریکی بینکوں میں ہی محفوظ ہے، اس خطیر رقوم سے پہلے تو امریکی اسلحہ سازی کے کارخانوں نے امریکی معیشت کو سنبھال رکھا ہے جس کیلئے خود مشرقِ وسطیٰ میں پہلے اسرائیل کا خطرہ دکھا کر ان ممالک کو منہ مانگی قیمت پر اسلحہ خریدنے پر مجبور کیا گیا لیکن بعد ازاں خود انہی ممالک کے درمیان ایسی فساد کی آگ بھڑکا دی کہ اب ان کی اسلحہ سازی کی صنعت کا پہیہ دن رات تیزی سے چل رہا ہے۔

عراق کو ایک سازش کے تحت پہلے ایران کے ساتھ آٹھ سال تک ایسی جنگ میں الجھا دیا گیا جس کی قیمت صرف ان دو ملکوں نے نہیں بلکہ تیل سے مالا مال دوسرے پڑوسی ممالک کو بھی اس جنگ کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ابھی یہ عذاب ختم نہیں ہوا تھا کہ عراق کو ایک گھناؤنی چال میں پھنسا کر کویت پر حملہ کروا دیا اور پھر سعودی عرب اور کویت کی مدد کے بہانے "ورلڈ آرڈر" کا آغاز کرتے ہوئے خود باقاعدہ اس خطے میں اپنی پوری جنگی حکمت عملی کے تحت اپنی اور اتحادیوں کی افواج کے ساتھ عراق پر حملہ کرکے کویت کو واگزار کرایا گیا اور خود امریکی ریکارڈ کے مطابق امریکا نے جہاں کویت اور سعودی عرب سے اپنی خدمات کیلئے ان دونوں ممالک سے 178 / ارب ڈالر وصول کیے اور عراق پر مجوزہ پابندیاں لگا کر عراق سے بھی 120 / ارب ڈالر خراج وصول کیا وہاں خطے کی سب سے بہترین اور جنگی وسائل سے مالا مال عراقی فوج کو مکمل طور پر تباہ کرکے اپنے لے پالک اسرائیل کو عراق سے لاحق خطرات سے بھی محفوظ کر دیا جبکہ اسرائیل پہلے ہی عراقی ایٹمی پروگرام کو ایک ایسے فضائی حملے میں تباہ کر چکا تھا جس کیلئے اس نے باقاعدہ سعودی عرب اور کویت کی اجازت سے ان ملکوں کی فضاؤں کو استعمال کیا۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعد ازاں ایک سازش کے تحت عراق پر خفیہ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگا کر حملہ کرکے محض اس لئے تباہ برباد کر دیا کہ عراق نے امریکی جارحیت کے بعد اپنی فوج کو از سرِ نو منظم کرنے کیلئے روس اور چین سے عراقی تیل کے عوض کئی معاہدے کئے اور تمام ممالک سے عراقی پٹرول کی قیمت ڈالر کی بجائے یورو اور دیگر کرنسیوں کی شرط رکھ دی اور امریکا نے عراق پر قبضہ کرکے عراقی تیل کے تمام ذخائر کی بیش بہا دولت کا ٹھیکہ امریکی کمپنیوں بالخصوص امریکی نائب صدر ڈک چینی کے حوالے کر دیا گیا۔ صدیوں سے محفوظ عراقی تہذیب کے بڑی بے رحمی کے ساتھ پرخچے اڑا دیئے گئے اور آج تک عراق میں خانہ جنگی جاری ہے اور تیل کی بے تحاشہ دولت والا ملک آج غربت کی چکی پیس رہا ہے۔

تنازعات اور تشدد معاشروں کا حصہ ہے۔ بہت سی ثقافتوں میں جنگ و جدل سے رغبت ہر دور میں رہی ہے۔ آج بھی ایسی بہت سی جنگیں لڑی جا رہی ہیں جن کا امریکا اور مغرب سے کوئی تعلق نہیں مگر پھر بھی امریکا و مغرب کا ہاتھ نمایاں ہے۔ امریکی اور مغربی معاشرے اپنے ہتھیار فروخت کرنے کیلئے

جنگ پسندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ کئی خطوں کو سلامتی کے حوالے سے شدید اندرونی خطرات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ متعدد ممالک کو غیر ضروری طور پر جنگ میں الجھا دیا گیا ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لیبیا اور یمن اس کی بہت واضح مثالیں ہیں۔ آج کے مغرب میں میڈیا، معیشت، سیاست، انٹرٹینمنٹ سبھی کچھ جنگ پسندی کے آغوش میں ہے، جب تک یہ رجحان ترک نہیں کیا جائے گا تب تک دنیا میں حقیقی امن کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔

بروز اتوار 10 ربیع الآخر / 13 اکتوبر 2024ء

قیامت کی چاپ: اسرائیل اور عالمی جنگ کا امکان

آیئے پہلے ماضی کے ، اپنے دورِ اقتدار میں ٹرمپ کی طرف سے قبلہ اول کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کی غلطی کی طرف بعد میں آئیں گے جھروکوں میں جھانکتے ہیں۔

دنیا کا یہ فیز چھ ہزار سال پر محیط ہے۔یہودیوں کے مطابق ان کا یہ تاریخی کیلنڈر نظام پیدائش کی تخلیق کی داستان اور اس کے بعد کی بائبل کی کہانیوں کے مطابق دنیا کی تخلیق سے لے کر اب تک کے سالوں کی تعداد کا حساب لگانے کی کوشش کرتا ہے۔موجودہ عبرانی سال 2/ اکتوبر 2024ء کو شروع ہوا ہے اور اس کا اختتام 22 ستمبر 2025ء کو غروبِ آفتاب پر ہو گا۔یہودیوں کے کیلنڈر کے مطابق (کتاب ہدایات) یہودیوں کی مقدس کتاب تلمود نے 5785 سال پورے کر لئے ہیں۔یہودی عقیدے کے مطابق دنیا کے خاتمے میں اب صرف 215 سال باقی ہیں۔یہ دنیا 215 سال بعد مکمل طور پر فنا ہو جائے گی۔یہودیوں نے قیامت سے قبل دو اہم کام کرنے ہیں، تابوت سکینہ کی تلاش اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر۔

یہ کہانی حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہے۔حضرت ابراہیمؑ چالیس سال حضرت اسماعیلؑ کے پاس مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر رہے۔آپؑ نے خانہ کعبہ تعمیر کیا اور آپؑ واپس فلسطین تشریف لے گئے، آپؑ نے وہاں اللہ تعالیٰ کا دوسرا گھر بیت المقدس تعمیر فرمایا۔خانہ کعبہ اور بیت المقدس کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا فرق تھا۔حضرت ابراہیمؑ نے فلسطین میں انتقال فرمایا۔آپ کا روضہ مبارک یروشلم کے مضافات میں ہے۔یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ کی مناسبت سے ہیبرون یا الخلیل کہلاتا ہے۔حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے مزارات بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ موجود ہیں۔بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کی اولاد ہیں۔یہ لوگ قحط کا شکار ہوئے، مصر کی طرف نقل مکانی کی، فرعون کی غلامی میں گئے۔ سینکڑوں سال ذلت برداشت کی اور 33 سو سال پہلے حضرت موسیٰؑ کی معیت میں فلسطین واپس آئے۔حضرت داؤدؑ نے ہزار سال قبل مسیح میں یروشلم فتح کیا اور اسے اپنی سلطنت "کنگڈم آف ڈیوڈ" کا دارالحکومت بنایا۔

حضرت داؤدؑ نے بیت المقدس کی بنیادوں پر یہودیوں کا عظیم معبد تعمیر کرانا شروع کیا، آپ کے بعد حضرت سلیمانؑ نے یہ تعمیر جاری رکھی، حضرت سلیمانؑ کے پاس حضرت موسیٰؑ کا ایک تابوت تھا۔اس تابوت میں پتھر کی وہ دو تختیاں بھی تھیں جو اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر کوہ طور پر اتاری تھیں۔ان تختیوں پر اللہ کے دس احکامات درج تھے۔تابوت میں حضرت ہارونؑ کا عصا اور وہ برتن بھی تھا جس سے من و سلویٰ نکلتا تھا۔حضرت سلیمانؑ نے یہ تابوت اس معبد کی بنیادوں میں چھپا دیا۔آپ کے دور میں بڑے بڑے جادوگر بھی تھے۔آپ نے اللہ کے حکم پر ان تمام جادوگروں کو قتل کر دیا اور ان کے جادو کے نسخوں کو بھی صندوقوں میں بند کر کے معبد کے نیچے غاروں میں چھپا دیا۔

یہودی حضرت سلیمانؑ کے معبد کو ہیکل سلیمانی کہتے ہیں۔یہ ہیکل 586 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے تباہ کر دیا تھا تاہم اس نے ہیکل سلیمانی کی بیرونی دیوار چھوڑ دی۔یہودی اس دیوار کو "کوتل" جبکہ مسلمان دیوار گریہ کہتے ہیں۔یہودیوں کا خیال ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے تابوت سکینہ اور جادو کے نسخے بیت المقدس کے نیچے غاروں میں چھپائے تھے چنانچہ یہ لوگ 3 ہزار سال سے بیت المقدس کے نیچے غار کھود رہے ہیں۔یہ بیت المقدس کو گرا کر مستقبل میں ہیکل سلیمانی کو یہاں تک پھیلانا بھی چاہتے ہیں، کیوں؟ میں اس کی طرف بھی بعد میں آؤں گا، پہلے بیت المقدس میں مسلمانوں کی دلچسپی کا ذکر ناضروری ہے۔

بیت المقدس 11 فروری 624 تک مسلمانوں کا قبلہ اوّل تھا۔ نبوت کے دسویں سال رجب کی ستائیسویں شب کو معراج کا واقعہ پیش آیا، اللہ نبی اکرم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے یروشلم لے کر آیا، آپ ﷺ نے قبلہ اوّل میں انبیا کرام کی امامت فرمائی۔ آپ ﷺ براق پر تشریف فرما ہوئے اور براق آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے حضور لے گیا۔ آپ ﷺ بیت المقدس کے صحن سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے، آج بھی وہاں سات فٹ لمبی چالیس فٹ چوڑی اور چھ فٹ اونچی چٹان موجود ہے۔ یہ چٹان آپ ﷺ کے ساتھ اوپر اٹھ گئی تھی لیکن حضرت جبرائیل نے اس پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ زمین سے جوڑ دیا تھا۔ چٹان پر حضرت جبرائیل کے ہاتھ کا نشان آج تک موجود ہے۔ اموی خلیفہ عبدالملک نے 691 میں چٹان کے گرد سنہرے رنگ کی عمارت بنا دی اور یہ عمارت عربی میں قبہ الصخرہ اور انگریزی میں "ڈوم آف دی راک" کہلاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ہاتھوں عرب سے باہر پہلی عمارت تھی اور یہ عمارت آج پوری دنیا میں یروشلم کی پہچان ہے۔

یہ سنہری عمارت قبلہ اوّل نہیں، بیت المقدس سنہری عمارت سے ذرا سے فاصلے پر تہہ خانے میں ہے، آپ کو وہاں جانے کیلئے سیڑھیاں اترنا پڑتی ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے آج سے آٹھ سو سال قبل مسجد اقصیٰ کی توسیع کی، یہ توسیع اقصیٰ جدید کہلاتی ہے۔ یہودی اس سنہری عمارت اور اقصیٰ جدید کو بھی گرانا چاہتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ ہیکل سلیمانی بیت المقدس اور اقصیٰ جدید تک وسیع ہو گا۔ یہودیت عیسائیت اور اسلامی عقائد کے مطابق قیامت سے قبل دجال کا ظہور ہو گا۔ یہودی دجال کو مسیحا کہتے ہیں جبکہ عیسائی اسے اینٹی کرائسٹ کا نام دیتے ہیں، یہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد ظاہر ہو گا۔ پوری دنیا کے یہودی اسرائیل میں جمع ہوں گے، دجال اسرائیل کو "کنگڈم آف ڈیوڈ" ڈکلیئر کرے گا اور دنیا کو فتح کرنا شروع کر دے گا۔ یہ پوری عیسائی اور مسلمان دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا، یہ جنگ چالیس پچاس سال جاری رہے گی اور دنیا ملبے کا ڈھیر بن جائے گی یہاں تک کہ دنیا کے قدیم ترین شہر دمشق میں حضرت امام مہدیؑ کا ظہور ہو گا۔ فجر کی نماز سے قبل حضرت عیسیٰؑ جامعہ امیہ کے سفید مینار سے اتریں گے اور حضرت امام مہدی کے پیچھے نماز ادا کریں گے اور یہ دونوں دجال کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے، بڑی جنگ ہو گی، یہودی اس جنگ کو "آرماگیڈن" کہتے ہیں۔ اسلامی عقائد کے مطابق مسلمان یہ جنگ جیت جائیں گے اور فتوحات کے بعد اسلامی ریاست بنے گی۔

حضرت عیسیٰ 45 سال کی زندگی گزار کر انتقال فرمائیں گے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ ان کے بعد حضرت مقعد کی حکومت آئے گی، حضرت مقعد کے انتقال کے 30 سال بعد اچانک سینوں سے قرآن مجید اٹھا لیا جائے گا، جس کے بعد قیامت کے آثار شروع ہو جائیں گے جبکہ یہودی عقائد کے مطابق یہ جنگ دجال جیت جائے گا جس کے بعد یروشلم کے مضافات میں "جبل الزیتون" پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور یہ قیامت کی پہلی نشانی ہو گی۔ جبل الزیتون (ماونٹ آف اولیوز) یروشلم کے مضافات میں ہے اور یہودی اس پہاڑی پر دفن ہونا اعزاز سمجھتے ہیں۔

یہودی دن میں تین بار اپنے سینا گوگا میں دجال کی آمد کی دعا کرتے ہیں، یہ دعا "شمونے عسرے" کہلاتی ہے۔ یروشلم یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تینوں مذاہب کیلئے مقدس ترین شہر ہے کیونکہ یہ انبیا کرام کا شہر ہے۔ مسلمان 13 سال بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہ شہر حضرت عمر فاروق کے دور میں فتح ہوا اور یہ سینکڑوں سال مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ سنہری گنبد قبہ الصخرہ آج بھی مسلمانوں کی نشانی بن کر یہاں موجود ہے۔ یہ شہر قیامت کی اہم ترین نشانیوں میں بھی شامل ہے۔ وہ چٹان جو معراج کے وقت براق کے ساتھ اوپر اٹھ گئی تھی، وہ مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کیلئے مقدس ہے۔ یہودی اسے "ماونٹ ماریجا" کہتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال ہے یہ چٹان دنیا کا مقامِ آغاز تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کیلئے حضرت اسحاق (یہودی عقیدے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربان کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ ہم مسلمان حضرت اسماعیلؑ کی قربانی پر ایمان رکھتے ہیں) کو بھی اسی چٹان پر لٹایا تھا۔ یہودی اگلے تیس برسوں میں بیت المقدس اقصیٰ جدید اور سنہری عمارت یہ تینوں عمارتیں گرائیں گے، مسلمانوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوگا، دجال کا ظہور ہوگا، عالمی جنگ شروع ہوگی۔ دجال احد کی پہاڑیوں تک پہنچ جائے گا، جبل الزیتون پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگی اور پھر قیامت آجائے گی۔ ہم مسلمان دجال تک یہودیوں سے متفق ہیں لیکن ہم آخر میں اسلام کے اور مسلمانوں کے غلبے پر ایمان رکھتے ہیں۔

ہم اب ڈونلڈ ٹرمپ کی حماقت کی طرف آتے ہیں۔ دنیا اس وقت دو خوفناک خطرات کے درمیان سانس لے رہی ہے، دنیا میں تباہ کن ہتھیاروں کے انبار لگے ہیں۔ کرہ ارض کے چاروں کونوں میں شدت پسندوں کی حکومتیں ہیں، پیوٹن جیسا شدت پسند روس میں موجود ہے جو ہر حال میں امریکا اور یورپ سے بعد ازاں سوویت یونین کا چھ ٹکڑوں میں تقسیم ہونا وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے موقع کی تلاش میں ہے جس کی ابتداء افغانستان سے روس کا انخلاء اور بھول نہیں پایا۔ امریکا اور مغرب شمالی کوریا میں کم جونگ کو ایک پاگل، جنونی حکمران سمجھتا ہے جس نے پہلی مرتبہ امریکا اور یورپ کو خوفزدہ کر کے اسے اس کی حیثیت یاد دلا دی ہے، نریندر مودی جیسا شدت پسند بھارت کا وزیر اعظم ہے جو کہ دنیا کے امن کیلئے شدید خطرہ بنا ہوا ہے لیکن اپنی بزدلی کی بنا پر سازشوں میں مصروف ہے۔

امریکا میں ایک مرتبہ پھر کملا ہیرس کے مقابلے میں ڈونلڈ ٹرمپ دوبارہ حکومت سنبھالنے کیلئے پر امید ہے اور وہ برملا اپنی انتخابی مہم میں جس طرح اسرائیل کا مربی بن کر اسرائیل کو ایران کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کا مشورہ دے رہا ہے، اور ان دنوں ایران کے بیلسٹک میزائل حملے کے بعد محسوس بھی یہ ہو رہا ہے کہ امریکی مدد سے اسرائیل کسی بھی وقت ایران پر حملہ کر سکتا ہے اور اسرائیل کے وزیر دفاع نے عالمی میڈیا پر ایران کو خبردار کرتے ہوئے "سرپرائز" دینے کا اعلان بھی کیا ہے۔

ادھر دوسری طرف ایران کے میزائل حملوں کے جواب میں اسرائیل کے وزیر دفاع یوو گیلنٹ نے فوجیوں سے خطاب کے دوران ایران کو دھمکی دیتے ہوئے خبردار کیا کہ حالیہ ایرانی میزائل حملے کا ان کے ملک کا جوابی اقدام "مہلک" اور "حیران کن" ہوگا، وہ سمجھ نہیں پائیں گے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ ایران کو ہر حال میں اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ دنیا اس حملے کے نتائج دیکھے گی۔ حماس اور حزب اللہ کے خلاف بھی حملوں میں مزید شدت لانے کی دھمکی دی ہے۔ 3/اکتوبر 2024ء جمعرات کو ایک ایران نے قطر کے ذریعے امریکا کو ایک پیغام بھیجا ہے کہ "یکطرفہ خود کو ضبط کرنے کا مرحلہ ختم ہو گیا ہے اور مزید برداشت ہماری قومی سلامتی کے تقاضوں کو غیر محفوظ بنا سکتی ہے، اس لئے آئندہ ایران پر حملے کا غیر روایتی جواب ملے گا جس میں براہِ راست اسرائیلی انفراسٹرکچر کو نشانہ بنانا بھی شامل ہے"۔

صیہونی چینل 12 کی مطابق شیطان صفت نیتن یاہو نے کابینہ کے متعدد وزراء، یہودی ربائی، اعلیٰ فوجی قیادت، انٹیلجنس ایجنسیوں کے حکام اور عالمی میڈیا کو ارڈینیٹرز کو فوری مشاورت کیلئے اپنے دفتر میں بلا کر ایک لمبی نشست کے بعد موجود جنگ کا نام "آہنی تلوار" سے بدل کر آرما گیڈون یعنی "قیامت کی جنگ" رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ دراصل عہد قدیم و جدید اور اسلامی روایات کے مطابق امام مہدی کے ظہور سے قبل لڑی جانے والی جنگ کا نام "آرما

گیڈون" بتایا گیاہے جس میں کروڑوں افراد مارے جائیں گے اور اس کا واضح تذکرہ انجیل میں باب "مکاشفہ یوحنا، آخری جنگ" میں بھی موجود ہے۔

شنید ہے کہ عراق اور شام کے ساتھ ساتھ افغانستان میں داعش ایک دفعہ پھر منظم ہو رہی ہے جبکہ پاکستان میں اب تک کئی خودکش حملوں کی ذمہ داری بھی قبول کر چکی ہے۔ پاکستان کے حالات ہم سب کے سامنے ہیں، اسلامی دنیا کی پہلی نیوکلیر ریاست ہے جو میزائل ٹیکنالوجی میں دنیا میں ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ دوسرا خطرہ اسرائیل اور یہودی ہیں، یہ قیامت کی چاپ سن رہے ہیں۔ یہ روز دن میں تین مرتبہ "شمونے عسرے" کرتے ہیں، یہ اونچی آواز میں دجال کو آواز دے رہے ہیں چنانچہ بس یہ آواز سننے کی دیر ہے اور یہ دنیا چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پس کر برابر ہو جائے گی۔

اگر آپ کو یاد ہو تو ٹرمپ کے دورِ اقتدار میں اس کے یہودی نژاد داماد جیرالڈ کشنر کو ایک نئے "لارنس آف عریبیا" کا کردار سونپا گیا کیونکہ وہ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کا بہترین دوست بھی ہے۔ وہ کام جو یہودی پچھلی سات دہائیوں سے نہ کر سکے، جیرالڈ کشنر کی معاونت سے ٹرمپ نے اسرائیل کے متحدہ عرب امارات، بحرین، سوڈان اور مراکش کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے ثالث کا کردار ادا کیا جبکہ سعودی عرب کے ساتھ کئی شعبوں میں تعاون شروع ہو گیا جس میں فضائی سروس سرفہرست ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے دورِ اقتدار میں 6 دسمبر 2017 کو اچانک اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم شفٹ کرنے کا اعلان کرکے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور دنیا کو ٹرمپ کے پروانے میں اپنی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے ان دنوں بھی اپنے کالمز میں متنبہ کیا تھا کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے والے ممالک یہ نہ سمجھیں کہ وہ گریٹر اسرائیل کے معاملے پر بچ سکیں گے۔ اسرائیل کی ان اقدامات پر یہ دنیا کی تباہی کا عمل شروع ہو جائے گا اور ہم تیسری عالمی جنگ کا رزق بن جائیں گے۔

12 مہینوں تک جاری رہنے والے انسانی بحران اور تباہی کے بعد بھی اسرائیل کے عوام صدمے کا شکار ہیں اور وہاں آئے دن بڑے پیمانے پر احتجاج ہو رہا ہے، سیاستدان کھل کر نیتن یاہو کی جنگجویانہ پالیسیوں کو آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔ اسرائیل کی معیشت مشکلات کا شکار ہے، سیاحت کی صنعت مکمل ٹھپ ہے اور دنیا کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات اتار چڑھاؤ کا شکار ہیں۔ مالیاتی ادارے موڈی نے 2024 میں اسرائیل کی شرحِ نمو کو 1.5 فیصد تک سکڑنے کی پیش گوئی کی جبکہ ٹائمز آف اسرائیل کی 18 فیصد ورک فورس جنگ کے دوران دفتروں سے غیر حاضر رہی ہے۔ ٹائمز آف اسرائیل کے مطابق اسرائیل کو اس جنگ کے دوران ہر دن 26.9 کروڑ ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اس وقت اسرائیل ایک ایسے لمحے پر کھڑا ہے جو اس کے مستقبل کا تعین کر سکتا ہے۔

نیتن یاہو کی پالیسیوں نے اسرائیل کو دیوالیہ کر دیا ہے لیکن عالمی مالیاتی ادارے فی الحال اس کا اعلان کرنے سے گریز کر رہے ہیں اور یہی حال اس کے مربی امریکا کا بھی ہو چکا ہے۔ عالمی دفاعی تجزیہ نگار اس اندیشے کا ذکر کر رہے ہیں کہ ان مشکلات کو چھپانے کیلئے اسرائیل یقینی طور چھپانے کیلئے اس خطے میں امریکا کو باقاعدہ اسی طرح ملوث کرنے کی کوشش کرے گا جس طرح کی غلطی امریکا عراق اور افغانستان میں کر چکا ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ غلطی کہیں عالمی جنگ کا دروازہ نہ کھول دے جس کا بہت زیادہ امکان ہے۔

يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾

پوچھتا ہے ”آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟ پھر جب دِیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے اُس وقت یہی انسان کہے گا ”کہاں بھاگ کر جاؤں؟“ ہر گز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی، اُس روز تیرے ربّ ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔

القیامہ(6۔15)

بروز منگل12 ربیع الآخر15 / اکتوبر2024ء

اگر ایسا ہوا تو......!

11 مئی 1995 کو جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے میں فریق ممالک نے یہ ایک مرتبہ پھر سر جوڑ کر فیصلہ کیا تھا کہ عدم پھیلاؤ کا معاہدہ غیر معینہ مدت تک موثر رہنا چاہیے۔ اس معاہدہ کا آغاز 1970 میں ہوا تھا اور ابتدائی طور پر اِس معاہدے کی مدّ 25 برس رکھی گئی تھی۔ اسی لیے 1995 میں اس معاہدہ کے جائزے اور اس میں توسیع کیلئے ہونے والی کانفرنس کے سامنے دو راستے تھے کہ آیا اِس معاہدے میں توسیع ہونی چاہیے اور اگر ایسا کیا جائے تو کیا اس کی کوئی مقررہ مدت ہونی چاہیے، یا یہ معاہدہ غیر معینہ مدت تک مؤثر رہنا چاہیے۔ دانشمندانہ طور سے این پی ٹی کے فریقین نے معاہدے میں غیر معینہ مدت تک توسیع کا فیصلہ کیا جس سے یہ یقینی بنانے میں مدد ملی کہ جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے کی کوششوں کی بنیاد قائم رہے گی۔ 25 سال بعد اس دانشمندانہ فیصلے کی خوشی مناتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ پچاس سال بعد بھی یہ معاہدہ عدم پھیلاؤ کی مصدقہ ضمانتوں کیلئے ایک قابل اعتبار بنیاد مہیا کرتا رہے گا جس کی بدولت جوہری توانائی کے پُرامن استعمال اور جوہری اسلحے پر کنٹرول اور اس کے خاتمے کی کوششوں کیلئے عالمگیر تعاون ممکن ہوتا ہے۔

اگست 2016 تک، 191 ریاستیں اس معاہدے کی فریق بن چکی ہیں جبکہ شمالی کوریا نے 1985 میں اس میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن کبھی اس کی تعمیل نہیں ہوئی بلکہ 2003 میں جوہری آلات کے دھماکے کے بعد اس معاہدے سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ معاہدے پر یو این 2015ء ریویو کانفرنس میں برطانوی وزارت خارجہ کی وزیر مملکت بیرونس جوائس اینلے نے سرد جنگ کے بعد وارہیڈز کی عالمی تعداد میں نمایاں کمی کے باوجود عالمی تخفیف اسلحہ کی سست رفتار پر اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ حالیہ برسوں میں جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے انسانی اثرات پر ہونے والی کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں یہ احساس بہت نمایاں نظر آیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ تصدیق بھی کر دی کہ ہم ناروے اور امریکا کے ساتھ اپنے تاریخی تصدیقی کام کو جاری رکھیں گے۔

23 جولائی 2024ء کو جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ سے متعلق جنیوا میں معاہدے کی گیارہویں جائزہ کانفرنس کی تیاری کے موقع پر چین کی وزارتِ خارجہ نے بیان جاری کیا کہ یہ معاہدہ بین الاقوامی جوہری تخفیف اسلحہ اور عدم پھیلاؤ کے نظام کی بنیاد ہے اور سلامتی اور ترقی کیلئے انٹرنیشنل گورننس سسٹم کا ایک اہم ستون ہے، معاہدے کے ایک رکن ملک کی حیثیت سے، چین نے ہمیشہ معاہدے کے مقصد کو مضبوطی سے برقرار رکھا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو وفاداری سے پورا کیا ہے اور معاہدے کے تین ستونوں: جوہری تخفیف اسلحہ، جوہری عدم پھیلاؤ اور جوہری توانائی کے پرامن استعمال کی جامع اور متوازن پیش رفت کی وکالت کی ہے۔ ان تمام مثبت کوششوں کے باوجود آخر یہ معاہدہ کیوں ناکام ہو کر رہ گیا ہے اور عالمی امن کے خشک اور خطرناک ایندھن میں خاکم بدہن کبھی ایک چنگاری کا کام کر کے دنیا کو پتھر کے زمانے میں دھکیل سکتا ہے۔

یوکرین میں جنگ کے آغاز ہی میں جن خدشات کا ذکر کیا تھا، وہ بالآخر درست نکلے کہ امریکا سرد جنگ کے زمانے کے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے ایک اہم بین الاقوامی معاہدے سے یکطرفہ طور پر دستبردار ہونے کا اعلان کرنے جا رہا ہے۔ یہ معاہدہ جسے انٹرمیڈی ایٹ رینج نیوکلئیر فورسز ٹریٹی (آئی این ایف) کہا جاتا ہے، 1987ء میں اس وقت کے امریکی صدر ریگن اور سوویت یونین کے گورباچوف کے درمیان طے پایا تھا۔ درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے جوہری ہتھیاروں کے اس معاہدے کا مقصد وسیع سطح پر تباہی مچانے والے ہتھیاروں کی دوڑ کو روکنا تھا۔ عالمی ماہرین نے اس معاہدے

کو ایک سنگِ میل قرار دیا تھا لیکن اب جوں جوں یوکرین کی جنگ کا پانسہ بدلتا دکھائی دیا تو امریکا نے روس کی جانب سے لگائے گئے کروز میزائل کو اس معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دیکر اپنی درپردہ پالیسی کا اظہار کر دیا۔ روس نے امریکا کے اس الزام کو مسترد کیا جبکہ ٹرمپ نے اپنے دورِ اقتدار میں امریکی ریاست نویڈا میں صحافیوں سے بات کرتے ہوئے تصدیق کی تھی کہ "ہم اس معاہدے کو ختم کرنے جارہے ہیں اور ہم اس سے دستبردار ہو جائیں گے۔ جونہی 13 جون 2022ء کو امریکا نے 13 جون 2002ء کو "اے بی ایم" معاہدہ سے علیحدگی اختیار کرنے کا اعلان کیا تو اس سے اگلے ہی دن روس نے بھی "سٹارٹ 2" معاہدہ کی مزید پابندی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

ادھر روس نے سرد جنگ کے دوران ہونے والے 1989ء کے انٹر میڈیٹ رینج نیوکلیئر فورسز کے تحت میزائلوں پر عملدرآمد کرنے کے معاہدے کو خیر باد کہنے کی وجہ یہ بتائی کہ واشنگٹن نے روس کے نئے کروز میزائل ٹیسٹ کو آئی این ایف کی شرائط کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے اس معاہدے کو معطل کر دیا تھا جس کے جواب میں پیوٹن نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ سرد جنگ دور کے ایٹمی ہتھیار کنٹرول کے معاہدے سے روس کو نکال لیں گے جو ایٹمی جنگ کے خلاف کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ حالیہ برسوں میں چین نے جو طرفہ معاہدے کا دستخط کنندہ نہیں ہے، ایٹمی میزائلوں میں خاصی پیش رفت کی ہے اس لئے فوجی خطرات کی وجہ سے اس معاہدے کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل روس نے واشنگٹن کی جانب سے نئے کروز میزائل ٹیسٹ کی تردید کردی تھی بلکہ اس نے جوابی اقدام کے طور پر امریکا پر الزام عائد کیا تھا کہ اس نے مشرقی یورپی رکن امریکی میزائل ڈیفنس سسٹم نصب کرکے اس معاہدے کی پہلے ہی خلاف ورزی کی ہے۔

پیوٹن نے کہا کہ اب ماسکو نئے میزائلوں کی تیاری اور موجودہ نظام کی تبدیلی پر کام شروع کر دے گا تاہم جب تک امریکا فیصلہ نہیں کرتا اس وقت تک ہم ہتھیار نصب نہیں کریں گے۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے ہم بھی امریکا کی طرح اس معاہدے کو معطل قرار دے رہے ہیں، واضح رہے کہ آئی این ایف معاہدہ زمین سے مار کرنے والے میزائلوں کے حوالے سے تھا جن کی حد پانچ سو کلومیٹر اور پانچ ہزار پانچ سو کلومیٹر کے درمیان تھی۔ تجزیہ نگاروں نے خبردار کیا ہے کہ میزائلوں پر کنٹرول کے معاہدے کے خاتمہ اور یورپ سے میزائل ڈیفنس سسٹم کی تنصیب سے یورپی یونین کے ممالک کیلئے خطرہ ہو سکتا ہے۔ خارجہ تعلقات پر یورپی کونسل کے شریک چیئرمین نے آئی این ایس کے خاتمہ کی صورت میں یورپ کو روسی زمینی لانچر سے پندرہ سو کلومیٹر رینج کے کروز میزائل سے ہی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ روس کے معاہدے سے نکلنے کے اعلان سے پہلے چین نے محاذ آرائی ٹالنے کی کوشش کی تھی، ادھر امریکا میں کانگرس نے پینٹاگون کو نئے میزائل کی تحقیق اور تیاری کیلئے فنڈز مہیا کر دیئے ہیں تاہم امریکی حکام نے زور دیا ہے کہ امریکا یورپ میں فوری طور پر درمیانی حد کے میزائل کی تنصیب کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

امریکا کا ماننا ہے کہ کئی مرتبہ مذاکرات کے باوجود کسی سمجھوتہ تلاش کرنے میں ناکامی کی وجہ سے امریکا نے معاہدہ معطل کیا تھا اور جوابی اقدام کے طور پر روس بھی سرد جنگ کے دوران ہونے والے اس میزائل معاہدے آئی این ایف سے نکل گیا ہے۔ برطانوی اخبار دی گارڈین کے مطابق ٹرمپ کے قومی سلامتی کے مشیر جان بولٹن امریکا کو اس معاہدے سے دستبردار کرانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ امریکی محکمہ دفاع اس کوشش کے خلاف تھا۔ روس

کے نائب وزیرِ خارجہ " سرگئی ریاب کووکے " مطابق امریکا کی اس معاہدے سے دستبرداری سے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی عالمی کوششوں کو شدید جھٹکا لگا ہے اور روس کیلئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ روسی فوج فعال میزائل پروگرام کیلئے زمینی لانچنگ سسٹم اور ہائپر سونگ گراؤنڈ بیس انٹرمیڈیٹ رینج میزائل تیار کرے جس میں اب وہ خود کفیل ہو گیا ہے۔

سٹارٹ یعنی سٹریٹجک آرمز ری ڈکشن ٹریٹی، جو تخفیفِ اسلحہ کا ایک عالمی معاہدہ 1991 میں روس اور امریکا کے درمیان طے پایا تھا اور یہ 1994 میں نافذ العمل ہو گیا تھا۔ اس معاہدے کا مقصد اُس وقت کی دو عالمی طاقتوں کے درمیان جوہری ہتھیاروں اور دور تک مار کرنے والے میزائلوں اور وسیع سطح پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی کمی کرنا تھا۔ امریکا اور روس کے نمائندوں نے بیجنگ میں آئی این ایف کو بچانے کی کوششوں کے سلسلے میں مذاکرات کیے تھے جو ناکام رہے۔ امریکا کے مطابق اگر روس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی میں یورپ میں لگائے گئے میزائلوں کو تباہ نہ کیا تو وہ آئی این ایف سے بھی فوری علیحدہ ہو جائے گا جبکہ ماسکو نے امریکی مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اس کے "نووا ٹور 9 ایم 729" میزائل اس معاہدے کی حدود و قیود کے مطابق لگائے گئے ہیں۔

روس کے وزیر خارجہ سرگئی لاوروف نے خبردار کیا ہے کہ ایران کی شہری جوہری تنصیبات پر اسرائیلی حملہ ایک "سنگین اشتعال انگیزی" ہو گا۔ اسرائیل وزیر دفاع کے ممکنہ حملے کے متوقع جواب میں ایرانی پارلیمنٹ میں "این پی ٹی" سے دستبرداری پر غور شروع ہو گیا ہے جبکہ ایران پہلے ہی قطر کے ذریعے امریکا کو پیغام دے چکا ہے کہ اسرائیلی حملے کے جواب میں غیر روایتی جواب دیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو۔۔۔!

بروز بدھ 13 ربیع الآخر 16/ اکتوبر 2024ء

ایران کے جوہری اہداف پر اسرائیلی حملے کے ممکنہ نتائج

اسرائیل پر ایرانی بیلسٹک میزائلوں کے بعد بڑھتی ہوئی خاموشی کے طوفان میں حیرت انگیز تلاطم جاری ہے اور خطے میں ممکنہ ردِّ عمل کے بارے میں خطرناک قسم کی خبریں بھی گونج رہی ہیں کہ آیا یہ حملہ کیسا اور کس نوعیت کا ہو گا؟ فریقین اب ایک دوسرے کو شدید ترین اور حیران کن جوابات کی دھمکیاں بھی دے رہے ہیں۔ اسرائیلی وزیر دفاع یوو گیلنٹ نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ جب اسرائیل کی طرف سے جوابی کارروائی کی جائے گی تو یہ "باقاعدہ ہدف بناکر کی جائے گی اور ایسی مہلک ہو گی کہ ایران اس کا اندازہ نہیں لگا پائے گا۔ گویا خطے میں ان خطرناک جوابی حملوں کیلئے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے طاقتور ممالک اس دنیا کو تاریک کرنے کی اجازت دیں گے؟

ایرانی حکومت کے مطابق اس کے بیلسٹک میزائل حملے اسرائیل کی طرف سے حزب اللہ کے رہنما حسن نصر اللہ اور حماس کے سیاسی رہنما اسماعیل ہنیہ کے قتل کا جواب تھا، گویا یہ ایران کی طرف سے جنگ بندی کا بھی پیغام تھا لیکن اسرائیل کی طرف سے لبنان اور غزہ میں حملے جاری رہنے کی وجہ سے حزب اللہ نے جوابی وار کرتے ہوئے شمالی اسرائیل میں حیفہ کے جنوب میں تقریباً 33 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبے ایک اہم فوجی آدے بنیامین پر ڈرون حملے میں 4 / اسرائیلی فوجی کے مرنے اور 60 سے زائد شدید زخمی ہونے کی تصدیق خود (آئی ڈی ایف) اسرائیل کی دفاعی ادارے نے تصدیق کر دی ہے۔ حزب اللہ کے میڈیا آفس نے اسرائیلی فوجی اڈے پر ہونے والے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے تل ابیب اور حیفہ کے درمیان واقع علاقے میں اسرائیلی دفاعی افواج (آئی ڈی ایف) گولانی بریگیڈ کے تربیتی کیمپ کو نشانہ بنایا گیا ہے اور یہ حملہ جمعرات کو جنوبی لبنان اور بیروت میں اسرائیلی حملوں کے جواب میں کیا گیا ہے۔

ادھر امریکی وزیر دفاع لائیڈ آسٹن نے اسرائیل کے وزیر دفاع سے ٹیلیفونک رابطہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لبنان میں "اقوام متحدہ کے امن فوج کے دستوں کی حفاظت" کو یقینی بنائے۔ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ کے ایک ترجمان نے بھی ان رپورٹس پر شدید حیرانگی کا ظہار کیا ہے کہ اسرائیل نے جان بوجھ کر جنوبی لبنان میں اقوام متحدہ کے امن مشن کی ایک چوکی پر فائرنگ کی ہے۔ یورپی یونین سمیت سری لنکا نے بھی لبنان میں امن فوج کے دستوں کو نشانہ بنانے کے واقعے کی مذمت کی ہے۔ اسرائیل نے قبل ازیں تسلیم کیا تھا کہ اس کی فوج کی گولیوں سے جنوبی لبنان میں دو امن فوجی زخمی ہوئے ہیں۔ یاد رہے اس سے قبل یونیفیل اپنے بیان میں کہہ چکا ہے کہ ایسا کوئی بھی جان بوجھ کر حملہ بین الاقوامی انسانی قانون کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ ان بگڑتے حالات کے پیشِ نظر ایران نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات رکھنے والی خلیجی ریاستوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسرائیل کے ممکنہ جواب میں اپنی فضائی حدود کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں کیونکہ اسرائیل کی مدد کرنے والا بھی ایرانی ردعمل کا ہدف ہو گا۔

یہ صرف کچھ ایسے عوامل ہیں جن پر امریکا اور اسرائیل کے درمیان اسرائیلی ردعمل کے حوالے سے غور کیا جا رہا ہے۔ واشنگٹن پہلے ہی اعلان کر چکا ہے کہ وہ ایران کی جوہری تنصیبات کے خلاف کسی بھی اسرائیلی اقدام کا مخالف ہے۔ امریکا میں 5 نومبر 2024ء کو صدارتی انتخاب ہو رہے ہیں اور ایسی صورتِ حال میں وائٹ ہاؤس ایرانی تیل کی تنصیبات پر کسی بھی ایسے حملے کا خیر مقدم نہیں کرے گا جس کا اثر تیل کی قیمتوں پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مشرق وسطیٰ کی ایک اور جنگ میں گھسیٹا جانا چاہے گا۔ ادھر دوسری طرف اسرائیل کے اتحادیوں نے رواں برس اپریل میں اسرائیل پر ایرانی حملے کے بعد تحمل کے

مظاہرے پر جس طرح زور دیا تھا وہ اس مرتبہ دکھائی نہیں دے رہا اور مکمل پر اسرا خاموشی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسرائیل کے لبنان، غزہ، یمن اور شام میں اپنے تمام دشمنوں کا ایک ساتھ مقابلہ کرنے کی دھمکیوں کے بعد لگتا ہے کہ نتن یاہو کی حکومت پیچھے ہٹنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

امریکی سیٹلائٹ انٹیلیجنس اور ایران میں موساد کے جاسوسوں کی مدد سے ، اسرائیلی فوج کے پاس انتخاب کرنے کیلئے ایران میں وسیع اہداف موجود ہیں جنہیں چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ اسرائیل کا پہلا اور اہم اہداف ایران کے وہ اڈے ہوں گے جہاں سے ایران نے اسرائیل پر حالیہ بیلسٹک میزائل برسائے گویا ایرانی لانچ پیڈ، کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹرز، ایندھن بھرنے والے ٹینک اور بنکروں میں بنے گودام کو نشانہ بنایا جائے گا۔

☆ اسرائیل اس کے علاوہ پاسداران انقلاب کے اڈوں کے ساتھ ساتھ فضائی دفاع کے نظام اور دیگر میزائل بیٹریوں کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔ وہ ایران میں اپنے جاسوسوں کے ذریعے بیلسٹک میزائل پروگرام میں شامل اہم افراد کو قتل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

☆ اسرائیل ایران کے اقتصادی اہداف کو نشانہ بناتے ہوئے ایران کے پیٹروکیمیکل پلانٹس، اس کی بجلی کی پیداوار کے کارخانے اور ممکنہ طور پر اس کے جہاز رانی کے شعبوں پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔ تاہم یہ ایرانی عوام کی نظر میں ایک انتہائی غیر مقبول اقدام ہو گا کیونکہ اس سے عام لوگوں کی زندگیوں کو فوج پر کسی بھی حملے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچے گا جو یقیناً ایران کو غیر روایتی حملے کی جانب لے جاسکتا ہے۔

☆ کیا اسرائیل ایران کے جوہری پروگرام پر حملہ کر کے دنیا کو اک نئی عالمی جنگ کی طرف کے جانے کی جرأت کرے گا، یہ سب سے بڑا اور اہم قدم ہو گا۔ اقوام متحدہ کا جوہری نگران ادارہ اس معروف حقیقت کی تصدیق کر چکا ہے کہ ایران سول نیوکلیئر پاور کیلئے درکار 20 فیصد سے کہیں زیادہ یورینیم افزودہ کر رہا ہے۔ اسرائیل اور دیگر کو شبہ ہے کہ ایران اس "بریک آوٹ پوائنٹ" تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے جہاں سے وہ بہت قلیل مدت میں جوہری بم بنانے کے قابل ہوسکے۔ اسرائیل کی ایرانی جوہری اہداف کی ممکنہ فہرست میں ایران کے فوجی جوہری پروگرام کا مرکز پارچین، تہران میں بوناب اور رامسر میں ریسرچ ری ایکٹرز کے علاوہ بوشہر، نتنز، اصفہان اور فردو میں اہم جوہری تنصیبات شامل ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اسرائیل کے ان اقدامات کے بعد یقیناً ایرانی ردعمل بھی اس سے کہیں زیادہ شدید ہو گا اور یقیناً اسرائیل اور اس کے اتحادی ایرانی ردعمل کا ناکام بنانے کیلئے بھی سر جوڑ کر بیٹھیں ہوں گے کہ اس خطرناک عمل کا ردعمل دنیا کو تاریک بھی کر سکتا ہے۔ مغرب اور امریکا میں ان خطرناک حالات کے بارے میں سخت تشویش کا عمل شروع ہو چکا ہے اور کثرت رائے کا یہ ماننا ہے کہ ایرانی مؤقف کو تسلیم کرنا چاہئے کہ اس کی جانب سے اسرائیل کے فوجی اہداف پر داغے گئے بیلسٹک میزائلوں کے بعد اب حساب برابر ہو چکا ہے لیکن اگر اسرائیل نے مزید کارروائی کی تو وہ پھر جوابی حملہ کرے گا۔

ایران کے صدر مسعود پیزشکیان کا یہ بیان کہ یہ ہماری صلاحیتوں کی صرف ایک ہلکی جھلک ہے۔ پاسداران انقلاب نے اس پیغام کو تقویت دیتے ہوئے کہا کہ "اگر صیہونی حکومت نے ایران کی کارروائیوں کا جواب دیا تو اسے کچل دینے والے حملوں کا سامنا کرنا پڑے گا"۔ عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کے

مطابق ایران اسرائیل کو فوجی طور پر شکست نہیں دے سکتا۔اس کی فضائیہ پرانی اور خستہ حال ہے،اس کا فضائی دفاع غیر محفوظ ہے اور اسے گزشتہ کئی برسوں سے سخت مغربی پابندیوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے لیکن اس کے پاس اب بھی بیلسٹک اور دیگر میزائلوں کے ساتھ ساتھ دھماکہ خیز مواد سے لدے ڈرونز اور مشرق وسطیٰ میں متعدد اتحادی ملیشیاز (عسکریت پسند گروہ) بھی موجود ہیں۔اس کے میزائل اگلی بار فوجی اڈوں کی بجائے اسرائیلی رہائشی علاقوں کو با آسانی نشانہ بناسکتے ہیں۔2019 میں سعودی عرب کی تیل تنصیبات پر ایران کی حمایت یافتہ ملیشیا کے حملے نے ثابت کر دکھایا تھا کہ ایران کیلئے پڑوسیوں پر حملہ کرنا کتنا آسان ہے۔

پاسدارانِ انقلاب کی بحریہ جو خلیج فارس میں کام کرتی ہے،کے پاس چھوٹی مگر تیزی سے میزائل حملے کرنے والی کشتیوں کے بڑے بیڑے ہیں جو ممکنہ طور پر امریکی بحریہ کے پانچویں بحری بیڑے کو ایک مربوط حملے میں مغلوب کر سکتے ہیں۔اگر اسے ایسا کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ آبنائے ہرمز میں بارودی سرنگیں بچھانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے،جس سے دنیا میں روزانہ کی بنیاد پر تیل کی 20 فیصد برآمدات میں شدید ترین خلل پڑ سکتا ہے،جس کا عالمی معیشت پر تباہ کن بُرا اثر پڑے گا۔اور پھر کویت سے عمان تک خلیج فارس کے عرب کنارے پر اوپر اور نیچے امریکی فوجی اڈے موجود ہیں۔ایران نے متنبہ کیا ہے کہ اگر اس پر حملہ کیا گیا تو وہ صرف اسرائیل پر ہی جوابی حملہ نہیں کرے گا بلکہ وہ اس حملے کی حمایت کرنے والے کسی بھی ملک کو نشانہ بنائے گا۔

یہ صرف کچھ ایسے منظر نامے ہیں جن پر تل ابیب اور واشنگٹن کے دفاعی منصوبہ ساز اب غور کر رہے ہوں گے۔

بروز جمعرات 14 ربیع الآخر/17 اکتوبر 2024ء

تحریک پاکستان کی بنیاد اور اغیار کی سازشیں

پاک وہند کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو غور وفکر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قیام پاکستان کی بنیاد کئی صدیاں پہلے رکھ دی گئی تھی اور بعد ازاں تاریخ حالات کو اس مقصد کے سانچے میں ڈھالتی رہی، اسی لئے بعض مؤرخین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیام پاکستان ناگزیر تھا اور یہ مشیتِ ایزدی تھی۔ غور کیجئے تو صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی سفر کے بعض اہم مقامات اور سنگ میل اس کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستان کی تواریخ میں سے تاریخ فرشتہ کو ایک معتبر حوالہ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ فرشتہ کے صفحہ 101 پر درج شہاب الدین غوری کا لکھا ہوا ایک خط پڑھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ شہاب الدین غوری نے یہ خط ہندوستان کے مشہور ہندو حکمران راجہ پرتھوی راج کے خط کے جواب میں کئی صدیاں قبل 1192ء میں لکھا تھا۔ ترائن کے میدان میں مسلمان اور ہندو افواج ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ پس منظر کے طور پر یہ بات ہمارے ذہنوں میں رہے کہ شہاب الدین غوری دو سال قبل پرتھوی راج سے شکست کھا چکا تھا اور اب ایک فیصلہ کن معرکے کیلئے میدان میں اترا تھا۔ پرتھوری راج ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت کا انتہائی مضبوط ترین اور طاقتور سمبل سمجھا جاتا تھا اور اسے ہندو راجاؤں کی پوری حمایت حاصل تھی۔ جنگ سے قبل غوری نے پرتھوی راج کو باہمی صلح کیلئے جو خط لکھا اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ یا تو موجودہ صوبہ پنجاب، سرحد اور سندھ کے علاقے میرے حوالے کر دو یا پھر فیصلہ کن جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ ان علاقوں کے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ ان میں مسلمان مقابلتاً زیادہ تھے لیکن حکومت کے ظلم وستم کے شکار تھے۔

بلوچستان اس اسکیم میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی مسلمانوں کی حکومت قائم تھی۔ بہر حال پرتھوی راج طاقت کے نشے میں مست تھا۔ اس نے غوری کی صلح کی مشروط پیشکش کو ٹھکرا دیا اور یہ علاقے دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجے کے طور پر جنگ ہوئی جس میں پرتھوی راج اور اس کے سینکڑوں ساتھیوں کو شکست فاش ہوئی جو اپنے اپنے علاقے کی افواج کے ساتھ اپنے دھرم کے مطابق اس مقدس جنگ میں شریک تھے۔ پرتھوی راج مارا گیا، ہندوؤں کی کمر ٹوٹ گئی اور غوری نے اس علاقے پر قبضہ کر کے قطب الدین ایبک کو حکمران نامزد کیا جس نے 1193ء میں دہلی پر قبضہ کر کے ہندوستان میں باقاعدہ ایک مسلمان حکومت کی بنیاد رکھی۔ جنگ ترائن کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے مقدر کا فیصلہ کر دیا اور ایک مسلمان حکومت کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔

غوری کا خط ہمارے لئے غیر معمولی انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے اور انکشاف کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جو گہرے غور وفکر کے متقاضی ہیں لیکن اس موضوع کی طرف بڑھنے سے قبل یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی تھی جو ان علاقوں سے کہیں کم تر رقبے پر محیط تھی۔ محمد بن قاسم 712ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا، فتوحات کرتے کرتے ملتان تک پہنچا اور صرف تین برس کے بعد 715ء میں واپس بلا لیا گیا۔ محمد بن قاسم کی رخصتی کے کچھ ہی عرصہ بعد مسلمان مملکت کمزور ہو گئی اور پھر سرداروں اور حکمرانوں کی بغاوتوں کے سبب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں ایک بڑی اسلامی حکومت کے قیام کا کریڈٹ قطب الدین ایبک کو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں موجودہ پاکستان پر مشتمل 1192ء تک مسلمان آبادی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت قدرے

زیادہ کس طرح ہو گئی جبکہ 1192ء تک یہاں کوئی مستحکم اسلامی حکومت بھی قائم نہیں تھی۔ بلاشبہ مسلمان حملہ آور اس دوران حملہ کرتے رہے اور اکثر اوقات مالِ غنیمت لے کر واپس لوٹ جاتے رہے۔

997ء سے لے کر 1030ء تک محمود غزنوی نے ہندوستان پر 17 حملے کئے جن سے مقامی ہندو ریاستیں کمزور ہوئیں، مسلمان دشمن قوتوں کی کمر ٹوٹی، مسلمانوں کو بالواسطہ تقویت ملی لیکن محمود غزنوی نے بھی ہندوستان میں کسی اسلامی ریاست کی بنیاد نہ رکھی اور اکثر اوقات یہاں سے مالِ غنیمت لے کر واپس وطن لوٹ گیا گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندو اور مغربی مؤرخین کا یہ الزام غلط ہے کہ یہاں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا کیونکہ جنگ ترائن تک ہندوستان میں نہ کوئی اسلامی حکومت موجود تھی اور نہ ہی مسلمانوں کو اتنی طاقت حاصل تھی کہ وہ بزورِ شمشیر اسلام پھیلا سکتے۔ ہوا یوں کہ بہت سے اولیائے کرام، صوفیاء اور صالحین اس عرصے میں ہندوستان آکر آباد ہوئے جن میں خاص طور پر حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش قابل ذکر ہیں جو محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ ان اولیائے کرام کی نگاہ کا فیض تھا کہ مقامی آبادیوں کے دل مسخر ہوتے گئے اور وہ صدیوں کے سفر میں اس طرح حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ 1192ء تک موجودہ سندھ، سرحد اور پنجاب کے علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی مقابلتاً زیادہ ہو گئی اور یوں قیام پاکستان کی راہ ہموار ہوتی گئی۔

اس مسئلے کے منتخب پہلوؤں پر غور کریں تو ان میں بڑی حکمت کے پوشیدہ راز کھلتے ہیں اور مشیت ایزدی کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اولیائے کرام تو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے جن میں دہلی، سرہند اور اجمیر شریف خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ان علاقوں میں مسلمان اکثریت میں کیوں نہ ہو سکے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان ان صوبوں یا علاقوں میں اکثریت میں ہوئے جو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے ملحق اور آپس میں پیوست تھے، ورنہ اگر مسلمان سرحد میں اکثریت میں ہوتے تو پھر یو پی یا ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں اکثریت میں ہوتے تو کیا پاکستان کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا یا اسے منوایا جا سکتا تھا؟ جواب نفی میں ہے کیونکہ پاکستان کے مطالبے کی بنیاد ہی یہی تھی کہ صوبہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان اور بعد ازاں مشرقی بنگال جہاں اکثریت میں ہیں اور جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، ان علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان مملکت قائم کر دی جائے جہاں مسلمان اپنے دین، ثقافت اور مذہب کے مطابق زندگی گزار سکیں، گویا یہ مشیت ایزدی تھی کہ مسلمان ان علاقوں میں اکثریت میں ہوئے جو جغرافیائی طور پر ایک یونٹ تھے۔

اس لحاظ سے پاکستان کی بنیاد اسی وقت رکھ دی گئی جب شہاب الدین غوری نے صلح کیلئے پرتھوی راج سے ان علاقوں کا مطالبہ کیا۔ اسی پس منظر میں حضرت قائداعظم نے علی گڑھ میں 1944ء میں خطاب کے دوران کہا تھا کہ پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن ہندوستان کی سرزمین پر پہلے مسلمان نے قدم رکھا کیونکہ مسلمان ایک مخصوص انداز زندگی، ایک منفرد کلچر اور سوچ کی نمائندگی کرتا ہے جو ہر لحاظ سے ہندوستان کی دوسری اقوام سے مختلف اور الگ ہے اور "یہ تاریخی جملہ قائداعظم نے اس لئے کہا تھا کہ ہندو مذہب میں جو بچہ جس گھر میں پیدا ہوتا ہے اس کی شناخت اپنے باپ کے مذہب سے پہچانی جاتی ہے اور یہ مذہبی طبقاتی تقسیم نے ہندوؤں کے درمیان نفرت اور تذلیل کی ایک گہری خلیج حائل کر رکھی ہے لیکن جس دن ہندوستان میں رہنے والے پہلے شخص نے اسلام کے الہامی دین کو قبول کیا تو گویا اس نے مکمل طور پر اپنی پرانی شناخت سے ناطہ توڑ کر ایک ایسے مذہب کو قبول کر لیا جس نے اس کے زندگی کے تمام ضابطہ حیات کو ہندوؤں سے بالکل الگ کر دیا۔

مجھے ہندوستان کی تاریخ میں مسلمان اور اسلام میں گہرا ربط نظر آتا ہے اور وہ یوں کہ جب بھی اسلام کو کوئی چیلنج درپیش ہوا یا مسلمانوں کے وجود کو صحیح معنوں میں کسی خطرے کا سامنا ہوا تو ایسی قوتیں نمودار ہوئیں جنہوں نے ان چیلنجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو ان سے بچانے کیلئے تحریکیں چلائیں۔ تاریخی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں نے 680 برس تک حکومت کی اور ان کے کل 76 بادشاہ ہوئے۔ سب سے طاقتور حکومت مغلیہ خاندان کی سمجھی جاتی ہے جس کے دور میں اکبر کے دین الٰہی کی صورت میں ہندوستان میں اسلام کو سب سے پہلے ایک سنجیدہ چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت مجدد الف ثانی اکبر کے دین الٰہی کی راہ میں سدِ سکندری بنے اور انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ مغلیہ خاندان کی حکومت ماسوائے اورنگزیب عالمگیر کے، ایک لبرل حکومت سمجھی جاتی ہے جس کے کم از کم دو یا تین بادشاہ ہندو ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس تناظر میں مغلیہ خاندان نے ہندوستان میں اسلام کی کیا خدمت کرنی تھی۔ اسلام تو اندر ہی اندر اولیائے اکرام، صوفیا اور اہل نظر کی برکت سے پھیلتا رہا۔

اورنگزیب عالمگیر کا انتقال 1707ء میں ہوا اور اس کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی مسلمانوں کیلئے انتہائی ابتلا کا دور تھا کیونکہ اس دوران مسلمان حکومتیں گرنے لگیں، مختلف علاقوں پر مسلمان دشمن قوتیں قابض ہو گئیں اور مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے۔ انگریز اکبر کے دور میں تجارتی مقاصد کے پیش نظر ہندوستان میں آئے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پھیلاتے رہے، اثر و رسوخ میں اضافہ کرتے رہے اور اپنی عسکری قوت بڑھاتے رہے چنانچہ انگریزوں نے 1757ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا، 1799ء میں ٹیپو سلطان کو شکست دے کر اس کی سلطنت پر قابض ہو گئے تھے، 1764ء میں بکسر کی لڑائی میں مغل بادشاہ شاہ عالم کی شکست کے بعد دہلی کی حکومت بھی انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہو گئی، 1808ء میں رنجیت سنگھ نے پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد ڈالی اور پنجاب میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا، حتیٰ کہ شاہی مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا۔

مسلمانوں کے اس تنزل اور ابتلا کے دور میں شاہ ولی اللہ نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی، مسلمانوں میں جہاد بیدار کرنے کیلئے منظم پروگرام شروع کیا، مسلمان دشمن قوتوں کو کمزور کرنے کیلئے احمد شاہ ابدالی کو حملے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان سرداروں کو خطوط لکھے جن کے مطالعے سے مسلمانوں کی نفسیات اور سوچ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خطوط کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اور اسلام کی بقا کیلئے کچھ علاقوں میں مسلمان حکومتوں کا قیام ضروری ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سوچ تحریک پاکستان کی بنیاد بنی، یہی بات علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد اور قائداعظم کے نام خطوط میں بار بار کہی اور خود قائداعظم بھی اکثر اوقات اس سوچ کا اظہار کرتے رہے۔ دراصل یہ وہ خواب تھا جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد ان کے قومی اور اجتماعی لاشعور میں پلتا رہا اور بالآخر اسی خواب کی تعبیر ان کو مطالبہ پاکستان میں نظر آئی۔

شاہ ولی اللہ کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور سید احمد شہید نے پنجاب کے مسلمانوں کو رنجیت سنگھ کے مظالم سے نجات دلانے کیلئے جہاد کا آغاز کیا۔ 1826ء میں جہادی قافلے صوبہ سرحد کی جانب روانہ ہوئے۔ مجاہدین نے پہلا اور دوسرا مقابلہ جیت کر سرحد پر قبضہ کر لیا، 1827ء میں سید احمد شہید صوبہ سرحد کے امیر المومنین مقرر ہوئے اور انہوں نے شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ رنجیت سنگھ خود پشاور پہنچا اور کچھ قبائلی سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا جن میں یار محمد اور سلطان محمد قابل ذکر ہیں۔ بالاکوٹ کے فیصلہ کن معرکے میں یار محمد مجاہدین کو عین جنگ کے دوران چھوڑ گیا، اپنے باورچیوں کے ذریعے شاہ صاحب کو زہر دلوا دیا۔ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید ہو گئے، یوں شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کا آغاز 1731ء میں کیا تھا وہ ایک صدی کے بعد 1831ء میں ختم ہو گئی۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کا ارادہ تھا کہ وہ اس خطے کے مسلمانوں کو سکھوں سے نجات دلا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے لیکن ان کا یہ خواب ادھورا رہا۔ اسے کسی اور شکل و صورت میں کسی اور طریقے سے شرمندہ تعبیر ہونا تھا، قدرت کو یہی منظور تھا۔ دوسری طرف انگریز آہستہ آہستہ اپنا جال پھیلا رہے تھے اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کیلئے شاطرانہ چالیں چل رہے تھے۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور شاہ عالم کی فوجوں کو شکست دینے کے بعد وہ ایک مؤثر عسکری قوت بن کر ابھر چکے تھے، انگریزوں نے اسی حکمت عملی کے تحت 1843ء میں سندھ کا الحاق اور 29 مارچ 1849ء کو پنجاب کا اپنے ساتھ الحاق کر کے ان صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ 1856ء میں انگریزوں نے اودھ کے فرمانروا واجد علی کے سسر اور وزیراعظم میر علی نقی کو اپنے ساتھ ملا کر واجد علی سے دستخط کروا کر اودھ پر قبضہ کر لیا اور میر واجد کو کلکتہ کے مٹیابُرج میں قید کر دیا۔

ایک مورخ کے بقول تین میروں نے ہندوستان میں مسلمان مملکتوں کے مقدر کا فیصلہ کر دیا۔ میر جعفر نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ سے غداری کر کے مسلمانوں کو بنگال کی حکومت سے محروم کر دیا، میر صادق نے ٹیپو سلطان سے غداری کر کے مسلمانوں کو میسور کی مملکت میں حکمران سے غلام بنا دیا اور میر علی نقی نے میر واجد سے دستخط کروا کر اودھ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت مضبوط بنانے اور سرحد میں مجاہدین سے گفت و شنید اور ان کی شکست میں لاہور کی فقیر فیملی کے ایک سربراہ کا بھی مؤرخین ذکر کرتے ہیں جسے رنجیت سنگھ کے دربار میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ انتہائی مشہور شخصیت معیز الدین احمد فرزند مولانا صلاح الدین احمد مرحوم تو دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے پنجاب سیکرٹریٹ کے قلعہ انار کلی (آرکائیوز) میں محفوظ پنجاب کے انگریز حاکم کا وہ فرمان اپنے آنکھوں سے پڑھا ہے جس کے مطابق لاہور کے ایک معروف خاندان کو فوری طور پر سید ہونے کا تاج پہنایا گیا تھا، یاد رہے کہ انگریزی زبان کے سرکاری حکم ناموں میں "امیجئیٹ افیکٹ" کے الفاظ ضرور استعمال ہوتے ہیں جس کا ترجمہ "فوری طور پر" ہوتا ہے۔

1857ء کی جنگ آزدی کی ناکامی کے بعد انگریز ہندوستان پر چھا گئے، انگریز آئے تو اپنے ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، مواصلات، ریلوے، ماڈرن ایجوکیشن، اور ایک سیاسی کلچر بھی لائے۔ انگریزوں کی پالیسیوں کے سبب ہندوستان میں نیشنلزم کا شعور مضبوط ہوا، سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئیں، حق رائے دہی اور انتخابات کا ذکر ہونے لگا جس سے محدود جمہوریت اور پھر اکثریت و اقلیت کے احساس نے جنم لیا۔

اس صورتحال کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ اقلیت ہونے کے سبب ہمیشہ ہمیشہ اکثریت کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے، انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ چونکہ وہ اپنے مذہب، ثقافت، تاریخی پس منظر اور قومی سوچ کے حوالے سے ایک علیحدہ قوم ہیں، اس لئے انہیں ایک علیحدہ وطن کے حصول کیلئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید احمد خان سے لیکر قائداعظم تک تقریباً سبھی مسلمان لیڈروں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کیا لیکن انہوں نے ہندو ذہنی رویے اور تنگ نظری کو قریب سے دیکھ کر اپنی راہیں الگ کر لیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا اہم ترین سنگ میل لکھنؤ پیکٹ 1916ء تھا جس کا خواب 1928ء میں نہرو رپورٹ نے پاش پاش کر دیا حتیٰ کہ

قائداعظم جیسے مستقل مزاج انسان کو یہ بھی کہنا پڑا کہ اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد 1930ء نے مسلمانوں کو نئی سوچ دی اور ان میں منزل کا شعور بیدار کیا جبکہ 1935ء کے انتخابات کے نتیجے کے طور پر 1937ء میں چھ صوبوں میں کانگریس کی حکمرانی نے مسلمان عوام کی آنکھیں کھول دیں۔ ان واقعات نے قراردادِ پاکستان کی راہ ہموار کی اور 1940ء میں مسلمانانِ ہند نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک علیحدہ اور آزاد وطن کا مطالبہ کر دیا۔

اس کے بعد برطانوی حکومت نے "مسئلہ ہند" کا حل ڈھونڈنے کیلئے بہت سی کوششیں کیں جن کی تفصیل کتابوں میں محفوظ ہے لیکن ساری کوششیں اور اسکیمیں ایک ایک کر کے ناکام ہو گئیں۔ سیاسی پیش رفت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے روحانی اشارے بھی ملتے ہیں جو مشیت ایزدی کی جھلک دکھاتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی مفسر قرآن، عاشق رسول ﷺ اور روحانی شخصیت تھے۔ ان کے مریدوں اور چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ ایسے فقیر منش اور صوفی انسان سے آپ صرف حق گوئی کی توقع کر سکتے ہیں۔ حضرت تھانوی کے خواہر زادے مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نے مجھے طلب فرمایا اور بتایا:

"میں بہت کم خواب دیکھتا ہوں مگر آج میں نے عجیب سا خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا میدان حشر ہے۔ اس میں اولیاء و صلحاء کرام، علماء کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اس مجمع میں عربی لباس پہنے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھے بتایا گیا کہ محمد علی جناح آج کل "اسلام" کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے"۔
(بحوالہ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی از منشی عبدالرحمٰن ادارہ اسلامیات لاہور 1992ء صفحہ 92) 4 جولائی 1943ء کو حضرت تھانوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی دونوں کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا، 1940ء کی قرارداد پاکستان کو کامیابی نصیب ہو گی، میرا وقتِ آخر ہے اگر میں زندہ رہتا تو ضرور اس عظیم مقصد کی کامیابی کیلئے کام کرتا، مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ وطن بنے۔ قیام پاکستان کیلئے جو کچھ ہو سکے کرنا، اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر ابھارنا، تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا"۔ (بحوالہ قائداعظم کا مذہب وعقیدہ از منشی عبدالرحمٰن صفحہ 249) اور قائداعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو از حبیب اللہ (1948)۔ قائداعظم کی نماز جنازہ کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔

مولانا حسرت موہانی ایک مردِ درویش، بے لوث عظیم اور بہادر انسان تھے، زندگی کا خاصا حصہ انگریزی راج کے خلاف جدوجہد کرنے کی سزا کے طور پر جیلوں میں گزار دیا اور اکثر اوقات سزا بامشقت پائی اس ضمن میں ان کا یہ شعر زبان زد عام ہے۔

اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

مولانا حسرت موہانی نے مسلم لیگ کے کئی اجلاسوں کی صدارت فرمائی اور اتنے دبنگ انسان تھے کہ مسلم لیگ کونسل کے بھرے اجلاس میں اٹھ کر قائداعظم کی پالیسیوں پر تنقید کرتے اور خود قائداعظم ان کا بے حد احترام کرتے تھے، یہاں قائداعظم کے جمہوری مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غربت کے باوجود گیارہ حج اور بہت سے عمرے نصیب کئے۔ مولانا نے زندگی کا بقیہ حصہ مسلم لیگ میں رہ کر حصول پاکستان کیلئے دن رات جدوجہد میں گزار دیا لیکن قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی کیونکہ ان کی جدوجہد ذات کیلئے نہیں بلکہ قوم وملت کیلئے تھی۔ محترم ظہیر

الاسلام فاروقی ایڈووکیٹ اپنی کتاب "مقصد پاکستان" (لاہور 1981ء) میں رقمطراز ہیں "1946ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں تھا۔ ٹرین میں پیر سید علی محمد راشدی کے ساتھ مولانا حسرت موہانی بھی ہم سفر تھے۔ راشدی صاحب نے مولانا حسرت موہانی صاحب سے پوچھا کہ "کیا مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان مان لیا جائے گا؟" مولانا حسرت موہانی مرحوم نے جواب میں کہا کہ "پاکستان تو بن جائے گا آگے کی فکر کرو" پھر کہا۔ میں نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا آنحضور ﷺ نے خود اس کی بشارت دی، بعد ازاں میں نے دیوان حافظ سے فال نکالی اور اس کی تضمین میں یہ اشعار کہے۔

جبکہ حافظ بھی مصدق ہو بہ فال دیواں

جب کہے خواب میں خود آکے وہ شاہِ خوباں

تجھ کو حسرت یہ مبارک، سند و مہر و نشاں

پردہ بردار کہ تا سجدہ کنند جملہ جہاں

مولانا حسین احمد کانگریس کے ممتاز لیڈر اور تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے جن کے بارے میں یہ واقعہ میں نے کئی بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ 46-1945 کے انتخابات کے ضمن میں کانگریس کیلئے ووٹ مانگنے کی غرض سے بنگال کا دورہ کر رہے تھے۔ ان کے ہمراہ بہت سے مریدان اور سیاسی کارکن بھی تھے ۔ اس انتخابی مہم کے دوران ایک دن انہوں نے نماز فجر ادا کی، امامت کے بعد اپنے محدود حلقے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج رات مجھے نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے، جب مولانا مدنی یہ کہہ چکے تو ایک مرید اٹھا اور اس نے کہا کہ حضرت چلئے اور مسلم لیگ کا ساتھ دیجئے اب اس کے بعد کانگریس کیلئے انتخابی مہم چلانے کا کوئی جواز نہیں، اس کے جواب میں مولانا مدنی نے کہا کہ دینی معاملات میں حضور ﷺ کی پیروی فرض ہے لیکن تکوینی وسیاسی معاملات میں نہیں۔ اب اصحابِ نظر خود ہی اندازہ لگالیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خواب میں پاکستان کی بشارت بھی دی لیکن اس کے باوجود اپنے سیاسی نظریات پر قائم رہے اور ان افراد کی بھی خبر لینے کی ضرورت ہے جو بھارت کی سرزمین پر کھڑے ہو کر یہ برملا کہتے ہیں کہ ہم نے پاکستان بنانے کی غلطی میں حصہ نہیں لیا لیکن اب پاکستان کی سیاست کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے مفاد سے لطف اندوز بھی ہو رہے ہیں۔

اس ضمن میں بہت سے واقعات مشہور ہیں لیکن میں نے صرف ان ہستیوں کے حوالے دیئے ہیں جن کی امانت و دیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ سیاسی محاذ کی پیش رفت بھی قابل غور ہے اور کچھ ایسے ہی اشارے دیتی ہے کہ انگریز بہر حال ہندوستان کو متحدہ رکھنا چاہتے تھے اور وہ اسی فریم ورک میں ہندوستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے سرگرداں تھے۔ اس ضمن میں بہت سی کوششیں کی گئی لیکن مشیت ایزدی یہی تھی کہ وہ بارآور نہ ہوں، یہاں کابینہ مشن پلان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسے مسلم لیگ نے قبول کر لیا تھا اور یوں حصول پاکستان دس برس کیلئے ملتوی ہو سکتا تھا کیونکہ کابینہ پلان کے مطابق مختلف گروپ دس سال کے بعد اس انتظام سے باہر نکل سکتے تھے۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ پاکستان کا قیام دس سال کیلئے ملتوی نہ ہو چنانچہ کانگریس نے اس پلان کو مسترد کر دیا اور یوں انگریزوں کے پاس ہندستان کو تقسیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔

تقسیم ہند کے اس پہلو پر بھی ذرا غور کیجئے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو جون 1948ء میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو 11 فروری 1947ء کو وائسرائے مقرر کیا گیا اور بعد ازاں ماؤنٹ بیٹن 20 مارچ 1947ء میں وائسرائے بن کر آیا تو حالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچا کہ تقسیم

کو زیادہ عرصے تک لٹکائے رکھنا نہایت خطرناک ہو گا چنانچہ اس نے برطانوی حکومت کو قائل کیا کہ ہندوستان کو جلد از جلد تقسیم کر کے آزادی دے دی جائے۔ یوں اعلان آزادی اور قیام پاکستان کیلئے 14 / اور 15 / اگست کی نصف شب کا انتخاب کیا گیا جو مسلمانان پاکستان کیلئے نہایت نیک شگون، مبارک مشیت ایزدی کا واضح اشارہ تھا کیونکہ رات "شب قدر" کی تھی، یہ مہینہ رمضان المبارک کا تھا اور 15 / اگست ہمارا پہلا یوم اور صاحبانِ نظر و باطن کیلئے پاکستان جمعتہ الوداع کے روز منایا جاتا تھا۔ یہ رمزیں صرف رمز شناس ہی سمجھ سکتے ہیں، اور یہ اشارے صرف ان کیلئے ہوتے ہیں جن کے باطن منور اور دل شفاف ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے توہم پرستی، رجعت پسندی اور ضعیف الاعتقادی کا طعنہ دے دیں لیکن مجھے تو یہ اشارے غور و فکر کا سامان لگتے ہیں۔ میں ایک ایسے شخص کو جو دنیاوی معیار کے مطابق نہایت پڑھا لکھا تھا، یہ سمجھانے کی کوششیں کر رہا تھا کہ پاکستان ایک منفرد قسم کا ملک ہے اور اگر آپ اس کے خمیر اور ضمیر میں جھانکیں تو غور و فکر کا بے پناہ ساماں ملتا ہے کہ اسے کس طرح مشیت ایزدی نے صدیوں تک تاریخ کے سانچے میں ڈھالا اور پھر دنیائے اسلام کا سب سے بڑا اسلامی ملک بنا کر دنیا کے نقشے پر ابھارا۔ اس تناظر میں ان کا یہ سوال ایک فطری رد عمل تھا کہ پھر 1971ء میں پاکستان کیوں ٹوٹ گیا؟ اقبال کے الفاظ میں تو اس سوال کا جواب کچھ یوں ہے۔

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

اگر آپ کو قدرت کی جانب سے ایک تحفہ یا انعام عظیم ملے تو اس کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں اور اگر آپ وہ تقاضے پورے نہ کریں تو پھر وارننگ ملتی ہے اور کبھی کبھی سزا بھی، مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی صورت میں ہمیں ایک انعام عظیم بخشا جو ہماری کوتاہیوں، کم نظری، سیاسی ہوس اور نالائقی سے نصف رہ گیا البتہ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ مشرقی پاکستان آج بھی مشرقی پاکستان ہے صرف ان کا نام بدلا ہے، وہ اپنے مزاج، ہندو دشمنی، اسلامی پس منظر اور فکر و نگاہ کے حوالے سے اب بھی مشرقی پاکستان ہی ہے اور اسے قدرت کا کرشمہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ اسی مبارک مہینے کی 5 / اگست 2024ء کو ایک ایسا انقلاب دیکھنے کو ملا کہ خونی حسینہ ڈائن بھاگ کر واپس اپنے انہی ہندو آقاؤں کے جوتے چاٹنے کیلئے پہنچ گئی اور اس کے بنائے ہوئے باپ کے بُتوں کو سر عام لوگوں نے پاش پاش کر دیا اور جوتوں کی بارش کر دی۔ آج اسی ڈائن کو امریکا اور برطانیہ نے بھی پناہ دینے سے انکار کر دیا ہے اور اقوام متحدہ نے اس کو ہونے والے تمام قتل وغارت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے عالمی طور پر تحقیق کا مطالبہ کیا ہے۔ مودی سرکار کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہیں اور ہنگامی اجلاس بلا کر بالآخر آئی ایس آئی کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے لیکن اس سانحے میں بھی ایک ایسا نقطہ پنہاں ہے جس پر غور کریں تو حیران کن اشارے ملتے ہیں اور فہم و فراست کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

کریں کہ ذرا غور کیجئے کہ بظاہر پاکستان توڑنے کی ذمہ داری تین سیاسی کرداروں پر عائد کی جاتی ہے جبکہ چوتھا کردار فوجی تھا۔ ذرا قدرت کے انتقام پر غور رہا چوتھا فوجی وہ تینوں سیاسی کردار یعنی اندرا گاندھی، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو غیر فطری موت کا نشانہ بن کر عبرت کی داستانیں چھوڑ گئے، کردار یحییٰ خان تو وہ بھی گھر کی قید میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا، اور اپنے پیچھے عبرت کی کہانیاں چھوڑ گیا۔ عالمی تاریخ گواہ ہے کہ ملک بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں، سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں اور قوموں کے جغرافئے بھی بدلتے رہتے ہیں، ابھی کل کی بات ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے "یو ایس ایس آر" روس نامی ایک سپر پاور ٹوٹ کر کئی آزاد مسلم ممالک کو جنم دیا، پولینڈ، بوسنیا اور سربیا وغیرہ کی تاریخ ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے لیکن مجھے عالمی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملی جہاں ملک ٹوٹنے پر کسی گوربا چوف کو پھانسی چڑھایا گیا ہو یا کسی ذمہ دار کو سبق آموز سزا ملی ہو جبکہ پاکستان میں قدرت کا یہ انتقام صرف

ایک نسل تک محدود نہیں رہا اور اب اس کی تازہ ترین مثال اس کی بیٹی حسینہ واجد کا فرار اور مجیب الرحمان کے بت کا جو حشر ہوا ہے، وہ سب کیلئے باعثِ عبرت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ غور کرنے والوں کیلئے اس میں عبرت کا بے پناہ ساماں موجود ہے، کبھی آپ نے غور کیا کہ پاکستان توڑنے والے تین کرداروں (مجیب الرحمان، اندار گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو) کی غیر فطری اور عبرت ناک اموات کے بعد ان کی آئندہ نسل میں سے بھی کسی مرد کو فطری موت نصیب نہیں ہوئی، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقیہ ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ اتفاق صرف سقوط مشرقی پاکستان کے تین کرداروں کے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ پھر سبھی کرداروں کے ساتھ کیوں ہوا؟ میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ قیام پاکستان کی تاریخ میں مشیت ایزدی کے واضح اشارے ملتے ہیں اور اس کی بشارت ہمارے نبی کریم ﷺ نے کئی بار دی تھی، اس لئے جو بھی اس ملک کی صحیح معنوں میں خدمت کرے گا وہ اس دنیا میں اور اگلے جہان میں بھی عزت پائے گا اور جو اسے کسی بھی طرح نقصان پہنچائے گا وہ یہاں اور وہاں بھی ذلیل و خوار ہو گا۔

کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی تو نہیں بس نام رہے گا اللہ کا!

انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردوں میں دن کی روشنی بھی ہے

بروز ہفتہ 16 ربیع الآخر 19/ اکتوبر 2024ء

عالمی طاقتوں کی مداخلت اور مظالم کی داستان

کوئی امریکا سے پوچھے کہ سات سمندر پار سے ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے کبھی مشرق وسطی کبھی خلیج کی ریاستوں کبھی جنوبی ایشیا اور سینٹرل ایشیا میں لاؤلشکر اور سازشیں لیکر کیوں نازل ہوتا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ موت فروخت کرنے اور زندگی خریدنے آتا ہے۔اس خواہش میں مہم جوئی توسیع پسندی مجرمانہ کاروبار طاقت کا بیجا استعمال اور مذہبی جنونیت کا عنصر بھی شامل ہے اگر امریکا کو انسان اور انسانیت امن وآشتی سے الفت ہوتی، اگر اسے غربت جہالت مفلسی بیماری سے نفرت ہوتی تو یہ دنیا جنت کا نظارہ پیش کر رہی ہوتی۔ان مقاصد کو پانے کیلئے جنگ وجدال، آگ وخون کے سمندر سے دنیا کو نہیں گزرنا پڑتا، نہ گولہ بارود کی ضرورت ہوتی بس صرف جیو اور جینے دو، انسان اور انسانیت کے اعلی اصولوں کی پاسداری طاقتور اور کمزور کا برابری کی بنیاد پر احترام بلاامتیاز رنگ ونسل ومذہب، باہمی احترام کسی قوم کی آزادی اس کی سرحدوں کے تقدس کو تسلیم کرنا بنیادی شرائط ہیں اوایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنا بہت ضروری ہے مگر موت کا سوداگر اور زندگی کا خریدار نام نہاد امن وآشتی کے دعویدار ہے جس نے اپنے ملک کے چاروں طرف طویل اور دیو قامت حفاظتی دیواریں اور فصیلیں بنا رکھی ہیں، اس میں بسنے والے انسان بھی نظر آتے ہیں اور انسانیت سے بھی واقف ہیں، آزاد بھی ہیں اور گولہ بارود کے زہر سے محفوظ بھی۔غریب بھوک وافلاس وبیماری کے مارے کمزور ناتواں انسان اور ممالک بچارے کیا ان کی سرحدوں میں دراندازی کر سکیں گے۔یہ قوت توان شکار کی تلاش میں محوپرواز عقابوں کو حاصل ہے جو جہاں چاہیں حملہ آور ہو جائیں اور انسان اور انسانیت کے جسم سے بوٹی بوٹی نوچ لیں۔

خونی عقابوں کا ٹولہ جو ننگے بھوکے انسانوں کی لاش کو گولہ بارود میں بھون کر نوچنے والے دہشتگرد عقاب اپنے ہی ہاتھوں ستائے ہوئے انسانوں میں دہشتگرد تلاش کر کے شکار کرنے پر آمادہ اور بضد ہیں۔ان دہشتگرد عقابوں کے اپنے بھی کوئی اصول نہیں ہیں اور شکار کی تلاش میں کبھی خود بھی دست وگریباں ہوتے رہے ہیں۔1950 میں برطانیہ فرانس اور امریکا نے ایک سہ فریقی معاہدہ کیا تھا جس کے تحت مشرق وسطی کی تمام سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت اس شرط پر دی گئی تھی کہ کوئی فریق جارحیت کا ارتکاب نہیں کرے گا مگر حرص وہوس کے مارے مغرب کو کہاں قرار۔6 سال ہی اس معاہدے کو گزرے تھے کہ برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کر دیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔سردست امریکا اور اس کے موجودہ اتحادیوں کے تین بنیادی مفادات زیرِ قلم ہیں۔

پہلا مفاد یہ ہے کہ خلیج کے ممالک سے جہاں سے دنیا کی ساٹھ فیصد تیل کی ضرورت پوری ہوتی ہے ان کے وسائل پر قبضہ کر کے اس علاقہ میں ان کی اجارہ داری قائم ہو۔(اس دوڑ میں سوویت یونین بھی شامل رہا ہے)امریکی پالیسی کے تحت امریکا اسرائیل کی سلامتی کی ضمانت فراہم کرنے کے علاوہ اس کی آزادی اور وجود کو اس قدر مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ اسرائیل کے خوف سے عرب ممالک پریشان اور دبے رہیں اور اس کی آڑ میں امریکی پالیسوں کو عربوں پر مسلط کیا جاتا رہے، جبکہ دوسری حکمت عملی یہ ہے کہ بعض عرب ریاستیں جن میں سعودی عرب، مصر، اردن اور خلیج کی دیگر بادشاہت اور حاکمیت پر مشتمل ریاستوں کے اقدار کے تحفظ اور اسرائیلی خوف سے نجات دلانے کی یقین دہانی پر نام نہاد دوستی کے نام پر امریکا نے ان کی معیشت اقتصادیات اور دفاعی شعبوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے، سلامتی کے خوف میں مبتلا سعودی عرب سمیت دیگر خلیجی ریاستوں میں امریکی فوجیں موجود ہیں۔ایک طرف امریکی فوجوں اور ساماں حرب کے اخراجات ان ممالک کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں تو دوسری طرف امریکی فوجوں کی ان

ریاستوں میں موجودگی اسرائیل کیلئے تحفظ اور سلامتی کا باعث ہیں۔

ایران میں انقلاب کے بعد امریکا اپنے ایک معتمد سے محروم ہوگیا۔ اس تبدیلی کے باعث امریکا نے سریع الحرکت فوج تیار کی جس کا مقصد خلیج اور ساری دنیا میں اپنے مفادات کا تحفظ بذریعہ طاقت کرنا تھا۔ عراق، شام، لبنان امریکی تسلط سے آزاد مگر سوویت یونین کے زیر اثر تھے۔ ایران کو کھونے کے بعد امریکا نے عراق کو اپنے حصار میں لے لیا چونکہ ایران عراق میں سرحدی و دیگر ایشوز پر شدید اور دیرینہ اختلافات اور تنازعات تھے، امریکا نے اس کا فائدہ اٹھا کر ایران کے انقلاب کو ناکام بنانے کیلئے دونوں میں جنگ کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ 8 سالہ عراق ایران جنگ نے دونوں ملکوں کو شدید جانی و مالی نقصانات سے دوچار کیا جبکہ اسلحہ ساز فیکٹریاں رکھنے والے امریکا سمیت دیگر ممالک نے ان دونوں ممالک کو 83 بلین ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔

ایران کو بھی سرحدی تنازعات اور دیگر دعوں کی تکمیل کی صورت صدامی اقتدار کے خاتمے میں نظر آئی۔ جنگ کی بساط بچھائی گئی۔ خلیج کی ریاستوں کو عدم تعاون کا سگنل دیا گیا، خلیج سے باہر اسلامی ملکوں کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی یا غیر جانب دار رہنے کو کہا گیا۔ مغربی اتحادیوں کے یہاں جنگ کا طبل بجایا گیا۔ ریہرسل شروع کر دی گئی۔ خلیجی ریاستوں کو اپنے تحفظ کے نام پر اسلحہ خریدنے کا حکم دیا گیا۔ اس خلیجی جنگ کی وجہ سے امریکی دفاعی صنعتوں کو تقریبا 210 بلین ڈالر صرف خلیجی ممالک کی طرف سے ملے تھے جس میں سعودی عرب نے تقریباً 60 بلین ڈالر کا اسلحہ امریکا سے خریدا اور ٹرمپ کے دورِ حکومت میں 300 بلین ڈالر کے معاہدوں پر دستخط کر کے اسلحہ ساز کمپنیوں کو نئی زندگی عطا کر دی گئی۔

امریکی ایما پر اسرائیل عراق سے چھیڑ چھاڑ اور فلسطینیوں پر مظالم کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ ماسوائے دو تین ممالک کے تمام خلیجی ریاستیں عراق کے خلاف امریکا کے پہلو میں کھڑی تھیں۔

امریکی ایما پر کردوں کی تحریک میں تیزی آچکی تھی۔ امریکی خفیہ ایجنسیاں اور ادارے فرقہ وارانہ صوبائیت لسانیت اور علاقائیت کے سوئے ہوئے فتنے کو جگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ عراقی تینوں افواج میں نفاق کی سازشیں کامیاب ہو چکی تھیں، سیکولرازم اور اشتراکیت کا پرچار کرنے والے صدام حسین کا خیال تھا کہ وہ مختلف المذاہب اور فرقہ واریت اور صوبائیت کے فتنے کو ختم کر کے ایک عراقی قوم پرست عوام تیار کر چکے ہیں۔

ادھر بش نے جنوری 2002 کے اسٹیٹ آف دی یونین خطاب میں عراق پر حملے کیلئے جواز پیش کرتے ہوئے عراق کو بدی کا محور قرار دیتے ہوئے الزام لگایا کہ عراق کے پاس دنیا کے سب سے زیادہ تباہ کن ہتھیار ہیں جبکہ خود امریکا کی سپیکر پیلوسی نے بش کو عراق کے خلاف فوجی طاقت استعمال کرنے کی اجازت دینے والی عراقی قرارداد کی مخالفت کی تھی۔ بش کے سب سے بڑے اتحادی برطانوی وزیر اعظم نے اپنے دورِ اقتدار کے پہلے چھ سالوں میں برطانوی فوجیوں کو پانچ بار لڑائی کا حکم دیا، جو برطانوی تاریخ میں کسی بھی دوسرے وزیر اعظم سے زیادہ تھا۔ اس میں 1998 اور 2003 دونوں میں عراق، کوسوو (1999)، سیرالیون (2000) اور افغانستان (2001) شامل تھے جبکہ اس وقت کے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے بھی عراق پر حملے کو غیر قانونی قرار دیا بلکہ جنیوا میں انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹ کے مطابق، عراق پر حملہ نہ تو مسلح حملے کے خلاف اپنے دفاع میں تھا اور نہ

ہی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کے ذریعے طاقت کے استعمال کی اجازت دی گئی تھی اور اس طرح اسے جارحیت کی جنگ کا جرم قرار دیا گیا تھا ۔ عراقی جنگ میں 4.7 ملین لوگ مارے گئے، عراق کے 450 بلین ڈالر کا پٹرول چرا لیا گیا۔ خود 2020 میں، نیٹا کرافورڈ، بوسٹن یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات کی سربراہ نے عراق جنگ کی طویل مدتی لاگت کا تخمینہ 1.922 ٹریلین ڈالر لگایا تھا۔

امریکا جو عراق پر ایٹمی و کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کا الزام لگا کر (جو کبھی برآمد نہ ہو سکا) اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوا، اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی پورا عراق آگ و خون میں نہلا دیا گیا۔ ہزاروں عراقی بلا امتیاز بوڑھے، جوان بچے خواتین بے رحمی سے شہید کر دیئے گئے، مقدس مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ مظالم کے ایسے خوفناک پہاڑ توڑے گئے کہ ساری دنیا نے ابو غریب جیل میں مسلمانوں کی غیرت کے جنازے نکلتے دیکھے اور عراق کی افواج نے صدام حسین سے غداری کی۔ تمام جہاز، میزائل اور سامان حرب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ امریکا کو لتاڑنے پر صدام حسین کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا لیکن دنیا نے دیکھا کہ بعد ازاں امریکی خارجہ سیکرٹری کولن پاؤل اور ٹونی بلئیر کو عراقی جنگ پر معافی مانگنا پڑی لیکن سوال یہ ہے کہ اس تمام تباہی کے ذمہ داروں کو عالمی عدالت کے کٹہرے میں کیوں پیش نہیں کیا گیا۔

معاملہ یہی ختم نہیں ہوا بلکہ جونہی تین دہائیوں کے بعد مصر میں منتخب حکومت نے اپنی خود مختاری کا جونہی احساس دلایا فوری طور پر اس کا دھڑن تختہ کر کے اپنا نمائندہ سامنے لے آئے اور اس کے ساتھ ہی خلیجی ریاستوں کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو یقین دلایا گیا کہ ان کے اقتدار کو اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں جب تک وہ امریکا اور مغرب کے تابعدار رہیں۔ امریکا اور مغرب کی مدد سے جاری اسرائیلی جارحیت اور درندگی پر خطے کے ان تمام ممالک پر مجرمانہ خاموشی اس کا کھلا ثبوت ہم سب کے سامنے ہے۔ دنیا کے امن پسند یہ پوچھ رہے ہیں کہ موت کے ان سوداگروں کا محاسبہ کب ہو گا؟

بروز بدھ 20 ربیع الآخر 23/ اکتوبر 2024ء

یحیٰ سنوار کی جگہ کون لے گا؟

اسرائیل میں یحیٰ سنوار کو 7 / اکتوبر 2023 کو اسرائیل پر ہونے والے حملوں کا "ماسٹر مائنڈ" قرار دیا جاتا تھا اور ماہرین کے مطابق اسمٰعیل ہانیہ کی شہادت کے بعد اُن کی تقرری اسرائیل کے خلاف بغاوت کا ایک جرات مندانہ پیغام تھا۔ اسرائیلی استعماری فوج نے حماس کی دیگر شخصیات کے ساتھ ان کا نام بھی اپنی انتہائی مطلوب افراد کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا ۔ گزشتہ دنوں غیر تصدیق شدہ ذرائع سے سوشل میڈیا پر شدید زخمی حالت میں زمین پر لیٹے ہوئے ایک شخص کی تصویر گردش کر رہی تھی اور اسرائیلی حکام اس کی شناخت کی تصدیق کرتے ہوئے تذبذب کا شکار تھے۔ بعد میں اسرائیلی فوج نے ڈورن کی مدد سے بنائی گئی ایک ویڈیو شیئر کی جس میں اس کے مطابق حماس کے سربراہ کی زندگی کے آخری لمحات دکھائے گئے تھے۔ اس ویڈیو میں ایک شخص کا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ اپنے اطراف سے ڈرون کو ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جونہی اسرائیلی فوج کے ترجمان ڈینیئل ہگاری نے یحیٰی سنوار کی رفح شہر میں شہادت کی تصدیق کی تو جہاں اسرائیل میں جشن کا سماں شروع ہو گیا وہاں غزہ کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ ایک اور شہادتِ حق کی گواہی دینے کیلئے یحیٰی سنوار جیسا مردِ مجاہد بھی سرخرو ہو گیا۔ کچھ ہی گھنٹوں کے بعد اسرائیلی وزیر دفاع یوآف گیلنٹ اور نیتن یاہو نے بھی یحیٰی سنوار کی ہلاکت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

حماس کے سیاسی بیورو کے رُکن خلیل الحیانے یحیٰی سنوار کی شہادت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ "یحیٰی سنوار کی تحریک فلسطینی مٹی پر فلسطینی ریاست کے قیام تک جاری رہے گی اور اس کا دارالحکومت یروشلم ہو گا۔ یحیٰی سنوار اور حماس کے دیگر رہنماؤں کا خون ہمیں روشنی دیتا رہے گا۔" انہوں نے یرغمال بنائے گئے اسرائیلیوں کا حوالہ دیتے ہوئے مزید کہا کہ "قابضین" کے یرغمالیوں کو اس وقت تک رہا نہیں کیا جائے گا جب تک غزہ پر جارحیت ختم نہیں ہوتی، اسرائیل کا مکمل انخلا نہیں ہو جاتا اور ہمارے قیدیوں کو رہا نہیں کر دیا جاتا۔

یحیٰی سنوار کی موت پر غزہ میں صدمے کی سی صورتحال نظر آتی ہے۔ امّ محمد کو شمالی غزہ میں اپنا گھر چھوڑنا پڑا تھا اور اب وہ الاقصیٰ ہسپتال میں رہتی ہیں ۔ ام محمد نے عالمی میڈیا سے اپنے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کچھ دنوں پہلے میں نے خیموں میں لگی آگ کو دیکھا تھا اور اس کی تکلیف اپنے دل میں محسوس کی تھی اور آج پھر ہم یحیٰی سنوار کی شہادت کی خبر کے سبب اس تکلیف سے گزر رہے ہیں۔" غزہ کے ایک اور رہائشی کے مطابق: یحیٰی سنوار غزہ میں تنازع شروع ہونے کے ایک برس بعد مارے گئے ہیں ان کی شخصیت کے حوالے سے لوگوں کی رائے مختلف ہو سکتی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ جس وقت انہیں شہید کیا گیا وہ پوری طرح مسلح تھے اور انہوں نے اسرائیلی فورسز سے بہادری کے ساتھ مقابلہ بھی کیا۔ وہ کسی انٹیلی جنس آپریشن میں نہیں مارے گئے جیسا کہ اسرائیلی فوج دعویٰ کر رہی ہے"۔

انس الجمال نامی سماجی و سیاسی کارکن یحیٰی سنوار کی موت پر لکھتے ہیں کہ "یہ وہ اختتام نہیں ہے جو نیتن یاہو چاہتے تھے۔ نیتن یاہو نہیں چاہتے تھے کہ یحیٰی سنوار اپنا عسکری لباس پہنے ہوئے اور رفح میں اگلے مورچوں پر قابض فوجیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے کسی ہیرو کی طرح نظر آئیں۔ نیتن یاہو نہیں چاہتا تھا کہ یحیٰی سنوار کسی جھڑپ میں اچانک مارے جائیں۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یحیٰی سنوار کو مارا جائے اور تصویر میں وہ خود یحیٰی سنوار کو مارنے کا حکم دیتے ہوئے نظر آئیں۔ نیتن یاہو ان فوجیوں کا احتساب کریں گے جنھوں نے یحیٰی سنوار کی تصویر لیک کی اور اب یہ تصویر فلسطینی افراد کیلئے فخر کا ذریعے بنے گی۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ 'اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کو علم ہونا چاہئے کہ فلسطینی موت سے بالکل نہیں ڈرتے کہ ہم نے ہر لمحے موت کو اپنی جیتی جاگتی

زندگی میں نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اپنے پیاروں کو بڑی بہادری کے ساتھ مسکراتے ہوئے موت سے بغل گیر ہوتے دیکھا ہے تاہم ہم نارمل زندگی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں کچھ سُکھ مل سکے۔ ہم اس جنگ سے اب تھک چکے ہیں۔ عمر نامی غزہ کے ایک اور رہائشی کہتے ہیں کہ "ہر اس فلسطینی کی طرح جس نے اپنی زندگی قربان کی ہے، غزہ یا غربِ اردن میں، ہم خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ یہ جنگ اب ختم ہو جائے"۔

اس حوالے سے بیداع الاولا کی سوشل میڈیا پر لکھتے ہیں کہ: 'وہ جنگ کے دوران رفح میں تیکّے میں شہید ہوئے، نہ کہ کسی آپریشن میں۔ وہ لڑے اور فرار نہیں ہوئے، ان کے گردن میں کوفیہ لپٹا ہوا تھا اور ہاتھ میں بارود تھا۔ انہوں نے ماتھے اور سر پر گولیاں کھائیں، نہ کہ پیٹھ پر یا ہاتھوں پر، وہ آگے بڑھتے ہوئے شہید ہوئے"۔

دوسری جانب سوشل میڈیا پر اسرائیل سے شیئر کی گئی اور مقامی میڈیا پر نشر کی گئی ویڈیوز میں اسرائیل کے شہر کریات بیالیک کی سڑکوں پر لوگوں کو یحیٰی سنوار کی موت کا جشن مناتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اسرائیل میں جشن منانے والے کچھ افراد نے اپنے گھروں کی بالکونی میں لاؤڈ سپیکرز پر اسرائیل کا قومی ترانہ لگایا ہوا تھا اور کچھ لوگ اپنی کاروں کا ہارن بجا کر یحیٰی سنوار کی موت کی خوشی منا رہے تھے۔ ایک اور ویڈیو میں اسرائیلی فوج کے اہلکاروں کو سڑکوں پر موجود ڈرائیورز کو مٹھائی کھلاتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اسرائیلی علاقے اشدود میں ایک رہائشی علاقے میں لوگوں کو حماس کے سیاسی بیورو کے سربراہ کی موت پر تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہوئے دیکھا گیا۔ شمالی اسرائیل میں گلیل کے ساحل کے قریب سڑکیں بلاک دیکھی گئیں کیونکہ وہاں سینکڑوں لوگ یحیٰی سنوار کی موت کی خبر سُن کر ناچ رہے تھے اور اسرائیلی جھنڈے لہرا رہے تھے۔

وہاں موجود ایک یہودی اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "یحیٰی سنوار ایک بُرے آدمی تھے اور ان کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ ان کی موت ہم سب یہودیوں کیلئے ایک تحفہ ہے۔ حماس کی قید میں موجود یرغمالیوں کے خاندانوں نے یحیٰی سنوار کی موت کا خیر مقدم تو کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ ان کے یرغمال بنائے گئے اہلخانہ کو واپس لانے کیلئے کوششوں کو تیز کیا جانا چاہیے۔ اینیوز نگواکر نامی شخص نے اسرائیل کے مقامی میڈیا کو بتایا کہ "ہم نے قاتل یحیٰی سنوار سے حساب برابر کر لیا ہے لیکن ہمیں مکمل فتح اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک ہم اپنے پیاروں کی زندگیاں نہیں بچاتے اور انھیں گھر واپس نہیں لے آتے"۔

مقبوضہ غرب اردن کے شہر رام اللہ میں مراد عمر نامی شخص نے خبر رساں ادارے رائٹرز کو بتایا کہ: "یحیٰی سنوار کی شہادت سے صورتحال مزید پیچیدہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد غزہ میں لوگوں کے پاس زیادہ آپشن نہیں بچیں گے اور اس سبب جنگ اور طول اختیار کر جائے گی" ادھر امریکی اور اسرائیلی کہتے ہیں کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یحیٰی سنوار اور حماس کے بغیر غزہ میں آج ایک نئے دن کا آغاز ہوا ہے، یہ ان کی غلط فہمی ہے اور یہ صرف سیاسی نعرے ہیں۔ جنگ جاری رہے گی اور ایسے نہیں لگتا کہ یہ کبھی ختم بھی ہو گی"۔ حبرون سے کچھ میل فاصلے پر مقیم اعلیٰ الشلامون کہتے ہیں کہ: میرے خیال میں جب بھی کوئی مرتا ہے تو اس کی جگہ کوئی اور لے لیتا ہے جو پچھلے شخص سے زیادہ ضدی ہوتا ہے۔ یحیٰی سنوار ایک ضدی شخص تھے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی جگہ بھی کوئی ان کے جیسا ہی شخص یا پھر ان سے زیادہ ضدی شخص لے گا۔

اردن کی سرحد اسرائیل سے ملتی ہے اور اس کے دارالحکومت عمان میں ہزاروں افراد یحیٰی یحیٰی سنوار کی موت کی مذمت کرنے اور حماس سے یکجہتی کا اظہار کرنے کیلئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ایک احتجاج کرنے والے شخص نے عالمی میڈیا سے بات کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ "یحیٰی سنوار اور مزاحمت

نظریات کا نام ہے اور ایک نظریہ کبھی مرتا نہیں۔ لاشیں گرتی ہیں، نظریات نہیں مٹتے۔ اس لئے یحیٰی سنوار کی شہادت سے صورتحال مزید خراب ہی ہوگی۔ جمعے کی صبح اسرائیل کے مقامی میڈیا کے مطابق اسرائیلی فوج نے ایک بیان میں کہا تھا کہ اردن کی طرف سے اسرائیل میں دراندازی کی کوشش کی گئی تھی اور اس واقعے میں دو فوجی اہلکار بھی زخمی ہوئے ہیں۔ اردن کی فوج نے اس معاملے پر جاری ایک بیان میں کہا کہ: میڈیا میں چلنے والے اطلاعات میں کوئی صداقت نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اردن کی فوج نے اردن کی مغربی سرحد عبور کی۔ ادھر دوسری طرف عراق میں اسماعیل ہنیہ کی موت پر بھی احتجاجی مظاہرے ہوئے تھے لیکن یحیٰی سنوار کی موت کے بعد جو مظاہرے یہاں ہوئے وہ ماضی کے مقابلے میں کافی بڑے تھے۔

عراقی رُکنِ پارلیمان رئیس المالکی نے کہا کہ: "یحیٰی سنوار کی موت کا منظر اُتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنی لاکھوں فلسطینیوں کی اموات اور ہزاروں بھوکے افراد کی نقل مکانی"۔ عراقی صحافی و بلاگر احمد الشیخ ماجد نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر ایک پوسٹ میں لکھا کہ "یحیٰی سنوار نے وہ زندگی گزاری ہے جس کا وجود صرف شاعری میں ہی نظر آتا ہے۔ عراق میں موجود ہم سب جانتے ہیں کہ اس سب کی وجہ کیا ہے اور ہم بلیک میلرز اور شیروں میں فرق بھی جانتے ہیں۔ یحیٰی سنوار عربوں کا وہ شیر ہے جس کی دھاڑ اس کی شہادت کے بعد بھی دشمنوں کو کو فزدہ رکھے گی"۔ مصر میں واقع جامع الاظہر نے یحیٰی سنوار کا نام لیے بغیر ان کی موت کو "فلسطینی مزاحمت میں ہیرو کی شہادت" قرار دیا۔ ایکس پر جاری ایک بیان میں جامع الاظہر کا کہنا تھا کہ نوجوانوں کے ذہنوں میں "فلسطینی مزاحمت کا نشان" سمجھے جانے والے افراد کی ساکھ کو مسخ کرنے کی کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ اس کو "دہشتگردی" نہ قرار دیا جائے بلکہ "مزاحمت" اپنی سرزمین کا دفاع کرنا اور مرجانا ایک ایسا رُتبہ ہے جس کی برابری ممکن نہیں"۔

مصری سیاستدان اور سابق صدارتی امیدوار حمدین صباحی نے یحیٰی سنوار کی موت کے بعد ایک تقریب میں شرکت کی اور کہا کہ: "آپ ہیرو کی طرح جیئے اور شہادت کے رُتبے پر فائز ہوگئے۔ آپ غزہ کے دیگر لوگوں کی طرح کسی ہیرو کی طرح شہید ہوئے۔ آپ کسی ٹنل میں نہیں چھپے، قیدیوں کے پاس پناہ نہیں لی بلکہ جب آپ کا دشمن سے سامنا ہوا تو آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہے تھے"۔

مصری اخبار الاحرام الشروق کے سابق ایڈیٹر ان چیف عبدالعظیم حماد نے حماس کے سیاسی بیورو کے سربراہ کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسرائیل مزاحمت کے تمام مراکز کو ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ خطے میں اسرائیل کی بالادستی کی راہ ہموار ہو سکے"۔ مصری میڈیا کی ایک اور شخصیت محمود سعد نے یحیٰی سنوار کی موت پر فلسطینی شاعر کی شاعری ایکس پر شیئر کی جس کے اردو میں لفظی معنی یہ ہیں: "اگر میں مرجاؤں تو میری ماں، تم رونا مت۔ میں مروں گا تاکہ میرا ملک زندہ رہ سکے"۔ احمد موسیٰ نامی ایک اور مصری شخص نے سوشل میڈیا پر اسرائیلی وزیر اعظم کو "جنگی مجرم" قرار دیا۔

کچھ بلاگرز اور سیاسی کارکنان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی جانب سے یحیٰی سنوار کی لاش کی تصاویر نے چی گویرا کی موت کے بعد کی تصاویر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ چی گویرا ارجنٹینا میں پیدا ہونے والے انقلابی تھے جو گذشتہ صدی کے دوسرے حصے میں "دنیا بھر میں انقلابی تحریکوں کی علامت" بن کر سامنے آئے۔ انہیں جب 1967 میں بولیویا میں مارا گیا تو ان کی لاش کی تصویر دُنیا بھر میں پھیل گئی تھی لیکن یحیٰی سنوار کی شہادت کی تصاویر نے

تو ایک ایسے نظریہ کو نئی زندگی عطا کی ہے جس کو ہر نوجوان اپنے لئے مشعل راہ سمجھے گا۔ دوسری جانب کچھ لوگوں نے حماس کے سیاسی بیورو کے سربراہ کی موت کا موازنہ صدام حسین کی موت سے کرنے کی کوشش کی کہ صدام حسین کو امریکی فوجیوں نے ایک "ٹنل کے اندر" پکڑا تھا جبکہ یحیٰی سنوار" ہاتھ میں اسلحہ پکڑے ہوئے، بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

یحیٰ سنوار کی شہادت کے بعد اب یہ قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں کہ اس تنظیم کا اگلا سربراہ کون ہوگا؟ حماس کے ایک عہدیدار کا کہنا ہے کہ تنظیم سکیورٹی وجوہات کی بنا پر اپنے نئے سربراہ کی شناخت خفیہ رکھے گی۔ 2003 میں حماس کے اس وقت کے سربراہ شیخ احمد یاسین اور ان کے جانشین عبدالعزیز الرنتیسی کو اسرائیل نے شہید کر دیا تھا۔ اس دور میں بھی حماس نے اپنے سربراہ کا نام ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ امکان ہے کہ حماس کے نئے سربراہ کا انتخاب مارچ 2025 میں کیا جائے گا اور تب تک یہ تنظیم پانچ رکنی کمیٹی چلائے گی۔ اس کمیٹی میں خلیل الحیہ، خالد مشعل، زاہر جبارین اور شوریٰ کونسل کے سربراہ محمد درویش شامل ہیں جبکہ پانچویں رکن کی شناخت خفیہ رکھی گئی ہے۔ دوسری جانب متعدد حلقوں میں یحیٰ سنوار کے نائب اور حماس کے سینیئر عہدیدار خلیل الحیہ کو اس عہدے کیلئے ایک مضبوط امیدوار سمجھا جارہا ہے۔

حماس کے اہلکار کے مطابق خلیل الحیہ نے سیاسی و خارجی امور کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ وہ غزہ کے معاملات کی براہِ راست نگرانی کر رہے ہیں۔ نتیجتاً وہ اس تنظیم کے قائم مقام سربراہ کی طرح کام کر رہے ہیں۔ یرغمالیوں کے معاملے پر انھوں نے کہا کہ حماس کے پاس یہ صلاحیت اور افرادی قوت ہے کہ وہ ان کا تحفظ یقینی بنا سکے۔ انھوں نے اس بارے میں مزید تفصیلات فراہم نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ گذشتہ جون سے بہت کم بات چیت ہو سکی ہے۔

غزہ سے باہر موجود حماس کی قیادت میں خلیل الحیہ ایک انتہائی سینیئر عہدیدار ہیں۔ قطر میں مقیم خلیل الحیہ اِس وقت حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کیلئے ہونے والے مذاکرات میں حماس کے وفد کی قیادت کر رہے ہیں۔ خلیل الحیہ غزہ کی صورتحال کے بارے میں گہری معلومات، رابطے اور تفہیم رکھتے ہیں۔ یحیٰ سنوار کی شہادت کے بعد اب آئندہ آنے والے دنوں میں حماس کے رہنما ایک بار پھر اکٹھے ہوں گے تاکہ اُن کے جانشین کا انتخاب کر سکیں۔ یاد رہے یحیٰی سنوار رواں برس ہی تہران میں سابق حماس رہنما اسماعیل ہنیہ کی ہلاکت کے بعد تنظیم کے سربراہ بنے تھے۔

جولائی 2024 کے بعد سے غزہ جنگ بندی سے متعلق مذاکرات تعطل کا شکار ہیں۔ اسرائیل اور مغربی میڈیا دنیا کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا ہے کہ سنوار کی قیادت جنگ بندی معاہدے کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ تھی۔ گذشتہ دنوں عالمی میڈیا نے رپورٹ کیا تھا کہ یحیٰ سنوار سفارتی ذرائع سے غزہ کے مسئلے کے حل کی بجائے عسکری حل پر زیادہ زور دیتے تھے۔ حماس کے ایک سینیئر عہدیدار نے متنبہ کیا ہے کہ یحیٰ سنوار کی شہادت کے باوجود جنگ بندی کو قبول کرنے اور اسرائیلی یرغمالیوں کی رہائی کیلئے حماس کی شرائط میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ حماس جنگ بندی کے عوض غزہ سے اسرائیل کے مکمل انخلا، انسانی امداد کی بلا روک ٹوک غزہ آمد اور جنگ زدہ علاقوں کی تعمیر نو کا مطالبہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ ان شرائط کو اسرائیل نے یکسر مسترد کرتے ہوئے اصرار کیا ہے کہ حماس کو ہتھیار ڈال دینے چاہییں۔

نیتن یاہو کی جانب سے حماس سے ہتھیار ڈالنے کے مطالبے کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں حماس کے عہدیدار نے کہا کہ "ہمارے لیے ہتھیار ڈالنا ناممکن ہے۔ ہم اپنے لوگوں کی آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں اور ہم ہتھیار ڈالنے کو قبول نہیں کریں گے۔ ہم آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑیں

گے، جیسا کہ سنوار نے کیا اور کہا تھا۔ سنوار کی شہادت کئی دہائیوں میں تنظیم کو پہنچنے والے سب سے بڑے نقصانات میں سے ایک ہے۔ اگرچہ ان کا متبادل لانا ایک چیلنج ہے لیکن حماس کی 1990 کی دہائی سے قیادت کے نقصانات برداشت کرنے کی تاریخ رہی ہے۔

اگرچہ اسرائیل حماس کے زیادہ تر رہنماؤں اور بانیوں کو شہید کرنے میں کامیاب رہا ہے لیکن تحریک نئے رہنماؤں کو تلاش کرنے کی اپنی صلاحیت میں لچکدار ثابت ہوئی ہے۔ اس بحران کے دوران غزہ میں قید اسرائیلی یرغمالیوں کی قسمت کے حوالے سے یہ سوال اب بھی موجود ہیں کہ ان کی حفاظت اور سلامتی کا ذمہ دار کون ہو گا۔ اس تناظر میں یحیٰی سنوار کے بھائی محمد سنوار ایک اہم شخصیت کے طور پر اُبھرے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ حماس کے باقی ماندہ مسلح گروہوں کی قیادت کر رہے ہیں اور غزہ میں تحریک کے مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایک طرف حماس کو اس سخت لمحے کا سامنا ہے تو دوسری طرف غزہ میں جنگ جاری ہے۔ گزشتہ ہفتے شمالی غزہ کے جبالیہ پناہ گزین کیمپ میں اسرائیلی فوج کے حملوں میں درجنوں افراد شہید ہوگئے تھے۔ اسرائیل کا دعوی ہے کہ حماس یہاں دوبارہ منظم ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعض تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ یحیی سنور کی شہادت حماس کیلئے بڑا دھچکا ہے۔ اگست میں اسماعیل ہانیہ کی موت کے بعد حماس نے انھیں منتخب کرتے ہوئے یہ اشارہ دیا تھا کہ حماس اسرائیل کے سامنے جھکنے والی نہیں ہے اور حماس نے وقت کے ساتھ ساتھ اسرائیل اور اس کے تمام اتحادیوں کو گزشتہ ایک سال کے اندر بھرپور مقابلہ کرکے نہ صرف حیران وپریشان کر دیا ہے بلکہ اپنے اس مضبوط عزم کا اظہار بھی کیا ہے کہ آئندہ آنے والے وقت میں ان تمام فراعین کو غزہ کے میدان میں ہی دفن کر کے رہیں گے۔ ان شاءاللہ

بروز جمعرات 21 ربیع الآخر 24/اکتوبر 2024ء

بحیرہ روم کا آتشیں مستقبل: تنازعات کی سمت

بحیرۂ روم کا محلِ وقوع بھی خوب ہے۔ یہ ایشیا، یورپ اور افریقا کا سنگم ہے۔ ان میں سے ہر براعظم بحیرۂ روم سے اس طور جڑا ہوا ہے کہ اُس سے ہٹ کر اہمیت گھٹ سی جاتی ہے۔ قدیم زمانوں ہی سے یہ سمندر دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان زور آزمائی کا مرکز رہا ہے۔ طاقت میں اضافے کیلئے بڑی ریاستیں اس خطے کو اپنے حق میں بروئے کار لاتی رہی ہیں۔ غیر معمولی اہمیت کے حامل محلِ وقوع نے بحیرۂ روم کو ایشیا اور یورپ کے متعدد ممالک کیلئے سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم بنادیا ہے اور اس حوالے سے خانہ جنگی اور اغیار کی بپا کی ہوئی تباہی کے باوجود لیبیا اب بھی ایک اہم ریاست ہے۔ سرد جنگ کے شروع ہوتے ہی امریکا نے ٹرومین ڈاکٹرائن کے تحت یونان اور ترکی کو غیر معمولی تناسب سے امداد دینا شروع کی۔ اس کا بنیادی مقصد بحیرۂ روم کے خطے میں امریکی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچانا تھا، ساتھ ہی ساتھ امریکا یہ بھی چاہتا تھا کہ سرد جنگ میں کمیونسٹ بلاک کے مقابل یونان اور ترکی ہر اعتبار سے امریکی اتحادی کی حیثیت سے ابھریں۔

سرد جنگ کے دور میں بحیرۂ روم سیاسی اور سفارتی سطح پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ امریکا و سابق سوویت یونین کے پہلو بہ پہلو یونان اور ترکی کیلئے بھی غیر معمولی اسٹریٹجک اہمیت کا حامل تھا۔ یونان اور ترکی معاہدہ نیٹو کے اہم ارکان کی حیثیت بھی ایسے نہ تھے کہ نظر انداز کر دیے جاتے۔ دوسری طرف اسی دور میں شام اور مصر کا سابق سوویت یونین کے اتحادیوں کی حیثیت سے ابھرنا اور شام کی بندرگاہ طرطوس کے علاوہ مصر کے علاقے سیدی برانی میں فوجی اڈوں کا قیام بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

سابق سوویت یونین نے 1972ء تک سیدی برانی کے فوجی اڈے کو نیٹو کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کیلئے استعمال کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے تحلیل ہو جانے کے بعد یہ خطہ امریکا اور یورپ کیلئے زیادہ اہم نہ رہا۔ وہ ان اتحادیوں پر مزید کچھ خرچ کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ سرد جنگ کے دور میں مخصوص سیاسی حالات نے امریکا کو مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کیا۔ امریکا کیلئے ایک بڑا مسئلہ چین بھی تھا جو تیزی سے ابھر رہا تھا۔ بحیرۂ روم کو نظر انداز کرنے کی پالیسی نے معاملات کی نوعیت بدل دی۔ خاص طور پر چین کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ تیل اور گیس کے نئے ذخائر دریافت ہوئے اور خطے نے دوبارہ اہمیت حاصل کرلی۔ اب قدرتی وسائل پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کیلئے امریکا، یورپ، روس اور علاقائی طاقتیں میدان میں ہیں۔

یہ بات تو اب بالکل واضح ہے کہ گیس کے ذخائر کی دریافت نے خطے کے ممالک کو زیادہ سرمایہ کاری کی تحریک دی ہے تاکہ سیاسی طور پر بھی پوزیشن غیر معمولی حد تک مستحکم رکھنا ممکن نہ ہو۔ یہ سرمایہ کاری اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ ایسا کرنے ہی سے ایک طرف تو خطے کے ممالک کو اپنی اندرونی ضرورت پوری کرنے میں مدد ملتی تھی اور دوسری طرف وہ عالمی منڈی میں مسابقت کے قابل نہ ہو سکیں۔ کسی بھی ملک میں گیس کی بڑھتی ہوئی ضرورت ہی اس امر کا تعین کرتی ہے کہ سب سے زیادہ گیس کون فراہم کرے گا۔ آج بہت سے ممالک توانائی کیلئے صرف گیس پر انحصار کرتے ہیں۔ ایسے میں طاقت بڑھانے والے عوامل میں تیل سے کہیں بڑھ کر گیس ہے۔ اس کے نتیجے میں اب سیاسی حقائق بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ توانائی کے معاملے میں کسی ایک ذریعے پر انحصار متعلقہ ممالک کیلئے اسٹریٹجک حقائق بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیبیا اس کی ایک واضح مثال ہے جہاں معاملات اب نظم و نسق قائم کرنے والے نظام کے ہاتھ سے باہر نکل چکے ہیں جس کیلئے امریکا اور مغرب پوری طرح ذمہ دار ہے۔

تکنیکی ماہرین بتا چکے ہیں کہ بحیرۂ کے خطے میں گیس کے غیر معمولی ذخائر موجود ہیں۔ گیس کے ذخائر پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول پانے کی خواہش نے ایک بار پھر بحیرۂ روم کو اکھاڑے کی سی شکل دے دی ہے۔ تمام بڑی طاقتیں بحیرۂ روم پر زیادہ سے زیادہ متوجہ رہنے کی پالیسی پر کاربند ہیں۔ مسابقت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ دی یو ایس جیولوجیکل کے ایک سروے کے مطابق لبنان سے قبرص اور مصر تک کے چند ایک علاقوں میں گیس کے 340 کھرب مکعب فٹ کے ذخائر کی موجودگی نے اختلافات اور تنازعات کو ہوا دی ہے۔ کئی ممالک گیس کے ذخائر سے مالامال علاقوں پر اپنا حق جتانے کھڑے ہوگئے ہیں۔ تنازعات شدت اختیار کرتے جارہے ہیں، ایسے معاملات کو بڑے پیمانے کے مسلح تصادم تک پہنچنے سے روکنا تمام معاملات میں ممکن نہیں ہوتا۔

یونان نے بڑے پیمانے پر تیل اور گیس محض تلاش ہی نہیں کیا بلکہ نکالنے کا عمل بھی شروع کردیا ہے۔ ترکی اور قبرص کے ترک نظم ونسق والے علاقے کی سمندری حدود بھی بحیرۂ روم کے خاصے وسیع علاقے تک ہیں مگر جب وہ تیل اور گیس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو یونان اور اُس کے زیرِ انتظام قبرص کا علاقہ معترض ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تنازع شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ قبرص مشترکہ طور پر ترکی اور یونان کے زیرِ انتظام ہے اور دونوں کی مشترکہ ملکیت کا درجہ رکھتا ہے۔ بحیرۂ روم میں قبرص کی سمندری حدود میں جتنے بھی قدرتی وسائل ہیں اُن پر ترکی اور یونان کا برابری کا دعویٰ ہے۔ ترکی چاہتا ہے کہ قبرص کے زیرِ انتظام حصے میں تیل اور گیس تلاش کرے اور نکالے مگر یونان معترض ہے کہ وہ ایک چھوٹے جزیرے کی ملکیت کے تنازع کے باعث اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان اختلافات ایک بار پھر غیر معمولی سطح پر شدت اختیار کرگئے ہیں۔ مشرقی بحیرۂ روم میں ماحول گرم تر ہوتا جارہا ہے۔ ترکی اور یونان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی علاقے کے دیگر ممالک کیلئے بھی خطرے کی گھنٹی ہے۔ یہ تنازع اگر شدت اختیار کرگیا تو اس کے شدید منفی اثرات پورے خطے پر مرتب ہوں گے۔

ٹرکش نیشنل آئل کمپنی نے تین سال قبل یہ کہا تھا کہ جدید ترکی کے قیام کی سوویں سالگرہ (2023ء) تک وہ تیل اور گیس کی طلب ملکی وسائل ہی سے پوری کرنے کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کررہی ہے۔ ترک وزارتِ توانائی نے بھی کہہ دیا ہے کہ تیل اور گیس کی طلب اندرونی ذرائع سے پوری کرنے کے معاملے میں پورے خطے میں اولین مقام تک پہنچنا چاہتی ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا اور اس کے نتیجے میں خطے میں سلامتی کی صورتِ حال کیا رخ اختیار کرے گی۔ مشرقی بحیرۂ روم میں بڑھتی ہوئی کشیدگی اس امر کی متقاضی ہے کہ معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی کوششوں کا آغاز کیا جائے مگر اب تک ایسی کوئی بھی کوشش دکھائی نہیں دی ہے۔

خطے میں تیل اور گیس کی تلاش کے کام کا نئے سِرے سے جائزہ لینا ہوگا۔ لیبیا ایک اہم ملک ہے کیونکہ اس کے تیل اور گیس کے ذخائر سب سے بڑھ کر ہیں. اس کی سیاسی اور معاشی حالت نے خطے کے بہت سے ممالک کو پریشان کررکھا ہے۔ لیبیا اب تک افریقا کیلئے سب سے بڑے گیٹ وے کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ بحیرہ روم کے ایسے حصے میں واقع ہے جہاں سمندر میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اس کی دسترس میں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود لیبیائی سرزمین پر بھی تیل اور گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ جسے بھی لیبیا پر تصرف حاصل ہے وہ پورے خطے پر نظر رکھ سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اس کی دسترس میں ہیں۔ خطے کی اور خطے سے باہر کی تمام طاقتیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ پورے بحیرۂ روم پر اپنا تصرف قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں مگر وہ اس خطے میں موجود اور متحرک رہ کر اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش ضرور کررہی ہیں کہ خطے کا کوئی بھی ملک تمام وسائل پر تنہا قابض و متصرف ہوکر اجارہ داری قائم نہ کرلے۔

لیبیا کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی داخلی صورتِ حال اور قضیے میں امریکا، روس، یورپ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، قطر، یونان، الجزائر اور یونان کے زیرِ انتظام قبرص بھی ملوث رہے ہیں۔ روس، سعودی عرب، یونان، متحدہ عرب امارات اور مغربی ممالک لیبیا کے قضیے میں جنرل خلیفہ ہفتار کے حامی ہیں۔ ترکی اور قطر نے اقوام متحدہ کے متعین کیے ہوئے وزیر اعظم فیض سراج کی بھرپور حمایت کی ہے۔ لیبیا کی صورتحال سے واضح ہے کہ خطے میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کی موجودگی نے کل کے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے اور جو ابھی کل تک اتحادی تھے وہ اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وسائل کی بندر بانٹ کیلئے ہے۔ ہر فریق چاہتا ہے کہ قدرتی وسائل سے مالامال جنرل خلیفہ ہفتار کی سربراہی میں کئی ملیشیاز باضابطہ اور جائز حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاری علاقے کے سب سے بڑے حصے پر اس کا تصرف قائم ہو جائے۔ کر رہی ہیں۔ کئی طاقتیں اس کام میں خلیفہ ہفتار کی مدد کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ بالکل غلط ہے مگر ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو کئی علاقائی اور یورپی ممالک لیبیا میں خلیفہ ہفتار کی مالی اور عسکری امداد کر رہی ہیں اور دوسری طرف ترکی نے لیبیا کی باضابطہ حکومت سے دو بڑے معاہدے کیے ہیں۔

ایک طرف تو لیبیا میں طاقت کا خلا موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خطے میں طاقت کا توازن بھی بگڑ چکا ہے۔ رہی سہی کسر تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کی موجودگی نے پوری کر دی ہے۔ دستر خوان تیار ہے تو سب کی رال ٹپک رہی ہے۔ ایک عشرے سے بھی زائد مدت سے مشرقی بحیرۂ روم کا خطہ بیرونی قوتوں کی توجہ اور کشمکش کا مرکز رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اب شدید تر نوعیت کی ہو گئی ہے۔ بڑی طاقتوں کی موجودگی سے خطے کے کسی ایک ملک کو تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز پا رہنے کی تحریک ملے گی مگر دوسری طرف یہ خدشہ بھی تو ہے کہ یہ خطہ بڑی طاقتوں کے درمیان زور آزمائی کا میدان بنا رہے گا۔

اب ان حالات کے بعد اس خطے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لیبیا سے شام تک جنگ کا گورکھ دھندا ایک سازش ہے، مفادات کیلئے رچایا جانے والا ڈرامہ ہے۔ 1930ء کے عشرے میں مشہور امریکی میرین میجر جنرل اسمیڈلے بٹلر نے کہا تھا کہ وہ اس امر کی تحقیق کر رہے تھے کہ دنیا بھر میں وہ کون سے گروہ ہیں جو اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے امریکی عسکری قوت کو استعمال کرتے ہیں۔ ہیٹی میں نیشنل سٹی بینک کے مفادات سے ہونڈراس کے یونائیٹڈ فروٹ پلانٹیشنز تک، چین کے اسٹینڈرڈ آئل ایکسیس سے نکاراگوا کے براؤن برادرز تک بیشتر امور کا جائزہ لے کر میجر جنرل اسمیڈلے بٹلر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ امریکی فوج چند بڑے کاروباری اداروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے کام کرتی ہے اور جس قدر بھی نقصان ہوتا ہے اس کا ازالہ امریکی عوام کی جیب سے کیا جاتا ہے۔ ان کی محنت کی کمائی پر بڑے کاروباری ادارے سیاسی سیٹ اپ کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ وقت اور حالات بدل چکے ہیں مگر پرانی کہاوت اب بھی مؤثر ہے کہ چیزیں جتنی زیادہ بدلتی ہیں اسی قدر وہ یکساں رہتی ہیں۔

یاد رہے کہ معمر قذافی کے آخری برسوں میں چین اور لیبیا کے تعلقات غیر معمولی حد تک پروان چڑھ گئے تھے۔ 2010ء میں دونوں ممالک کے درمیان تجارت کا حجم 6/6 ارب ڈالر سے زائد رہا تھا۔ 2007ء میں جب امریکا نے افریقا پر توجہ دینا شروع کی تب معمر قذافی نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ چین سے تعلقات بہتر رکھنا بہت سود مند ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے افریقا میں چین کی سرمایہ کاری کو کھل کر سراہا۔ ساتھ ہی

ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ علاقائی سیاست سے دوررہ کر چینیوں نے افریقا میں کروڑوں افراد کے دل جیت لیے ہیں۔اب صورت حال بدل چکی ہے۔ عبوری سیٹ اپ نے اپنے ابتدائی دور میں چین سے تعلقات کو سرد خانے میں رکھ دیا تھا جس کی وجہ قومی عبوری کونسل کے عہدیداروں نے یہ بتائی تھی کہ لیبیا میں تعمیر نو کے ٹھیکوں کی تقسیم میں چین کو اس بات کی سزادی گئی تھی کہ اس نے انقلابی قوتوں کو تسلیم کرنے میں دیر لگائی۔بعد میں اس بیان کی تردید بھی کی گئی مگر ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ بہت سی چینی کمپنیاں لیبیا میں منجمد اور پھنسے ہوئے 8/18 ارب ڈالر سے زائد کے اثاثوں کی بحالی اور وصولی کا انتظار کر رہی تھیں مگر خیر ایسا نہیں ہے،اب عبوری قومی کونسل نے چینی کمپنیوں سے بات چیت کے کئی کامیاب دور مکمل کرنے کے بعد کافی حد تک معاملات کو درست سمت کی طرف موڑ دیا ہے۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ لیبیا میں شامل عظیم اور درمیانی طاقتوں کے درمیان، چین کو اکثر اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ یہ کرائے کے فوجی یا فضائی حملے کرنے والوں متحدہ عرب امارات، ترکی اور روس کی مخالفت کر رہا تھا لیکن چین اب ان تمام واقعات کے بعد مستقل طور پر ان طریقوں سے سرمایہ کاری اور اثرورسوخ استعمال کر رہا ہے جو چین کے عالمی عزائم میں لیبیا کے حتمی انضمام کو فروغ دیتے ہیں۔یادرہے کہ 2011 میں معمر قذافی کے خلاف چین نے فوجی مداخلت کی اجازت دینے کیلئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ووٹ سے پرہیز کیا اور نیٹو کی قیادت میں نوفلائی زون اور سرکاری افواج پر فضائی حملوں کے ردعمل کو فوری طور پر مسترد کر دیا تھا۔"انسانی تباہی" کے خوف اور ممکنہ طور پر امریکی اثرورسوخ کا مقابلہ کرنے کے خوف میں، چین کی شدید مزاحمت لیبیا اور اس وقت کے وسیع ترخطے میں اس کی غیر جانبداری کی یہ پالیسی اس کے بعد سے اب تک اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔

قذافی کی حکومت کے خاتمے کے بعد سے، لیبیا میں چین کی شمولیت، اور پس پردہ سفارت کاری اس کے اثرورسوخ کی سب سے مضبوط لائن نے اقتصادی دخول پر توجہ مرکوز کی ہے-چین نے فوجی الجھنوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے تجارتی عزائم کو بڑی دانشمندی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔بیجنگ کی محتاط اور محدود مصروفیت نے اپنے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود مقامی حقائق کے بارے میں شدید آگاہی کا مظاہرہ کیا ہے،بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنے کیلئے اپنے نقطہ نظر کی تشکیل نو کرتے ہوئے تنازع کے نامعلوم نتائج کیلئے اپنے فوائد کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا ہے۔

جب 2011 میں مظاہروں کے پھیلنے کا سامنا کرنا پڑا تو چین نے نیٹو کی قیادت میں فوجی مداخلت کو مسترد کرتے ہوئے لیبیا کے ساتھ اپنے اقتصادی تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ چین اب بھی طویل عرصے سے اپنی عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند ہے اور اپنے اس مؤقف پر چین کو عرب لیگ اور افریقی یونین جنہوں نے لیبیا میں فوجی مداخلت کی حمائت کی تھی، کے ساتھ اپنے تعلقات پر بھی جھگڑا کرنا پڑا جبکہ بیجنگ کو مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک کے ساتھ حال ہی میں مضبوط ہوئے اپنے سفارتی اور اقتصادی تعلقات کو برقرار رکھنے میں بھی دلچسپی تھی۔اس سے بھی بڑھ کر، بیجنگ نے اپنی ملکی سلامتی کا تحفظ کرنے کی کوشش کی اور نام نہاد "ریسپانسیبلٹی ٹوپروٹیکٹ" نظریے کی توثیق سے گریز کیا، جوکہ انسانی حقوق کے تحفظ کی بنیاد پر خودمختار ممالک میں مداخلت کا عالمی معیار ہے۔یہ نقطہ نظر روس کی طرف سے بھی شیئر کیا گیا، جس کے نتیجے میں نہ صرف لیبیا بلکہ شام اور ایران کے حوالے سے چین-روس کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوئی جبکہ چین اکثر ماسکو کی قیادت کی پیروی کرتا ہے۔

یادرہے کہ 2011ء میں لیبیا میں تنازع شروع ہونے سے قبل چین مختلف بنیادی ڈھانچے کی سرگرمیوں میں مصروف تھا، اور لیبیا نے بدلے میں چین کو کافی سرمایہ بھیجا تھا۔2011 تک، چین کے پاس لیبیا میں تقریباً 18.8 بلین ڈالر مالیت کا کاروبار کرنے والی 75 کمپنیاں تھیں۔ان سرگرمیوں میں 36 ہزار چینی مزدور 50 منصوبوں پر کام کر رہے تھے، جن میں رہائشی اور ریلوے کی تعمیر سے لے کر ٹیلی کمیونیکیشن اور ہائیڈروپاور کے منصوبے شامل

تھے۔ خاص طور پر لیبیا کے انقلاب سے پہلے سال میں، لیبیا چین کے خام تیل کی سپلائی کا 3 فیصد فراہم کر رہا تھا یعنی دنیا کے دوسرے سب سے بڑے صارف کیلئے سپلائی کا 3 فیصد، تقریباً ڈیڑھ لاکھ بیرل یومیہ، یا اس کا دسواں حصہ، لیبیا کی خام برآمدات، لیبیا کی تیل کی صنعت میں درآمدات سے ہٹ کر گہرے طور پر چینی کمپنیاں ملوث تھیں اور چین کی تمام اعلیٰ سرکاری تیل فرموں "سی این پی سی، سنوپیک گروپ اور سی این اواوسی" کے لیبیا میں بنیادی ڈھانچے کے منصوبے کھڑے تھے۔ یہی وہ تمام وجوہات تھیں جس کی بناء پر امریکا اور مغرب کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ لیبیا میں چین کے موجودہ تجارتی اثر و رسوخ سے یہ سارا خطہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کی معمر قذافی کو بھرپور سزا دی گئی لیکن مکافاتِ عمل یہ ہے کہ چین نے اس تمام عرصے میں جنگی بنیادوں پر اپنا دوبارہ تجارتی اعتماد بحال کر لیا ہے جس سے یہ بات پایہ یقین تک پہنچ گئی ہے کہ بحیرہ روم کے ممکنہ میدان جنگ میں چین خاموش نہیں بیٹھے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکا اور مغرب چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنے کیلئے بحیرہ روم کے سمندروں میں آگ لگانے کیلئے تیار ہے جبکہ حالات پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش ناک ہیں؟

بروز ہفتہ 23 ربیع الآخر 26/اکتوبر 2024ء

ایرانی میزائل پروگرام: تاریخ، ترقی اور موجودہ چیلنجز

رات کے گھپ اندھیرے میں مسجدِ اقصیٰ کے سنہرے گنبد کو 13 / اپریل 2024ء کا وہ منظر ضرور یاد ہو گا جب اس کے اوپر سے گزرتا ہوا ایرانی بیلسٹک میزائل اور ڈرون پہلی بار اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کے مشہور دفاعی نظام "آئرن ڈروم" یعنی آہنی دیوار سے بچتے ہوئے اسرائیلی فضائی اڈے اور مختلف مقامات پر اپنی دسترس کی گواہی چھوڑ آئے۔ اسرائیلی کی درندگی کے جواب میں 6 ماہ بعد یکم اکتوبر 2024ء کو ایک بار پھر یہ کہہ کر حملہ دہرایا گیا کہ ہم نے اسمٰعیل ہانیہ اور حسن نصر اللہ کی شہادتوں کے جواب میں اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے تاہم اس مرتبہ ایرانی پاسداران انقلاب نے زیادہ بڑی تعداد میں اسرائیل اہداف کو نشانہ بناتے ہوئے اسے ہلکی جھلک قرار دیتے ہوئے متنبہ بھی کیا کہ آئندہ حملوں کے جواب میں غیر روایتی جواب دیا جائے گا۔

سٹمسن انسٹیٹیوٹ کے محقق اور نیٹو کے آرمز کنٹرول پروگرام کے سابق ڈائریکٹر کے مطابق "ایران کے حالیہ حملے نے مشرق وسطیٰ کی صورتحال کو ہمیشہ کیلئے بدل کر رکھ دیا ہے۔ واضح رہے کہ اس حملے کی بنیاد فراہم کرنے والا ایرانی میزائل پروگرام گذشتہ کئی دہائیوں میں حیران کن رفتار سے اپنے اہداف کو نشانہ بنانے کی بھرپور صلاحیت کے ساتھ ترقی کرتا ہوا اس قدر مؤثر اور قابلِ بھروسہ ہو گیا ہے کہ اب اس کیلئے "پوائنٹر" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مغربی دنیا اسے خوفناک حد تک سنجیدہ لیتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کے دیگر اتحادیوں کیلئے بھی شدید خطرہ قرار دے رہی ہے۔

خطے میں اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کی جارحیت کو عالمی منظر نامے سے محو کرنے کیلئے اب سارا رخ ایرانی بیلیسٹک میزائلوں سے درپیش خطرات کی طرف موڑ دیا گیا ہے کہ آخر اس قدر شدید ترین عالمی پابندیوں کے باوجود ایران نے اس قدر جدید میزائل پروگرام کا سفر کیسے طے کر لیا اور اس وقت ایران کے پاس کس قسم کے اور کتنے فاصلے تک مار کرنے والے میزائل ہیں۔

امریکی ادارے پیس انسٹیٹیوٹ کے مطابق مشرق وسطیٰ میں ایران کے پاس سب سے بڑا اور متنوع بیلسٹک میزائلوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ایران خطے کا واحد ملک ہے جس کے پاس جوہری ہتھیار تو نہیں لیکن اس کے بیلسٹک میزائل دو ہزار کلو میٹر کے فاصلے تک پہنچ سکتے ہیں۔ بیلسٹک ٹیکنالوجی تو دوسری عالمی جنگ کے وقت بن چکی تھی، تاہم دنیا میں صرف چند ہی ممالک کے پاس یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود اس ٹیکنالوجی کی مدد سے بیلسٹک میزائل بنا سکیں۔ جبکہ 2006 میں اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت کسی بھی قسم کی جوہری ٹیکنالوجی یا مواد کی ایران کو فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ اس میں ایسا سامان بھی شامل تھا جسے کسی اور مقصد کے ساتھ ساتھ عسکری مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تین ہی ماہ بعد اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے ایک اور قرارداد میں ایران سے روایتی ہتھیاروں یا اسلحہ کی لین دین پر بھی مکمل پابندی لگا دی جس میں عسکری ٹیکنالوجی بھی شامل تھی۔ اس قرارداد کے تحت لگنے والی پابندیوں کی زد میں ایران کے جوہری پروگرام کے ساتھ ساتھ بیلسٹک میزائل پروگرام بھی آ گیا۔ ایسے میں ایران کیلئے روس اور چین جیسے ممالک سے بھی اسلحہ خریدنا ممکن نہ رہا جن سے وہ عراق جنگ کے وقت سے سامان خرید رہا تھا تاہم ایرانی رہبر اعلیٰ خامنہ ای نے حال ہی میں ایک خطاب میں واضح کر دیا کہ "جس عسکری اور میزائل پروگرام سے مغرب پریشان ہے، وہ سب پابندیوں کے دوران بنا۔ ایران نے گذشتہ دو دہائیوں کے دوران شدید نوعیت کی بین الاقوامی پابندیوں کے باوجود یہ ٹیکنالوجی حاصل بھی کی اور بیلسٹک میزائل تیار بھی کیے"۔ بیلسٹک میزائل جوہری وار ہیڈ (یعنی جوہری ہتھیار) لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مغربی ممالک کے مطابق چونکہ ایران نے بیلسٹک ٹیکنالوجی حاصل کر لی ہے اس لیے وہ جوہری توانائی کے حصول اور جوہری ہتھیار بنانے کیلئے ضروری سطح تک یورینیم کو افزودہ کرنے کی کوئی

کوشش ترک نہیں کرے گا۔ جولائی 2015 میں ایران اور چھ عالمی طاقتوں کے درمیان مشترکہ جامع پلان آف ایکشن معاہدے کے اختتام اور پھر " قرارداد 2231 " کی منظوری کے بعد، ایران کے خلاف اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تمام پابندیاں ہٹادی گئیں لیکن "ٹرگر / سنیپ بیک میکانزم " کے نام سے جانی جانے والی شق نے ہتھیاروں کی پابندیوں کو برقرار رکھا جس کے تحت خاص طور پر پانچ سال تک ایران کے میزائل پروگرام کی نگرانی ہونی تھی۔ یہ ایران پر دباؤ ڈالنے اور اس کے میزائل پروگرام کو کنٹرول کرنے کا ایک حربہ تھا۔

تاہم ایران نے اپنا میزائل پروگرام اس حد تک بڑھایا کہ مارچ 2016 میں امریکا، برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو ایک مشترکہ خط لکھتے ہوئے ایران پر میزائل تجربات کرنے کا الزام لگایا کہ اس نے " جے سی پی اوا ے" معاہدے کے بعد سلامتی کونسل کی " قرارداد 2231 " کی خلاف ورزی کی ہے۔ بالآخر 2020 میں امریکا کے سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایران کے میزائل پروگرام کے خطرے سے نمٹنے اور اس پروگرام کا معائنہ اور تصدیق کرنے کیلئے درکار طریقۂ کار کی کمی کا الزام لگا کر اس معاہدے سے دستبرداری کا اعلان کردیا۔

اگرچہ ایران نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ مشترکہ جامع پلان آف ایکشن کا حصہ ہے لیکن قرارداد 2231 میں طے شدہ ڈیڈ لائن کے خاتمے کے ساتھ ہی، روحانی حکومت نے اکتوبر 2021 میں روس اور چین سے ہتھیاروں کی خریداری کیلئے اشتہارات دیے لیکن عالمی پابندیوں کی بناء پر ایران اب تک اپنی ان کوششوں می کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایران اس وقت 50 سے زیادہ قسم کے راکٹ، بیلسٹک اور کروز میزائلوں کے ساتھ ساتھ عسکری ڈرونز تیار کرتا ہے، جن میں سے کچھ روس اور یوکرین کی جنگ جیسے عالمی تنازعات میں استعمال بھی ہوئے ہیں۔

ایران، عراق جنگ کے دوران ایران کے توپ خانے کی مار کرنے کی حد 35 کلومیٹر تھی جبکہ عراقی فوج کے پاس 300 کلومیٹر تک مار کرنے والے "سکڈ بی " بیلسٹک میزائل تھے، جو ایران کے اندر مختلف شہروں کو نشانہ بناتے تھے۔ جب عراقی فوج نے میزائل حملوں کی بنیاد پر برتری حاصل کی تو ایران نے بھی میزائل استعمال کرنے کا سوچا اور اس وقت ایرانی رہبر روح اللہ خمینی نے عراق کے میزائل حملوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی۔ نومبر 1984 میں حسن تہرانی مقدم کی سربراہی میں "پاسدارانِ انقلاب کی ایرو سپیس فورس کے کمانڈر امیر علی حاجی زادہ، میزائل یونٹ کی تشکیل کے ذمہ دار بنے اور میزائل سرگرمیوں کیلئے ایران کے مغرب میں واقع شہر کرمان میں پہلا اڈہ تیار کرتے ہوئے میزائل " کمانڈ کا آغاز کیا گیا۔ 1985 میں پہلی بار لیبیا سے روسی ساختہ "سکڈ بی" میزائل خریدے اور 30 میزائلوں کی کھیپ کے ساتھ ہی لیبیا سے تکنیکی مدد کیلئے مشیر بھی ایران آئے اور میزائل آپریشن اُن کی مدد سے ہی سرانجام پایا۔

عراق پر ایران کی جانب سے پہلا میزائل حملہ 21 مارچ 1985 کو ہوا جس میں کرکوک شہر کو نشانہ بنایا گیا۔ دو دن بعد، دوسرا ایرانی حملہ بغداد میں عراقی آرمی آفیسرز کلب پر کیا گیا جس میں تقریباً 200 عراقی کمانڈر مارے گئے۔ ایران کے اِن میزائل حملوں کے بعد عرب ممالک کی جانب سے لیبیا سے شدید احتجاج کیا گیا جس کے نتیجے میں لیبیا کے مشیروں نے ایران چھوڑ دیا اور جانے سے پہلے میزائلوں اور لانچنگ سسٹم کو ناکارہ بھی کر دیا۔ اس صدمے کے بعد ایرانی فضائیہ کے ارکان کے ایک گروپ نے خود ان میزائلوں کی آزمائش کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آئی آر جی سی کے ارکان کے اس چھوٹے سے گروپ نے راکٹوں اور لانچروں کے پرزے کھول کر اُن کی ریورس انجینئرنگ شروع کی۔

حسن تہرانی مقدم، جنہیں "اسلامی جمہوریہ ایران کے میزائل پروگرام کا باپ" کہا جاتا ہے، "زیرو ٹو ون ہنڈرڈ میزائل پروگرام "نامی دستاویزی فلم میں

دکھایا گیا کہ ایران سے لیبیا کے مشیروں کی روانگی کے بعد پاسداران انقلاب کے 13 ارکان کو سکڈ بیلسٹک میزائلوں پر کام کی تربیت کیلئے شام بھیجا گیا اور ایک محدود وقت کے اندر انہوں نے سکڈ میزائل کے کام کو سمجھ لیا۔ 1986ء میں مقدم کو ایرانی فضائیہ کا میزائل کمانڈر مقرر کیا گیا اور پھر 1988 کے بعد سے ایرانی پاسدارانِ انقلاب کو رنے سنجیدگی سے میزائل بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

سٹمسن انسٹیٹیوٹ میں عالمی سلامتی اور اس سے منسلک ٹیکنالوجیز کے محقق اور نیٹو کے اسلحہ کنٹرول پروگرام کے سابق ڈائریکٹر ولیم البرک کے مطابق "ان برسوں میں چین اور شمالی کوریا نے بھی ایران کے ساتھ وسیع پیمانے پر میزائلوں کے حوالے سے تعاون کیا تھا اور بعد میں ایران کو اپنے میزائل پروگرام کو بڑھانے کیلئے روس کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایران ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ملک ہے اور اس نے ریورس انجینئرنگ کر کے ان میزائلوں کے پرزوں کو الگ کرنے اور اسے دوبارہ ترتیب دینے کا طریقہ سیکھنے کے حوالے سے کافی مؤثر تحقیق کی ہے"۔

1980 کی دہائی میں شمالی کوریا اور بعد میں چین ایران کے میزائل پروگرام کی مدد کو آئے۔ نتیجتاً، کچھ عالمی طاقتوں نے چین کو "میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول رجیم" کا رکن بنانے کی کوشش کی، جو کہ میزائلوں کی پیداوار، ترقی اور ٹیکنالوجی کو محدود کرنے کیلئے 35 رکن ممالک کے درمیان ایک غیر رسمی سیاسی مفاہمت ہے۔ چین اس معاہدے کا حصہ بننے پر تو راضی نہ ہوا لیکن اس نے معاہدے کی شرائط پر کاربند رہنے کا عہد ضرور کیا۔

"نازعات" اور "مجتمع" راکٹ ایران میں بنائے گئے راکٹوں کی پہلی نسل تھے، اور اس کے فوراً بعد "تھنڈر-69" میزائل سامنے آیا جو بنیادی طور پر مختصر فاصلے تک مار کرنے والا چینی B610 بیلسٹک میزائل ہے، جسے ایرانی مسلح افواج نئے سرے سے ڈیزائن کر لیا ہے۔ ایران کے میزائل پروگرام کی ترقی، پاسداران انقلاب کے ایروسپیس میزائل یونٹ میں حسن تہرانی مقدم کی نگرانی میں اور اُس وقت آئی آر جی سی ایئر فورس کے کمانڈر احمد کاظمی کی مدد سے 2000 کی دہائی کے اوائل میں شروع ہوئی تھی تاکہ مزید جدید ٹیکنالوجیز جیسے بیلسٹکس اور سیٹلائٹ انجن کی تعمیر میں کامیابی حاصل کی جاسکے۔

تاہم ایران کے میزائل پروگرام کے دوسرے اور سنجیدہ مرحلے کا آغاز "فتح 110" میزائل کی تیاری سے ہوا۔ ایران کے میزائل پروگرام کی ترقی میں حسن مقدم سب سے اہم شخصیت تھے۔ 2009 میں انہوں نے ایک پروگرام کے دوران پہلی بار "ایکسٹرا ہیوی سیٹلائٹ انجن" سیریز کا تجربہ کیا۔ ایرانی اہم ذرائع کے مطابق 12 نومبر 2011ء کو فوجی اڈے پر تخریب کاری کے نتیجے میں ہونے والے دھماکے میں 16 / افراد سمیت حسن تہرانی مقدم اس وقت مارے گئے جب وہ ایک نئے میزائل تجربے کی تیاری کر رہے تھے۔ دھماکے کی اصل وجہ کا کبھی تعین نہیں ہو سکا لیکن حسن مقدم ہی تھے جن کی قبر پر لکھا گیا تھا کہ "یہاں وہ شخص دفن ہے جو اسرائیل کو تباہ کرنا چاہتا تھا"۔ اس وقت امیر علی حاجی زادہ کی سربراہی میں پاسداران انقلاب کی ایروسپیس فورس، ایران کی مسلح افواج کیلئے میزائل اور ڈرونز بنانے والا سب سے بڑا ادارہ ہے اور گزشتہ برسوں میں، یہ دراصل ایرانی فوج کی جگہ اسلامی جمہوریہ کی بیرون ملک کارروائیوں کی ذمہ دار رہی ہے۔

اگرچہ ایران ہمیشہ اپنے میزائلوں کی نمائش کرتا ہے اور انہیں فوجی ہتھیاروں کی تیاری کے میدان میں ایک اہم کامیابی کے طور پر پیش کرتا ہے تاہم اس کے میزائل پروگرام اور میزائل اڈوں کی ترقی اور اُن پر ہونے والی پیشرفت اب تک کوئی نہیں جان سکا۔ پاسداران انقلاب کے مطابق اُن کے پاس سنگلاخ پہاڑوں میں سرنگوں کی شکل میں خصوصی انجینئرنگ اور ڈرلنگ کے ساتھ بنائے گئے کئی میزائل اڈے ہیں۔ پہلی مرتبہ 2004ء میں آئی آر جی سی فضائیہ کے کمانڈر امیر علی حاجی زادہ نے ایسے میزائل اڈوں کے بارے میں بات کی تھی جو ایران کے مختلف صوبوں میں زمین سے 500 میٹر نیچے تک کی گہرائی میں بنائے گئے ہیں۔

اِن زیرِ زمین میزائل اڈوں کی تعمیر کب ہوئی اس بارے میں باوثوق معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن مہدی بختیاری نے الجزیرہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ مغربی ایران میں 1984ء میں میزائل پروگرام کے آغاز میں پہلا زیرِ زمین اڈہ بنالیا گیا تھا۔ ایرانی میڈیا اور پاسداران انقلاب نے اب تک کئی زیر زمین میزائل اڈوں کی مختلف تصاویر شائع کی ہیں، جنہیں وہ "میزائل سٹی" کہتے ہیں۔ ان میزائل اڈوں کا صحیح مقام معلوم نہیں اور نہ ہی سرکاری طور پر اس کے بارے میں کوئی اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔ ان خفیہ زیر زمین اڈوں کی شائع ہونے والی تصاویر کے مطابق ان میں سے ایک میں، جو دیگر اڈوں سے بڑا معلوم ہوتا ہے، پاسداران انقلاب کے سب سے اہم میزائل اور ڈرون ہتھیار رکھے گئے ہیں اور ساتھ ہی میزائلوں کی تیاری اور انہیں داغنے کی جگہ (لانچرز) ہے۔ جاری کی گئی ویڈیوز میں سے ایک میں میزائل اور ان کے لانچروں سے بھری راہداری دکھائی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ جگہ بھی جہاں میزائل فائر کیے جانے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

مارچ 2019 میں پاسداران انقلاب نے خلیج فارس کے ساحل پر ایک "سمندری میزائل شہر" کی نقاب کشائی کی۔ اس اڈے کے اصل مقام کو ماضی کی طرح ظاہر نہیں کیا گیا لیکن صوبہ ہرمزگان کے مقامی میڈیا نے اس اڈے کے بارے میں خبریں دیں۔ سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کے کمانڈر انچیف حسین سلامی نے خلیج فارس کے ساحلوں پر اس "میرین میزائل سٹی" کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ کمپلیکس پاسداران انقلاب اسلامی کی بحریہ کی سٹریٹجک میزائلوں کے ذخیرہ کرنے کی متعدد تنصیبات میں سے ایک ہے، جہاں میزائل اور لانچر سسٹم نصب ہیں"۔

ایران کے زیرزمین میزائل اڈوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے لیکن ایران کی زمینی افواج کے کمانڈر، احمد رضا پوردستان نے جنوری 2014 میں اعلان کیا تھا کہ میزائلوں والے زیرِ زمین شہر صرف پاسداران انقلاب کیلئے مخصوص نہیں ہیں اور ایرانی فوج بھی ان میں سے کئی کی مالک ہے۔ امیر علی حاجی زادہ، آئی آر جی سی کی جانب سے ایران میں میزائل بنانے والے تین زیرزمین کارخانوں کی موجودگی کا اعلان بھی کر چکے ہیں۔ ایران کی مسلح افواج، خاص طور پر پاسدارانِ انقلاب کی ایروسپیس فورس، راکٹ، کروز اور بیلیسٹک میزائلوں کی ایک وسیع رینج تیار کرتی ہے۔

.بیلسٹک میزائل ایران میں تیار کیے جانے والے میزائلوں کی سب سے اہم قسم ہے۔ بیلسٹک میزائل اونچائی پر اور ایک قوس میں پرواز کرتا ہے۔ اس کی فائرنگ کے تین مراحل ہوتے ہیں، دوسرے مرحلے میں اس کی رفتار تقریباً 24 ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہو جاتی ہے۔ طویل فاصلے تک مار کرنے والے .بیلسٹک میزائل داغے جانے کے بعد زمین کی فضا سے باہر نکل جاتے ہیں اور فضا میں دوبارہ داخل ہونے پر آواز کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار تک پہنچ جاتے ہیں۔ کروز میزائل مکمل طور پر گائیڈڈ ہوتے ہیں اور کم اونچائی پر پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ریڈار کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرتے ہیں۔ کروز میزائل کی رفتار 800 کلومیٹر فی گھنٹہ سے شروع ہوتی ہے۔

ایران کے پاس چار اقسام کے میزائل ہیں۔ راکٹ، کروز میزائل، بیلیسٹک میزائل اور ہائپر سونک میزائل۔ ایرانی ساختہ میزائلوں کے ان چار گروپوں میں بنیادی طور پر سطح سے سطح اور سطح سے سمندر میں مار کرنے والے میزائل شامل ہیں۔ البتہ دفاعی نظام کے میزائل بھی ایران کے ہتھیاروں میں شامل ہیں جن میں سے کچھ روس اور چین کے بنائے ہوئے ہیں اور کچھ ایرانی مسلح افواج کی اپنی ایجاد ہیں۔ اپریل 2024 میں اسرائیل پر اپنے میزائل حملے میں ایران نے "عماد تھری" بیلسٹک میزائل "پاوہ" کروز میزائل اور "شاہد 136" ڈرون کا استعمال کیا تھا تاہم ایران کی سرکاری خبر ایجنسی نے "خیبر شکن" بیلسٹک میزائل داغنے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔

عماد میزائل القدر بیلسٹک میزائل کی بہتر شکل ہے۔ 2015ء میں درمیانے فاصلے 1700 کلومیٹر تک مار کرنے والے عماد بیلسٹک میزائل کی لمبائی 15 میٹر ہے اور اس کے وار ہیڈ کا وزن 750 کلو گرام ہے۔ "پاوہ" میزائل کی فروری 2023ء میں نقاب کشائی ہوئی۔ یہ بھی درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے کروز میزائلوں کا ایک خاندان ہے جس کی رینج 1650 کلومیٹر ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ میزائلوں کی ایک نسل ہے جو ہدف تک پہنچنے کیلئے مختلف راستے اختیار کر سکتا ہے۔ پاوہ میزائل گروپ میں حملہ کرنے اور حملے کے دوران ایک دوسرے سے رابطے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایران نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ میزائل اسرائیل تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، شاید اسی وجہ سے اسے اسرائیل پر حملے کیلئے چُنا گیا تھا اور جو 13 اپریل کو ہونے والے حملے میں ثابت بھی ہوا۔

ایران کے پاس اس وقت میزائلوں کی زیادہ سے زیادہ موثر رینج دو سے ڈھائی ہزار کلومیٹر کے درمیان ہے اور وہ فی الحال یورپی ممالک کو نشانہ بنانے کے قابل نہیں ہے۔ ایران کی مسلح افواج نے دعویٰ کیا ہے کہ ایسا رہبر اعلیٰ علی خامنہ ای کی ہدایت پر ہے کہ فی الحال ایرانی میزائلوں کی رینج دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ اس ہدایت کے بعد طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی تیاری کا سلسلہ روک دیا گیا ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق اس فیصلے کی ایک "وجہ" ہے، لیکن انہوں نے وہ وجہ بیان نہیں کی۔

"ذوالفقار" ایک اور مختصر فاصلے (700 کلومیٹر) تک مار کرنے والا بیلسٹک میزائل ہے جسے 2017 اور 2018 میں داعش کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔ اس میزائل کی لمبائی 10 میٹر ہے، اس میں ایک موبائل لانچ پلیٹ فارم ہے اور اس کے ریڈار پر نظر نہ آنے کی صلاحیت سے لیس ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ ایک اور "ذوالفقار 10" میزائل کی بہتر شکل ہے اور اس کے وار ہیڈ کا وزن 450 کلو بتایا جاتا ہے۔

عالمی سلامتی کے ماہر ولیم ایلبرک کے مطابق ایران کے پاس میزائلوں کی تیاری کی بہت اچھی صلاحیت ہے اور ایران کے میزائل پروگرام کی ترقی دوسرے ممالک سے میزائلوں کو اُدھار لینے اور ان کی نقل بنانے سے ہوئی ہے: وہ مائع ایندھن سے ٹھوس ایندھن والے راکٹوں اور میزائلوں کی جانب بڑھے ہیں۔ میزائلوں کی درست طریقے سے ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے، اس لیے ایران نے اس معاملے میں بہت ترقی کی ہے اور اس وقت اس کا پروگرام مختصر اور درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک اور کروز میزائلوں کیلئے جدید ترین میزائل پروگراموں میں سے ایک ہے۔ حالیہ برسوں میں ایران اور روس کے درمیان قریبی فوجی تعاون سے ایران کو روسیوں سے سیکھنے کا موقع ملا ہے اور اس تعاون کے بدلے میں ایران کو مزید جدید میزائلوں کے ڈیزائن، ٹیکنالوجی اور صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں لیکن ایران نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کے میزائلوں کی نئی نسل ہائپر سونک ہتھیاروں کی نسل سے ہے۔ ہائپر سونک سے مراد وہ ہتھیار ہیں جن کی رفتار عام طور پر آواز کی رفتار سے پانچ سے پچیس گنا تک ہوتی ہے۔ ایران نے پہلی بار "فتح" میزائل کو بیلسٹک اور کروز دونوں زمروں میں ہائپر سونک میزائل کے طور پر متعارف کرایا۔ "الفتح" کے ہائپر سونک میزائل

کی رینج 1400 کلومیٹر ہے اور آئی آر جی سی نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ میزائل کو تباہ کرنے والے تمام دفاعی نظاموں کو چکمہ دے کر انہیں تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"الفتح" ٹھوس ایندھن کے میزائلوں کی ایک نسل ہے جس کی رفتار ہدف کو نشانہ بنانے سے پہلے 13 سے 15 میک تک ہے۔میک 15 کا مطلب پانچ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار ہے۔

پاسداران انقلاب ایرو سپیس آرگنائزیشن کے کمانڈر امیر علی حاجی زادہ نے الفتح میزائل کی نقاب کشائی کی تقریب میں کہا تھا کہ "یہ میزائل تیز رفتار اور فضا کے اندر اور باہر جا سکتا ہے"۔ساتھ ہی حاجی زادہ نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ "فتح کو کسی میزائل سے تباہ نہیں کیا جا سکتا"۔الفتح بیلسٹک میزائل کی نقاب کشائی کے بعد تہران کے فلسطین سکوائر میں اسرائیل کو دھمکی دینے کیلئے ایک اشتہار نصب کیا گیا جس پر "400 سیکنڈز میں تل ابیب" تحریر تھا۔اس ہائپر سونک میزائل بنانے کی دھمکی کے جواب میں اسرائیل کے وزیر دفاع یوو گیلنٹ نے کہا "ہمارے دشمن اپنے بنائے ہوئے ہتھیاروں پر شیخی بگھار رہے ہیں۔ہمارے پاس کسی بھی ٹیکنالوجی کا بہتر جواب ہے، چاہے وہ زمین پر ہو، ہوا میں ہو یا سمندر میں۔"

الفتح-1 کی نقاب کشائی کے چار ماہ بعد پاسداران انقلاب نے 1500 کلومیٹر تک مار کرنے والے الفتح-2 کی نقاب کشائی کی جو بہت کم اونچائی پر پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور پرواز کے دوران کئی بار اپنا راستہ بھی بدل سکتا ہے۔اس میزائل کی نقاب کشائی رہبر اعلیٰ علی خامنہ ای کے آئی آر جی سی سے وابستہ ایرو سپیس سائنسز اینڈ ٹیکنالوجیز کی عاشورہ یونیورسٹی کے دورہ پر کی گئی تاہم اس میزائل کی رینج کے بارے میں کوئی معلومات شائع نہیں کی گئیں۔اگرچہ ایران نے فتح میزائل کو اسرائیل کے خلاف خطرے کے طور پر متعارف کروایا تھا لیکن اس نے 13 اپریل اور پھر یکم اکتوبر کے حملے میں ان میزائلوں کا استعمال نہیں کیا تھا۔

گذشتہ دہائی میں ایران مختلف وجوہات کی بنا پر علاقائی تنازعات میں شامل ہوا ہے اور اس نے اپنی سرزمین سے مخالف گروہوں، جماعتوں اور ممالک کے خلاف سرحد پار کارروائیاں کی ہیں۔ایران کی تمام بیرون ملک کارروائیاں پاسداران انقلاب کی فضائیہ نے کی ہیں اور پاسداران کے اس شعبے نے ایران کی فوج کی جگہ تنازعات میں شمولیت اور ردِ عمل کی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔اگرچہ پاسداران انقلاب کی بیرون ملک شاخ قدس فورس کی افواج ایران، عراق جنگ کے خاتمے کے بعد افغانستان سے لے کر بوسنیا اور ہرزیگوینا، عراق، شام، لبنان وغیرہ میں موجود تھیں لیکن اسے ایران کی سرکاری طور پر موجودگی یا ردعمل نہیں سمجھا گیا۔

ایران، عراق جنگ کے خاتمے کے بعد ایران کی سرزمین سے دوسرے ملک پر پہلا حملہ شام کے شہر دیر الزور میں داعش کے خلاف ہوا۔یہ آپریشن جسے "لیلۃ القدر" کا نام دیا گیا تھا، اسلامی کونسل پر داعش کے حملے کے جواب میں کیا گیا تھا۔اس میں کرمان شاہ اور کردستان سے داعش کے ہیڈ کوارٹر پر درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے چھ ذوالفقار اور قیام بیلسٹک میزائل داغے گئے تھے۔پھر عراق کے کردستان ریجن میں واقع کوئسنجق میں کردستان ڈیموکریٹک پارٹی آف ایران کے ہیڈ کوارٹر کو سات الفتح-110 میزائلوں سے نشانہ بنایا گیا۔ایک بیان میں پاسداران انقلاب نے اعلان کیا کہ یہ جولائی 2017 میں ماریوان میں سید الشہدا حمزہ بیس پر حملے کا بدلہ تھا۔

نو اکتوبر 2017 کو ایران کے پاسداران انقلاب نے اہواز میں مسلح افواج کی پریڈ پر حملے کا جواب دیتے ہوئے "محرم کا حملہ" نامی آپریشن میں شام میں چھ قیام اور ذوالفقار میزائلوں کے علاوہ سات جنگی ڈرونز کی مدد سے دریائے فرات کے کنارے داعش کے ٹھکانوں کو تباہ کر دیا۔18 جنوری 2018 کو عراق

میں امریکا کے ہاتھوں قدس فورس کے کمانڈر قاسم سلیمانی کی ہلاکت کے جواب میں پاسداران انقلاب کی فضائیہ نے 13 فتح-313 اور قیام-2 بیلسٹک میزائل عراق میں امریکی فوج کے سب سے بڑے اڈے عین الاسد پر داغے۔ اس کے علاوہ عراق کے کردستان خطے کے دارالحکومت اربیل میں ایک اڈے پر بھی حملہ کیا گیا۔ قاسم سلیمانی کی ہلاکت کے بعد ہمسایہ ممالک پر ایران کے میزائل حملوں کی شدت میں اضافہ دیکھا گیا۔ پھر مارچ 2002 میں اسلامی انقلاب گارڈ نے بز کریم بزنجی کے ملکیتی مکان پر 12 فاتح، 110 بیلسٹک میزائل فائر کیے جس کے بارے میں ایران کا دعویٰ تھا کہ یہ کردستان کے علاقے میں اسرائیل کے "سٹریٹیجک مراکز" میں سے ایک تھا۔

اگلے برس پاسداران انقلاب کی فضائیہ نے "ربیع 1" اور "ربیع 2" نامی کارروائیوں میں عراقی کردستان میں ایرانی کرد پارٹیوں کے ہیڈ کوارٹر پر فتح 360 میزائلوں سے حملہ کیا۔ جنوری 2004 میں آئی آر جی سی نے ایک بار پھر عراقی تاجر کے مکان پر حملہ کیا جسے اس نے موساد کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا تھا اور ساتھ ہی ادلب میں داعش اور حزب الترکستانی کے اڈوں پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔ 16 جنوری 2024 کو اسلامی انقلابی گارڈ کی فضائیہ نے پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے ایک سرحدی گاؤں "سبز کوہ" کے رہائشی علاقے میں جیش العدل گروپ کے مرکز پر میزائل سے حملہ کیا جس کے اگلے ہی دن پاکستان نے ایران کے صوبہ سیستان اور بلوچستان میں کئی مقامات پر میزائل داغے۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی ملک نے ایران کے میزائل حملوں پر براہ راست ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ اس تناؤ کے درجہ حرارت کو کم کرنے کیلئے تیز تر کوششوں کے نتیجے میں ایرانی وزیر خارجہ نے پاکستان کا دورہ کیا اور بعد ازاں ایرانی صدر کے پاکستانی دورہ نے حالات کو معمول پر لانے میں کافی مدد کی۔

دمشق میں ایران کے قونصل خانے کی عمارت پر اسرائیلی میزائل حملے میں ایرانی جرنیل محمد رضا زاہدی اور آئی آر جی سی کے چھ دیگر افسران کی ہلاکت کے بعد ایران نے "وحدۃ الصادق" نامی آپریشن کے دوران سینکڑوں ڈرونز، کروز اور بیلسٹک میزائلوں سے اسرائیل میں مختلف مقامات پر حملہ کیا۔ ایران نے دعویٰ کیا کہ اس حملے میں گولان کی پہاڑیوں میں نوواتیم فضائی اڈے اور سیری ہرمون بیس کو نشانہ بنایا گیا۔

عالمی سلامتی کے ایک محقق ولیم ایلبرک کے مطابق اسرائیل پر ایرانی میزائل حملے میں ہدف کو نشانہ بنانے اور درست ہدف تک پہنچنے میں ایرانی میزائلوں کی صلاحیت میں کمی کسی حد تک نظر آئی لیکن ایران نے اس حملے سے اسرائیل کی دفاعی صلاحیتوں کے بارے میں بلکہ ایرانی میزائلوں کو پسپا کرنے کیلئے اسرائیل کے ساتھ شامل دیگر ممالک کے بارے میں بھی بہت کچھ جان لیا"۔

انقلابِ ایران سے پہلے ایران کا سب سے بڑا اتحادی امریکا تھا اور زیادہ تر فوجی ہتھیار، جن میں بنیادی طور پر لڑاکا طیارے شامل تھے، امریکا سے خریدے گئے تھے۔ ایران نے 160 ایف فائیو لڑاکا طیارے خریدے جو ان ممالک کیلئے سستے لڑاکا طیارے کے طور پر بنائے گئے تھے جو مہنگے لڑاکا طیارے نہیں خرید سکتے تھے۔ پہلوی دور حکومت میں ایران کیلئے میکڈونل ڈگلس ایف فور جنگی طیاروں کی ایک بڑی تعداد بھی خریدی گئی تھی جو آج بھی فضائی بیڑے میں موجود ہیں۔ پھر شاہ ایران نے انہیں ایک نئے لڑاکا طیارے سے تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور 60 ایف 16 ٹام کیٹ طیارے خریدے گئے۔ اس وقت ایران مشرقِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ جنگی طیارے رکھنے والے ممالک میں سے ایک تھا۔

اسلامی انقلاب کے بعد تہران میں سفارت خانے پر حملے اور قبضے کی وجہ سے ایران اور امریکا کے تعلقات ہمیشہ کیلئے منقطع ہو گئے۔ اسلحے کی پابندی سمیت مختلف امریکی پابندیوں کے نتیجے میں ایران کو نشانہ بنایا گیا اور چونکہ جدید ہتھیاروں اور جنگی طیاروں کا حصول ممکن نہیں تھا اور جنگ کے دوران عراق کے

بیلسٹک میزائلوں نے ایران کو اندر تک نشانہ بنایا سو اس وجہ سے اس نے راکٹ پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایسے میں ایران کیلئے میزائل پروگرام بہترین انتخاب تھا جو اسے دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا تھا اور جنگ کی صورت میں اس کی رسائی دوسرے ممالک تک بھی ہو جاتی۔ اسی وجہ سے اس وقت ایران کا میزائل پروگرام اس ملک کے جدید ترین اور اہم ترین ہتھیاروں کے پروگراموں میں شمار ہوتا ہے۔ عالمی سلامتی اور اس سے منسلک ٹیکنالوجیز کے محققین کے مطابق یہ میزائل، لڑاکا طیاروں کا ایک بہترین متبادل تھے جن کیلئے زیادہ تربیت اور پائلٹوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور انہیں داغنا آسان تھا۔ اب ایران اپنے طور پر میزائل تیار کر سکتا ہے اور میزائل جنگی طیاروں سے بہت سستے ہیں۔ ایسی بہت سی وجوہات ہیں کہ ایران میزائلوں کی تلاش میں ہے۔

جیسے جیسے ایران کا میزائلوں کے بارے میں علم اور اسلحہ خانہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے، علاقائی تنازعات اور کشیدگی کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ ایران اب تک خطے کے ممالک کے خلاف کیے جانے والے میزائل حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا ہے لیکن یہ دیکھنا باقی ہے کہ مغرب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا یہ سٹریٹیجک صبر کہاں تک جاتا ہے، اور دوسری طرف کیا ایران اپنے میزائل پروگرام کے بارے میں دوبارہ غور کرتے ہوئے ان کی رینج بڑھانے پر مجبور ہو گا۔ اب یہ لمحہ فکر معاملہ اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کیلئے ہے کہ وہ اس معاملے کو کس قدر سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

بروز سوموار 25 ربیع الآخر 1446ھ 28/اکتوبر 2024ء

ماضی کی گونج: آج کے امریکی مسلمان

امریکا میں عمومی طور پر رائے عامہ کے جائزوں کے ذریعے پیشگوئی کی جاتی ہے وائٹ ہاؤس کا اگلا مکین کون ہو گا، کون سا صدارتی امیدوار عوامی مقبولیت کی کس سطح پر کھڑا ہے۔ کیا یہ جائزے درست بھی ثابت ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ اگلے چند دنوں میں دنیا کے سامنے آجائے گا لیکن مشرقِ وسطیٰ میں جاری کشیدگی اور شدید تناؤ کی صورتحال میں امریکی مسلمان کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، 2009ء میں معروف مصنفہ "سوھیلا سنی" کی شاہکار انگریزی کتاب (American Islam: The Struggle for the Soul of a Religion) امریکن اسلام: دی سٹرگل فار دی سول آف اے ریلیجن" میں امریکی مسلمانوں کے چیلنجز، حقوق اور ثقافتی مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس سے ماضی کی تاریخ میں اسلام کی گونج، امریکا میں مسلمانوں کی تاریخ اور ماضی سے حال تک اسلام فوبیا کی بڑی دلچسپ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ آیئے اس کتاب کے تناظر میں موجودہ امریکی انتخابات میں مسلمانوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں:

امریکا کے تیسرے صدر اور اعلانِ آزادی کے خالق تھامس جیفرسن کے پاس نہ صرف یہ کہ قرآن کا نسخہ تھا بلکہ انہوں نے اسلام کو امریکی معاشرے کی تصویر کے ایک ممکنہ رنگ کے طور پر دیکھا اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کی کوشش بھی کی۔ تھامس جیفرسن نے مسلمانوں کو نئی ابھرتی ہوئی امریکی ریاست کے ممکنہ شہریوں کے روپ میں دیکھا۔ امریکا کا اعلانِ آزادی تحریر کرنے سے 11 سال قبل انہوں نے قرآن کا نسخہ خریدا تھا۔ تھامس جیفرسن کا قرآن کا وہ نسخہ آج بھی کانگریس کی لائبریری میں محفوظ ہے اور امریکیوں کے اجداد اور اسلام کے تعلقات کی علامت ہے۔ امریکی راست گو دانشوروں کیلئے یہ تعلقات آج بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

تھامس جیفرسن کے پاس قرآن کے نسخے کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لیتے تھے مگر اس امر کی وضاحت نہیں ہوتی کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی چاہتے تھے۔ تھامس جیفرسن نے بنیادی حقوق پر اسلامی تصور سے پہلی شناسائی سترہویں صدی کے انگریز فلسفی جان لاک کی تحریروں سے حاصل کی۔ جان لاک نے یورپی معاشروں پر زور دیا تھا کہ وہ مسلمانوں اور یہودیوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کریں۔ جان لاک نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی جنہوں نے یہ نکتہ ایک صدی قبل سمجھ لیا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق سے متعلق تھامس جیفرسن کا تصور بحیرۂ اوقیانوس کے آر پار سولہویں سے انیسویں صدی عیسوی تک کے فکری ارتقا کی روشنی میں زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

جب یورپ میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تب بہت سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس امر کی نشانی کے طور پر آزمایا کہ نظریاتی معاملات میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کے حوالے سے تحمل اور رواداری کی حد کیا ہو سکتی ہے۔ یورپ میں قائم ہونے والی نظیروں کی بنیاد پر امریکا میں بھی مسلمان، ''شہریت کی حدود اور رواداری'' کے حوالے سے بحث کا موضوع بن گئے۔ نئی حکومت کی تیاریوں کے دوران جب امریکا کے بانیان نے (جو تمام کے تمام پروٹسٹنٹ تھے) مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو دی جانے والی مذہبی آزادی کے بارے میں غور کیا تو اس حوالے سے اسلامی دنیا میں پائی جانے والی نظیروں کے حوالے دیے۔ امریکا کی بانی نسل نے اس نکتے پر خصوصی بحث کی کہ امریکا کو مذہبی اعتبار سے پروٹسٹنٹ ہونا چاہیے یا تمام مذاہب کے پیروکاروں کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے۔ اس نکتے پر بھی پورے اہتمام سے بحث کی گئی کہ اگر تمام مذاہب کے پیروکاروں

کو قبول ہی کرنا ہے تو کیا کسی بھی غیر پروٹسٹنٹ کو صدر کے منصب تک پہنچنے کی اجازت دی جانی چاہیے؟ اس سے انہیں مذہبی آزادی سے متعلق امور پر غور کرنے کی تحریک ملی۔ انہوں نے کئی باتیں سوچیں مثلاً یہ کہ کیا امریکا میں کوئی ایسی اسٹیبلشمنٹ قائم ہونی چاہیے، جو پروٹسٹنٹ فرقے کو تحفظ فراہم کرتی ہو۔ اس کا بنیادی مقصد مذہب کو ریاست سے الگ رکھنے کا انتظام یقینی بنانا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آئین میں مذہب سے متعلق ٹیسٹ کا معاملہ بھی شامل کیا جانا تھا، جیسا کہ 19 ویں صدی تک ریاستوں میں رہا۔

مسلمانوں کی شہریت کے خلاف مزاحمت کا تصور 18 ویں صدی تک حیرت انگیز نہ تھا۔ امریکیوں کو یورپ سے مذہب کے پیشوایانہ اور سیاسی کردار پر کم و بیش ایک ہزار سال کے منفی خیالات ترکے میں ملے تھے۔ مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے منفی تاثر کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ امریکا کے ابتدائی دور کی چند اہم ترین شخصیات نے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کو امریکا کے متوقع شہریوں کی حیثیت سے سوچا ہی نہ جائے۔ بانیانِ امریکا نے مسلمانوں کا ایسے شہریوں کے روپ میں تصور کیا جنہیں تمام حقوق میسر ہوں۔ مسلمانوں کے حقوق کے دفاع سے متعلق بانیانِ امریکا کا یہ حیرت انگیز موقف دراصل یورپ میں سیاسی فکر کے ہزار سالہ ارتقا کا منطقی نتیجہ اور اس کی توسیع کے مترادف تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شدید مخالفت کی فضا میں بھی مسلمانوں کو تمام حقوق کے ساتھ شہری بنانے کا تصور امریکا میں کیوں کر محفوظ رہا؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اس تصور کا 21 ویں صدی میں مستقبل کیا ہے؟

انہوں یہ کتاب ہمیں امریکا کے قیام کے ابتدائی دور میں چند نمایاں شخصیات کے ان تصورات سے آگاہ کرتی ہے، جو وہ اسلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ نے اسلام کے بارے میں پائی جانے والی منفی آرا کو جوں کا توں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یورپ نے انہیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں برداشت کا رویہ نہ اپنانے کی غیر محسوس تعلیم دی تھی، مگر انہوں نے اس تعلیم کو قبول نہ کیا۔

امریکا کے بیشتر پروٹسٹنٹ باشندے یہ تصور رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے خیالات کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے ایک طرف تو پروٹسٹنٹس میں "اسٹیٹس کو" کی راہ ہموار ہوئی اور دوسری طرف امریکا کے دیگر باشندے یہ سوچنے پر مائل ہوئے کہ دوسروں کی بات سننے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایک طرف اگر مسلمانوں کو قبول نہ کرنے کی سوچ پروان چڑھی تو دوسری طرف امریکیوں کی اکثریت نے یہ سوچنا شروع کیا کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی قبول کرنا چاہیے تاکہ معاشرے میں امتیازی روّیہ نہ پایا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو بھی اپنانے کا شعور پیدا ہوا۔

یہ سب کچھ اس وقت سوچا جا رہا تھا جب مسلمان ابھی امریکا میں آئے نہ تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی انہیں قبول کرنے کی سوچ پروان چڑھائی جا رہی تھی۔ تھامس جیفرسن اور ان کے قریبی رفقا بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں سوچنے اور بحث کرنے سے امریکا میں حقوق کے حوالے سے آفاقیت کی راہ ہموار ہو گی اور پھر یہ ہوا کہ امریکا میں اقلیتوں (کیتھولک عیسائی اور یہودی) کو قبول کرنے اور معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے حوالے سے فکر آگے بڑھی۔ مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث نے امریکا میں یہ تصور پیدا کیا کہ سب کو کھلے دل سے قبول کیا جائے۔

امریکا کو برطانیہ سے حقیقی آزادی 1783ء میں ملی۔ اس سال جارج واشنگٹن نے نیویارک میں سکونت پذیر آئرش کیتھولک عیسائیوں کو خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف 25 ہزار کیتھولک عیسائی تھے، جن کے حقوق خاصے محدود تھے۔ انہیں نیویارک میں کسی بھی طرح کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کی

اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ جارج واشنگٹن نے اس نکتے پر زور دیا کہ امریکا کو ہر مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو قبول کرنا چاہیے جن پر مظالم ڈھائے گئے ہوں اور جنہیں مستقل دباؤ میں رکھا گیا ہو۔ انہوں نے یہودیوں کو بھی خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف دو ہزار یہودی تھے جارج واشنگٹن چاہتے تھے کہ امریکی سرزمین پر دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگوں، بالخصوص مذہب کے نام پر نشانہ بنائے جانے والوں کو پناہ ملے۔

1784ء میں جارج واشنگٹن نے ماؤنٹ ورنن کے مقام پر اپنے گھر پر مسلمانوں کے حوالے سے اپنے خیالات کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا۔ ورجینیا سے کسی دوست نے جارج واشنگٹن کو لکھا کہ اسے اپنا گھر بنانے کیلئے ایک بڑھئی اور ایک مستری (معمار) کی ضرورت ہے۔ جارج واشنگٹن نے اسے لکھا کہ کسی بھی مکان کی تعمیر یا فرنیچر کی تیاری میں اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ کاریگر کس مذہب، فرقے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا کاریگر ایشیا، افریقا یا یورپ کا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان، عیسائی یا یہودی ہو یا پھر یہ کہ وہ کسی مذہب پر یقین ہی نہ رکھتا ہو۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا جارج واشنگٹن کے فکری دھاروں میں مسلمان بھی بہتے تھے۔ انہوں نے "امریکا سب کیلئے" کے تصور میں مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہے جارج واشنگٹن کو اندازہ ہو کہ کسی بھی شعبے میں کوئی کردار ادا کرنے کیلئے ابھی بہت دنوں تک مسلمان نمودار نہیں ہوں گے۔

بہر حال مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ 18ویں صدی عیسوی میں بھی امریکا میں مسلمان سکونت پذیر تھے مگر تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو مستقبل کے امریکی شہری تصور کرتے ہوئے ان کا ذکر کیا تھا۔ جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کی تحریروں اور تقاریر میں مسلمانوں کا ذکر بلا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں عظیم شخصیات مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے دو متضاد یورپی رویوں اور تصورات کی وارث تھیں۔

ایک تصور یہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات پروٹسٹنٹ عیسائیت کی تعلیمات کے یکسر منافی بلکہ اس سے متصادم ہیں اور یہ کہ جابرانہ حکومتوں کے قیام میں بھی اسلامی نظریات نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ مسلمانوں کو امریکا کے پروٹسٹنٹ معاشرے میں قبول کرنے کا مطلب ایک ایسی برادری کو قبول کرنا تھا جس کے مذہب اور اس سے متعلق تصورات کو یورپ نے غلط، اجنبی اور خطرناک قرار دیا تھا۔ معاملہ مسلمانوں تک محدود نہ تھا۔ امریکی پروٹسٹنٹ تو کیتھولک عیسائیوں کے نظریات کو بھی اِسی طرح اجنبی اور خطرناک قرار دیتے تھے۔ کیتھولسزم کو بھی آزادی کے امریکی تصورات اور وسیع النظری کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔

جیفرسن اور نان پروٹسٹنٹ شہریت کی حامی دیگر شخصیات نے آئین کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ ایک اور فکری دھارے کو پروان چڑھانے میں معاونت کی، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں کو قبول کرنے کی راہ بھی ہموار ہوتی تھی۔ 16ویں صدی کے جن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے اپنے اپنے نظریات کی تبلیغ کی تھی، انہوں نے ان کیلئے جان بھی دی تھی۔ 17ویں صدی عیسوی میں یورپ کے جن لوگوں نے تمام مذاہب کو قبول کرنے اور تمام ثقافتوں اور نسلوں کے لوگوں کو اپنے ہاں قابل قبول قرار دینے کی بات کی تھی انہیں سزائے موت یا پھر قیدِ بامشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثریت کو ان نظریات کی بنیاد پر ملک سے نکال دیا گیا۔ اس معاملے میں امیر و غریب اور بے کس و طاقتور کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اشرافیہ میں سے بھی جن لوگوں نے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنانے کی بات کی، انہیں شدید مخالفت اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔

یورپ میں رومن کیتھولک چرچ سے متصادم نظریات رکھنے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کسان تھے، سیاسیات سمیت مختلف علوم کے ماہرین تھے یا پھر اوّل اوّل انگریز بیپٹسٹ۔ ان میں کوئی بھی سیاسی قوت رکھنے والا یا اعلیٰ معاشرتی حیثیت کا حامل شخص نہ تھا۔ مذہب کے لگے بندھے نظریات سے ہم

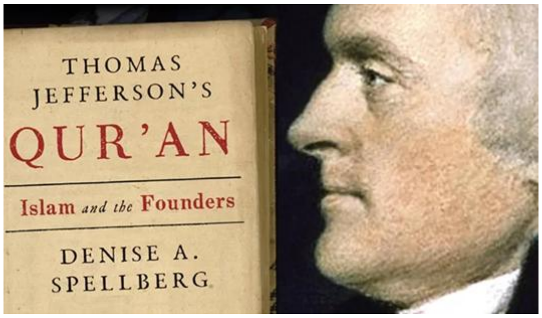

آہنگی نہ رکھنے والے اگرچہ منظم نہ تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے منظم فکر رکھنے والے مسلمانوں کو عیسائی ریاستوں میں ایذاؤں سے بچانے کیلئے خاصی وقیع جدوجہد کی۔

18ویں صدی کی اینگلیکن اسٹیبلشمنٹ کے رکن اور ورجینیا کے ایک اعلیٰ سیاست دان کی حیثیت سے تھامس جیفرسن نے وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ میں اپنے پیش کرنے والوں پر شدید لعن طعن کا سبب بنے تھے اور بہتوں کو تو سزائے موت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ تھامس جیفرسن چونکہ خود اسٹیبلشمنٹ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ان کا مؤقف ورجینیا میں پوری توجہ سے سنا گیا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر تھامس جیفرسن نے نوزائیدہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ کے مرکزی دھارے سے بہت دور جوہڑ کی شکل میں اپنی وقعت کھو بیٹھے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ تھامس جیفرسن نے تمام مذاہب کے لوگوں کو قبول کرنے اور ہر مذہب کے پیروکاروں کے حقوق کو سرکاری مداخلت سے مُبرّا رکھنے کا تصور پیش کیا اور ان پر مبارک باد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مخالفین نے ہر قدم پر ان کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے حلقوں میں جیفرسن کو غیر معمولی وقعت ملی۔ پریسبائٹیریز اور بیپٹسٹس سمیت بہت سی ایسی برادریوں نے جیفرسن کی بات پر مسرت کا اظہار کیا جو پروٹسٹنٹس کی جانب سے جبر کا سامنا کرتے رہے تھے۔ ویسے تو خیر امریکی معاشرے کا کوئی بھی طبقہ غیر پروٹسٹنٹس کو جامع امریکی شہریت دینے کے حق میں نہ تھا، مگر پھر بھی مسلمانوں کیلئے ان کے دلوں میں نرم گوشہ ضرور تھا۔

مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث شروع کرنے والے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ 18ویں صدی کے معاشرے میں محض فکری یا نظری سطح پر بھی خاصا اجنبی اور ناقابلِ قبول تھا۔ تب تک امریکی شہریت کا حقدار وہی سمجھا جاتا تھا جو پروٹسٹنٹ، سفید فام اور مرد ہو۔ شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنا لازم تھا۔ ورجینیا میں اس حوالے سے قانون سازی تو ایک بڑے سفر کی محض ابتدا تھی۔ تھامس جیفرسن، جارج واشنگٹن اور جیمز میڈیسن نے شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنے کا عمل شروع کیا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی کیریئر کے دوران اس آدرش کے حصول کیلئے غیر معمولی محنت کی مگر مکمل کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ وہ اپنا ادھورا کام بعد میں آنے والوں کیلئے فریضے کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ کتاب پہلی بار اس امر پر بحث کرتی ہے کہ کس طور جیفرسن اور ان کے ساتھی، اسلام کے بارے میں اپنے نامکمل اور مبہم تصورات کے باوجود، مسلمانوں سمیت تمام نان پروٹسٹنٹ افراد کے شہری حقوق کیلئے متحرک رہے۔

جارج واشنگٹن نے جب 1784ء میں مسلمانوں کو محنت کشوں کی حیثیت سے امریکا آنے کی اجازت دینے کی وکالت کی، اس سے ایک عشرہ قبل انہوں نے اپنی محصول پذیر املاک میں افریقی نسل کی دو عورتوں کا ذکر بھی کیا تھا، جو ماں بیٹی تھیں۔ ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا فاطمہ صغیرہ تھا۔ جارج واشنگٹن نے مسلمانوں کو امریکی شہریت دینے کی وکالت کی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو غلام کی حیثیت سے خرید کر اُنہوں نے خود ہی ان کے بنیادی حقوق کی راہ مسدود کی تھی۔ واضح رہے کہ تب تک غلام مسلمانوں کو اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ جیفرسن اور میڈیسن کی جاگیروں اور زرعی اراضی پر بھی یہی حقیقت پائی گئی ہو۔ مگر خیر، ان کے غلاموں کے مذہب کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ اس میں کوئی

شک نہیں مغربی افریقا سے محنت کشوں کے طور پر لائے گئے مسلم غلاموں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہ تعداد امریکا میں آباد کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں سے کہیں زیادہ رہی ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت سے سابق مسلم غلاموں نے کانٹی نینٹل آرمی میں بھی خدمات انجام دی ہوں۔ مگر خیر، اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اپنے مذہب پر کاربند رہے ہوں اور یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکا ہے کہ امریکا کے بانیوں کو ان کی موجودگی کا علم تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں کے شہری یا شہریتی حقوق سے متعلق بحث پر یہ سابق مسلم غلام اثر انداز نہیں ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا میں مسلمان (پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرح) 17ویں صدی سے موجود تھے مگر نسل اور غلامی کے عوامل اس قدر مضبوط تھے کہ ان کے مذہب کا معاملہ سات پردوں میں لپٹا رہا۔ امریکا کے بانیان نے جب مستقبل کے امریکی مسلمانوں کے حقوق کا سوچا تھا تو ان کے ذہن میں سفید فام مسلم ہی رہے ہوں گے کیونکہ 1790ء کے عشرے تک کسی بھی نسل یا مذہبی پس منظر کا حامل سفید فام شخص امریکا میں شہریت کیلئے درخواست دے سکتا تھا۔ جیفرسن نے صرف دو مسلمانوں سے ملاقات کی تھی اور وہ دونوں ترک نسل کے شمالی افریقی سفیر تھے۔ جیفرسن نے ان کی رنگت کے بارے میں کچھ کہا، نہ لکھا۔ دونوں بہت حد تک سفید فام تھے۔ ان دونوں میں رنگ یا مذہب کے اعتبار سے جیفرسن کیلئے کوئی کشش نہ تھی۔ اس نے ان دونوں سے ملاقات کی اور انہیں اہمیت دی تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ سیاسی و سفارتی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ اس سے قبل تھامس جیفرسن نے سفیر، وزیر خارجہ اور نائب صدر کی حیثیت سے شمالی افریقا کی ریاستوں سے امریکا کے تنازع کو مذہب کے نقطۂ نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ بحیرۂ روم اور مشرقی بحر اوقیانوس امریکی جہازرانی کو قزاقوں سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ جیفرسن نے ٹریپولی اور تیونس کے حکمرانوں پر واضح کیا کہ ان کا ملک اسلام مخالف جذبات یا تعصب نہیں رکھتا اور ایک مرحلے پر تو وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے دونوں حکمرانوں سے کہا کہ ہم بھی اُسی خدا کی عبادت کرتے ہیں، جس کے عبادت گزار آپ ہیں!

جیفرسن مذہب کو سیاست یا حکومت سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیرون ملک جن خیالات کو رواج دیا، ملک میں اُنہی خیالات کو اہمیت دی۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جیفرسن کے تصورات بنیادی طور پر شمالی افریقا کی ریاستوں سے تعلق کی بنیاد پر پروان چڑھے ہوں گے۔ یہی شمالی افریقا سے متعلق ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بھی تھے۔ یہ نکتہ بھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ جیفرسن نے ذاتی طور پر موحد ہونے کی بنیاد پر اسلامی دنیا سے اپنے تعلق کو زیادہ اہمیت دی ہوگی۔

جیفرسن کے زمانے تک اسلام کے بارے میں بہت سے منفی تاثرات اور تصورات بھی پائے جاتے تھے اور یقینی طور پر وہ ان سے پوری طرح محفوظ یا لاتعلق تو نہیں رہے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق یورپ سے ترکے میں ملنے والے چند تصورات اور مثالوں کو انہوں نے ورجینیا میں مذہب کو ریاستی یا حکومتی امور سے الگ رکھنے کی بحث میں مضبوط بنیاد کے طور پر استعمال کیا ہو۔ جیفرسن نے 18ویں اور 19ویں صدی میں اصول اور تعصب کی جس جنگ میں فتح پائی تھی، وہ اب بھی، 21ویں صدی میں، بحران کی صورت امریکیوں کے سامنے کھڑی ہے۔ 19ویں صدی کے اواخر سے اب تک امریکا میں مسلمانوں کی تعداد نمایاں رفتار سے بڑھی ہے اور اب امریکا میں آباد مسلمان نسلی تنوع اور تحرک سے متصف ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکا میں مسلمانوں کو کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا۔ جیفرسن کے زمانے میں مسلمانوں کی ایک تصوراتی آبادی کو تعصب کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ آج کے امریکا میں ان مسلمانوں پر سیاسی حملے ہو رہے ہیں، جو ایک حقیقت کی حیثیت سے امریکی معاشرے کا حصہ ہیں۔ نائن الیون

کے اور دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا میں مسلمانوں کے خلاف ایسی فضا تیار کر دی گئی ہے، جس میں سبھی اس بات کے حق میں دکھائی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے تمام بنیادی و شہری حقوق نہ دیے جائیں۔

اب امریکا میں یہ بحث بھی زور پکڑ گئی ہے کہ کوئی مسلمان امریکی صدر بننے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ بارک اوباما کے حوالے سے یہی سوال اٹھا تھا مگر یہ سوال نیا نہیں۔ امریکی سیاسی تاریخ میں جیفرسن پہلی شخصیت تھے جن پر مسلمان ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ کوئی امریکی مسلمان صدر بن سکتا ہے یا نہیں، یا اسے صدر بننے دینا چاہیے یا نہیں۔ اِس نکتے پر بحث سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے کہ امریکی شعورِ عامہ میں مسلمان کس طور داخل ہو چکا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے حقوق کس طرح ابتدائی مرحلے میں قومی آدرش کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یوں آج کے امریکا میں مسلمانوں کی شہریت کے مسئلے کو سمجھنے کیلئے 18 ویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کے حقوق سے متعلق چھڑنے والی بحث کو سمجھنا لازم ہے۔

امریکی مسلمانوں کے حقوق نے نظری سطح پر تو بہت پہلے قبولیت پالی مگر عملی دنیا میں انہیں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی مسلمانوں کو حقوق کے حوالے سے یومیہ بنیاد پر آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے امریکا میں اسلام کے معروف مورخ جان ایسپوزیٹو کو بھی مجبور ہو کر کہنا پڑا ہے کہ "امریکی مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مغربی "وسیع النظری اور رواداری یعنی کلیت پسندی کی حدود کیا ہیں؟" "ہمیں تھامس جیفرسن کا قرآن" کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کو امریکی آدرشوں کا حصہ کب، کہاں اور کس طرح بنایا گیا۔ موٗرخین نے اب تک یہ ثابت کرنے پر توانائی صرف کی ہے کہ مسلمان مکمل طور پر امریکی آدرشوں کے خلاف ہیں۔ اور یہی لوگ اس نکتے پر بھی زور دیتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ امریکیوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو فطری طور پر غیر امریکی قرار دیکر مسترد کیا ہے۔ بعض موٗرخین نے تو یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکا دراصل 18 ویں صدی میں اسلام کی شدید مخالفت اور اس کے جابرانہ طرزِ حکومت کے مآخذ کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ امریکا کی ابتدائی پالیسیوں اور حکمتِ عملی سے متعلق دستاویزات میں اس حوالے سے بہت کچھ مل بھی جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نمایاں حد تک مثبت تصورات بھی ملتے ہیں، جیسا کہ "مستقبل کے امریکی مسلم شہریوں کے حقوق" سے متعلق بحث ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تمام پروٹسٹنٹس نے اسلام کو یکسر اجنبی مذہب کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا۔

یہ کتاب اس نکتے پر روشنی ڈالتی ہے کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ غیر امریکی نہیں تھے بلکہ ملک کے قیام کے وقت ہی سے ان کی ممکنہ شہریت اور متوقع حقوق پر بحث بھی ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سے آئیڈیلز کو اس وقت کے امریکیوں کی اکثریت نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اسلام اور اسلامی دنیا کے حوالے سے جیفرسن کے نظریات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب جان ایڈمز اور جیمز میڈیسن کے خیالات کو بھی عمدگی سے بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی بحث ملک کے بانیان تک محدود نہ تھی۔ ورجینیا میں بیپٹسٹ اور پریسبائٹیرینز کی جدوجہد اور مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ان کی معرکہ آرائی کا احوال بھی اس کتاب میں ہے اور کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھنے والے مشہور وکیل جیمز آئرڈیل اور سیموئل جانسٹن کا مسلمانوں کے حقوق کیلئے آواز اٹھانا بھی اسی کتاب سے ثابت ہے۔ ایونجیلیکل بیپٹسٹ جان لیلینڈ نے، جو جیفرسن اور میڈیسن کے ساتھیوں میں سے تھے، مسلمانوں کے حقوق کیلئے کنیکٹیکٹ اور میساچوسیٹس میں آواز اٹھائی۔ ساتھ ہی انہوں نے آئین میں پائی جانے والی خامیوں، پہلی آئینی ترمیم کے نقائص اور ریاستی سطح پر مذہب کے کردار کے خلاف بھی احتجاج کیا۔

اس کتاب میں مغربی افریقا سے تعلق رکھنے والے دو مسلم غلاموں ابراہیم عبد الرحمن اور عمر ابن سعید کا تذکرہ ملتا ہے۔ عمر ابن سعید عربی جانتا تھا اور اس نے عربی میں آپ بیتی بھی لکھی تھی۔ ان دو مسلمانوں کے تذکرے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس وقت امریکا میں ہزاروں مسلمان تھے مگر انہیں مذہب پر کاربند رہنے سمیت بہت سے حقوق حاصل نہ تھے۔ انہیں شہریت کے حق سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں نے 20ویں صدی میں بھی اپنے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھی۔ انہیں جو حقوق ملے وہ آئین سے مکمل ہم آہنگ نہ تھے۔ یہ حقیقت البتہ انتہائی تلخ ہے کہ آج بھی امریکا میں مسلمان واحد برادری ہے جسے مکمل طور پر قبول نہیں کیا گیا اور آج بھی اس کے اثرات کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قصر سفید کے فرعون ٹرمپ کے یروشلم کو اسرائیل کا دار لحکومت تسلیم کرنے کے فیصلے کے تو کسی شک وشبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی کہ صرف امریکا میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے خلاف اس نے کھلا اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ جاری اسرائیلی درندگی کی امریکی انتخابات میں دونوں جماعتوں کے امیدواروں کی کھلم کھلا حمائت خطے میں گریٹر اسرائیل کی تشکیل کیلئے جاری اسرائیلی جارحیت پر عالم اسلام خاموش رہ کر اپنی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے یا پھر اپنی تقدیر کو پھر سے سنوارنے کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے؟

بروز جمعرات 28ربیع الآخر1446ھ 31/اکتوبر2024ء

امریکی دستاویزات لیک: مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی کے چیلنجز

ایران نے یکم اکتوبر کو اسرائیل پر تقریباً200 بیلسٹک میزائل داغے تھے۔ اسرائیلی فوج کے مطابق ان میں سے زیادہ تر فضا میں ہی تباہ کر دیئے گئے تھے لیکن یقیناً کچھ اپنے اہداف تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ فی الحال اسرائیل اس حملے کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کو میڈیا سے چھپا رہا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل رواں سال اپریل میں شام کے دارالحکومت دمشق میں ایرانی قونصلیٹ پر اسرائیلی حملے کے بعد ایران نے اسرائیل کی جانب ڈرونز اور میزائل داغے تھے جس کے بعد اسرائیل کو مزید محفوظ کرنے کیلئے امریکا نے ہنگامی بنیادوں پر کام شروع کر رکھا ہے۔ خطے میں مسلسل مزید کسی خوفناک جنگ کے بادل ابھی تک منڈلا رہے ہیں۔

چند دن قبل انہی خطرات کی نشاندہی ایک ٹیلی گرام چینل "مڈل ایسٹ سپیکٹیٹر" نے کچھ مبینہ خفیہ امریکی دستاویزات کو شائع کر کے خطے میں جاری خطرات سے آگاہ کیا ہے کہ کس طرح امریکا کی جانب سے ایران پر حملہ کرنے کے اسرائیلی منصوبے کا جائزہ لیا گیا تھا۔ چینل کا دعویٰ ہے کہ یہ دستاویزات امریکی انٹیلیجنس سے وابستہ ایک اہلکار نے انہیں فراہم کی ہیں۔ امریکی ایوانِ نمائندگان کے سپیکر مائیک جانسن نے عالمی میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں اس بارے میں بریفنگ دی گئی ہے جس کی تفصیلات وہ فی الحال شیئر نہیں کر سکتے، تاہم انھوں نے تصدیق کی ہے کہ اس ضمن میں تحقیقات کی جا رہی ہیں کہ یہ خفیہ امریکی دستاویزات کیسے لیک ہوئیں۔ اِن دستاویزات کا لیک ہونا "انتہائی پریشان کُن" ہے۔

اس سے قبل خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس (اے پی) نے تین نامعلوم امریکی اہلکاروں کے حوالے سے بتایا تھا کہ امریکا اس بات کی تحقیقات کر رہا ہے کہ ایران پر ممکنہ اسرائیلی حملے سے متعلق واشنگٹن کے جائزے پر مبنی دو خفیہ دستاویزات کیسے لیک ہوئیں۔ ایک اور امریکی اہلکار نے اے پی کو بتایا کہ یہ دستاویزات اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ ان دستاویزات پر "ٹاپ سیکرٹ" لکھا ہے اور تاریخ 15 اور 16 اکتوبر درج ہے۔ مذکورہ ٹیلی گرام چینل تہران سے چلایا جا رہا ہے اور یہ "مزاحمت کے محور" کی خبروں کو کور کرتا ہے۔ ماضی میں اس چینل نے ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے حوالے سے میمز بھی شائع کی تھیں۔

سیٹلائٹ امیجز کے ذریعے ایران پر حملہ کرنے کی اسرائیلی تیاریوں کے حوالے سے مرتب کردہ یہ جائزہ دستاویزات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسرائیل اب بھی اپنے فوجی سازوسامان کو ایران پر حملے کیلئے نزدیکی اڈوں پر منتقل کر رہا ہے اور اس نے حال ہی میں ایک بڑی فوجی مشق بھی کی ہے۔ امریکی سپیس انٹیلیجنس ایجنسی اور امریکی نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کی جانب سے تیار کردہ یہ دستاویزات 'فائیو آئیز' یعنی امریکا، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے پانچ ملکی انٹیلیجنس اتحاد کے ساتھ شیئر کی جاتی تھیں۔

ٹیلی گرام کے بعد امریکی چینل نے بھی اس حوالے سے رپورٹ شائع کی ہے کہ امریکا تحقیقات کر رہا ہے کہ یہ دستاویزات کیسے لیک ہوئیں؟ کیا کسی نے جان بوجھ کر انہیں لیک کیا یا یہ دستاویزات ہیکنگ جیسے دیگر طریقوں سے حاصل کی گئیں۔ ایسے معاملات کی تفتیش عام طور پر امریکن فیڈرل پولیس (ایف بی اے)، وزارت دفاع اور دیگر امریکی سیکیورٹی اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تاہم ایف بی آئی نے فی الحال اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے تاہم "اے پی" کے مطابق ان دستاویزات میں سے ایک اس دستاویز سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً7 ماہ قبل امریکی سپیس انٹیلیجنس ایجنسی کے ذریعے لیک ہوئی تھی اور امریکی ایئر نیشنل گارڈ کے ایک اہلکار نے اسے لیک کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ پینٹاگون نے اِن دستاویزات کے بارے میں شائع ہونے

والی رپورٹس کا نوٹس تو لیا ہے لیکن مزید کوئی تبصرہ کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) نے بھی اے پی کی جانب سے تبصرہ کرنے کی درخواست کا جواب نہیں دیا ہے۔

یاد رہے کہ ایران کے حالیہ میزائل حملے کے بعد اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ مناسب وقت پر اور اپنے "قومی مفادات" کی بنیاد پر اس کا جواب دے گا۔ گزشتہ ہفتے واشنگٹن پوسٹ نے خبر دی تھی کہ نیتن یاہو ایران کی جوہری اور فوجی تنصیبات کی بجائے صرف فوجی مراکز کو نشانہ بنائیں گے۔ اسرائیل کے وزیر دفاع یوو گیلنٹ نے بھی حال ہی میں اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ جب اسرائیل کی طرف سے جوابی کارروائی کی جائے گی تو یہ "باقاعدہ ہدف بنا کر کی جائے گی اور مہلک" ہو گی اور یہ بھی کہ ایران اس کا اندازہ نہیں لگا پائے گا جس کے جواب میں ایرانی وزیر خارجہ عباس عراقچی نے ایران پر کسی بھی حملے کو "ریڈ لائن" قرار دیتے ہوئے خبر دار کیا ہے کہ تہران اس کا مناسب جواب دے گا۔

ایران کے وزیر خارجہ نے ترکی کے این ٹی وی چینل کو بتایا کہ اسرائیل پر ایران کے میزائل حملے میں صرف فوجی تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کے بیلسٹک میزائل حملے اسرائیل کی طرف سے حزب اللہ کے رہنما حسن نصر اللہ اور حماس کے سیاسی رہنما اسماعیل ہنیہ کے قتل کا جواب تھے مگر اب ہم نے اسرائیل میں اپنے تمام اہداف کی نشاندہی کر لی ہے اور ان پر بھی ایسا ہی حملہ کیا جائے گا"۔ اس کے ساتھ ہی ایران نے خلیجی عرب ریاستوں کو، جن میں سے بعض کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ہیں، خبر دار کیا ہے کہ وہ اپنی فضائی حدود کو اسرائیل کے ممکنہ جوابی حملے کیلئے استعمال نہ ہونے دیں کیونکہ جو بھی ملک ایران پر حملہ کرنے میں اسرائیل کی مدد کرے گا اسے کسی بھی ایرانی ردعمل کا ہدف سمجھا جائے گا۔

یاد رہے حماس کے رہنما یحییٰ سنوار کی شہادت کے بعد امریکا اسرائیل پر زور دے رہا ہے کہ وہ غزہ میں جنگ بندی کی جانب بڑھے۔ امریکا نے اسرائیل کو خبر دار کیا ہے کہ وہ لبنان کے شمال میں فوجی کارروائیوں کو مزید وسعت نہ دے اور وسیع تر علاقائی جنگ کا خطرہ مول نہ لے تاہم اسرائیل کی قیادت نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ ایران کے میزائل حملے کا جواب ضرور دے گا۔ امریکی صدر بائیڈن نے برلن میں صحافیوں کے اس سوال کہ اسرائیل کب اور کیسے ایران کے میزائل حملوں کا جواب دے گا، کا جواب دیتے ہوئے صرف "ہاں" کہا مگر انہوں نے مزید وضاحت نہیں کی۔

اہم بات یہ ہے کہ امریکا میں صدارتی انتخاب میں بھی کم وقت بچا ہے اور ایسی صورتحال میں وائٹ ہاؤس ایرانی تیل کی تنصیبات پر کسی بھی ایسے حملے کا خیر مقدم نہیں کرے گا جس کا اثر تیل کی قیمتوں پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مشرق وسطیٰ کی ایک اور جنگ میں گھسیٹا جانا چاہے گا لیکن ٹیلی گرام چینل پر لیک ہونے والی دستاویزات پر نیشنل سکیورٹی کونسل کے ترجمان جون کربی کا کہنا تھا کہ "دستاویزات لیک ہونے کے معاملے پر جو بائیڈن "گہری تشویش" کا شکار ہیں"۔ امریکی حکام اس بات کا تعین تاحال نہیں کر سکے ہیں کہ یہ دستاویزات جان بوجھ کر لیک کیے گئے ہیں یا انہیں حاصل کرنے کیلئے ہیکنگ کا سہارا لیا گیا ہے۔

عسکری تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ دستاویزات میں استعمال کی گئی ہیڈ لائنز (شہ سرخیاں) مستند نظر آتی ہیں اور اسی طرح کے الفاظ کا استعمال ماضی میں سامنے آنی والی دیگر خفیہ دستاویزات میں بھی کیا گیا ہے۔ ان پر "ٹاپ سیکرٹ" کے ساتھ ساتھ "ایف جی آئی" یعنی "فارن گورنمنٹ انٹیلی جنس" بھی لکھا ہے۔ بظاہر یہ دستاویزات "فائیو آئیز" یعنی امریکا، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے پانچ ملکی انٹیلی جنس اتحاد کے ساتھ شیئر کی جاتی تھیں۔ ان دستاویزات میں "ٹی کے" یعنی "ٹیلنٹ کی ہول" جیسے کوڈ ورڈ بھی استعمال کیے گئے ہیں جس کا مطلب سیٹلائیٹ بیسڈ سگنلز انٹیلی جنس اینڈ امیجری انٹیلی

جنس ہے۔

ان دستاویزات کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ اسرائیل ایران میں کہاں کہاں اہداف کو نشانہ بنانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس جائزہ رپورٹ کی بنیاد 14 اور 15 اکتوبر کو امریکی جی و سپیشل انٹیلیجنس ایجنسی کی جانب سے اکٹھی کی گئی معلومات کا تجزیہ ہے۔ اس جائزہ رپورٹ میں دو ایئر لانچڈ بیلسٹک میزائلوں "گولڈن ہورائزن" اور "راکس" کا ذکر بار بار آیا ہے۔ "راکس" ایک لانگ رینج (دور تک مار کرنے والا) میزائل سسٹم ہے جو کہ اسرائیلی کمپنی رافئل نے بنایا ہے اور اس کے ذریعے زمین کے اوپر اور زیرِ زمین اہداف کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ "گولڈن ہورائزن" سے مراد اسرائیل کا بلیو سپیرو میزائل سسٹم ہے جس کی رینج تقریباً دو ہزار کلومیٹر ہے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اسرائیلی فضائیہ رواں برس یکم اپریل کی ہی طرز پر ایران پر ایک اور حملے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے لیکن یہ حملہ پچھلے حملے کے مقابلے میں وسیع تر ہو گا۔ اس مرتبہ وہ اپنے اِن دور تک مار کرنے والے ہتھیاروں کا استعمال کرنے کیلئے ایران کی ممکنہ دھمکی کی بناء پر اردن کی فضائی حدود کو بھی استعمال نہیں کرے گا کیونکہ ایران پہلے ہی خبردار کر چکا ہے کہ ممکنہ اسرائیلی حملے میں جن ممالک کی فضائی حدود یا اڈے استعمال ہوئے انہیں ایران کا ٹارگٹ سمجھا جائے گا۔

ان لیک ہونے والے دستاویزات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل ایران کو مزید حملوں سے باز رکھنے کیلئے کسی بھی قسم کے جوہری آپشن کی تیاری نہیں کر رہا۔ اسرائیل کی درخواست پر امریکی حکومتوں نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ اس کے قریب ترین اتحادی یعنی اسرائیل کے پاس جوہری ہتھیار ہیں۔ ایسے میں ان دستاویزات میں جوہری ہتھیار کا ذکر آنا امریکا کیلئے شرمندگی کا باعث بن رہا ہے۔ ان دستاویزات میں اس بات کا ذکر نہیں کہ اسرائیل کب اور کون سے ایرانی اہداف کو نشانہ بنائے گا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امریکا نے اسرائیل کی جانب سے ایران کی جوہری تنصیبات اور تیل کی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی مخالفت کی ہے تو اس کے بعد پاسدارانِ انقلاب کے عسکری اڈے، اس سے جُڑی شخصیات اور بسیج فورس بچتے ہیں جو کہ ایران کے اندر اور باہر اپنے ملک کے خلاف مزاحمت کو ختم کرنے کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

جہاں تک ایران پر اسرائیلی حملے کا تعلق ہے تو بہت سی شخصیات کا ماننا ہے کہ انہیں توقع تھی کہ اسرائیل اب تک یہ کر گزرے گا لیکن رواں برس اپریل میں ایران نے بھی اسرائیل پر جوابی حملہ کرنے کیلئے 12 دن انتظار کیا تھا۔ خیال رہے اس سے قبل اسرائیل نے دمشق میں ایک ایرانی سفارتی عمارت کو نشانہ بنایا تھا جس میں پاسدارانِ انقلاب کے سات اراکین بھی ہلاک ہوئے تھے۔ ایران پر اسرائیلی حملے میں تاخیر کی ایک وجہ امریکی خدشات بھی ہو سکتے ہیں۔ امریکا نہیں چاہتا کہ اُن کے ملک میں صدارتی انتخاب سے پہلے خطے میں مزید تناؤ بڑھے تاہم دونوں صدارتی امیدواروں نے جس طرح اپنی انتخابی مہم میں اسرائیل کی کھلم کھلا حمائت کی ہے اور یحیٰی سنوار کی شہادت پر جس خوشی کا اظہار کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل امریکی انتخابات سے قبل ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا لیکن نیتن یاہو کا سابقہ کردار اس سے بالکل مختلف ہے۔

ممکنہ طور پر یہ دستاویزات کسی ایسے شخص نے افشاں کی ہیں جو ایران پر حملے کے اسرائیلی منصوبے کو ناکام بنانا چاہتا تھا۔ ایران سائبر وارفیئر کے شعبے میں بھی وسیع صلاحیتیں رکھتا ہے، اسی سبب یہ تحقیقات بھی جاری ہیں کہ کہیں دستاویزات کی یہ لیک ہیکنگ کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ اگر یہ دستاویزات اصلی ہیں

تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریب ترین دفاعی اتحادی ہونے کے باوجود بھی امریکا اسرائیل کی جاسوسی کرتا ہے۔ ان دستاویزات کے جائزے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی فضائیہ ایران کے خلاف کوئی لانگ رینج حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ان کی جانب سے کسی بھی متوقع ایرانی حملے کو روکنے کیلئے بھی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ جب اسرائیل اپنے منصوبے پر عمل کرے گا تب ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ میں شدید تناؤ کی کیفیت طاری ہو جائے گی اور کیا اس تناؤ کے رد عمل کو دنیا برداشت کر پائے گی۔

ادھر تہران اور ماسکو کے درمیان عسکری اور تکنیکی تعاون جو 2002 میں یوکرین کی جنگ سے جاری ہے، اب اس کا تعلق ایران اسرائیل جنگ میں بھی نظر آرہا ہے۔ ایران اس سے قبل روس کو جنگی ڈرون اور ہتھیاروں کی دیگر چھوٹی چھوٹی کھیپیں دے چکا ہے جنہیں روسی فوج یوکرین پر حملے کیلئے استعمال کر رہی ہے لیکن خطے میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کے بعد فوجی اور تکنیکی تعاون کو اعلیٰ سطح تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ روس ایران کو کچھ سوخوئی 35 (فلانکر) لڑاکا طیارے فروخت کر سکتا ہے۔ یہ طیارہ اصل میں مصر کو فروخت کیلئے بنایا گیا تھا لیکن ان دونوں ملکوں کے درمیان معاہدے پر کبھی عمل درآمد نہیں ہو سکا ۔ایران نے ان جنگی طیاروں کو خریدنے میں اپنی دلچسپی ظاہر کی ہے۔

اگر ایران کو یہ لڑاکا طیارے مل گئے تو ایران کے خلاف کسی بھی ملک کی فضائی کارروائیاں مزید مشکل ہو جائیں گی۔ اس وقت ایرانی فضائیہ کے پاس صرف چند درجن جنگی طیارے ہیں، جن میں سے زیادہ تر پرانے روسی اور امریکی ماڈلز ہیں جو اسلامی انقلاب 1979 سے پہلے کے دور کے ہیں۔ 70 فٹ سے زیادہ لمبا اور دو انجن والا سوخوئی ایس یو-35 روسی فضائیہ کا جدید ترین بھاری بھرکم سپر سونک لڑاکا طیارہ ہے اور اس کا ایک انجن 31 ہزار پاؤنڈز جتنی طاقت فراہم کر سکتا ہے۔ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود یہ جہاز پلک جھپکتے ہی اپنی سمت تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ 2023 کے موسم بہار میں ایرانی ریڈیو نے اقوام متحدہ میں ایران کے وفد میں شامل نامعلوم رکن کا حوالہ دیتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ جنگی طیاروں کا معاہدہ ہو گیا ہے لیکن ایران کی جانب سے طیاروں کی فراہمی کے متعلق کوئی رپورٹ جاری نہیں کی گئی۔

اس کے جواب میں روس ایران کو مختصر فاصلے تک مار کرنے والے میزائل سسٹم "پنتسیر۔ایس ون" جیسے فضائی دفاعی نظام بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہ نظام طویل فاصلے تک مار کرنے والے دفاعی نظام اور دیگر اہم اہداف کو اسرائیلی میزائل حملوں سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ خفیہ امریکی دستاویزات کے مطابق 2023 میں روسی کرائے کے جنگجو ویگنر گروپ کی جانب سے اس نظام کو حزب اللہ یا ایران کو منتقل کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس وقت امریکا کی قومی سلامتی کونسل کے ترجمان جان کربی نے اعلان کیا تھا کہ ایسی کسی کارروائی کی صورت میں امریکا "روسی افراد اور اداروں کے خلاف انسداد دہشت گردی پابندیاں لگانے کیلئے تیار ہے" تاہم ابھی تک اس منصوبے پر عمل درآمد کے بارے میں کوئی رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔

دوسری طرف ایران، روس کو آپریشنل ٹیکٹیکل یا کم فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل بھیج سکتا ہے۔ روسی فوجی ہتھیاروں میں ایسے میزائلوں کا اضافہ یوکرین میں جنگ کی موجودہ حالت پر خاصا اثر ڈالے گا۔ اسرائیل کے ساتھ جنگ کی صورت میں ایران جو اس ملک سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور ہے، کو درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی ضرورت ہو گی۔ دوسری جانب روس کو 500 کلومیٹر سے کم رینج والے ٹیکٹیکل یا کم فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے روس کو ایسے آلات کی منتقلی سے ایران کی اسرائیل پر حملہ کرنے کی صلاحیت متاثر نہیں ہو گی۔ یہ مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ اس نے ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان مزید سفارتی تناؤ پیدا کر دیا ہے۔ گزشتہ ماہ ستمبر کے اوائل میں جو بائیڈن نے یوکرین کو روسی سرزمین پر اہداف کے خلاف امریکی میزائل استعمال کرنے کی اجازت دینے پر غور کیا۔ اس وقت امریکا، فرانس، جرمنی اور برطانیہ نے سرکاری طور پر

ایران پر روس کو بیلسٹک میزائل فراہم کرنے کا الزام لگایا تھا۔ میڈیا میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ میزائل پہلے ہی روس پہنچ چکے تھے لیکن دنیا اس منافقت سے بے خبر نہیں کہ یہ تمام ممالک اس سے کہیں زیادہ خطرناک اسلحہ اسرائیل کو فراہم کر رہے ہیں۔

اگرچہ کیئو کو روس کے اندر اہداف پر حملہ کرنے کیلئے مغربی ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت نہیں ملی ہے لیکن ماسکو نے یوکرین میں ایرانی میزائل استعمال کرنے سے بھی انکار کیا ہے۔ ایران نے سرکاری طور پر ان میزائلوں کو روس بھیجنے کی تردید کی ہے۔ لڑاکا طیاروں اور بیلسٹک میزائلوں کی ممکنہ فروخت ہتھیاروں کے سب سے بڑے سودے ہیں جو میڈیا کو لیک ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک ان پر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن اس طرح کی مساوات کا امکان ایران اور روس کے درمیان فوجی اور تکنیکی تعاون کی اعلیٰ صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے جو کہ خطے کے حالات کو متاثر کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ تعاون اسرائیل کے مفادات کو متاثر کرتا ہے۔ اگرچہ روس کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات اتنے کم اور کشیدہ نہیں ہیں جتنے ان کے دوسرے مغربی ممالک کے ساتھ تعلقات ہیں لیکن یہ اتنے قریبی بھی نہیں ہیں۔ یوکرین خاص طور پر اسرائیل کے موثر فضائی دفاعی نظام جیسے آئرن ڈوم میں دلچسپی رکھتا ہے۔ گویا مستقبل میں مشرقِ وسطیٰ میں بڑھتی کشیدگی کے ساتھ ساتھ یوکرین کا مسئلہ بھی امریکا اور اس کے اتحادیوں کیلئے انتہائی خوفناک خواب بنتا دکھائی دے رہا ہے۔

بروز اتوار یکم جمادی الاول 1446ھ 3 نومبر 2024ء

امریکی اقدار اور ٹرمپ

یہ پہلا موقع تھا کہ وائٹ ہاؤس میں بیٹھے امریکی صدر جس کے پاس ایٹمی بریف کیس کا بٹن دبانے کی مکمل طاقت ہے، اس کے بارے میں امریکی الیکٹرانک میڈیا پر بیانگ دہل ایک امریکی ماہر نفسیات دلائل کے ساتھ ٹرمپ کی دماغی صحت پر اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کر رہی تھی جس سے تمام دفاعی اور سیاسی تجزیہ نگاروں میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ماہر نفسیات ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے جب سے امریکی صدر کا منصب سنبھالا ہے تب سے وہ ایسا بہت کچھ کر رہے ہیں جو امریکا کو ایک عظیم طاقت بنانے والے عوامل کے خلاف ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر ایسی باتیں اور حرکتیں کی ہیں جو ان کے منصب کے تقاضوں سے کسی بھی طور میل نہیں کھاتیں۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ جو کھلنڈراپن ان کے مزاج میں پایا جاتا ہے وہ امریکی صدر کے منصب میں بھی دکھائی دے۔ امریکا کو ایک عظیم طاقت میں تبدیل کرنے والے اصولوں، طریقوں اور خواص کو انہوں نے نشانے پر لینے کی کوشش کی ہے اور یہ بات اب بیشتر امریکی زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

عالمی سیاست کے حوالے سے کوئی بھی پیش گوئی انتہائی دشوار کام ہے۔ حالات اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ ہر پیش گوئی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور ٹرمپ کا معاملہ تو ہمیشہ سے پیچیدہ رہا ہے۔ ٹرمپ کے دورِ صدارت میں پہلے ایک سال کے دوران ایسا بہت کچھ ہوا جس کی بنیاد پر ان کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہنا انتہائی دشوار ہو گیا تھا۔ پیش گوئی کرنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ وہ اگر کچھ کہیں گے تو ٹرمپ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کر کے انہیں ناکامی وذلت سے دوچار کر دے گا۔ یہ بات البتہ پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مورخین جب ٹرمپ کے ادوار کے بارے میں لکھیں گے تو اس نکتے پر ضرور زور دیں گے کہ انہوں نے اپنے کھلنڈرے مزاج سے وہ نظم وضبط تباہ کر دیا جو امریکی صدر کیلئے لازم قرار دیا جاتا تھا۔ اب تک انہوں نے بہت کچھ اپنی خواہش کے اصول کی بنیاد پر کیا، جس کے نتیجے میں امریکا کو کئی معاملات میں تھوڑی بہت سبکی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس کو سب نے محسوس کیا کہ ٹرمپ کے پاس اپنا کوئی وژن نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسی "گرینڈ اسٹریٹیجی" تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا کہ وہ امریکی معاشرے اور قیادت کے ڈھانچے کو کوئی باضابطہ نئی شکل دینا اور بحرانوں سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس حوالے سے ان کی سنجیدگی کا گراف خاصا نیچا رہا۔

کسی بھی ملک کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی واضح اور بڑی حکمت عملی نہ ہو۔ اس مرحلے سے گزرے بغیر کوئی بھی ریاست ترقی تو کیا کرے گی، اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ پائے گی۔ امریکا کوئی عام ملک نہیں، عالمی طاقت ہے۔ اس کیلئے تو قیادت کے ڈھانچے کا مضبوط ہونا اور بیشتر بین الاقوامی معاملات میں واضح حکمت عملی کا ہونا لازم ہے۔ امریکا میں ایک زمانے سے عظیم، ہمہ گیر حکمت عملی اپنانے کا رجحان رہا ہے اور یہ رجحان محض اپنی پسند کا نہیں بلکہ مجبوری اور لازم ہے۔ امریکا سپر پاور ہے، اسے کئی ممالک سے خصوصی تعلقات استوار رکھنا پڑتے ہیں۔ ہر خطے پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ کسی بھی صدر کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ملک کی "گرینڈ اسٹریٹیجی" سے ہٹ کر کچھ کرے۔ وہ اگر نمایاں حد تک بصیرت سے محروم ہو اور مستقبل بعید کے بارے میں سوچنے اور اس حوالے سے کوئی واضح منصوبہ تیار کرنے کا اہل نہ ہو تب بھی اسے حکمت عملی کے حوالے سے بہت سے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لینا ہی پڑتی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ بظاہر بصیرت کے حامل نہیں مگر ان کیلئے بھی ممکن نہیں تھا کہ ملک کی گرینڈ اسٹریٹیجی کو نظر انداز کرتے یا اس سے مطابقت رکھنے والے اقدامات نہ کرتے۔ لیون ٹراٹسکی نے خوب کہا ہے کہ اگر کوئی صدر گرینڈ اسٹریٹیجی میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا ہو تب بھی گرینڈ اسٹریٹیجی تو اس میں دلچسپی لیتی ہی ہے۔ یعنی پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں، صرف بڑھنے کا آپشن ہے۔

یہ نکتہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ٹرمپ نے ایک اہم موقع پر امریکا کی صدارت سنبھالی تھی۔ ان کے انتخاب سے پہلے کے 70 برسوں میں امریکا نے دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد سے ایک ایسی طاقت کا کردار ادا کیا تھا جو پوری دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا بھرپور عزم اور توانائی رکھتی تھی۔ امریکا نے کئی خطوں کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کیا۔ متعدد ممالک کو تعمیر و ترقی کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور دوسری طرف کئی ممالک امریکا کے ہاتھوں خرابیوں سے بھی دوچار ہوئے۔ 1990ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا چونکہ واحد سپر پاور تھا اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ تقریباً تین عشروں پر محیط اس مدت کے دوران امریکا نے اچھا کم اور بُرا زیادہ کیا ہے۔ بعض مواقع پر صاف محسوس کیا گیا کہ امریکا کیلئے معاملات الجھے ہوئے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس کی پشت پر یا تو بدحواسی ہے یا پھر خوف۔

امریکی دفاعی تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ٹرمپ ایک ایسے وقت امریکا کے صدر منتخب ہوئے، جب چین اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آچکا تھا۔ چین ایک بڑا چیلنج ہے جس سے نمٹنے کیلئے امریکا کو اپنی "گرینڈ اسٹریٹجی" تبدیل کرنا پڑے گی۔ ایک طرف جہاں چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کرلی ہے، وہاں خطے میں پاکستان جیسا اہم اتحادی جس نے امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور بننے میں اہم کردار ادا کیا، سب کو علم ہے کہ کشمیر میں جاری ظلم و ستم اور پاکستان میں دہشتگردی کی بناء پر بھارت کے ساتھ تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں لیکن امریکی بے وفائی اور بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے اور افغانستان میں بدترین ہزیمت و شکست کے بعد پاکستان پر بلاوجہ دباؤ ڈالنے کی غلط پالیسی اختیار کرنے کی بناء پر بھی سخت دھچکا لگا ہے اور ردّ عمل میں خطے میں چین، پاکستان، روس اور ایران کا ایک مضبوط بلاک بھی تشکیل پاچکا ہے۔

ایک طرف چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کی ہے اور دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں بھی صورتِ حال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے جو امریکا کیلئے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کو بہتر طرزِ حکمرانی کی حیثیت سے قبول نہ کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر آمریت اس کے مسائل حل کر دے تو جمہوریت کی کیا ضرورت ہے؟

کئی عشروں سے امریکا عالمی سیاست و معیشت پر بلا شرکتِ غیرے متصرّف رہا ہے۔ اس نے یورپ کو ساتھ ملا کر اپنی مرضی کے فیصلے کیے ہیں اور ان فیصلوں کا پھل بھی کھایا ہے مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کئی ممالک تیزی سے مضبوط ہو کر ابھرے ہیں۔ یورپ نے اپنی راہ بہت حد تک الگ کرلی ہے ۔ چین، روس، برازیل، جنوبی افریقا اور دوسرے بہت سے ممالک تیزی سے مستحکم ہوئے ہیں۔ ان کا استحکام امریکی بالادستی کیلئے واضح خطرے کی شکل میں ابھرا ہے۔ یہ سوال امریکا میں بھی جڑ پکڑ چکا ہے کہ عالمی سیاست و معیشت میں اب امریکا کیلئے کیا رہ گیا ہے۔ موجودہ صدارتی انتخاب میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ عالمی سطح پر امریکا کو برتر حیثیت برقرار رکھنے کے قابل کس طور بنایا جائے۔ سیدھی سی بات ہے، چیلنجز بڑھ چکے ہیں۔ حکمت عملی میں غیر معمولی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

ٹرمپ نے اپنے دورِ حکومت میں ایسا کچھ نہیں کیا جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ آئندہ امریکا کو نئی بلندیوں پر لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں ۔ وہ بظاہر اس سیاسی بصیرت سے محروم دکھائی دیتے ہیں جو کسی امریکی صدر کیلئے لازم سمجھی جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہ اپنی شخصیت

کا کوئی تاثر چھوڑنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ چند ایک معاملات میں انہوں نے بڑھک سے ہٹ کر عمل کے میدان میں اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ اپنے اقوال واعمال سے امریکی فکر کو متاثر کرنے میں تھوڑے بہت کامیاب ضرور ہوئے ہیں۔ یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ امریکا نے جن اصولوں اور طریق کار کو اپنا کر اب تک عالمی سیاست و معیشت میں اپنی بالادستی کسی نہ کسی طور برقرار رکھی ہے، اُنہیں ٹرمپ نے متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ٹرمپ کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ وہ سوچتے اور کرتے ہیں اس سے امریکا کی طاقت اور دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو گا اور عالمی سیاست و معیشت میں امریکی بالادستی برقرار رہے گی مگر درحقیقت ان کی پالیسیوں سے امریکا کو نقصان پہنچا ہے۔ پالیسی ساز اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ ٹرمپ کے آنے کے بعد سے امریکا کی سب سے بڑی طاقت والی حیثیت متاثر ہوئی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے رہے ہیں اُس کے وہ اثرات رونما نہیں ہوئے جو ہونے چاہیے تھے۔ اب امریکیوں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ ٹرمپ کی پالیسیوں سے عالمی سطح پر امریکا کی پوزیشن قابل ذکر حد تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

امریکی پالیسی ساز یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں جس سے بڑی حد تک واضح اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ امریکا نے چار نسلوں تک دنیا کو ایک ایسا نظام دیا ہے جس نے امن، خوش حالی، استحکام اور جمہوریت کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ بات دیگر نظام ہائے سیاست سے موازنے کی صورت میں کہی جارہی ہے۔ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت پر جو بالادستی پائی وہ اس کی ”سخت قوت“ کا نتیجہ تھی۔ امریکا کے پاس بے مثال قوت تھی اور اس قوت کو بھرپور انداز سے بروئے لانے پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے باضابطہ عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کی۔ ایسا نہیں کہ سرد جنگ کے زمانے میں سابق سوویت یونین کے ہوتے ہوئے امریکا کی عالمی حیثیت اتنی مضبوط تھی جسے چیلنج نہ کیا جاسکتا تھا تاہم دنیا دو واضح عالمی قوتوں کے درمیان تقسیم تھی۔ بظاہر امریکا نے غیر معمولی عسکری قوت کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا کی عسکری قوت مزید بڑھ گئی۔ عالمی معیشت میں بھی اس کا حصہ اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرحلے پر امریکی خام قومی پیداوار عالمی خام قومی پیداوار کا 25 فیصد تھی۔ دنیا نے کسی ایک ملک کو باقی دنیا کے مقابلے میں اس قدر طاقتور کبھی نہیں دیکھا لیکن امریکا کو یہ مقام کبھی نہ ملتا اگر سوویت یونین افغانستان میں جارحیت کی غلطی نہ کرتا اور پاکستان جیسا اتحادی امریکا کی بھرپور مدد نہ کرتا لیکن امریکا نے اپنی سابقہ تاریخ دہراتے ہوئے پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کیا کہ جونہی سابقہ روس شکست وریخت سے دوچار ہوا، امریکا وعدہ خلافی کرتے ہوئے پاکستان اور افغانستان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر فوری طور پر پاکستان کے مخالف کیمپ کو گلے لگالیا کیونکہ بھارت نے بھی پانچ دہائیوں سے ایک وفادار ساتھی روس سے بھی آنکھیں پھیر کر امریکا کی گود میں پناہ لیکر اپنی برہمنی روایت کو قائم رکھا جس کا روسی وزارتِ خارجہ نے بھرپور گلہ کا اظہار بھی کیا۔

لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مکافاتِ عمل نے چند برسوں کے دوران امریکی بالادستی کیلئے بہت سے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ اب چین، روس اور دیگر ممالک ابھر کر سامنے آئے ہیں مگر اس کے باوجود امریکا سمجھتا ہے کہ اس کی عسکری اور معاشی قوت اب بھی اس قدر ہے کہ وہ عالمی سیاست و معیشت پر نمایاں حد تک متصرف ہے اور امریکی قیادت اب بھی دنیا بھر میں معاملات کو الٹنے اور پلٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے کارگر ہوتی اور اسے زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار کرتی مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا بھرپور استحکام سے ہمکنار نہ ہو بلکہ مجموعی طور

پر تمام خطے ترقی کریں، خوش حالی پائیں اور خاص طور پر ہم خیال ممالک زیادہ مستفید ہوں۔ اس بین الاقوامی نظام کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے۔ یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی رہنما کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے۔ کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کی خاطر کیا گیا، مگر درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی واستحکام سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے نہیں بلکہ اس کے قریبی اتحادیوں کیلئے بھی کارگر ہوتی اور امریکا زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار ہوتا مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا نہ صرف بھرپور استحکام سے ہمکنار ہو اور اس کے اتحادی مجموعی طور پر خطے میں ترقی اور خوشحالی کیلئے اس کی بالادستی قبول کریں اور خاص طور پر ہم خیال ممالک اس کی ہر پالیسی میں اس کے ہمنوا ہوں جس طرح مشرقِ وسطیٰ میں مسلم ممالک اور افغانستان کی تباہی میں اس کے تمام پروگرامز ترتیب دیے اس بین الاقوامی نظام "ورلڈ آرڈر" کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے۔ ۔ اتحادیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا گئے، یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی رہنما کی حیثیت اختیار کرنے کے راستے پر گامزن ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے اور کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو اپنے مفادات کیلئے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کے نام پر کیا گیا لیکن اب اقوام عالم یہ سمجھ چکے ہیں کہ درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی واستحکام سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی امریکی مساعی درحقیقت صرف اس مقصد کے تحت تھیں کہ عالمی سیاست و معیشت میں اس کی بالادستی قائم ہو اور مسلسل بغیر کسی چیلنج کے برقرار رہے۔ اسی لئے کویت عراق جنگ کے بعد جارج بش اوّل نے یہودی نژاد ہنری کسینجر کے تشکیل کردہ "نیو ورلڈ آرڈر" پروگرام کو متعارف کرانے کے بعد امریکا نے جو عالمی نظام پر اس قدر زور دیا تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ معیشت، عسکری قوت اور سفارت کاری کے میدان میں اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے وہ جو دنیا تشکیل دینے میں مصروف ہے، اس کا واحد مقصد اکیلے ہی اس سے بھرپور استفادہ مقصود ہے تاکہ عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر امریکا اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر کے عالمی بالادستی کو یقینی بنائے۔

یہ نکتہ نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت میں اب تک جو بھی مرضی کے فیصلے کیے ہیں ان کے حوالے سے اپنے اتحادیوں کیلئے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی طاقت کے ذریعے غیر معمولی حد تک اپنی مرضی کے فیصلے کر سکتا تھا مگر اس کے بجائے کم استحصالی انداز اختیار کر کے امریکا نے ان تمام ممالک کو مجوزہ مفادات میں کچھ حصہ ضرور دیا جو عالمی نظام کے حوالے سے اس کے تصورات کو قبول کرنے کیلئے تیار تھے۔ دیگر سپر پاورز کے مقابلے میں امریکا نے طاقت کے ذریعے بات منوانے پر کم توجہ دی۔ امریکا کے بہت سے شراکت دار اس امر کا برملا اعتراف

کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی معاملے میں امریکا کی بالادستی سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں امریکا معاملات سے الگ تھلگ نہ ہو جائے اور پھر ان ممالک کو دیگر قوتوں کے ساتھ بھی سرد جنگ کا سامنا کرنا پڑے!

ہر حال میں سب سے پہلے امریکا کا نعرہ امریکی سیاست و معیشت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا نے کبھی اپنے مفادات کو کسی بھی صورتِ حال کے تابع نہیں کیا۔ وہ صورتِ حال کو اپنے مفادات کے تابع کرنے پر یقین رکھتا آیا ہے۔ ایک یورپی سفارت کار کا کہنا ہے کہ یورپ نے 70 سال تک امریکا کی ڈفلی پر رقص کیا ہے۔ ویتنام سے نکارا گوا تک لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ اپنے ملک کے مفادات کو ہر حال میں تقویت بہم پہنچانے کیلئے امریکی حکام نے غیر معمولی تشدد اور ظلم و جبر کی راہ پر چلنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ معیشت اور سیاست سے ہٹ کر بھی کئی معاملات میں امریکی اندازِ قیادت بہت اہم رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا نے عالمی سطح پر امن اور استحکام کے حوالے سے غیر معمولی کردار ادا کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت دنیا سرمایہ داری اور کیمونزم نظام میں واضح طور پر تقسیم تھی اور امریکا کے اتحادی یہ سمجھتے تھے کہ امریکا عسکری امور میں کمٹ منٹ کے مطابق کام کرنے اور ڈیلور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور یہ کہ ایک انتہائی خطرناک دنیا میں حقیقی استحکام پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کی صلاحیت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ امریکا ہے۔

امریکی صدور اس امر کیلئے کوشاں رہے ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی جمہوریت اور بنیادی حقوق کی پاسداری کو یقینی بنایا جائے جو امریکی قیادت کے تابع رہے اور اس کی واضح مثال ہمیں پہلے الجزائر اور بعد ازاں مصر کی مرسی حکومت کا تختہ الٹنے سے ملتی ہے۔ امریکی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ عالمی سطح پر بالادستی برقرار رکھنے میں یہ بات بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے کہ اخلاقی سطح پر امریکا کیسی دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ امریکا نے اپنی اخلاقی بالادستی بھی یقینی بنانے کیلئے دنیا بھر میں کھلے معاشرے معرضِ وجود میں لانے اور لبرل ازم کو بھرپور تقویت بہم پہنچانے کی کوششیں جاری رکھی ہیں۔

سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے ایک بار کہا تھا کہ امریکا نے زیادہ مستحکم تعلقات ان ممالک سے استوار رکھے ہیں جہاں ایسی جمہوریت کی جڑیں گہری اور مضبوط ہیں جو امریکی اور اس کے اتحادیوں کی پالیسیوں سے مکمل آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کریں۔ یہ محض اتفاق نہیں، امریکا جن ممالک میں حقیقی جمہوریت اور سیکولر لبرل روایات دیکھنا چاہتا ہے ان کی طرف زیادہ جھکتا ہے۔ امریکی قیادت انہی ممالک سے بہتر سیاسی اور معاشی روابط کو فروغ دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے جہاں کی سیاسی روایات امریکی اور اس کے اتحادیوں کی سیاسی روایات سے ہم آہنگ ہوں۔ معاملات محض لین دین کی سطح سے کہیں بلند ہو کر ورلڈ آرڈر کے حقیقی نظریہ اور ثقافتی ہم آہنگی مفادات تک تابع ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے صرف ”سخت قوت“ (معاشی و عسکری) پر مدار رکھا ہے۔ وہ اپنی بات منوانے کیلئے اور اپنی نمبر ون پوزیشن برقرار رکھنے کیلئے دنیا بھر میں سوفٹ امیج بھی پھیلاتا ہے۔ امریکیوں نے ہر دور میں چاہا ہے کہ دنیا ان کے ملک کو دیکھ کر صرف خوفزدہ نہ ہو بلکہ متاثر ہو کر متوجہ بھی ہو۔ آج دنیا بھر میں امریکا کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر اس کے باوجود دنیا کے ہر ملک کے باشندے چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طور امریکا میں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ جن ممالک سے امریکا کے تعلقات اچھے نہیں اور جہاں کے لوگ امریکا سے شدید نفرت کرتے ہیں وہاں بھی لوگ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ امریکی ویزا لگ جائے یعنی مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امریکا کی ”سخت قوت“ کو تقویت بہم پہنچانے میں ”نرم قوت“ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ناپسندیدہ ہوتے ہوئے بھی امریکا میں دنیا بھر کے لوگوں کیلئے غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے لیکن صد افسوس کہ

ٹرمپ کی نئی امیگریشن پالیسی نے امریکا کے برسوں سے قائم اس تاثر کو بری طرح نہ صرف مجروح کیا بلکہ خود امریکی اعلیٰ عدالت نے مداخلت کرکے ٹرمپ کی اس پالیسی کو مسترد کر دیا تھا۔

اب تک ٹرمپ نے جو کچھ کہا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ بنانے پر کم اور بگاڑنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔(ڈین ایچیسن کیلئے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ امریکا کی تخلیق کے وقت تھے)۔خود امریکی اور مغربی سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ٹرمپ کی بڑھکیں دیکھتے ہوئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ انہیں شاید کل کو یہ بات قابل فخر محسوس ہو کہ وہ امریکا کی تباہی کے وقت موجود تھے۔ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایسا بہت کچھ کہا جو بتاتا ہے کہ انہیں بنیادی امریکی اقدار کی پاسداری کا ذرا بھی خیال نہیں۔انہوں نے آزاد تجارت کے بجائے اپنے مفادات کو ہر حال میں مقدم رکھنے کی تجارت پر زور دیا۔ٹرمپ نے جمہوریت کیلئے اب تک ویسی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جیسی ان کے پیش رو بیان کرتے آئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جمہوریت کے مقابل ولادیمیر پوٹن کیلئے پسندیدگی کا اظہار کیا جو مطلق العنانیت کو بنیادی سیاسی قدر قرار دے کر تمام اختیارات اپنی ذات میں سمیٹنا چاہتے ہیں۔

امریکا نے پانچ چھ عشروں میں جو کچھ بھی پایا ہے اُسے ٹرمپ ٹھکانے لگانا چاہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ امریکا نے جنگ کے بعد کے زمانے میں جو خارجہ پالیسی اپنائی وہ بہت سے معاملات میں مخالفین کو اس قدر رعایتیں دیتی رہی ہیں کہ اب وہ منہ دینے کا سوچ رہے ہیں۔امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اس کوشش میں اس نے اپنی مصنوعات اور ٹیکنالوجی دنیا بھر کو دی ہے۔اس بات کو ٹرمپ جیسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ان کا خیال یہ ہے کہ امریکا کو اپنی ٹیکنالوجیز اور جدید ترین مصنوعات ساری دنیا میں پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

ٹرمپ نے امریکی فوج کو قیدیوں پر تشدد ڈھانے کی اجازت دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ دہشتگردی ختم کرنے کی خاطر اگر جنگی جرائم کا ارتکاب بھی کرنا پڑے تو ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا نے کسی نہ کسی طور اپنی بالادستی کو برقرار رکھا ہے مگر ٹرمپ تو اسے ٹھکانے لگانے کیلئے بے تاب رہے۔ایسا نہیں کہ جو کچھ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے کہا وہ جذباتیت کی طرح پر تھا۔وہ ایک زمانے سے کئی امریکی شراکت داروں پر شدید نکتہ چینی کرتے آئے ہیں۔انہوں نے 80ء کے عشرے میں جاپان اور کویت کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں ممالک سے امریکا کو ملا کم ہے اور امریکا نے دیا زیادہ ہے۔اسی طور انہوں نے 2015ء اور 2016ء میں جرمنی اور میکسیکو پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں ممالک نے امریکا کیلئے طفیلی کا کردار ادا کیا ہے۔

اپنی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے امریکا کے بعض شراکت داروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے دوڈھائی عشروں کے خیالات ہی کا عکاس ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے امریکا کے بعض اتحادیوں اور اتحادیوں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ محض بڑھک نہیں، جذباتیت کی سطح پر نہیں بلکہ وہ واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے، یعنی وہ امریکا کے بعض اتحادیوں کو ایک طرف ہٹانے اور نئے تعلقات استوار کرنے کی راہ پر گامزن ہونے کیلئے بے تاب تھے چاہے اس کیلئے امریکا کو کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔کیا خود امریکا کے خیر خواہ اور ان کے اتحادی ایک مرتبہ پھر ٹرمپ کی ان پالیسیوں کے اجراء کی حمائت کریں گے جس کی بناء پر امریکا تیزی سے تنہائی کا شکار ہونے جارہا ہے۔

بروز منگل 3 جمادی الاول 1446ھ 5 نومبر 2024ء

آزادی اظہار اور حدود کا توازن

"اظہارِ رائے کی آزادی" کا مفہوم اور تعریف تو یہ ہے کہ کسی کو بھی کھل کر اپنا نکتہ نظر بیان کرنے، سوال اٹھانے، اختلاف اور تنقید کرنے کی اجازت ہے، لیکن کسی دوسرے کی تذلیل اور کردار کشی کرنے اور دوسروں پر تہمتیں لگا کر اس کو نقصان پہنچانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ اظہار رائے کی آزادی میں تنقید کا حق بجا ہے، لیکن یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جہاں تنقید کی حد ختم ہوتی ہے، وہاں سے ہی تذلیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور کسی کی تذلیل کرنا ہر معاشرے میں برا عمل ہے۔ کئی لوگ تنقید کرتے کرتے تمام حدیں عبور کر جاتے ہیں، نفرت انگیز مذہبی و سیاسی تقاریر کرنے، شر انگیز بیانات دینے، کسی کی عزت کو داغدار کرنے، کسی کی توہین، کسی کے وتحقیر اور تذلیل کرنے، مذہب، مسلک، فرقے اور کسی کی محترم شخصیت پر انگلی اٹھانے کو رائے کی آزادی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ آزادی رائے کے اخلاقی حق کی کھلی خلاف ورزی اور ان کی شعوری پستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دنیا کے کسی بھی معاشرے میں رائے کے اظہار کی ایسی آزادی نہیں دی جاتی، جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوں۔ ہر معاشرے نے اپنے حالات کے مطابق اظہار رائے کی حدود مقرر کی ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں 1966ء میں پاس کی گئی ایک قرارداد "آئی سی سی پی آر" کے مطابق ضروری ہے کہ کوئی بھی ایسی تقریر یا تحریر جو کسی ملک میں رہنے والے کسی بھی فرد یا گروہ کی مذہبی، قومی یا نسلی مخالفت یا دل آزاری کا سبب بنے اور ان کے خلاف نفرت یا حقارت کا اظہار کرے تو اس ملک کا فرض ہے کہ اس کو روکے اور اس کے خلاف قانون سازی کرے، جبکہ متعدد یورپین ممالک میں آزادی اظہار رائے پر بہت سی پابندیاں ہیں۔

میں آپ کے توسط سے آج یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "26/ اکتوبر 2016 کو یورپی یونین کی عدالت برائے انسانی حقوق (ای ایچ سی آر) نے فیصلہ دیا تھا کہ پیغمبرِ اسلام کی توہین آزادیِ اظہار کی جائز حدوں سے تجاوز کرتی ہے، اور اس کی وجہ سے تعصب کو ہوا مل سکتی ہے اور اس سے مذہبی امن خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ فیصلہ عدالت نے پیغمبر اسلام کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہنے والی آسٹریا سے تعلق رکھنے والی خاتون کے خلاف سزا کے فیصلے کی اپیل پر صادر کیا تھا۔ عدالت کا فیصلہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہے"۔

میں یہاں آپ کو بتاتا چلوں کہ فرانس کے شہر سٹراسبرگ میں واقع ای ایچ سی آر عدالت نے خاتون کو سزا دیتے وقت ان کی آزادیِ اظہار اور دوسروں کے مذہبی احساسات کے تحفظ کے حق کا بڑی احتیاط سے توازن برقرار رکھا۔ اس خاتون نے، جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا اور انہیں صرف ای ایس کہا جاتا ہے، 2008 اور 2009 میں اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات کے عنوان کے تحت مختلف تقاریر میں پیغمبرِ اسلام کے بارے میں چند کلمات ادا کیے تھے جن کی پاداش میں ان پر ویانا کی ایک عدالت میں مقدمہ چلا اور عدالت نے انہیں فروری 2011 میں مذہبی اصولوں کی تحقیر کا مجرم قرار دیتے ہوئے 480 یورو کا جرمانہ، مع مقدمے کا خرچ، عائد کر دیا۔ اس فیصلے کو آسٹریا کی اپیل کورٹ نے بھی برقرار رکھا تھا۔ اس کے علاوہ 2013 میں عدالت عظمیٰ نے بھی اس مقدمے کو خارج کر دیا تھا۔ یہ فیصلہ ججوں کے 7 رکنی پینل نے دیا۔

اس کے بعد اس خاتون نے یورپی یونین کے قانون کی انسانی حقوق کے بارے میں شق 10 کا سہارا لیتے ہوئے یورپی عدالت میں اپیل کی کہ مقامی عدالتیں ان کی آزادیِ اظہار کے حق کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہیں"۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے جس عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے، وہ عدالت کل 47 ججوں پر مشتمل ہے جن کے نام یورپی یونین کے رکن ممالک تجویز کرتے ہیں جبکہ ان کا انتخاب کونسل آف یورپ کی پارلیمانی اسمبلی کرتی ہے۔ اس

آسٹرین خاتون نے یہ مقدمہ انسانی حقوق کی شق 10 کے تحت درج کروایا تھا کہ آسٹریا کی مقامی عدالتوں نے ان کے آزادیِ اظہار کے بنیادی حق کا تحفظ نہ کر کے یورپین کنونشن برائے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔ تاہم ان کی اپیل مسترد ہو گئی۔

یہ شق نمبر 10 کیا ہے؟ شق نمبر 10 میں جہاں آزادی رائے کا حق دیا گیا ہے وہیں دوسرے حصے میں آزادیِ اظہار پر قدغنیں بھی لگائی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ آزادیِ اظہار کے ساتھ فرائض اور حقوق بھی شامل ہیں، اور یہ آزادی کسی جمہوری معاشرے کے قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے رسوم، حالات، ضوابط کے ماتحت ہے اور اس کی آڑ میں کسی کے جذبات مجروح نہیں کیے جاسکتے۔ اس فیصلہ آنے کے بعد یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یورپین ممالک بہت معتدل مزاج ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی متعصبانہ اور امتیازی رویے کو اپنا شعار نہیں بناتے۔ یورپ معتدل پسند، آزاد خیال اور ہر قسم کی آزادی کا قائل ہے اور پوری دنیا کے مذاہب اور انسانوں کے ساتھ اس کا رویہ غیر امتیازانہ ہے تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے کیوں کہ ہر معاملے میں ان کے دہرے معیارات واضح اور صاف صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔

آخر ان قوانین کی موجودگی میں فرانس کے صدر کی طرف سے پیغمبر اسلام کی توہین کا پس منظر کیا ہے؟ ایک طویل مدت سے آزادی اظہار کے نام پر پیغمبر اسلام سیدنا محمد ﷺ کی توہین ایک تسلسل کے ساتھ کی جارہی ہے۔ سوشل میڈیا اس بات پر تل گیا ہے کہ آپ ﷺ کی جس حد تک بھی ممکن ہو، تضحیک اور نعوذ باللہ مذاق اڑانے کی کوشش کی جائے جس کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں سخت غم وغصہ پایا جارہا ہے۔ ہر مرتبہ کی توہین، گستاخانہ خاکوں اور تحریروں کے بعد پورے عالم اسلام میں ایک ہلچل مچ جاتی ہے، جلوس نکالے جاتے ہیں، جلسے ہوتے ہیں اور دنیا کے کونے کونے میں صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ اس احتجاج میں صرف مسلمان ہی شریک نہیں ہوتے بلکہ حقیقت کو سمجھنے والے اور زمینی حقائق پر نظر رکھنے والے غیر مسلموں کی بھی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی ہم زبان ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ پاک ہستیوں کے خلاف کسی بھی قسم کی تضحیک ایک ایسا عمل ہے جو فطرت انسان کی برداشت سے باہر ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف اب تک بھیجے جانے والے تمام انبیاعلیہ السلام کو مانتا ہے بلکہ وہ دیگر مذاہب کے مذہبی پیشواؤں کی عزت واحترام کو بھی نہ صرف دل سے تسلیم کرتا ہے بلکہ ان کی بھی وہی عزت و تعظیم کرتا ہے جو اللہ کے ولیوں اور پیغمبروں کی جاتی ہے کیونکہ ہمیں تو قرآن نے یہ سبق دیا ہے کہ "كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍمِّن رُّسُلِهِ، اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں، ہم اس کے رسولوں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

جس انداز میں رسول اکرمؐ کی توہین کی جاتی ہے اس کے جواب میں مسلمانان عالم وہ سب کچھ نہیں دہرا سکتے جو کچھ "یہ باطل شیاطین" کر رہے ہیں کیونکہ ہر پاک ہستی مسلمانوں کیلئے محترم اور قابل تعظیم سمجھی جاتی ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ پیغمبر اسلام کی توہین کے جواب میں دیگر مذاہب کی پاک ہستیوں یا ان کے رسولوں اور پیغمبروں کی تضحیک کی جائے۔ ممکن ہے توہین کے جواب میں وہ منتظر ہوں کہ مسلمان بھی ان کے رسولوں اور پیغمبروں کی تضحیک پر اتر آئیں اور ان کو اس بہانے فتنہ وفساد مچانے کا موقع مل جائے لیکن دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کی پستی تک گر جانا گوارہ کرنے کے بجائے احتجاج کی راہ اختیار کی اور کسی بھی متشددانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے دنیا بھر میں پرامن صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، جس کا آخر کار اللہ کے فضل وکرم سے ایک اچھا نتیجہ نکلتا ہے اور دنیا کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر قسم کی بے غیرتی کو اظہار رائے کے حق کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ 2019ء کی مردم شماری کے مطابق فرانس کی کل آبادی 66 ملین ہے اور اس وقت 60 لاکھ مسلمان فرانس میں مقیم ہیں اور سرکاری رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی سالانہ 4 فیصد آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور مشہورِ زمانہ قابل اعتماد "ڈیو" ادارے کے مطابق 2050ء تک

مسلمان تعداد میں زیادہ ہوں جائیں گے اور ملک کا اقتدار مسلمانوں کے پاس جاسکتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یورپ میں فرانس واحد ملک ہے جہاں 78 فیصد مسلمان "پریکٹسنگ مسلمان" ہیں اور 84 فیصد مسلمان ماہِ رمضان میں پورے روزے رکھتے ہیں اور مساجد کی رونقیں دیکھ کر ان شدت پسند لوگوں کی نیندیں حرام ہو رہی ہیں جبکہ اسی ادارے کے مطابق فرانس میں 60 فیصد افراد "ملحد" بے دین ہو چکے ہیں اور عیسائیت دم توڑ رہی ہے جس کی وجہ سے ویٹی کن کافی تشویش میں مبتلا ہے جبکہ فرانس سمیت سارے یورپ میں تیزی سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ایک مشہور عالمی جریدے کی شائع ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق فرانس کی 60 فیصد آبادی ولد الزنا یعنی ناجائز بچوں پر مشتمل ہے۔زنا کے پیداوار بچوں کی یہ تعداد دنیا میں کسی بھی ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔اب جہاں کی اکثر آبادی کے متعلق ان کے اپنے جریدے یہ انکشاف کرتے ہیں وہاں ہی حرامی ہوگی وہاں دنیا کی پاکیزہ ترین ہستی رسول اللہ ﷺ کا احترام کیسے کیا جائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں مذہبی فرقہ واریت کے باوجود تضحیک کے ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے جیسا کہ مغرب کی سول سوسائٹی میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن یہاں بھی اظہارِ آزادی کا بیہودہ سلسلہ ایسا چل نکلا ہے کہ بغیر کسی تصدیق کے سوشل میڈیا کے توسط سے قیامت خیز مناظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں اور گھر بیٹھی بیٹی کے نام ایسے واقعات منسوب کرکے اسی کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے جبکہ وہ خود اپنے والدین کے ہمراہ ساری میڈیا کے سامنے اس سارے من گھڑت واقعہ سے لاتعلقی کا اظہار کرنے کیلئے مجبور کر دی جاتی ہے لیکن اس واقعہ نے ملک بھر میں بیٹیوں کے والدین کے دلوں پر جو صدمات کے کوہِ گراں گرائے ہیں، اور اس سے ملک کا جو خطیر نقصان ہوا ہے، اس کا مداوا کیسے ہوگا۔کیا ہم اپنے خالق رب کریم کے اس حکم کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوئے جس نے واضح طور پر فرمایا ہے:يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍفَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًابِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَافَعَلْتُمْ نَادِمِينَ(الحجرات:6) اے ایمان والو!اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لاوے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچادو، پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔اور ایسا ہی ارشاد میرے آقا ﷺ کا بھی ہے:عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ(صحیح مسلم، باب النھی عن الحدیث بکل ما سمع،(1/8) برقم(7)، ط/دار الجیل بیروت) آدمی کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔

ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر ارضِ وطن میں آئینی ترامیم کے حوالے سے قوم کو بے شمار شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور اس میں حکومت کی عجلت اور اداروں کی نااہلی اور تقسیم نے جلتی آگ پر پانی پھینکنے کی بجائے تیل چھینک کر اس کے الاؤ کو مزید بھڑکا دیا ہے۔یقیناً ان ترامیم کی تفصیلات اور اس کے نتائج سامنے بھی آنا شروع ہو گئے ہیں لیکن نجانے کیوں مجھے سات سو سال قبل لکھی گئی ابن خلدون کی اس تحریر میں مستقبل کے تصور کا منظر نامہ نظر آرہا ہے:

مغلوب قوم کو ہمیشہ فاتح کی تقلید کا شوق ہوتا ہے، فاتح کی وردی اور وردی پر سجے تمغے، طلائی بٹن اور بٹنوں پر کندہ طاقت کی علامات، اعزازی نشانات، اس کی نشست و برخاست کے طور طریقے، اس کے تمام حالات، رسم ورواج، اس کے ماضی کو اپنی تاریخ سے جوڑ لیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ حملہ آور فاتح کی چال ڈھال کی بھی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جس طاقتور سے شکست کھاتے ہیں، اس کی کمال مہارت پر آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے

ہیں۔ محکوم معاشرہ اخلاقی اقدار سے دستبر دار ہو جاتا ہے، ظلمت کا دورانیہ جتنا طویل ہوتا ہے، ذہنی وجسمانی طور پر محکوم سماج کا انسان اتنا ہی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے، ایک وقت آتا ہے کہ محکوم صرف روٹی کے لقمے اور جنسی جبلت کیلئے زندہ رہتا ہے۔

جب ریاستیں ناکام اور قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ان میں نجومی، بھکاری، منافق، ڈھونگ رچانے والے، چغل خور، کھجور کی گٹھلیوں کے قاری، درہم و دینار کے عوض فتویٰ فروش فقہیہ، جھوٹے راوی، ناگوار آواز والے متکبر گلوکار، بھد اڑانے والے شاعر، غنڈے، ڈھول بجانے والے، خود ساختہ حق سچ کے دعویدار، زائچے بنانے والے، خوشامدی، طنز اور ہجو کرنے والے، موقع پرست سیاست دانوں اور افواہیں پھیلانے والے مسافروں کی بہتات ہو جاتی ہے۔ ہر روز جھوٹے روپ کے نقاب آشکار ہوتے ہیں مگر یقین کوئی نہیں کرتا، جس میں جو وصف سرے سے نہیں ہوتا وہ اس فن کا ماہر مانا جاتا ہے، اہل ہنر اپنی قدر کھو دیتے ہیں، نظم ونسق ناقص ہو جاتا ہے، گفتار سے معنویت کا عنصر غائب ہو جاتا ہے، ایمانداری کو جھوٹ کے ساتھ، اور جہاد کو دہشتگردی کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔

جب ریاستیں برباد ہوتی ہیں، تو ہر سو دہشت پھیلتی ہے اور لوگ گروہوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں، عجائبات ظاہر ہوتے ہیں اور افواہیں پھیلتی ہیں، بانجھ بحثیں طول پکڑتی ہیں، دوست دشمن اور دشمن دوست میں بدل جاتا ہے، باطل کی آواز بلند ہوتی ہے اور حق کی آواز دب جاتی ہے، مشکوک چہرے زیادہ نظر آتے ہیں اور ملنسار چہرے سطح سے غائب ہو جاتے ہیں، حوصلہ افزا خواب نایاب ہو جاتے ہیں اور امیدیں دم توڑ جاتی ہیں، عقلمند کی بیگانگی بڑھ جاتی ہے، لوگوں کی ذاتی شناخت ختم ہو جاتی ہے اور جماعت، گروہ یا فرقہ ان کی پہچان بن جاتے ہیں۔

مبلغین کے شور شرابے میں دانشوروں کی آواز گم ہو جاتی ہے۔ بازاروں میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور وابستگی کی بولیاں لگ جاتی ہیں، قوم پرستی، حب الوطنی، عقیدہ اور مذہب کی بنیادی باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی خاندان کے لوگ خونی رشتہ داروں پر غداری کے الزامات لگاتے ہیں۔ بالآخر حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ لوگوں کے پاس نجات کا ایک ہی منصوبہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے ہجرت، ہر کوئی ان حالات سے فرار اختیار کرنے کی باتیں کرتا ہے، تارکین وطن کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے، وطن ایک سرائے میں بدل جاتا ہے، لوگوں کا کل سازوسامان سفری تھیلوں تک سمٹ آتا ہے، چراگاہیں ویران ہونے لگتی ہیں، وطن یادوں میں اور یادیں کہانیوں میں بدل جاتی ہیں۔

ابن خلدون خدا آپ پر رحم کرے! کیا آپ ہمارے مستقبل کی جاسوسی کر رہے تھے؟ آپ سات صدیاں قبل وہ دیکھنے کے قابل تھے جو ہم آج تک دیکھنے سے قاصر ہیں۔ کاش یہ تحریر ہمارے حکمران طبقے اور عوام تک بھی پہنچ جائے جو آج اپنے تئیں عقل کل سمجھتے ہوئے تیزی سے بربادی کی گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں۔ امت مسلمہ کی پستی کی داستان ہمارے مسلم دانشوروں نے بہت پہلے بھانپ لی تھی کیونکہ وہ لوگ کوتاہ نظر نہ تھے، بلکہ دیدہ بینا رکھتے تھے۔ کاش ہم اب بھی سنبھل جائیں تو امت اپنے بگڑے کو سنوارنے کی کوئی صورت نکال پائے لیکن اس کیلئے جس باضمیر اور مخلص قیادت کی ضرورت ہے اس کا آج شدید فقدان ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کو ضرور استعمال کریں لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھیں کہ کل کلاں کوئی اللہ کے ہاں آپ کی شکائت نہ کرے۔

بروز جمعۃ المبارک 6 جمادی الاول 1446ھ 8 نومبر 2024ء

قومی خزانے پر عدالتی مراعات کا بوجھ: حقائق اور سوالات

پاکستان کی وفاقی وزارت قانون وانصاف کی جانب سے جاری نوٹیفکیشن میں اعلان کیا گیا کہ سپریم کورٹ کے ججوں کو ملنے والے ہاؤس رینٹ (گھروں کا کرایہ) ساڑھے تین لاکھ روپے جبکہ جوڈیشل الاؤنس دس لاکھ روپے سے زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن انصاف مہیا کرنے والے کسی ایک جج نے بھی پاکستان کی ابتر معاشی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے ان الاؤنسز میں اضافے پر ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی میں تو اتنی اخلاقی جرات ہونی چاہیے کہ لاکھوں کے اضافے سے انکار کر دے۔ گھروں کا اتنا کرایہ 95 فیصد پاکستانیوں کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔ کرایے کی مد میں ساڑھے تین لاکھ روپے کون ادا کرتا ہے؟

اس ملک میں یہ عجیب مذاق ہے۔ ججوں کیلئے گھر کے کرائے کی مد میں الاؤنس کو 65 ہزار روپے سے بڑھا کر ساڑھے 3 لاکھ روپے کر دیا گیا جبکہ جوڈیشل الاؤنس کو دس لاکھ روپے سے زیادہ کر دیا گیا ہے جبکہ غریب کے پاس کھانے کو کچھ نہیں، مڈل کلاس کی تنخواہیں نہیں بڑھتیں، ملک میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے، قابل نوجوانوں کے پاس روزگار نہیں۔ بلومبرگ کی رپورٹ کے مطابق 2015ء سے لیکر 2024ء کے ابتدائی پانچ مہینوں تک مجموعی طور پر 62 لاکھ 20 ہزار سے زائد پڑھے لکھے نوجوان ملک چھوڑ چکے ہیں۔ بیورو آف امیگریشن کے مطابق صرف 2023ء میں 8 لاکھ 23 ہزار نوجوان اور 2024ء میں اب تک 8 لاکھ 95 ہزار نوجوان پاکستان کو خیر آباد کہہ چکے ہیں لیکن دوسری طرف تقریباً ہر سال ججوں کی تنخواہوں اور مراعات میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ججز کو ملنے والی نئی مراعات اور دیگر الاؤنسز کے مطابق ایک جج کی ماہانہ تنخواہ 20 لاکھ روپے سے زیادہ ہو گئی ہے۔

ادھر پارلیمان میں 26 ویں ترمیم کی منظوری لیکر طوفانی رفتار سے اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے سپریم کورٹ میں ججوں کی 34 تک کرنے کا بل منظور کروایا گیا جبکہ اس سے قبل سینیٹ کی قائمہ کمیٹی نے سپریم کورٹ میں ججز کی تعداد 17 سے بڑھا کر 25 کرنے کی منظوری دی تھی۔ اب ان قوانین کی منظوری کے فوری بعد من پسند ججز کی تقرری کے بعد ان کو نوازنے کیلئے شاہانہ مراعات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ اِس وقت سپریم کورٹ میں ججز کی تعداد 19 ہے جس میں سے 17 مستقل جبکہ 2 ایڈہاک جج ہیں۔ بظاہر حکومت نے اپنے اس اقدام کی بنیادی وجہ عدالتِ عظمیٰ میں ہزاروں کی تعداد میں زیرِ التوا مقدمات کو نمٹانا ہے۔ سپریم کورٹ کے ریکارڈ کے مطابق اِس وقت عدالتِ عظمیٰ میں زیرِ التوا مقدمات کی تعداد 60 ہزار سے زیادہ ہے جبکہ ساری قوم اس حکومتی اقدام کو "اعلیٰ عدلیہ" کے ججوں کو دباؤ میں لانے اور من پسند افراد کو سپریم کورٹ میں تعینات کرنے کی سوچی سمجھی سازش قرار دیتے ہوئے پریشان ہے کہ وہ کس کے ہاتھ پر اپنی بے بسی اور اپنے حقوق کا خون تلاش کرے۔ ان مراعات کا اعلان کرتے ہوئے زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ قوم کو یہ بھی بتایا جاتا کہ سپریم کورٹ کے ججز کو حکومت کی جانب سے ماہانہ تنخواہ کے علاوہ کیا کیا سہولیات اور مراعات ملتی ہیں؟

پاکستان میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی تنخواہ اس وقت تقریباً ساڑھے 12 لاکھ روپے ہے۔ وزارت انصاف و قانون کے گزشتہ برس جولائی میں جاری ہونے والے نوٹیفکیشن کے مطابق سپریم کورٹ کے باقی ججز کی ماہانہ تنخواہ تقریباً گیارہ لاکھ بنتی ہے۔ سپریم کورٹ ججز لیو پینشن اینڈ پریویلیجز آرڈر 1997 کے مطابق سپریم کورٹ کے ججز کو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ سرکاری گھر بھی ملتا ہے۔ سرکاری گھر نہ ملنے کی صورت میں سپریم کورٹ کے جج کو کرائے کے گھر میں رہنے پر ماہانہ کرائے کی مد میں الاؤنس دیا جاتا ہے۔ گھر کے ساتھ ساتھ حکومت پاکستان ججز کے گھر میں استعمال ہونے والی بجلی،

گیس اور پانی کا بل بھی حکومتی خزانے سے ادا کرتی ہے۔اس کے علاوہ سپریم کورٹ کے جج کو سرکاری گاڑی کے ساتھ ماہانہ 400لیٹر پیٹرول بھی ملتا ہے ۔ سپریم کورٹ کے ججز کو انکم ٹیکس سے بھی استثنیٰ حاصل ہوتا ہے۔ ججز کو روزمرہ کے اخراجات کیلئے الاؤنس جبکہ اس کے ساتھ جوڈیشل الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ پر سپریم کورٹ کے جج کو پینشن کے علاوہ یہ سہولت بھی ملتی ہے کہ وہ سرکاری خرچ پر اپنی مرضی کا ایک ڈرائیور یا ملازم بھی رکھ سکتا ہے تاہم جج کی موت کے بعد ان کی بیوہ کو بھی یہ سہولیات حاصل ہوتی ہیں۔

میں تو یہ سن کر بھی حیران ہوں کہ ججز کو قرض دیے جارہے ہیں،وہ بھی سود سے پاک۔ وہ تو پہلے ہی سرکاری گھروں میں رہ رہے ہیں اور انہیں مراعات بھی ملتی ہیں۔ لاہور ہائیکورٹ بار کونسل کے ایک عہدیدار کے مطابق پنجاب کی نگراں حکومت کی جانب سے لاہور ہائی کورٹ کے 11 ججز کو گھروں کی تعمیر کیلئے 36 کروڑ روپے سے زائد کے بلاسود قرضے دینے کی منظوری دی گئی جس کی تصدیق اُس وقت نگراں حکومت کے وزیرِ اطلاعات نے بھی کی۔ صوبائی کابینہ کی سٹینڈنگ کمیٹی برائے خزانہ کی جانب سے دی گئی اس منظوری پر ملک کی موجودہ معاشی صورتحال میں ایسے اقدامات سے سرکاری خزانے کو نقصان پہنچانے کا آخر کون ذمہ دار ہے؟ کیا اس قومی نقصان اور جرمِ عظیم پر عدلیہ کو سوموٹو نوٹس لینے کی توفیق ہوئی؟

تاہم اُس وقت جب یہ سوال میں نے اپنے ایک کالم میں نگران حکومت سے پوچھا تو انہوں نے بڑی معصومیت سے اپنی جان چھڑاتے ہوئے جواب دیا کہ ماضی میں بھی ججز کو بلاسود قرضے دیے جاچکے ہیں جس کا ایک مقصد انہیں کرپشن سے دور رکھنا ہے۔ کیا کوئی صاحب عقل اس منطق سے اتفاق کر سکتا ہے کہ ایسے فرد کی بطور جج تعیناتی ہی کیوں کی جائے جس پر ذرہ بھر بھی کرپشن کا شک ہو تو گویا اگر یہ مراعات نہ دی جائیں تو ججز کا کرپشنز میں ملوث ہونے کا احتمال ہے، اور کیا ماضی میں ایسی کوئی مثال ہے جب آپ نے کسی کرپٹ جج کو عبرت ناک سزا سنائی ہو۔ یہاں تو خود سپریم کورٹس کے ججز نے متفقہ طور پر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو غلطی قرار دیکر ثابت کر دیا ہے اور ویسے بھی درجنوں مثالیں ایسی ہیں کہ سپریم کورٹ نے ملزمان کو باعزت بری کیا ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ ملزمان کو تو کئی برس پہلے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا تھا اور اب ان کے خاندان زمانے بھر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

نگران حکومت نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے یہ منطق پیش کر دی کہ سٹینڈنگ کمیٹی برائے خزانہ کے اجلاس میں ایجنڈا نمبر 17، 18اور 19 میں 11 ججز کو گھروں کی تعمیر کیلئے جو "بلاسود قرض" منظور کیے گئے جو ہر جج کیلئے اوسطاً قریب ساڑھے تین کروڑ روپے کی رقم بنتی ہے، یہ قرضے ججز کی تین برسوں کی (36 بنیادی) تنخواہوں کے برابر ہیں جو کہ 12 سال کی مدت میں ان کی تنخواہوں سے ہی منہا کر لیے جائیں گے جبکہ یہ چھپایا گیا کہ ان مراعات کے بدلے خود حکومت ان ججز سے کیا مراعات وصول کرتی ہیں۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جج اگلے 12 سال تک زندہ بھی رہے گا یا کہ نہیں۔

حکومت نے اپنا بوجھ اتارنے کیلئے قوم کو یہ تو بتا دیا کہ "ججوں کی قرضوں" کیلئے درخواستیں لاہور ہائی کورٹ کے رجسٹرار آفس کی جانب سے آئی تھیں جنہیں روٹین کے مطابق پنجاب کابینہ کی سٹینڈنگ کمیٹی برائے خزانہ نے منظور کر لیا لیکن حکومت کے دوسرے اداروں میں کام کرنے والے ملازمین ایسی مراعات سے کیوں محروم ہیں جبکہ وہ تو باقاعدہ اپنی تنخواہوں پر ٹیکس بھی دیتے ہیں اور ججز تو ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ حکومت نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یہ وہ 11 جج حضرات ہیں جو قرضے لینے سے رہ گئے تھے۔ لاہور ہائی کورٹ کے باقی تمام ججز ماضی میں گھر بنانے کیلئے مختلف حکومتوں سے سود فری قرض حاصل کر چکے ہیں۔ ان 11 ججوں نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا تھا۔ حکومت نے اپنی غلطی یا کرپشن چھپانے کیلئے مزید کہا کہ "ججوں کو سود فری قرضے دینے کا ایک بڑا مقصد انہیں کرپشن سے دور رکھنا بھی ہے تا کہ وہ اپنے وسائل سے ہی اپنی سروس کے دوران گھر بنانے کے قابل ہو جائیں جبکہ

عقل کے ان اندھوں کو یہ معمولی بات کیوں سمجھ میں آتی کہ ججز پہلے ہی بڑی تنخواہیں اور مراعات وصول کر رہے ہیں تو ایسے میں یہ بلاسود قرض بھی بظاہر بدعنوانی کی ایک قسم ہے جس کے ذریعے دراصل ججز سے اپنے حق میں مراعات لینا مقصود ہے۔

تاہم لاہور ہائیکورٹ میں دائر کردہ ایک درخواست میں ان قرضوں کو "امتیازی" اور "عدم مساوات پر مبنی" قرار دیتے ہوئے انہیں کالعدم قرار دینے کی استدعا بھی انہیں ججز کے روبرو کی ہے اور پاکستان بار کونسل نے لاہور ہائیکورٹ کے ججز کیلئے بلاسود قرضوں پر شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے مبینہ نوٹیفکیشن فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ تاہم قوم یہ مذاق اس سے قبل کئی مرتبہ دیکھ چکی ہے کہ عوام اپنی پارلیمان کے جن افراد کو کرپشن ختم کرنے کیلئے ووٹ دیکر منتخب کرتی ہے تو تنخواہ بڑھانے کے بل پر حکومت اور اپوزیشن "عوام کے سامنے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے" دونوں یک جاں دو قالب نظر آتے ہوئے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہوتے ہیں۔

ایک بیان میں بار کونسل نے اسے "غیر اخلاقی" اور "غیر قانونی" قرار دیا اور کہا کہ "ایسے اقدامات سے، خاص طور پر ملک کی موجودہ بدترین معاشی حالات میں، سرکاری خزانے کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ججوں کیلئے عوامی وسائل سے قرضے کی منظوری کا یہ عمل نہ تو جائز ہے اور نہ ہی قابل قبول ہے جبکہ عوام الناس پہلے ہی افراط زر سے بری طرح متاثر ہیں اور ان کی معاشی حالت پہلے سے ہی ابتر ہے، انہیں مہنگائی کا سامنا ہے۔ عوام اور یہاں تک کہ غریبوں سے بھی قرضوں پر 20 سے 25 فیصد سود وصول کیا جارہا ہے جبکہ ایک جج جو پرکشش تنخواہوں کا پیکج اور دیگر مراعات سے بھی لطف اندوز ہو رہا ہے، اسے بلاسود قرضہ دینا بذات خود ججوں کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی، امتیازی سلوک اور عدم مساوات کے مترادف ہے۔

ساری قوم لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس غیر اخلاقی اور بلاجواز قرض اور مراعات کو قبول کرنے سے نہ صرف خود انکار کر دیں گے بلکہ ججوں سمیت تمام مراعات یافتہ طبقے کو پہلے سے موجود تمام مراعات فوری طور پر بند کرنے کا حکم جاری کریں گے۔ یہ مراعات ایک ایسے وقت میں دی جارہی ہیں جب عوام مہنگائی کے باعث دب چکے ہیں اور حکومت بجلی کی قیمتیں بڑھاتی چلی جارہی ہے مگر دوسری طرف ہماری اشرافیہ کو مالی طور پر مزید مضبوط کیا جارہا ہے۔

عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف فراہم کریں وہاں حکومت کی جانب سے ایسے اقدامات "رشوت دینے اور عدلیہ پر دباؤ ڈالنے" جیسا ہے۔ بلاشبہ عدالتوں میں زیر التوا کیسز کی بڑی تعداد نے عدالتی نظام مفلوج کر کے رکھ دیا ہے جہاں صرف ان کیسز کو ترجیحی بنیادوں پر سنا جارہا ہے جو سیاسی حلقوں یا سماج کے اشرافیہ سے متعلق ہیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے کیسز 10،10 سال تک عدالتوں میں سنے نہیں جاتے۔ یہ المیہ ہے کہ دنیا آگے جارہی ہے اور ہم پیچھے جارہے ہیں۔ امریکا کے ورلڈ جسٹس پروجیکٹ کے تحت گزشتہ کئی برسوں سے دنیا کے مختلف ممالک میں عدلیہ کی کارکردگی اور عدالتی نظاموں سے متعلق اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں۔ دنیا کے 128 ممالک کے ڈیٹا پر مشتمل اس ادارے نے اپنی جو **تفصیلات جاری** کی ہیں، ان میں قانون کی بالادستی یا رول آف لاء ایک انتہائی اہم انڈکس ہے۔ اس تحقیق کے مطابق جنوبی ایشیا کے کئی ممالک میں عدلیہ کی کارکردگی کی صورت حال پاکستان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ رول آف لاء انڈکس کے مطابق نیپال اپنی عدلیہ کی کارکردگی کے لحاظ سے 61 ویں، سری لنکا 66 ویں اور بھارت 69 ویں نمبر پر ہے۔ بدنصیبی یہ ہے کہ پاکستان اس وقت انصاف کی فراہمی کے حوالے سے دنیا کے 128 ممالک کی فہرست میں 120 نمبر پر ہے۔

ججز کو بلا سود قرض اور مراعات دیے جانے کے خلاف نہ صرف وکلا تنظیموں بلکہ سوشل میڈیا پر بھی حیرت ظاہر کی گئی ہے۔ انڈسٹریز اور کاروبار بلند شرح سود کی وجہ سے دیوالیہ ہو کر بند ہو رہے ہیں لیکن پنجاب حکومت ججز کو بلا سود قرض دے رہی ہے اور وفاقی حکومت ججز کو شاہانہ مراعات دینے کا بل پاس کر کے اپنے حق میں انہیں ممنون کر رہی ہے! جو غلط ہے اس کو ٹھیک کرنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ نئی غلطیاں نہ کریں، اس ملک پر رحم کریں۔ سوال یہ ہے کہ کیا سینیٹیشن ورکر یا سیکورٹی گارڈ بھی 371 ملین روپے کا بلا سود قرض حاصل کر سکتا ہے؟ یا ججز کو عطا کردہ مجوزہ مراعات سے کوئی کلرک بھی استفادہ کر سکتا ہے جو اپنی ساری عمر ان ججز کی جھڑکیاں سنتے گزار دیتا ہے۔ ججز کیلئے بلا سود قرض، طاقتور ادارے کیلئے ریٹائرمنٹ کے بعد 90 ایکڑ زمین، سینیٹ چیئرمین اور سابق چیئرمین کیلئے بڑی مراعات، کیا پاکستان بناتے وقت یہ طے کیا تھا کہ ملک کی تمام مراعات کا حقدار بس ایک مخصوص طبقہ ہو گا اور باقی ساری قوم ان کی خدمت کیلئے شب و روز غلاموں کی طرح کام کریں گے۔

حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مارچ 2013ء میں سپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا نے دفتر چھوڑنے سے دو روز قبل بڑی خاموشی سے قومی اسمبلی کی فنانس کمیٹی کے آخری اجلاس کی خود صدارت کرتے ہوئے اپنے لئے تاحیات ایسی بھاری مراعات کی منظوری لے لی جس پر پاکستانی عوام کے آج بھی کروڑوں خرچ ہو رہے ہیں اور وہ اگر دوبارہ ایم این اے یا سپیکر نہ بھی بن سکیں پھر بھی انہیں تاحیات یہ مراعات ملتی رہیں گی۔ ان بھاری مراعات کے علاوہ جب سے فہمیدہ مرزا نے سپیکر کا عہدہ سنبھالا، صرف پانچ برسوں میں فہمیدہ مرزا اور ان کے خاوند ذوالفقار مرزا نے اپنی شوگر ملز کے ذمے پچاس کروڑ سے زائد کے قرضے معاف کرائے۔ اپنے آپ کو تنقید سے بچانے کیلئے فہمیدہ مرزا نے اپنے ساتھ سات سابق سپیکرز قومی اسمبلی کو بھی یہ مراعات دینے کا فیصلہ کیا، اس متنازعہ فیصلے سے بھٹو اسمبلی کے سپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان، فخر امام، الٰہی بخش سومرو، حامد ناصر چٹھہ اور چودھری امیر حسین کو بھی ان مراعات سے نوازدیا گیا، یوسف رضا گیلانی کو بھی سابق سپیکر کے طور پر یہ مراعات حاصل ہیں۔ اجلاس میں سپیکر قومی اسمبلی نے اپنے چہیتے افسروں کو جو برسوں پہلے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے ان کی مدت ملازمت میں تیسری توسیع کر دی گئی حالانکہ سپریم کورٹ پہلے ہی یہ فیصلہ دے چکی تھی کہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کو توسیع نہیں دی جاسکتی، تاہم سیکرٹری قومی اسمبلی سمیت دس ریٹائرڈ ملازمین کو دوبارہ توسیع دی گئی، سینیٹ سیکرٹری افتخار بابر کو بھی سپریم کورٹ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملازمت میں توسیع دی گئی، سپیکر قومی اسمبلی فہمیدہ مرزا اپوزیشن اور حکومتی ارکان نے مل کر ان مراعات کی منظوری قومی اسمبلی کی فنانس کمیٹی کے اجلاس میں دی اور کسی نے اتنی مراعات پر کوئی سوال نہ اٹھایا اور خاموشی سے مراعات کے اس پیکیج پر دستخط کر دیئے گئے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی گئی۔ کیا آج تک ہماری عدلیہ نے قوم کے خزانے پر اتنے بڑے ڈاکے کا سوموٹو نوٹس لیا؟

خیال رہے کہ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام اور نیشنل ہیومن ڈولپمنٹ کی جانب سے 2021 میں شائع ہونے والی ایک مشترکہ رپورٹ میں بیان کیا گیا تھا کہ کیسے پاکستان کے امرا، جاگیردار، سیاسی قائدین اور فوج کو ملنے والے معاشی مراعات پاکستان کی معیشت میں 17 / ارب ڈالر سے زیادہ کا اضافی خرچے کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیویلپمنٹ اکنامکس (پائیڈ) کی رپورٹ کے مطابق عدلیہ کے ایک ہائی کورٹ کے جج کو اپنی ملازمت کے دوران مفت گھر ملتا ہے، جس کا کرایہ حکومت دیتی ہے جبکہ بجلی کا بل اور سرکاری گاڑی بھی حکومتی کھاتے میں آتے ہیں۔ پائیڈ کی رپورٹ کے مطابق اگر جج اپنے گھر میں رہتے ہیں تو ان کے گھر کا اضافی خرچہ، جو دستاویزات میں تقریباً 65 ہزار روپے ماہانہ رقم بتائی جاتی ہے، مختص کر دی جاتی ہے۔ گھر کا کرایہ ساڑھے تین لاکھ روپے جبکہ جوڈیشل الاؤنس دس لاکھ روپے سے زیادہ۔۔۔ پاکستان میں سپریم کورٹ کے ججز کو ملنے والی کچھ مراعات

میں اضافے کے اعلان کے بعد کیا ججز کی غربت دور ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ پھر ان مراعات کے بل پر غور کر لیں کہیں ان مراعات کی کمی کی بناء پر آپ کے خدشات کی بناء پر کہیں کرپشن کا باب نہ کھل جائے؟

جانے کیا کیا ظلم پرندے دیکھ کے آتے ہیں
شام ڈھلے پیڑوں پر مرثیہ خوانی ہوتی ہے

بروز اتوار 8 جمادی الاول 1446ھ 10 نومبر 2024ء

اقبال کا یقینِ کامل اور قومیت کا ناسور

برصغیر کی تقسیم جیسی زمینی حقیقت کے بعد اب تاریخ کو جھٹلانے یا ان حقیقی خاکوں میں جھوٹ و بدنیتی کا رنگ بھر کر تاریخی واقعات کی شکل بگاڑ کر نئی نسل کو گمراہ کرکے اقبال سے بدظن کرنے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے چاند پر تھوکا واپس اپنے منہ پر گرتا ہے۔ سات دہائیوں کے گزرنے کے بعد اقبال پر پنڈت نہرو کے اس بے جا الزام کو کیوں دہرایا جارہا ہے کہ "اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں سوشلزم کے زیرِ اثر تصورِ پاکستان سے دستبردار بھارت قائم ہو جائے جہاں ہر روز کشمیر اور گجرات جیسی قیامتیں مسلمانوں ہو گئے تھے۔ کیا ان الزامات سے زمینی حقائق بدل سکتے ہیں کہ دوبارہ ایسا اکھنڈ اس الزام میں آخر کیوں ملوث کیا جارہا ہے؟ اور ایک ہی وقت میں بھارت پر ڈھائی جائیں! اقبال جنہوں نے پاکستان جیسی ریاست کا خواب دیکھا، ان کو اور پاکستان میں ایسا بے ڈھنگا راگ کیوں سنائی دے رہا ہے؟ آیئے تاریخ کے جھروکوں سے حقائق کی دنیا میں جھانکتے ہیں!

نہرو اپنی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" جو انہوں نے 1944ء میں قلعہ احمد نگر کے زنداں میں بیٹھ کر لکھی تھی، اس کتاب میں انہوں نے بطور شاعر اور مفکر اقبال کے فیضان کی تحسین فرمائی ہے مگر اقبال کو خراجِ تحسین کرتے وقت وہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ اقبال "ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے"۔ نہرو مزید لکھتے ہیں کہ اقبال پاکستان کے اوّلین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران اقبال نے ان سے یہ کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمائت کی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔ شائد انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیمِ ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہوا، ہم آہنگ نہیں تھا۔ آخری عمر میں اقبال کا رحجان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔ سوویت یونین کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا"۔

نہرو کا یہ الزام سراسر غلط ہے، ان کا یہ الزام لاعلمی پر نہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے جن لوگوں نے اقبال کی شاعری، فلسفہ اور سیاست کا سرسری سے بھی کم مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس صداقت کی گواہی دیں گے کہ اقبال جاگیرداری نظام کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ نہرو سے سب سے بڑا تاریخی سہو یہ ہوا کہ وہ بھول گئے کہ ان کی کتاب سے 3 برس قبل قائداعظم کے دیباچہ کے ساتھ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے تھے، یہ انگریزی کتاب یقیناً نہرو کی نظر سے گزر چکی ہوگی، اس کتاب میں شامل 28 مئی 1937ء کا وہ طویل خط بھی شامل ہے جس میں نہرو کی "بے خدا سوشلزم" کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان تو رہے ایک طرف، خود ہندو معاشرہ بھی "بے خدا سوشلزم" کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ نہرو کے سوشلزم کو رد کرتے وقت اقبال نے قائداعظم کو بتایا کہ اگر اسلامی شریعت کی دورِ حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں از سرِ نو تفسیر کی جائے تو مسلمان عوام کی روٹی روزگار کا مسئلہ بہتر طور پر حل ہو سکتا ہے۔ مسلمان کو غربت کے عذاب سے نجات دلانے کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی الگ قانون ساز اسمبلی ہو اور یہ اسمبلی متحدہ ہندوستان کی بجائے ایک الگ خود مختار مملکت میں ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس خط کے مندرجات زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

اوّل: اقبال نہرو کی "بے خدا سوشلزم" پر اسلام کے اقتصادی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔

دوم: اسلام کے اقتصادی نظام کو عہدِ جدید کے سیاق و سباق میں نافذ کرنے کیلئے جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام ضروری ہے۔

سوم: اپنی وفات سے فقط چند ماہ پہلے وہ قائد اعظم کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ وہ قیامِ پاکستان کو کل ہند مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام بنالیں۔
چہارم: اس خط کے آخر میں وہ قائد اعظم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت نہیں آپہنچا جب ہمیں کھل کر قیامِ پاکستان کو اپنی منزل قرار دے دینا چاہئے؟

نہرو دانستہ طور پر اقبال کی وفات سے تین ماہ پیشتر میاں افتخار الدین کے ہمراہ جاوید منزل میں علامہ اقبال سے جو ملاقات کی تھی، اس ملاقات کی خوشگوار یادوں کا یہ واقعہ بیان کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا لیکن اسے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں بیان کر دیا ہے۔
محترم بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:
نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے، انڈین نیشنل کانگرس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے اور دونوں مرتبہ اپنے خطباتِ صدارت میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے نہرو سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟ نہرو نے جواب دیا کہ، نصف درجن کے قریب۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، تعجب ہے، خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے، ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کا مشورہ دوں، تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں؟" اس پر نہرو خاموش ہو گئے۔

اسی ملاقات میں ایک اور ناگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا اور نہرو نے اس کو بھی قوم کو بتانا مناسب نہیں سمجھا، ہاں البتہ بٹالوی صاحب نے بیان کر دیا ہے:
"ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے؟ مسلمان جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں، اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے، تو اچھا، یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا معمولی سپاہی ہوں"۔
اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے چنانچہ وہ اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔

حیرت یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقابلِ فراموش یادوں کو تو آسانی سے فراموش کر دیا مگر ایڈورڈ تھامسن کی گپ شپ کو ناقابلِ تردید تاریخی صداقت کا درجہ دے دیا۔ ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے استاد تھے اور تاریخ ہند سے بھی علمی شغف رکھتے تھے۔ وہ دو مرتبہ برطانیہ کے اخبار "مانچسٹر گارڈین" کے نامہ نگار کے روپ میں بھی برٹش انڈیا تشریف لائے تھے۔ گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، راج گوپال اچاری، سردار پٹیل اور نہرو کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے جہاں وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے، وہاں کانگرس کی پرجوش وکالت کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جس روایت کا سہارا لیکر نہرو نے اقبال پر الزام تراشی کی ہے وہ ایڈورڈ تھامسن اور علامہ اقبال کی زبانی گفتگو پر مبنی ہے۔ ایڈورڈ تھامسن موصوف کا یہ بیان

قائد اعظم کے نام اقبال کے متذکرہ بالا خطوط کی دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ اقبال نہرو ملاقات کے مندرجہ بالا احوال ومقامات کی بنیاد پر جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال آخر دم تک اپنے تصورِ پاکستان کو قیامِ پاکستان کی صورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنامیں سرشار رہے۔ قائد اعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں سرگرمِ عمل رہے اوراسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ میری زندگی کی دعائیں مانگنے کی بجائے محمد علی جناح کی طویل زندگی کی دعائیں مانگو، صرف جناح ہی قوم کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نہ معلوم یہ باتیں نہرو کے ذہن سے کیوں محو ہو گئی تھیں یا انہوں نے ان باتوں کو ناخوشگوار اور اپنی سیاسی آئیڈیالوجی کی تردید سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا:

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ علامہ اقبال ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ میرے نبی ﷺ کا یہ مبارک فرمان ہے کہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جس کے اخلاق بہترین ہیں۔ اسی لیے نظریاتی اختلاف کے باوجود علامہ اقبال اور نہرو کے درمیان ہمیشہ باہمی احترام کے تعلقات قائم رہے۔ نہرو نے 1933ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کے طرزِ فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ گاندھی جی کے اس رویہ کی حمائت میں نہرو کی لب کشائی پر اقبال حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ اقبال اس کانفرنس میں شریک تھے مگر نہرو شریک نہیں تھے۔ کانگرس کی نمائندگی گاندھی جی نے کی تھی۔ گاندھی جی نے واپسی پر کہا کہ انہوں نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو قبول کر لیا تھا مگر سیاسی رجعت پسندی کی بناء پر مسلمانوں نے کانفرنس کو ناکام بنا دیا۔ نہرو نے گاندھی جی کی باتوں میں آکر مسلمان مندوبین کے خلاف ایک انتہائی سخت سیاسی بیان داغ دیا چنانچہ علامہ اقبال نے گاندھی جی کے اس الزام کی تردید میں نہرو کو جو خط تحریر کیا اس میں علامہ کا اخلاق ملاحظہ فرمائیں:

"میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانیوں میں کم یاب ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے 3 سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق نہرو کی تحقیق کی بنیاد کسی تعصب پر مبنی ہے"۔ اس خوش گمانی کے اظہار کے بعد علامہ اقبال نے اصل حالات کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ "گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات کو ذاتی طور پر ماننے کا عندیہ تو دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بات کی حتمی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کانگرس کی مجلسِ انتظامیہ بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کانگرس انہیں ان مطالبات کے سلسلے میں مکمل اختیار دینے کیلئے کبھی بھی رضامند نہیں ہو گی، گویا عملاً گاندھی جی نے مسلمانوں کے تمام مطالبات کو رد کر دیا تھا، گاندھی جی کی دوسری غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی حمائت ترک کر دیں مگر مسلمانوں نے اچھوتوں کی حمائت سے دستبرداری سے انکار کر کے گاندھی جی کو ناراض کر دیا تھا"۔ چنانچہ اپنے اس خط میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ اپنے زبانِ زدِعام سوشلسٹ خیالات کے پیشِ نظر نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمائت کریں گے؟ کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا الزام دیں۔ اس صورت میں میں وہ لوگ جو ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ نہرو فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہندو مہاسبھا کی جاری کردہ مہم میں ایک سرگرم رکن ہیں"۔

مسلمانوں کے خلاف نہرو کا دوسرا الزام یہ تھا کہ مسلمان ہندوستانی قومیت کے مخالف ہیں۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا:
"اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں ہی اس نظریہ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں۔ میں نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں، جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقاء کیلئے ضروری سمجھتی ہے، نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسے رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں، یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیشِ نظر اس طرح تقسیم کرنا ہو گا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے"۔

نہرو کے جواب میں دیا گیا علامہ اقبال کا یہ بیان یقینی طور پر نہرو کی نظروں سے گزرا ہو گا، اس بیان میں روزِ اوّل تا آخر اقبال کا ترقی پسند، وسیع النظر اور انسان دوست مسلک نمایاں ہے۔ یہ بیان تصورِ پاکستان کی نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے عبارت ہے۔ ایسے میں نہرو کا یہ کہنا کہ 1930ء کے بعد اقبال اپنے تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے، دیانت داری پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ تاریخی حقیقت پر تعصب کی چادر ڈالنے کے مترادف ہے۔ آیئے مستند تاریخی حوالوں سے کچھ اور پوچھتے ہیں:

جب نہرو نے "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں دنیائے اسلام کی صورتحال پر تین مضامین میں وطنیت اور لادینیت کے فروغ کا خیر مقدم کیا تھا تو اس کے جواب میں اقبال نے بھی "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) ہی میں نہرو کی فکری گمراہی کو راست فکری میں بدلنے کیلئے اپنے طویل مضمون کے آغاز میں برملا کہا: میں اس بات کو نہرو اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ نہرو کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو نہرو سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ وہ اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو"۔

قارئین! ذرا غور فرمائیں کہ اقبال کا یہ تجزیہ کہ "نہرو کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے" وقت نے بہت جلد سچ ثابت کر دکھایا، جب نہرو کے دل میں برصغیر کی زندگی کے ٹھوس حقائق کا احساس جاگ اٹھا تو مولانا ابوالکلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں ٹھوس حقائق یعنی قیامِ پاکستان کی حقیقت کو قبول کرنے کا مشورہ دینے لگے۔ مولانا آزاد نے اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" میں اس بات کا ذکر یوں فرمایا ہے:
"کچھ دنوں کے بعد جواہر لال دوبارہ مجھ سے ملنے آئے۔ اس نے ایک طویل تمہید کے ساتھ آغاز کیا جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں خواہش مندانہ سوچ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ بالآخر وہ اس بات پر پہنچے اور مجھ سے تقسیم کی مخالفت ترک کرنے کو کہا"۔

اسلامیانِ ہند نے 1946ء کے انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے نہرو اور گاندھی جی کے سیاسی خواب پرستوں کو زندگی کے جن حقائق کا احساس دلایا تھا، اقبال نے برسوں پہلے نہرو کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سیاسی تدبر کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے فرار کرنے کی بجائے

ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے پنجہ آزماہو اجائے"۔اپنے زیرِ نظر مضمون میں بھی علامہ اقبال نے جداگانہ مسلمان قومیت کے سوال پر دو ٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔اقبال نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسلک پر ان الفاظ پر روشنی ڈالی تھی:

"اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جبکہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتا ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے، جداگانہ مسلمان قومیت کا سوال صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹادیں۔جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کرلیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامیانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کردے، اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کرسکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کرلیں گے"۔

علامہ اقبال کا یقینِ کامل بالکل درست نکلا، اسلامیانِ ہند نے بالآخر متحدہ ہندوستانی قومیت کے سیاسی تصور کو غلط ثابت کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان قائم کرلیا۔ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہوگئی اور یوں پاکستان میں اسلام سے عشق اور وطن سے محبت میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔اب ہمارا دین اسلام ہے اور ہمارا وطن دار لسلام ہے اور دوسری طرف آپ نہرو کی صداقت کا اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ساری دنیا کے سامنے انہوں نے تحریری طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کشمیریوں کو حق خودارادیت دیں گے لیکن خود ہی اپنی تحریر سے منحرف ہوگئے اور اس وعدہ خلافی نے ان کی ساری شخصیت کا بھرم طشت ازبام کردیا ہے۔علامہ کا یہ شعر کتنا حسبِ حال ہے:

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

رہے نام میرے رب کا جو حق سچ ہے!

بروز منگل 10 جمادی الاول 1446ھ 12 نومبر 2024ء

ایٹمی پاکستان: امریکی اور اسرائیلی مفادات کا اصل چیلنج

گزشتہ برس سات اکتوبر کو اسرائیل پر حماس کے حملے کے بعد سے تمام نظریں مشرق وسطیٰ پر لگی تھیں اور سب کے ذہن میں یہ سوال تھے کہ اسرائیل کی جانب سے ردعمل کتنا شدید اور طویل ہو گا؟ اور خطے کے عرب ممالک کے عوام اور حکومتیں کیا ردعمل دیں گی؟ آج تک پہلے سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں مل سکا: اسرائیلی بمباری نے غزہ کی پٹی میں تباہی برپا کر دی اور اب تک 42500 فلسطینی ہلاک ہو چکے ہیں لیکن اس کے تھمنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دوسرے سوال کے جواب کا کچھ حصہ واضح ہے، اگر کوئی یہ توقع رکھتا ہے کہ عرب دنیا کے دارالحکومتوں میں بڑے پیمانے پر احتجاج یا مظاہرے ہوں گے تو انھیں مایوسی ہو گی۔ اگرچہ عرب ممالک کی آبادی کی بڑی تعداد کی حمایت اور جذبات فلسطین کے ساتھ یکجہتی کے ہیں لیکن ان ممالک میں مظاہروں کو محدود رکھا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے عرب ممالک کی حکومتوں کا ردعمل بہت کمزور یا مایوس کن رہا۔ اسرائیل پر روایتی تنقید یا قطر اور مصر کی حکومتوں کی جانب سے اس تنازعے میں ثالثی کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کے علاوہ کسی نے بھی فلسطینیوں کا ساتھ نہیں دیا۔

کسی بھی عرب ملک نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات ختم نہیں کیے یا کوئی ایسا اقدام نہیں اٹھایا جس سے اسرائیل پر سفارتی یا معاشی دباؤ بڑھتا یا اس جنگ کو روکنے میں مدد ملتی مگر خطے میں فلسطین کے مسئلے نے اپنی اہمیت کیوں کھو دی۔ مشرق وسطیٰ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب پیچیدہ ہے۔ سعودی عرب بھی سات اکتوبر میں غزہ اور اسرائیل کے جنگ کے آغاز سے قبل اسرائیل کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کئی دہائیوں سے اور حالیہ تنازعہ کے آغاز سے لے کر آج تک ہر عرب ملک نے اپنے اپنے مفادات کی پیروی کی۔ وہ فلسطینیوں کی حمایت اور یکجہتی کی بات کرتے ہیں، اور ایسا نہیں کہ یہ جذبات حقیقی نہیں ہیں لیکن وہ اپنے قومی مفادات کو پہلے دیکھتے ہیں جبکہ عرب دنیا میں عوامی رائے اسرائیل کے سخت خلاف ہے۔

عرب ممالک کے عوام کے دل میں غزہ کے تباہ حال شہریوں کے لیے بہت ہمدردی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومتیں فلسطینیوں کے لیے کچھ زیادہ کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ممالک اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیں، اور کم از کم ردعمل دیتے ہوئے سفارت کاروں کو ان کے ممالک سے نکال دیا جائے لیکن یہ اب تک نہیں ہوا۔ دراصل عرب حکومتوں نے فلسطینیوں کو کافی عرصہ پہلے چھوڑ دیا تھا۔

عرب ممالک کی تاریخ میں عربوں نے ایک شناخت، ایک زبان، اور بڑی حد تک ایک مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے شناخت کو جوڑا لیکن خطے میں یورپی ۔ نوآبادیاتی اثرات سے پیدا ہونے والے خدشات بھی موجود رہے ہیں لیکن ان ممالک کی حکومتوں کے مفادات بھی ایک دوسرے سے متضاد رہے ہیں فلسطینیوں اور عرب ممالک کے درمیان تعلقات بھی آسان نہیں رہے، خاص طور پر ان کے ساتھ جنھوں نے 1948 میں اسرائیل کی ریاست کے اعلان کے بعد بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کو خوش آمدید کہا۔ لبنان کی خانہ جنگی اور فلسطینی عسکریت پسندوں اور اردنی بادشاہت کے درمیان جھڑپیں بعض اوقات خطے کی متضاد تاریخ کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن مسئلہ فلسطین کئی دہائیوں سے عرب ممالک کے لیے متحد ہونے کا عنصر بھی تھا لیکن وائے افسوس کسی نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کیلئے اللہ کی اس نعمت کو فراموش کر دیا اور آج مسلم امہ تمام وسائل ہونے کے باوجود سب سے زیادہ ذلیل ورسوا ہو رہی ہے۔

ان حالات میں یہ خدشہ بڑھ گیا ہے کہ کیا نیتن یاہو "گریٹر اسرائیل" کے خواب کی تکمیل کیلئے جلد مشرق وسطیٰ کا نقشہ بدلنے جارہا ہے اور بظاہر دنیا یہ سب ہوتا دیکھتی رہ جائے گی؟ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انٹونیو گوٹیریش کے مطابق اسرائیل کی طرف سے غرب اردن کا یکطرفہ الحاق "بین الاقوامی قانون کی سب سے سنگین خلاف ورزی ہوگی"۔

مسلم دنیا اور یورپی ممالک بھی فلسطینی غرب اردن کو زبردستی ہتھیانے کے اسرائیلی منصوبے کی مذمت اور مخالفت کر چکے ہیں لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ نیتن یاہو کو اس انتہائی متنازع اقدام کیلئے امریکی صدر اور انتہائی مضبوط یہودی لابی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت دنیا کی مکمل یہ تجارت "آئل، ادویات اور اسلحے کی انڈسٹری" کے ساتھ الیکٹرانک کے ساتھ ساتھ دیگر زندگی کی ضروریات کی 38 کارپوریشنز کنٹرول کر رہی ہیں اور تمام عالمی کارپوریشنز یہودیوں کی ملکیت ہیں اور انہوں نے بڑی چابک دستی سے چین کے اندر بھی بہت سی انڈسٹریز میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے لیکن پچھلے 10 برسوں سے چین نے بڑی حکمت کے ساتھ اپنا کنٹرول بحال کر لیا ہے جس کے بعد یہ کارپوریشنز بھی کھل کر سامنے آگئی ہیں اور ہر صورت میں دنیا میں چین کی بڑھتی ہوئی معاشی سبقت کو نیچا دکھانے کیلئے پہلے سے زیادہ متحرک ہو گئی ہیں اس حوالے سے یقیناً امریکی سپر میسی کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کیلئے سازشوں میں مصروف ہیں اور اسی تناظر کی تفصیل "کیا تیسری جنگ عظیم کا اسٹیج تیار ہو چکا ہے؟" کے عنوان سے میں اپنے آرٹیکل میں تفصیل سے تحریر کر چکا ہوں جس کو قارئین کی ایک بڑی تعداد میں خاصی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

مشرق وسطیٰ کے مبصرین اس بات پر متفق ہیں کہ نیتن یاہو طاقت کے زور پر جو کچھ کرنے جارہا ہے اس کے خطے کے امن و استحکام پر گہرے منفی اثرات پڑیں گے۔ نیتن یاہو غرب اردن کا اسرائیل کے ساتھ زبردستی الحاق کرنے کے بعد اگر فلسطینیوں کو وہاں سے بے دخل کر سکتا تو شاید کر دیتا لیکن ایسا ممکن نہیں۔ غرب اردن میں فلسطینیوں کی تعداد کوئی 25 لاکھ ہے۔ اسرائیل کا حصہ بننے کی صورت میں فلسطینی اسرائیلی آبادی کا 40 فیصد ہو جائیں گے۔ عالمی رائے عامہ نے نیتن یاہو سے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ تمام فلسطینیوں کو اسرائیلی شہریت دے کر برابری کے حقوق کا وعدہ پورا کرے لیکن اب نیتن یاہو اس خدشہ کا اظہار کر رہا ہے کہ ایسا کرنے سے اسرائیل میں فلسطینیوں کی تعداد بڑھ جائے گی جس سے یہودی اکثریت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے نیتن یاہو فلسطینیوں کو بطور شہری برابر کے حقوق دینے کے بھی خلاف ہے لیکن اگر اسرائیل نے فلسطینیوں کو اپنے ہی علاقے میں دوسرے درجے کا شہری بنانے کی کوشش کی تو اس سے غم و غصہ بڑھے گا۔ جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت نے ایک عرصے تک مقامی سیاہ فام آبادی پر اسی طرح حکومت کی اور اس کا استحصال کیا لیکن وہاں کے لوگوں کی جدوجہد اور عالمی دباؤ کے بعد بالآخر اس نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اسرائیل کیلئے آج کے دور میں اسی طرح کا امتیازی نظام متعارف کرانا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گا۔ اس روش کے آگے جا کر خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔

فوری طور پر شاید کوئی شدید ردِ عمل سامنے نہ آئے۔ عرب حکمران اور دیگر ملک فلسطینیوں کے ساتھ ہمدردی دکھانے کی خاطر زبانی کلامی اسرائیل کی مذمت کریں گے لیکن عملی طور پر دنیا نے بظاہر فلسطینیوں کو اب ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر ممالک سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے پر امریکا اور اسرائیل کے ساتھ ایک حد تک ہی محاذ آرائی کی جا سکتی ہے لیکن فلسطینیوں کی خاطر ان سے لڑائی نہیں کی جا سکتی۔ خود فلسطینی قیادت اتنی مایوس ہے کہ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کرے گی لیکن اسرائیل کے خلاف پر تشدد مظاہروں کی حمایت نہیں کرے گی۔

امریکا سمیت عالمی برادری نوے کی دہائی سے اوسلو معاہدے کے تحت خطے میں دو ریاستوں کے قیام کیلئے کوشاں رہی ہے لیکن دنیا کی نظر میں نیتن یاہو کا یہ اقدام فلسطینیوں کا اپنی علیحدہ ریاست کا دیرینہ خواب چکنا چور کرنے کے مترادف ہے اور نیتن یاہو کی ان خواہشات میں ٹرمپ کے یہودی

نژاد داماد جیر الڈ نے خوب رنگ بھرا ہے اور حالیہ عرب معاہدوں کیلئے سب سے زیادہ اس نے وہی کام کیا ہے جو خلافتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کیلئے لارنس آف عریبیہ نے کیا تھا۔ نیتن یاہو اور ان کے حمایتیوں کے نزدیک غرب اردن کا علاقہ انتہاء پسند یہودی عقیدے کے اعتبار سے اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہے اور ملک کی سلامتی کیلئے بھی ناگزیر ہے لیکن دنیا کے نزدیک اسرائیل نے ان علاقوں پر 1967ء کی جنگ کے بعد سے قبضہ کرر کھا ہے۔

پچھلی چند دہائیوں میں اسرائیل ان مقبوضہ علاقوں میں "نئے زمینی حقائق" قائم کرنے کی پالیسی پر گامزن رہا ہے جس کے تحت وہاں مسلسل نئے گھر قانونی ہیں۔ اس کے باوجود آج غرب سے یہودی خاندانوں کو لالا کر بسایا جاتا رہا ہے۔ عالمی برادری کی نظر میں یہ تعمیرات غیر اور فلیٹ تعمیر کر کے باہر اردن کی ان شاہکار بستیوں میں کوئی پانچ لاکھ کے قریب اسرائیلی یہودی بستے ہیں۔ نیتن یاہو کا خیال ہے کہ وہ طاقت کے بل پر "گریٹر اسرائیل" کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تیار ہے لیکن دنیا کی نظر میں ان کا یہ عمل خطے کو تباہی اور جنگ کی طرف دھکیل رہا ہے جس سے اسرائیل کے وجود کو بھی شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

دو قومی نظریہ تقسیمِ ہند کا اصل محرک بنا یعنی مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں جن کا مذہب، ثقافت، تاریخ، رہن سہن اور تہذیب و تمدن سب یکسر مختلف ہے۔ اس فلسفے کے تناظر میں مملکتِ خداداد پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور ہندوستان دو الگ الگ ملکوں میں بٹ گیا۔ بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فروری 1948ء میں امریکا کے نام پیغام میں فرمایا تھا "میں نہیں جانتا کہ پاکستان کے دستور کی آخری شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار اور جمہوری انداز کا ہو گا۔ اسلام کے اصول آج بھی ہماری زندگیوں میں اسی طرح قابل عمل ہیں، جس طرح 1300 سال پہلے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے"۔ یہ تھا وہ نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ بنیادی طور پر یہ وہی نظریہ ہے جو رسول کریم ﷺ نے آج سے تقریباً 1450 سال قبل انسانیت کو دیا تھا۔ اس کی روشنی میں دیکھیں تو پاکستان کوئی معمولی ملک نہیں، اس کے قیام کی نوید 1450 سال قبل سنائی گئی تھی۔ رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی کو اہلِ عرب صادق اور امین کہتے تھے اور یہود و نصاریٰ بھی اس بات پر متفق تھے کہ آپ ﷺ صادق بھی ہیں اور امین بھی، لیکن یہودیوں نے آپ ﷺ کو اللہ کا سچا نبی ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ آپ ﷺ حضرت اسماعیل علیہ سلام کی آل میں سے تھے۔ یہودی خود کو اللہ کی مقرّب ترین اور بہترین قوم سمجھتے تھے، سارے انبیاء بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے لیکن خاتم النبیین ﷺ کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں تھا جس کو یہود نے ماننے سے انکار کیا، ان کی رائے میں اللہ نے عزت و وقار صرف بنی اسرائیل کو بخشا ہے، لہٰذا جو بھی نبی مبعوث کیا جائے گا اس کا تعلق لازماً بنی اسرائیل سے ہی ہو گا۔ یوں مسلمانوں سے یہودیوں کی جنگ شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے۔

قیامِ پاکستان کے 9 ماہ بعد ہی اسرائیل کے نام سے فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کی جبری ریاست قائم کی گئی۔ اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم اور صیہونی تنظیم کے سربراہوں میں سے ایک ڈیوڈ بین گوریان نے اپنی پہلی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ریاست اسرائیل کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو وہ پاکستان ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔" واضح رہے کہ 14 / اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا اور 14 مئی 1948 کو اسرائیل کی

ناجائز ریاست قائم کی گئی۔ نومولود پاکستان کو اسرائیل نے اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دے دیا۔ گوریان نے کہا تھا کہ "جس دن پاکستان ختم ہو جائے گا اس دن اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پاکستان ایک نظریے کے تحت وجود میں آیا اور نظریہ کو ختم کرنا چونکہ بچوں کے آسان کھیل جیسا نہیں ہوتا تو یہاں دشمن نے سفاک چال چلی۔ ملک توڑنے کیلئے مذہب کی غلط ترجمانی کرتے ہوئے زبان، رنگ، نسل، قوم اور فرقوں کا سہارا لیا گیا۔ آج یہی غیروں کے ایجنڈے پر اس نظریاتی ملک کو توڑنے کی سازش کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ویسے تو مسلمانوں کی تاریخ جرات و بہادری سے عبارت ہے لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ اوروں کی طرح اس قوم میں بھی گلی محلوں سے لے کر سیاسی ایوانوں میں غدار لوگ پائے جاتے رہے ہیں۔ موجودہ صورتحال میں پاکستان کو انتہائی خطرات کا سامنا ہے۔ بھارتی سرحد ہمیشہ سے ہی پریشانی کا سبب رہی ہے، اور دشمن افغان سرحد کو بھی استعمال کرتا رہتا ہے۔ ایک طرف فوج طویل ترین سرحدوں کی حفاظت پر معمور ہے تو دوسری طرف ملک میں انتہا پسند تنظیموں اور دہشتگردوں سے بھی نمٹ رہی ہے جبکہ کوئی قدرتی آفت آجائے، حتیٰ کہ ابرِ رحمت ہی کھل کر برس جائے تو بھی انتظامیہ کو مدد کیلئے فوج کی جانب دیکھنا پڑتا ہے۔

پاکستانی افواج ہمہ وقت متعدد محاذوں پر برسرِپیکار ہے۔ ایسے میں اب سی پیک کے خلاف امریکا اسرائیل اور بھارت سے گٹھ جوڑ کر کے جہاں پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے وہاں امریکی دباؤ اور دھمکیوں نے انتہائی گھمبیر صورتحال پیدا کر دی ہے لیکن دوسری طرف ہماری نااہل سول حکومت کرپشن کے مقدمات میں الجھی ہوئی ہے۔ لگ یوں رہا ہے کہ ملک کی داخلہ و خارجہ امور بھی اب فوج کو ہی دیکھنے ہوں گے۔ سیاسی عدم استحکام بھی عروج پر ہے۔ سابقہ حکومت کے دور میں اسلام آباد میں ایک مذہبی جماعت کے دھرنے اور ان کے مطالبات کے آگے گھٹنا ٹیک دینا بھی عالمی سطح پر بدنامی کا سبب بنا۔ اگر ہم تاریخ کے جھروکوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ امریکا نے پاکستان کو ہمیشہ ہی مایوس کیا ہے۔

سانحہ 1971ء میں اس تاریخی بحری بیڑے کے دھوکے کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے جو امریکا نے پاکستان کی مدد کیلئے بھیجنا تھا۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ امریکا کے بیشتر امور اسرائیل سے کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ امریکا اسرائیل کو امداد کے نام پر اتنی خطیر رقم دیتا ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ 14 ستمبر 2016 کو امریکا نے اسرائیل کے ساتھ 10 سالہ فوجی امداد کا 38 ملین ڈالر کی مدد کا معاہدہ سائن کیا اور یہی اسرائیل پاکستان کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ امریکا کی سلامتی کی پالیسی سے لیکر انتظامی امور تک سب یروشلم میں طے پاتے ہیں۔ اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن جیسے بین الاقوامی ادارے اسرائیل کے اختیار میں ہیں تو امریکا کی پالیسیز پاکستان کے حق میں مفید کیسے ہو سکتی ہیں؟

واضح رہے کہ پاکستان پورے عالم اسلام میں واحد نیوکلیئر پاور ہے اور یہی اسرائیل کو کسی طور ہضم نہیں ہوتی۔ 1981 میں اسرائیل نے بھارت کی مدد سے کہوٹہ نیوکلیئر ری ایکٹر پر ناکام حملے کی سازش بھی کی جو کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان تمام معلومات اور تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکا پاکستان اور مسلمانوں کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ افغانستان، عراق، لیبیا، شام، یمن، مصر، مراکش، لبنان، تیونس اور فلسطین میں امریکا اور اسرائیل کا کردار سب کے سامنے ہے۔ یہاں ہونے والی خونریزی کے پیچھے گریٹر اسرائیل کا منصوبہ ہے اور گریٹر اسرائیل کی راہ میں بڑی حد تک رکاوٹ پاکستان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو ختم کرنے کیلئے ان ممالک کی سر توڑ کوششیں جاری ہیں۔

برما میں ہونے والے حالیہ فسادات اور مسلمانوں کی بدترین نسل کشی بھی اسی منصوبے سے متعلق ہے۔ اگر آپ معاملات کا بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ

عراق، افغانستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی کرنے والے امریکا نے برما میں مسلمانوں کے قتل عام پر انسانی حقوق کا واویلا کرکے وہاں امن فوج بھیجنے کے مطالبہ کی آڑ میں بھی ایک بھیانک سازش میں مصروف تھا۔ دراصل امریکا کو اس خطے میں ایک محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کو افغانستان میں بدترین شکست کے بعد مطلوب تھی جو پاکستان سمیت، چین اور شمالی کوریا کی نگرانی کرسکے لیکن چین نے بروقت اس سازش کو بھانپ کر ”ون روڈ ون بیلٹ“ کے منصوبے کے تحت فوری طور پر برما کے ساتھ کئی تجارتی معاہدے کرکے امریکا کا راستہ مسدود کر دیا۔

مختصراً یہ کہ آنگ سان سوچی امریکا ہی کا پیدا کردہ ایک ایسا کردار ہے جو بھارت کی مدد سے میانمار میں امریکا کی راہ ہموار کرتا تھا۔ اس اسرائیل کا یہ سازشی دماغ ہے جو درحقیقت ”گریٹر اسرائیل“ کی منزل کی طرف گامزن ہے جس کی راہ ہموار کرنے کیلئے ایران کو مشتعل کرکے جاری جنگ کی آگ پر مزید پٹرول پھینکنا ہے تاکہ اس سارے خطے کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا جائے اور اس کی آڑ میں گریٹر اسرائیل کی تکمیل کیلئے امریکا اور مغرب کی پشت پناہی سے اپنے شیطانی منصوبے پر عملدرآمد کیا جاسکے لیکن اس سارے منصوبے کے پیچھے اگر کوئی براہِ راست رکاوٹ ہے تو وہ کلمہ طیبہ کے نام پر 27 رمضان کی مبارک شب کو معرضِ وجود میں آنے والا ایٹمی طاقت کا حامل ملک پاکستان ہے۔ ربِّ کریم ہمارے پاکستان کی حفاظت فرمائے آمین

بروز جمعتہ المبارک 15 جمادی الاول 1446ھ 15 نومبر 2024ء

ٹرمپ کی کابینہ کے اہم ارکان: نامزدگیوں کا تجزیہ

ڈونلڈ ٹرمپ 20 جنوری کو امریکا کے 47 ویں صدر کی حیثیت سے حلف اٹھائیں گے تاہم حلف اٹھانے سے قبل ہی ٹرمپ نے اپنے دوسرے دور صدارت کیلئے اہم عہدوں پر نامزدگیاں کر دی ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک میں بھی ان تعیناتیوں کو غور سے دیکھا جا رہا ہے اور اس بات کا اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ کون سی شخصیت اہم امور پر ماضی میں کیا مؤقف اپناتی رہی ہے۔ ان تعیناتیوں سے ماہرین یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ٹرمپ کی پالیسی کیا ہو گی؟ مشرق وسطیٰ پر امریکا کیا مؤقف اپنائے گا اور کیا وہ اسرائیل کی حمایت ہی جاری رکھے گا؟ اب تک نئی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹرمپ اپنے حامیوں کو نواز رہے ہیں لیکن کیا ٹرمپ واقعی قومی سلامتی کو ترجیح دیتے ہوئے آئندہ دنیا میں جاری ان تمام جنگوں کو بند کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کا انہوں نے وعدہ کیا ہے۔

اس تحریر میں ہم اہم ترین عہدوں پر ہونے والی ان نامزدگیوں پر نظر دوڑائیں گے کہ ٹرمپ کی ٹیم کا حصہ بننے والی یہ شخصیات کون ہیں اور ماضی میں ان کی سیاسی سوچ کیا رہی ہے؟ اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ریپبلکن صدر کی جنوبی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور خصوصاً پاکستان کیلئے کیا پالیسی ہو گی۔ ٹرمپ کی ٹیم میں ایسی کئی شخصیات شامل ہیں جو ماضی میں جنوبی ایشیا خصوصاً پاکستان اور انڈیا اور مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کے باعث خبروں میں رہے ہیں تاہم حلف برداری سے قبل واضح طور پر یہ کہنا مشکل ہو گا کہ وہ کس معاملے پر کیا پالیسی اختیار کرتے ہیں۔

ٹرمپ نے ایک سابق فوجی کرنل مائیک والٹز کو قومی سلامتی امور کے مشیر نامزد کیا ہے جو ماضی میں چین کو امریکی اثر ورسوخ کیلئے معاشی اور عسکری اعتبار سے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے اسے ایک نئی سرد جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح اقوام متحدہ کے سفیر کیلئے نامزد ہونے والی الیز سٹیفنک نے بھی ماضی میں چین پر الزام لگایا تھا کہ وہ الیکشن میں مداخلت کر رہا ہے جب یہ خبریں سامنے آئی تھیں کہ چینی حمایت یافتہ ہیکرز نے سابق صدر کے فون سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ٹرمپ نے چین پر تنقید کو تجارت تک محدود رکھا ہے تاہم ان کی خارجہ امور کی ٹیم چین کے نقادوں سے بھر رہی ہے۔

ٹرمپ نے سیکریٹری خارجہ کے اہم عہدے کیلئے سینیٹر مارکو روبیو کو نامزد کیا جو کہ ماضی میں ٹرمپ کے مخالف رہے ہیں لیکن انھیں خارجہ پالیسی امور کا ایک ماہر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر امریکا کے اعلیٰ سفارت کار کے طور پر کام کریں گے۔ ان کی نامزدگی کا اعلان کرتے ہوئے ٹرمپ نے کہا کہ "روبیو آزادی کی ایک مضبوط آواز" اور امریکا کیلئے "طاقتور وکیل" ثابت ہوں گے۔ وہ کیوبا کے تارکین وطن خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان کی اس عہدے کیلئے منظوری دی گئی تو وہ امریکی تاریخ میں پہلے لاطینی سیکرٹری خارجہ ہوں گے۔ یہ ماضی میں چین کے ناقد رہے ہیں۔

روبیو پاکستان کے قریب ترین اتحادی چین کے حوالے سے بھی انتہائی سخت موقف رکھتے ہیں۔ رواں برس ستمبر میں انہوں نے امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ چین "امریکا کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ مخالف ہے۔ کمیونسٹ چین جمہوری ممالک کا نہ ابھی دوست ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ 2020 میں چینی حکومت نے ان پر پابندی عائد کر دی تھی جب انہوں نے ہانگ کانگ میں مظاہروں پر کریک ڈاؤن کے بعد چین کے خلاف پابندیاں لگوانے کی مہم چلائی تھی۔ وہ ایران اور چین سے متعلق سخت مؤقف اپنانے کیلئے جانے جاتے ہیں۔

رواں برس جولائی میں سینیٹر مارکو روبیو اس وقت بھی خبروں میں آئے تھے جب انہوں نے امریکی سینیٹ میں انڈیا کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت میں ایک بِل متعارف کروایا تھا۔ اس بِل کا نام امریکا، انڈیا دفاعی تعاون ایکٹ تھا جس کا مقصد دونوں ممالک میں دفاعی شراکت داری کو بڑھانا تھا تاکہ انڈو پیسیفک خطے میں "چین میں بڑھتی ہوئی جارحیت" کو روکا جاسکے۔ انڈیا کو درپیش خطرات کے پیشِ نظر اسے سکیورٹی تعاون مہیا کی جائے اور اس کے ساتھ دفاع، سِول سپیس، ٹیکنالوجی اور معاشی سرمایہ کاری کے شعبے میں بھی تعاون کیا جائے۔ اس بِل میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ "ٹیکنالوجی کی منتقلی" کے حوالے سے انڈیا کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جائے جو کہ امریکا جاپان، اسرائیل، کوریا اور نیٹو اتحادیوں کے ساتھ رواں رکھتا ہے۔

اس بِل میں پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ کانگریس کو پاکستان کے "دہشتگردی اور پروکسی گروپس کے ذریعے انڈیا کے خلاف طاقت کے استعمال پر کانگریس میں رپورٹ جمع کروائی جائے۔ اگر پاکستان انڈیا کے خلاف دہشتگردی سپانسر کرنے میں ملوث پایا جاتا ہے تو اسے سکیورٹی کے اعتبار سے مدد نہ فراہم کی جائے۔ مارکو روبیو ایران کے حوالے سے بھی سخت مؤقف رکھتے ہیں اور اس کو "دہشتگرد" ملک بھی قرار دے چکے ہیں۔

رواں برس اسرائیل پر ایرانی حملوں کے بعد مارکو روبیو نے حماس کے خلاف اسرائیلی کاروائیوں کی حمائت کرتے ہوئے سوشل میڈیا پر لکھا تھا کہ: اسرائیل کو ایران کو ویسا ہی ردِ عمل دینا چاہیے جیسا امریکا دیتا اگر کسی ملک نے ہم پر 180 میزائل داغے ہوتے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ (اسرائیل) حماس کے ہر عناصر کو تباہ کرے۔ یہ (حماس) جانور ہیں جنہوں نے خوفناک جرائم کیے ہیں۔ روبیو خارجہ تعلقات اور انٹیلی جنس کمیٹیوں کے سینئر رکن اور ٹرمپ کے سابق سیاسی حریف اور سخت ناقد رہ چکے ہیں اب وہ ان کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کے نائب سربراہ کے طور پر کام کر رہے ہیں اور وہ خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔ روبیو کو خارجہ پالیسی کے حوالے سے ایک شاطر ماہر سمجھا جاتا ہے جنہوں نے ماضی میں کہا تھا کہ روس اور یوکرین کے درمیان جاری تنازع کو "نتیجے تک پہنچانے" کی ضرورت ہے۔ تاہم روبیو نے اس عہدے کیلئے اپنی نامزدگی کو ایک "بھاری ذمہ داری" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ بطور سیکرٹری خارجہ روزانہ ان (ٹرمپ) کے ایجنڈے کیلئے کام کروں گا۔ صدر ٹرمپ کی قیادت میں ہم طاقت کے ذریعے امن قائم کریں گے اور ہمیشہ امریکیوں اور امریکا کے مفادات کو ہر چیز پر مقدم رکھیں گے۔

فلوریڈا کے رُکنِ کانگریس مائیک والٹز جو امریکی فوجی ہونے کی حیثیت سے کئی بار افغانستان، مشرقِ وسطیٰ اور افریقا میں بھی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ گذشتہ برس انڈین چینل ویون کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انہوں نے پاکستان کے حوالے سے کہا تھا کہ: دہشتگردی خارجہ پالیسی کا حصہ نہیں ہو سکتی۔ چاہے وہ لشکرِ طیبہ ہو یا دیگر دہشتگرد گروہ، یہ ناقابلِ قبول ہے۔ پاکستانی حکومت، فوج اور انٹیلیجنس کو اس سے آگے بڑھنا ہوگا اور ہم ان پر صحیح سمت اختیار کرنے کیلئے دباؤ ڈالتے رہیں گے۔ رواں برس جولائی میں فلوریڈا پولیٹکس کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ٹرمپ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ہمارے ایک صدر تھے جنہوں نے نام نہاد دولت اسلامیہ کو شکست دی تھی، ایران کو توڑ دیا تھا، ہمیشہ اسرائیل اور دیگر اتحادیوں کے ساتھ کھڑے رہے اور چین کو اس کے کیے پر پسپائی پر مجبور کیا۔ آپ نے صدر ٹرمپ کی موجودگی میں کبھی امریکا میں جاسوس غبارے نہیں دیکھے ہوں گے۔

تُلسی گبارڈ امریکی فوج میں بطور لیفٹیننٹ کرنل بھی خدمات سرانجام دے چکی ہیں اور وہ اس دوران مشرقِ وسطیٰ اور افریقا میں بھی تعینات رہی ہیں۔ ٹرمپ نے سابق رُکن کانگریس تِلسی گبارڈ کو نیشنل انٹیلیجنس کا ڈائریکٹر نامزد کیا ہے۔ ماضی میں تُلسی گبارڈ بھی پاکستان پر تنقید کرتی ہوئی نظر آئی ہیں۔ 2017 میں انہوں نے پاکستان پر اُسامہ بن لادن کو پناہ دینے کا الزام بھی عائد کیا تھا۔ اس وقت کالعدم جماعت الدعوۃ کے سربراہ حافظ سعید کی ایک مقدمے پر رہائی پر بھی تُلسی نے پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ حافظ سعید ممبئی حملوں کے "ماسٹر مائنڈ" تھے جن میں چھ امریکیوں سمیت سینکڑوں

افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مارچ 2019 میں انہوں نے پاکستان اور امریکا کے درمیان تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک سوشل میڈیا پوسٹ میں لکھا تھا کہ "جب تک پاکستان دہشتگردوں کو محفوظ پناہ گاہیں فراہم کرتا رہے گا دونوں ممالک کے درمیان تناؤ رہے گا وقت آگیا ہے کہ پاکستانی رہنما انتہا پسندوں اور دہشتگردوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔"

جون ریٹکلف ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت میں بھی نیشنل انٹیلیجنس کے سربراہ رہ چکے ہیں اور اب ایک مرتبہ پھر ان کو بطور (سی آئی اے) کا سربراہ نامزد کیا گیا ہے۔ انہیں پہلی بار 2019 میں سابق سپیشل کونسلر رابرٹ مولر سے کانگریس میں ہائی پروفائل سوالات کرنے کے چند دن بعد نیشنل انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر کیلئے نامزد کیا گیا تھا۔ ملر ایف بی آئی کے سابق ڈائریکٹر تھے جنہوں نے روس اور ٹرمپ کی 2016 کی انتخابی مہم کے درمیان ملی بھگت کے الزامات کی تحقیقات کی قیادت کی تھی۔ ٹرمپ نے جان ریٹکلیف کی اہلیت کے بارے میں خدشات پر دونوں جماعتوں کے اعتراضات کے چند دن بعد ان کی نامزدگی واپس لے لی تھی۔ 2020 میں ٹرمپ نے جان ریٹکلیف کو دوبارہ نامزد کرتے ہوئے کہا تھا کہ "پریس نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا"۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چین اور ایران کے حوالے سے سخت مؤقف رکھتے ہیں۔ دسمبر 2020 میں "داوال سٹریٹ جرنل" میں ایک مضمون میں انہوں نے لکھا تھا کہ "انٹیلیجنس بہت واضح ہے: بیجنگ اقتصادی، عسکری اور ٹیکنالوجی کے میدان میں امریکا اور پوری دینا پر برتری چاہتا ہے۔ چین کی بڑی کمپنیاں اپنی سرگرمیوں کی آڑ میں چین کی کمیونسٹ حکومت کیلئے کام کرتی ہیں۔

امریکی سیاست اور پالیسی سازوں پر گہری نظر رکھنے کے بعد یوں لگتا ہے کہ ٹرمپ کی حلف برداری سے قبل واضح طور پر یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہ کس معاملے پر کیا پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ پاکستان ٹرمپ کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے اور اگر ہم ٹرمپ کی جانب سے عہدوں پر نامزد کی گئی شخصیات کے بیانات دیکھیں تو لگتا ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ اپنے نظریات کے مطابق ہی کام کرے گی۔ تاہم پالیسی سازی میں نظریات کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ پالیسی سازی میں نظریات سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ پیچیدہ مشکلات سے نمٹنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخصیات متعدد موضوعات پر سخت مؤقف رکھتے ہیں لیکن ضرورت پڑنے پر وہ کمزور آنے کے ڈر کے بغیر اپنے عملیت پسند ہونے کی گنجائش بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ بالآخر ان سب کو صدر کی ایماء پر ہی کام کرنا پڑے گا اور ٹرمپ کوئی نظریاتی شخصیت نہیں بلکہ ڈیل میکر ہیں اور جنگوں کے خلاف ہیں۔ جہاں تک پاکستان کی بات ہے تمام پالیسیاں پہلے جیسے ہی رہیں گی، اگر معاملات خراب نہیں ہوتے یا پاکستان کسی بڑے بحران کا شکار نہیں ہو جاتا۔ پاکستان ٹرمپ انتظامیہ کیلئے تیسرے درجے کی ترجیحات میں ہی رہے گا یا پھر پاکستان کو نئی آنے والی انتظامیہ کے سامنے خود کو مددگار ثابت کرنا ہوگا لیکن چین کی دوستی ایک چیلنج کی طرح ہر حال میں مقدم ہوگی۔

نئی امریکی انتظامیہ کو چیلنجز کے ایک انبار کا سامنا ہے۔ پاکستان خصوصاً اس کی اندرونی سیاست اور اس کا انڈیا سے تعلق ان کی ترجیحات کی فہرست میں بہت نیچے ہوں گے۔ نئی ٹرمپ انتظامیہ کی تمام تر توجہ پہلے مشرقِ وسطیٰ اور خصوصاً ایران پر ہوگی۔ قوی امکان یہی ہے کہ ٹرمپ کی مشرقِ وسطیٰ پالیسی کی

بنیاد "ایران پر زیادہ سے زیادہ دباؤ" ڈالنے پر ہوگی اوران کی کوشش ہوگی کہ معاہدہ ابراہیمی کو ایک مرتبہ پھر زندہ کیا جائے اور توجہ اس بات پر رکھی جائے کہ سعودی عرب اسرائیل کو بطور ریاست تسلیم کرلے۔ تاہم ایسا ہونا اس لیے مشکل ہے کیونکہ فلسطین کی صورتحال انتہائی کشیدہ ہے اور ریاض میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں سعودی ولی عہد نے اپنی تقریر میں واضح طور پر اسرائیل کو فوری طور پر جنگ بند کرنے اور ایران پر حملہ ہونے کی صورت میں اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان سے فوج کے انخلا کے بعد امریکا کی نگاہ میں پاکستان کی اہمیت کم ہوئی ہے اس لئے پاکستان ابھی واشنگٹن کے ریڈار پر نہیں ہے۔ پاکستان اور چین کے درمیان سٹریٹجک تعلقات اور انڈیا اور امریکا کے درمیان شراکت داری کے بیچ میں ہی پاکستان کو کوئی گنجائش نکالنا ہوگی اور امریکا سے تعلقات کو بہتر بنانا ہوگا۔ تاہم ٹرمپ کی ٹیم میں چین مخالف شخصیات اگر پاکستان کو چین یا انڈیا کے لینس سے دیکھتی ہیں تو امریکا اور پاکستان کے درمیان معنی خیز دوطرفہ تعلقات کی گنجائش مزید سُکڑ جائے گی۔ اس لئے اندازہ یہی ہے کہ نئی انتظامیہ کی پالیسی میں شاید پاکستان کیلئے کوئی خوشگوار تبدیلی دیکھنے میں نہ آئے۔ امریکی پالیسی ساز یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو نظرانداز کرنے کی پالیسی اور واشنگٹن میں طاقت کے ایوانوں تک اسلام آباد کو رسائی نہ دینا پاکستان کو ایک مشکل پوزیشن میں رکھنے کیلئے مناسب ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ایران اور چین کے مقابلے میں پاکستان کے پاس زیادہ موقع ہے کہ وہ کچھ کوششیں کرکے ٹرمپ انتظامیہ سے تعلقات بہتر کرسکیں۔

مائیک ہکابی اسرائیل کیلئے امریکا کے نئے سفیر ہوں گے۔ اگرچہ وہ 13 سال میں اس عہدے پر آنے والی وہ پہلی شخصیت ہیں جو یہودی نہیں لیکن 69 سالہ ہکابی ایک طویل عرصے سے اسرائیل کے حق میں آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ 2008 میں مائیک ہکابی نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "فلسطین نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ مائیک ہکابی کی نامزدگی پر اسرائیل کے وزیر برائے قومی سلامتی ایتامیر بین گویر نے سوشل میڈیا پر ان کا نام جھنڈے اور دل کی ایموجیز کے ساتھ شیئر کیا۔ امریکی ریاست آرکنساس کے سابق گورنر نے اپنا پہلا دورہ اسرائیل 1973 میں کیا اور اس کے بعد سے وہ وہاں جانے والے درجنوں عیسائی مشنوں کی قیادت کرتے رہے۔ 2018 میں اسرائیل کے دورے کے دوران مغربی کنارے پر ایک نئے ہاؤسنگ کمپلیکس کیلئے اینٹیں بچھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ وہ "کسی دن یہاں گھر خریدنا پسند کریں گے۔

چند دن قبل ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے ڈونر اور رئیل سٹیٹ ٹائیکون "سٹیو وٹکوف" کو امن کیلئے ایک ان تھک آواز اور اسے اپنا فخر قرار دیتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کیلئے خصوصی ایلچی نامزد کیا ہے۔ یاد رہے کہ سٹیو ٹرمپ کے قریبی دوست ہیں اور طویل عرصے سے ان کے گولف پارٹنر ہیں۔ درحقیقت ، وٹکوف ستمبر میں ٹرمپ پر دوسرے قاتلانہ حملے کے دوران ان کے ساتھ گولف کھیل رہے تھے۔ سٹیو نے مین ہٹن فراڈ کیس میں عدالت میں ٹرمپ کے دفاع میں گواہی دی تھی۔ دونوں کی ملاقات 1986 میں کاروباری لین دین کے بعد ہوئی تھی۔ سٹیو کے مطابق اس وقت ٹرمپ کو سینڈوچ خرید کر دیا تھا کیونکہ اس وقت ٹرمپ کے پاس کوئی کیش رقم نہیں تھی۔

پیٹ ہیگستھ ماضی میں امریکی فوج کے ساتھ بھی منسلک رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فاکس نیوز کے میزبان بھی رہ چکے ہیں۔ وہ فوجیوں کی وکالت کرنے والے دو گروپس کے بھی سربراہ رہ چکے ہیں۔ انہوں نے مینیسوٹا میں سینیٹ کی نشست کیلئے الیکشن میں بھی حصہ لیا تھا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکے تھے ۔ٹرمپ نے پیٹ ہیگستھ کو سیکرٹری دفاع کے عہدے کیلئے نامزد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ سخت، ذہین اور سب سے پہلے امریکا کو حقیقی معنوں میں

مانتے ہیں۔ پیٹ کی وجہ سے ہماری فوج دوبارہ بہترین بنے گی اور امریکا کبھی گرے گا نہیں۔ فوجیوں کیلئے کوئی بھی نہیں لڑتا اور پیٹ "طاقت کے ذریعے امن" کی ہماری پالیسی کے دلیر اور محب وطن چیمپیئن ہوں گے"۔

فلوریڈا کے 50 برس کے رکن کانگرس مائیک والٹز ماضی میں امریکی فوج کا حصہ رہے اور کئی بار افغانستان، مشرق وسطیٰ اور افریقا کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان کو ٹرمپ کے دوسرے دور صدارت میں قومی سلامتی کے نئے مشیر کے طور پر نامزد کیا گیا ہے۔ وہ طویل عرصے سے ٹرمپ کے حامی ہیں۔ ایکس پر اپنے پیغام میں انہوں نے لکھا کہ وہ ٹرمپ کی کابینہ میں خدمات سرانجام دینے پر "بہت اعزاز" محسوس کرتے ہیں۔ ہماری قوم کی اقدار، آزادی اور ہر امریکی کی حفاظت کا دفاع کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں"۔

مسلح افواج کی سب کمیٹی کے سربراہ مائیک والٹز چین کے بارے میں سخت مؤقف رکھتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بحرالکاہل میں تنازعات کیلئے امریکا کو مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو یوکرین کیلئے اپنی حمایت برقرار رکھنی چاہیے لیکن حالیہ عرصے میں اس جنگ کیلئے امداد پر وہ امریکی اخراجات کے دوبارہ جائزے کی وکالت بھی کرتے ہیں۔

ٹرمپ کے بڑے حامی اور فنانسر ایلون مسک اور سابق ریپبلکن صدارتی امیدوار وویک راماسوامی کو بھی ٹرمپ نے حکومتی کارکردگی کے نئے محکمے کی قیادت کرنے کا کام سونپا ہے۔ واضح رہے کہ ٹرمپ کے سب سے اہم حامی سمجھے جانے والے اور دنیا کے امیر ترین افراد میں شامل ایلون مسک نے ان کی انتخابی مہم کو 11 کروڑ 90 لاکھ کا فنڈ دیا ٹرمپ نے ایک بیان میں کہا کہ "یہ دوشاندار امریکی مل کر میری انتظامیہ کیلئے سرکاری بیوروکریسی کو ختم کرنے، اضافی ضابطوں میں کمی، فضول اخراجات میں کمی اور وفاقی ایجنسیوں کی تنظیم نو کرنے کیلئے راہ ہموار کریں گے، جو "امریکا بچاؤ" تحریک کیلئے ضروری ہے"۔

ٹرمپ انتظامیہ میں ملنے والی اس ذمہ داری پر ردعمل دیتے ہوئے امریکی ٹیکنالوجی کمپنی ٹیسلا کے سربراہ ایلون مسک نے لکھا کہ "یہ نظام میں شامل افراد کو ہلا کر رکھ دے گا"۔ دوسری جانب وویک راماسوامی نے بھی لکھا کہ وہ "کوئی رعایت نہیں برتیں گے"۔ اسی طرح ٹرمپ نے تصدیق کی ہے کہ وہ جنوبی ڈکوٹا کی گورنر کرسٹی نوم کو محکمہ ہوم لینڈ سکیورٹی کی سربراہی کیلئے مقرر کریں گے۔ نوم کا نام موسم گرما میں ایک ممکنہ نائب صدر کے امیدوار کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ طویل عرصے سے ٹرمپ کی اتحادی رہی ہیں اور انہوں نے منتخب صدر کیلئے بھرپور مہم بھی چلائی۔ رواں برس وہ میڈیا کی شہ سرخیوں میں بھی رہی تھیں، جب انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ انہوں نے اپنے کتے کو گولی سے مارا کیونکہ یہ "غیر تربیت یافتہ اور "خطرناک" تھا۔

ان نامزدگیوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹرمپ اپنے حامیوں کو نواز رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ چین اور ایران کے ساتھ انتہائی سخت مؤقف رکھتے ہوئے اسرائیل کی کھل کر حمائت کریں گے جس سے ان کے جنگ بند کرانے کا انتخابی وعدہ مشکوک ہو گیا ہے۔

بروز اتوار 15 جمادی الاول 1446ھ 17 نومبر 2024ء

ٹرمپ اور مشرق وسطیٰ: جنگ، امن یا حل؟

کملا ہیرس نے اپنے انتخابی گڑھ ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنے آنسو بہاتے ووٹرز کی موجودگی میں ٹرمپ کو کامیابی کی مبارکباد دیتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا اور ٹرمپ ملکی تاریخ کے دوسرے صدر بن گئے ہیں جنہیں دو مختلف اوقات میں دوبار صدر منتخب کیا گیا ہے۔ ان سے پہلے گروور کلیولینڈ نے 1885 سے 1889 تک یہ عہدہ سنبھالا تھا جس کے بعد کلیولینڈ کی دوسری مدت 1893 سے لے کر 1897 کے درمیان تھی۔ تاہم ٹرمپ کا دوسرا صدارتی دور کیسا ہوگا؟ ان کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی اور وہ کون سے ادھورے منصوبے ہیں جن کو وہ مکمل کرنا چاہیں گے؟ ساتھ ہی ساتھ اہم سوال یہ بھی ہے کہ ٹرمپ کے بارے میں خدشات کیا اور کیوں ہیں؟

ان اہم سوالات کے جوابات ٹرمپ کی پہلی صدارت میں ایسے اشارے چھپے ہیں جن کی مدد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس بار امریکا کی قیادت کیسے کریں گے۔ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ٹرمپ اپنی صدارت وہیں سے شروع کریں گے جہاں یہ 2020 میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔ ٹرمپ نے اپنی فتح کے موقع پر ریاست فلوریڈا میں اپنے سیاسی کارکنوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے عزم کو دہرایا کہ "یہ ایک سیاسی فتح ہے جنہوں نے انہیں 47ویں مرتبہ صدر بننے میں کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنی مہم کے نعرے "آئیں امریکا کو پھر سے عظیم بنائیں" کا استعمال کرتے ہوئے کہا کہ اس فتح کے بعد ہم امریکا کو ایک بار پھر عظیم بنانے کے قابل ہوں گے۔

ٹرمپ نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ زیادہ تر غیر ملکی اشیا پر 10 فیصد سے 20 فیصد تک ٹیرف لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں جبکہ چین سے درآمدات پر ٹیرف میں 60 فیصد تک اضافہ کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ بہت سے ماہرین اقتصادیات نے خبردار کیا ہے کہ اس طرح کے اقدامات سے ایک بڑی تعداد میں امریکی صارفین متاثر ہوں گے جنہیں مہنگی قیمتوں میں اشیا کی خریداری کرنی پڑے گی۔ اپنی پہلی صدارتی مدت میں ٹرمپ نے چین پر غیر منصفانہ تجارتی طریقوں اور انٹیلیکچوئل پراپرٹی کی چوری کا الزام لگاتے ہوئے بیجنگ کے ساتھ تجارتی جنگ شروع کر دی تھی لیکن چین کی بروقت پالیسیوں کی بناء پر ٹرمپ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اہم امریکی کانگریس میں ریپبلکن اور ڈیموکریٹ قانون سازوں کی تعداد بلاشبہ اس بات کا تعین کرے گی کہ آیا اس مرتبہ ٹرمپ اپنی پالیسیوں کو اس طریقے سے نافذ کر سکیں گے جس طرح وہ چاہتے ہیں یا نہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ 2017-2019 میں سینیٹ اور ایوان نمائندگان دونوں پر ریپبلکنز کا کنٹرول تھا لیکن اس وقت تجربے میں کمی کے باعث انہیں کانگریس میں ریپبلکنز کی اکثریت ہونے کے باوجود اپنی پالیسیاں منوانے میں مشکلات کا سامنا ہوا۔ چونکہ ریپبلکنز نے انتخابات میں سینیٹ اور ایوانِ نمائندگان کے ایوانوں کا کنٹرول حاصل کر لیا ہے، اس لیے ٹرمپ انتظامیہ ممکنہ طور پر ایسی قانون سازی کرے گی جس میں نہ صرف سرحد، سکیورٹی، سرحدی دیوار کی تکمیل اور ٹیکس مراعات کیلئے فنڈنگ بھی شامل ہوگی بلکہ ٹرمپ ایسے لوگوں کی بڑے پیمانے پر ملک بدری کے اپنے منصوبے کیلئے کانگریس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جن کے پاس ملک میں رہنے کی قانونی اجازت نہیں ہے۔

پیو ریسرچ سینٹر کے اندازوں کے مطابق 2022 میں امریکا میں تقریباً ایک کروڑ 10 لاکھ غیر قانونی تارکین وطن تھے جبکہ ٹرمپ نے دعویٰ کیا تھا کہ تارکین وطن کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ تارکین وطن کی بڑے پیمانے پر ملک بدری بہت مہنگی پڑ سکتی ہے اور اس منصوبے پر عمل درآمد مشکل ہوگا۔ ایسا کرنے سے امریکا کی معیشت کے بعض شعبوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں جن میں غیر قانونی تارکین

وطن کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ امکانات ہیں کہ امریکا کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے ٹرمپ کی دوسری صدارتی مدت ان کی پہلی مدت سے مشابہت رکھے گی۔ وہ چاہتے ہیں کہ امریکا کو دنیا کے تنازعات سے دور رکھا جائے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ روس کے ساتھ مذاکرات یا معاہدوں کے ذریعے "گھنٹوں کے اندر" یوکرین جنگ ختم کر دیں گے۔ دوسری جانب ٹرمپ نے خود کو اسرائیل کا حامی قرار دیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں بہت کم بیانات دیے ہیں کہ وہ غزہ اور لبنان میں جاری جنگ کیسے ختم کریں گے۔

کچھ عرصے پہلے تک اقوام متحدہ کے انڈر سیکریٹری جنرل فار ہیومینیٹیرین افیئرز اینڈ ایمرجنسی ریلیف کوآرڈینیٹر کے طور پر کام کرنے والے اور تنازعات کے ایک تجربہ کار ثالث مارٹن گریفتھس کا کہنا ہے کہ میں ٹرمپ کی صدارت میں 'امریکا فرسٹ' کی پالیسی دیکھ رہا ہوں جو عالمی عدم استحکام کو مزید گہرا کر دے گی اور یوکرین میں جنگ بند کرنے کا عمل پیوٹن کی حوصلہ افزائی کا سبب بنے گا جو خطے میں مکمل امریکی پسپائی کا مظہر ہوگی۔

لیکن اس وقت یوکرین کی جنگ سے بھی زیادہ اہم مشرقِ وسطیٰ میں جاری جنگ نے دنیا کے امن کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ برس 7 اکتوبر کو حماس نے اسرائیل کے دائمی ظلم وستم سے نجات پانے کیلئے بالآخر اپنے محدود وسائل کے ساتھ فدائی حملے میں 1200 سے زائد اسرائیلی مار دیئے اور کئی سو افراد کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ غزہ لے گئے تھے۔ اسرائیل کے جوابی حملے میں اب تک 50 ہزار کے قریب فلسطینی شہید اور ایک لاکھ سے زائد زخمی ہو چکے ہیں، غزہ مکمل طور پر کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس جنگ کے شعلے لبنان سے ہوتے ہوئے شام اور ایران تک پہنچ چکے ہیں اور اسرائیل کی درندگی کی پیاس بجھنے کا نام تک نہیں لے رہی۔

مئی 2024 میں بائیڈن انتظامیہ نے کانگریس کو بتایا تھا کہ وہ اسرائیل کو 8400 کروڑ روپے سے زیادہ کے ہتھیار بھیجنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور اس کے بعد اس پر جلد ہی عملدرآمد بھی کر دیا گیا۔ اس پیکج میں 70 لاکھ ڈالر مالیت کے ٹینک اور گولہ بارود بھی شامل تھا۔ امریکا کے واٹسن انسٹیٹیوٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق غزہ جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک امریکا اسرائیل کو تقریباً 18 ارب ڈالر کی فوجی امداد فراہم کر چکا ہے۔ غزہ جنگ کے آغاز کے بعد امریکا جس طرح اسرائیل کی مسلسل مدد کر رہا ہے، اس کی وجہ سے امریکا میں رہنے والے مسلمان ووٹرز میں ناراضگی پائی جاتی ہے اور ٹرمپ نے اپنے سیاسی مخالفین کیلئے پائی جانے والی اس ناراضگی کو اپنے حق میں خوب استعمال کیا جبکہ انتخابی مہم میں صدارت کے دونوں فریق نے اسرائیل کی بھرپور حمائت کا برملا اظہار کیا اور ٹرمپ نے تو اسرائیل کو ایران کی ایٹمی صلاحیت کو تباہ کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم میں ان بیانات کے باوجود متعدد مواقع پر یہ دعویٰ بھی کیا کہ ملک میں بسنے والے عرب اور مسلم نژاد افراد کی بڑی تعداد انہیں ووٹ دے گی کیونکہ مُسلم برادری یہ بات جانتی ہے کہ کملا ہیرس اور اُن کی جنگ پسند کابینہ مشرق وسطیٰ پر حملہ کر کے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دے گی اور تیسری عالمی جنگ کا آغاز کر دے گی۔ 4 نومبر کو یعنی ووٹنگ سے ایک دن پہلے، ٹرمپ نے ٹویٹر پر پیغام لکھا کہ "ہم امریکی سیاست کی تاریخ کا سب سے بڑا اتحاد بنا رہے ہیں۔ مشیگن کے عرب اور مسلم ووٹرز ہمارے ساتھ ہیں کیونکہ وہ امن چاہتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے تمام عرب اور دیگر مسلم کمیونٹیز سے اپنے آئندہ صدارتی انتخاب میں ووٹ دینے کی بار بار اپیل بھی کی تاکہ وہ صدر بن کر دنیا میں امن لانے کیلئے جاری جنگوں کو بند کر سکیں۔

یاد رہے کہ مشی گن ایک ایسی ریاست ہے جہاں عرب اور مسلم ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ 15 الیکٹورل ووٹ رکھنے والی اس بڑی ریاست میں مقابلہ سخت تھا لیکن یہاں سے فتح ٹرمپ کی ہوئی جو ظاہر کرتی ہے کہ اپنے بیانات اور وعدوں کی مدد سے ٹرمپ یہاں کے ووٹرز کو قائل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ صدارتی انتخاب سے قبل ٹرمپ نے ڈیئربورن نامی علاقے میں ایک حلال کیفے کا دورہ بھی کیا تھا۔ اِس علاقے کو امریکا کا "عرب دارالحکومت" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عرب کمیونٹی کا مضبوط گڑھ ہے۔ اسی طرح مشی گن میں منعقدہ ایک ریلی میں مسلم رہنماؤں کے ایک گروپ نے ٹرمپ کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ ٹرمپ کی جیت سے مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہو گا۔

اہم سوال یہ ہے کہ کیا غزہ اور لبنان پر اسرائیل کے حملوں کے نتیجے میں امریکا میں بسنے والی مسلم کمیونٹی ڈیموکریٹک پارٹی سے ناراض تھی جس کا فائدہ ٹرمپ نے خوب اٹھایا اور آج ایک مرتبہ پھر تاریخی کامیابی کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں اگلے چار برس امریکا سمیت دنیا کی تقدیر کے فیصلے کرنے جا رہے ہیں؟

ہم سب جانتے ہیں کہ اِس وقت مسلم دنیا کی پوری توجہ "فلسطین" پر ہے اور اُن کی خواہشات، سیاست، خدشات سب کا محور فی الوقت "فلسطین" ہی ہے۔ مسلمانوں اور عربوں نے اچانک سے ہی ٹرمپ کو پسند کرنا شروع نہیں کر دیا تاہم اُن کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ ایک جانب کملا ہیرس تھیں تو دوسری جانب ٹرمپ۔ کملا ہیرس کی مخالفت کرنا اور ٹرمپ کا جیتنا دو الگ چیزیں ہیں۔ اسرائیل غزہ جنگ کے بعد امریکا بھر میں جو مظاہرے ہوئے، وہ بائیڈن انتظامیہ کی خاموشی اور اس کے اسرائیل کا ساتھ اور امداد دینے پر ہوئے تاہم اس سب کے باوجود (اس ضمن میں) ٹرمپ سے بھی زیادہ توقعات وابستہ نہیں ہونی چاہییں۔ ماضی میں وہ کُھل کر اسرائیل کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے دورِ صدارت میں امریکی سفارتخانے کو یروشلم منتقل کر دیا تھا جو کہ اس وقت بین الاقوامی طور پر ایک متنازع مگر اسرائیل میں مقبول اقدام قرار دیا گیا تھا۔ ٹرمپ کے دورِ اقتدار میں ان کے یہودی نژاد داماد جیرالڈ کشنر کا ایک نئے "لارنس آف عریبیا" کا کردار بھی سب کے سامنے آ چکا کہ کس طرح وہ سعودی ولی عہد کی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خطے میں اہم تبدیلیاں رونما کروانے میں کامیاب رہا جس کے نتیجے میں کئی عرب ممالک نے نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کرتے ہوئے سفارتی تعلقات قائم کر لئے بلکہ اب تجارتی معاہدوں کی شکل میں مزید قربتوں میں اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ سعودی عرب نے بھی اسرائیل کو اپنی فضائی حدود کو بطور راہداری استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ شنید یہ بھی کہ سعودی عرب بھی باضابطہ طور پر اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے جا رہا تھا جس کے بعد قوی امید تھی کہ سعودی عرب کے اس عمل کے بعد مزید درجن سے زائد ممالک بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کا عندیہ دے چکے تھے کہ اچانک غزہ کی جنگ نے اس سارے عمل کو مؤخر کر دیا۔

سوال یہ بھی ہے کہ کیا امریکا کے مسلمان اور عرب ووٹرز کے پاس ٹرمپ کی بیان بازی پر یقین کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا اس لیے وہ ان کی حمایت میں سامنے آئے ہیں۔ ادھر دوسری طرف ٹرمپ کی انتخاب میں جیت کو نتن یاہو نے "عظیم ترین کامیابی" قرار دیا ہے جبکہ اسرائیلی صدر نے ٹرمپ کو "امن کا چیمپیئن" اور اسرائیلی اپوزیشن لیڈر نے انہیں "اسرائیل کا حقیقی دوست" قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا امکان ظاہر کیا ہے کہ بطور صدر ٹرمپ اسرائیل کی عسکری اور سفارتی امداد جاری رکھیں گے اور شاید اس میں اضافہ بھی کر دیں لیکن اسرائیل کے حوالے سے ٹرمپ کی متوقع پالیسی پر ایک رائے اور بھی ہے۔ ٹرمپ نے اپنی فتح کے موقع پر پہلا بیان یہ دیا ہے کہ وہ "جاری جنگوں کو روکیں گے اور کوئی نئی جنگ شروع نہیں کریں گے"۔

اسرائیلی میڈیا میں یہ اطلاعات آئی تھیں کہ ٹرمپ نے نیتن یاہو کو کہا تھا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں لیکن ہم ٹرمپ کے بارے میں ایک بات جانتے ہیں کہ ان کے کسی بھی فیصلے یا قدم کی پیش گوئی کرنا انتہائی مشکل ہے۔ یاد رہے کہ 2020 میں امریکا کی ثالثی سے متحدہ عرب امارات اور بحرین نے اسرائیل کے ساتھ ایک تاریخی معاہدے پر دستخط کیے جسے "ابراہیم ایگریمنٹ" کہا جاتا ہے اوراس کے تحت ان مسلمان ممالک نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کیا تھا اوراسی ضمن میں دیگر مسلمان ممالک سے بات چیت جاری تھی مگر اسی دوران ٹرمپ کی صدارت کا خاتمہ ہو گیا۔
سفارتی اور سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ٹرمپ کے دوسرے دورِ اقتدار میں شاید نیتن یاہو کو حماس، حزب اللہ اور ایران کے خلاف کارروائیاں کرنے میں زیادہ چھوٹ حاصل ہو گی۔ ایسے میں ایرانی جوہری تنصیبات پر اسرائیلی حملہ بھی خارج الامکان نہیں قرار دیا جاسکتا تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرمپ مشرقِ وسطیٰ میں کسی بڑی ڈیل کی حمایت کریں جس کا حصہ سعودی عرب اوراسرائیل دونوں ہوں تاہم مشرق وسطیٰ کے معاملے میں ایک بڑا فریق ایران بھی ہے اور ٹرمپ کے پہلے دور میں ایران اور امریکا کے تعلقات مسلسل کشیدہ رہے تھے۔

ٹرمپ کے دورِ حکومت میں امریکا نے خود کو ایران سے متعلق جوہری معاہدے سے الگ کر لیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ معاہدہ 2015 میں یعنی براک اوباما کے دور میں ہوا تھا۔ اس معاہدے کے تحت ایران پر سے جوہری پروگرام کو روکنے کے بدلے میں سخت پابندیاں ہٹادی گئی تھیں تاہم ٹرمپ کے سابقہ دورِ حکومت میں یہ معاہدہ ختم کرکے ایران پر ایک مرتبہ پھر بڑے پیمانے پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ٹرمپ نے اپنے دوراقتدار میں عرب دنیا اوراسرائیل کے درمیان نئے تعلقات قائم کرنے میں بہت مدد کی تھی۔ اس معاہدے کے تحت اسرائیل نے مغربی کنارے کے بڑے حصوں کو ضم کرنے کا منصوبہ ملتوی کر دیا تھا اور تقریباً 50 سال بعد اسرائیل اور متحدہ عرب امارات کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے جو اپنے آپ میں ایک بڑی بات تھی۔

ٹرمپ سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ کاروباری شخصیت بھی ہیں جو چیزوں کو بلیک اینڈ وائٹ میں دیکھتے ہیں۔ ٹرمپ مسلم ممالک کی داخلی سیاست، ثقافت، خود مختاری اور بادشاہت جیسی چیزوں میں مداخلت نہیں کرتے۔ دوسری طرف ڈیموکریٹس سعودی عرب پر پابندی لگانے، انسانی حقوق اور اقتدار میں شراکت کی بات کرتے ہیں، جبکہ ٹرمپ یہ زبان بالکل استعمال نہیں کرتے اور یہی بات خطے کے مسلم لیڈروں کو بھاتی ہے۔ جب ٹرمپ 2016 میں صدر بنے تو انہوں نے اپنے پہلے سرکاری غیر ملکی دورے کیلئے سعودی عرب کا انتخاب کر کے سب کو حیران کر دیا تھا۔ اکثر امریکی صدور اپنے پہلے غیر ملکی دورے پر کینیڈا یا میکسیکو جاتے ہیں۔

دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ خطے میں اب زیادہ تر مسلم دنیا "فلسطین" کا جھنڈا اٹھائے تھک چکی ہے کیونکہ وہ جان چکے ہیں کہ اس سے (یعنی فقط احتجاج سے) کچھ حاصل ہونے والا نہیں کیونکہ اس پورے معاملے کا ایک معاشی پہلو بھی ہے کیونکہ یہ پیسہ کمانے کی صدی ہے۔ مسلم دنیا اب سمجھتی ہے کہ وہ فلسطین کی حمایت اوراسرائیل کی مخالفت کی وجہ سے یورپ سے تعلقات بہتر نہیں بنا سکتی۔ دنیا موسمیاتی تبدیلی، سرمایہ کاری، علمی معیشت کے بارے میں بات کر رہی ہے اور یہ صرف فلسطین کے مسئلے میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی جدید تاریخ بنیادی طور پر امن کی ناکام کوششوں کی تاریخ بن چکی ہے۔

اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کی کوششوں کا آغاز 1993 میں اوسلو امن معاہدے سے ہوا تھا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی دہائیوں

تک مذاکرات ہوتے رہے لیکن یہ خطہ امن کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکا، نہ تو مقبوضہ علاقوں پر سے اسرائیل کا قبضہ ختم ہوا اور نہ ہی دو الگ ریاستوں کی تشکیل ممکن ہو پائی لیکن اکتوبر 2023 کے بعد اسرائیل غزہ جنگ نے مشرق وسطیٰ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے اور اب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ وہ کام کر پائیں گے جس کی بہت سے لوگ اور ان کے ووٹرز اُن سے توقع لگائے بیٹھے ہیں۔

امریکی عرب ووٹرز کا ماننا ہے کہ ٹرمپ کے آنے کے بعد یہ امکانات بڑھ جائیں گے اگرچہ اسرائیل اور حماس کا اس جنگ کے خاتمے میں کردار انتہائی اہم ہو گا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو ٹرمپ پہلے ہی مشرق وسطیٰ سے امریکی فوجیوں کے انخلا اور افغانستان میں جنگ کے خاتمے کا جیسے اعلانات کر کے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ "جنگ" کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم سب ٹرمپ کے سابقہ دور کو یاد کریں تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ٹرمپ ثالثی نہیں کریں گے بلکہ حل مسلط کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکا بہت طاقتور ہے۔ وہ ایک جارحانہ سیاستدان ہیں جو چیزوں کو لٹکانے یا معاملات میں تاخیری حربے اپنانے میں یقین نہیں رکھتے۔ ٹرمپ کو امریکا کی بالادستی پر بہت اعتماد ہے، جو ان کی سیاست اور خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اسرائیل سے زیادہ نقصان فلسطینیوں کا ہو گا کیونکہ حل صرف کمزوروں پر مسلط کیا جا سکتا ہے۔

بروز منگل 17 جمادی الاول 1446ھ 19 نومبر 2024ء

کیا امریکا کے دن گزر چکے ہیں؟

نائن الیون کے بعد باقاعدہ ایک سازش کے تحت پینٹا گون کے کرنل رالف پیٹر نے خطے کے جاری کردہ نقشے میں پاکستان کے کئی ٹکڑے دکھاتے ہوئے تاریخوں کا تعین بھی کیا لیکن ہر سال اپنی خباثت کو چھپانے کیلئے مختلف توجیہات سامنے لاتا رہا۔ پاکستانی میڈیا میں جب ہر طرف سناٹا تھا تو اس وقت بھی میں نے ایک آرٹیکل ”کیا امریکا ٹوٹ جائے گا“ جب تحریر کیا تو اس قلمی دلائل کے ساتھ اس کا مفصل جواب دیتا رہا اور آخر میں 28/اگست 2017ء کو وقت چاروں طرف سے کئی جغادریوں نے یورش کر دی اور کئی ایک امریکا کے نمک خواروں نے بھکاری کی خواہش قرار دیتے ہوئے بڑا تمسخر اڑایا لیکن آج خود امریکا کی کئی امیر ریاستوں میں یہ مطالبہ سامنے آنا شروع ہو گیا ہے کہ ہماری ریاستوں کا ٹیکس جنگی جنون کی تکمیل کیلئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی چاہے اس کیلئے یونائیٹڈ سٹیٹ آف امریکا سے چھٹکارہ کیوں نہ حاصل کرنا پڑے گویا سوویت یونین کے طرح امریکا بھی اب ٹکڑے ہونے جا رہا ہے۔

آج سے چند ماہ قبل بھی کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ ایک متکبر شخص ٹرمپ جب ننگر ہار پر غیر جوہری بموں کی ماں کے نام سے موسوم سب سے بڑا بم گرا کر دنیا کو یہ کہہ کر ڈرائے گا کہ امریکا جب چاہے اس دنیا کو پانچ منٹ میں خاکستر کر سکتا ہے لیکن میرے رب کی طاقتوں کا نہ دکھائی دینے والا ایک انتہائی چھوٹا جراثیم کرونا وائرس کی شکل میں ایسا وارد ہوا کہ اس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔۔ واحد سپر پاور اور اس کے اتحادی بھی پریشان ہو گئے۔ پریشان کیسے نہ ہوتے؟ معیشت کا پہیہ مکمل طور پر رک چکا تھا۔ پیداواری عمل معطل ہو گیا تھا۔ تجارتی سرگرمیاں ایسی ماند ہوئی ہیں کہ امریکی پٹرول پانی سے بھی سستا ہو گیا ہے۔ تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔ صارفین کا اعتماد خطرناک حد تک ایسا مجروح ہوا کہ ابھی تک پوری طرح بحال ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اگر کورونا کی وبا جلد ختم نہ ہوتی تو خطرہ کا لارم بج اٹھا تھا کہ امریکا کے مالیاتی اور زرعی طور پر دیوالیہ ہونے پر ایک ایسے معاشی بحران کو روکنا ممکن نہ ہو گا جو امریکا کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کو بھی لپیٹ میں لے گا اور معاملات کو انتہائی خرابی تک پہنچا دے گا۔

کورونا نے عالمی معیشت کے بنیادی ڈھانچے کی بہت سی خامیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کر دیا۔ وبا کے ہاتھوں عالمی معیشت کی مشکلات کئی گنا ہو چکی ہیں۔ اس وبا کے پھیلنے سے قبل ہی امریکا میں یہ خیال عام تھا کہ رواں بجٹ میں کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کا گراف ہزار ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا لیکن امریکا میں کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ دو ہزار ارب ڈالر کی حد چھو جانے سے دیگر قرضے بھی معیشت پر غیر معمولی بوجھ کی صورت میں بڑھ گئے اور یہی وجہ ہے کہ صدر بائیڈن کو امریکی قوم کو اپنے خطاب میں بتانا پڑا کہ اگر امریکی سینیٹ نے مزید قرض لینے کی منظوری نہ دی تو امریکا کو دیوالیہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل میں بھی معاشی حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ عالمی مالیاتی اداروں کے مطابق اسرائیل دیوالیہ ہو چکا ہے اور نیتن یاہو جنگ کی آڑ میں اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کا دھوکہ دے رہا ہے۔

کاروباری سرگرمیاں جو کرونا کی وجہ سے ماند پڑ چکی تھیں، اس کی بناء پر بینکاری نظام ابھی تک ڈھنگ سے کام نہیں کر رہا۔ آج بھی ہزاروں نہیں لاکھوں افراد اپنے گھروں سے کام کر رہے ہیں اور ہزاروں بینک کی برانچیں یا تو بند کر دی گئی ہیں یا ایک دوسرے میں ضم کر دی گئی ہیں جس کی بنیاد پر ہزاروں عمارتیں خالی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا ماتم کرتے دکھائی دے رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں افراد کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔ حکومت کو ٹیکس اور ڈیوٹی کی مد میں ہونے والا خسارہ الگ ہے۔ 2008ء کی کساد بازاری میں وفاقی ٹیکسوں کی مد میں امریکی خزانے کو 400/ارب ڈالر سے زیادہ

کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا جو مسلسل جاری ہے۔ اور اب حالت یہ ہے کہ اس بار امریکی خزانے کو وفاقی ٹیکسوں کی مد میں اِس سے کہیں زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سماجی بہبود کے کھاتے میں اس بار غیر معمولی رقوم خرچ کرنا پڑیں گی۔ اس کیلئے الگ سے فنڈ مختص کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی کیونکہ نظام کچھ ایسا ہے کہ ضرورت کے مطابق فنڈنگ خودبخود بڑھ جاتی ہے۔ امریکی بجٹ میں کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ کتنا رہے گا، اس حوالے سے ماہرین مختلف اندازے قائم کر رہے ہیں۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ صورتِ حال انتہائی خطرناک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بجٹ خسارہ چار سے پانچ ہزار ارب ڈالر سے کہیں زیادہ کا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو امریکی معیشت کو مکمل تباہی سے بچانا انتہائی دشوار ہو گا۔

2019ء میں امریکا کی خام قومی پیداوار کے حوالے سے تخمینہ 21 ہزار ارب ڈالر تک لگایا گیا تھا۔ تب کورونا وبا کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اب معاملات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ معیشتی سرگرمیاں ماند پڑ چکی ہیں۔ ایسے میں خام قومی پیداوار سے متعلق تخمینوں کا غلط ہو جانا بھی حیرت انگیز نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں 2020ء میں 15 فیصد کمی سے امریکا کی خام قومی پیداوار 18 ہزار ارب ڈالر تک پہنچ گئی۔ ایسی صورت میں امریکا کا کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ خام قومی پیداوار کے 28 فیصد سے بھی زائد ہو گیا ہے۔

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ یوکرین کی جنگ کا بوجھ ہی ناقابل تلافی تھا کہ اب اونٹ کی کمر پر آخری تنکے کے مصداق حالیہ اسرائیل کی مشرقِ وسطیٰ میں درندگی کا بوجھ ممکنہ تباہی کے بھوت کی طرح سر پر کھڑا ناچ رہا ہے تاہم عالمی مالیاتی اداروں کو بھی اپنی بقاء کا مسئلہ درپیش ہے اور یقیناً وہ اپنا یہ سارا بوجھ تیسری دنیا کے مقروض ملکوں کی رگوں سے نچوڑنے کیلئے آئے دن نئی پابندیوں کے ساتھ حملہ آور ہو رہی ہیں جس کے نتیجے میں بالآخر تیسری دنیا کے عوام اپنی حکومتوں کے خلاف ایسا ردعمل دینے پر مجبور ہو جائیں گی جس کی بناء پر عالمی طور پر کساد بازاری میں ایسا اضافہ ہو جائے گا کہ عالمی اقتصادی قحط کا جن نئے انداز سے عالمی تباہی کا موجب بن جائے گا۔

یہ ذہن نشیں رہے کہ یہ اعداد و شمار بھی حتمی نوعیت کے نہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکا کا کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ اس بار اتنا بڑا ہو گا کہ اُس کے شدید منفی اثرات سے بچنے کیلئے فنڈنگ کا اہتمام تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سود کی شرح میں اضافے کا امکان دکھائی نہیں دیتا اور سچ تو یہ ہے کہ سود کی شرح میں کمی ہی واقع ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب زیادہ منافع کی امید ہی نہ ہو تو سرمایہ کاروں کو کس طور متوجہ کیا جاسکے گا۔ امریکا میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے پر آمادہ کرنا اب جُوئے شیر لانے کے مترادف ہو گا۔ امریکا میں زیادہ سرمایہ کاری چین اور خلیجی ریاستوں، بالخصوص متحدہ عرب امارات کی ہے۔ چین کو بیرونی طلب میں کمی کا سامنا ہے یعنی برآمدات کا گراف نیچے آرہا ہے۔ دوسری طرف خلیجی ریاستوں کی تیل کی آمدن کا گراف بھی گر رہا ہے۔ ایسے میں امریکی پالیسی سازوں کو سوچنا پڑے گا کہ امریکی معیشت کیلئے توانا رکھنے کیلئے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ چین اور سعودی عرب دنیا بھر میں سرمایہ کاری کی ری سائیکلنگ کے حوالے سے سب سے اہم عوامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر اُن کی طرف سے سرمائے کا بہاؤ متاثر ہوا تو عالمی منڈی میں امریکی ڈالر کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ امریکا کو اپنی معیشت کا تیاپانچا روکنے کیلئے کیا کرنا چاہیے۔ اس مرحلے پر امریکا کیلئے وہی آپشن بچا ہے، جو 2008ء کی کساد بازاری کے موقع پر بچا تھا یعنی یہ کہ کسی بھی اور سرمایہ کار کے آگے بڑھنے کا انتظار کیے بغیر امریکا کو اپنے ٹریژری بونڈ خود خریدنا پڑیں گے۔ امریکا کا مرکزی بینک اس حوالے سے کلیدی کردار ادا کرے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا میں صرف کرنٹ اکاؤنٹ کا یا بجٹ خسارہ سر پر کھڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا میں کارپوریٹ سیکٹر کے قرضوں کا بحران بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہ قرضے کم و بیش دس ہزار ارب ڈالر سے کہیں زیادہ ہیں جو امریکی

معیشت کے مجموعی ٹرن اوور کا 50 فیصد سے بھی زائد ہے۔ معاملات کو مزید خراب کرنے والی حقیقت یہ ہے کہ ان میں بیشتر قرضے نان انویسٹمنٹ گریڈ کی کمپنیوں کے جاری کردہ ہیں اور ان قرضوں کی حیثیت کچرے سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امریکی معیشت کا پہیہ رک چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں سالمیت بھی متاثر ہے۔ معیشت مزید خرابی کی طرف جائے گی۔ بہت سے ادارے دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہ سب کچھ امریکی بینکاری نظام کے منہ پر زوردار طمانچہ ہوگا۔ سینڈیکیٹیڈ قرضوں کو "بونس" سمجھیے۔ کارپوریٹ بونڈ کے ایک بڑے حصے کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق توانائی کے شعبے سے ہے۔ توانائی کا شعبہ بھی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ عالمی پیداوار کے 20 فیصد کے مساوی "اضافی صلاحیت" ہے۔

چین کے اپنے مسائل ہیں۔ چینی قیادت نے کچھ عرصے سے اپنے چند بنیادی معیشتی مسائل کو حل کرنے کے بجائے چھپانے کو ترجیح دی ہے۔ یہ حقیقت نظر انداز کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی مسئلہ حل کرنے سے حل ہوتا ہے، چھپانے سے ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی اُس کے اثرات میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے۔ یورپی یونین نے معاملات کو سلجھانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ یورپین سینٹرل بینک (ای سی بی) کے ذریعے کچھ وزن ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جرمنی اور چند دوسرے ارکان ایسا کرنے کے خلاف ہیں۔ کوئی بھی اپنی کرنسی کو داؤ پر لگانے کیلئے تیار نہیں۔ ای سی بی نے گزشتہ چند برس قبل 850 ملین یورو مالیت کے سرکاری اور کارپوریٹ بونڈ خریدنے کا اعلان کیا تھا جس پر ابھی تک مکمل عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپی یونین میں اندرونی سطح پر کس نوعیت کے مسائل پنپ رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ واشنگٹن کے قانون ساز ہر حال میں کساد بازاری کو روکنا چاہتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ کسی بھی معاشی خرابی کو مصنوعی طریقوں سے روکنے کی کوشش مزید مسائل کو پیدا کرنے یا پہلے سے موجود مسائل کو مزید سنگین کر دیا کرتی ہے۔ حکومتی سطح پر چاہے کتنا ہی بڑا بیل آؤٹ پیکیج دیا جائے، معیشتی خرابی کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ بیل آؤٹ پیکیج کے نتائج کچھ مدت کے بعد ظاہر ہونے لگتے ہیں اور خرابیاں کھل کر سامنے آنے لگتی ہیں۔

امریکا اور یورپ میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے جو معاشی سرگرمیاں رک گئی تھیں۔ وہ ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہو سکیں۔ اب بھی جو صنعتی یونٹ بند ہو گئے تھے اور تجارتی اداروں کو تالا لگ گیا تھا، اس کو دوبارہ بحال کرنے میں مالیاتی مشکلات آڑے آ رہی ہیں۔ لوگوں کی نقل و حرکت بھی محدود یا برائے نام ہے۔ کوشش یہ کی جارہی ہے کہ خام قومی پیداوار میں کمی واقع نہ ہو۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ جب معیشت کا پہیہ رکا ہوا ہوگا تو خام قومی پیداوار میں کمی لازمی طور پر واقع ہوگی۔ اس کمی کو روکنے کی کوشش کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ یہ کمی عارضی ہو۔

کورونا وبا کے دوران کوشش یہ کی جارہی تھی کہ کسی نہ کسی طور کوئی بہت بڑا بیل آؤٹ پیکیج میدان میں لایا جائے۔ کورونا کے ہاتھوں پیدا ہونے والی صورتِ حال پر دولت برسا کر اُس کے اثرات کو محدود رکھنے کی کوشش کی گئی تاکہ جب یہ وبا ختم ہوگی اور معیشتی سرگرمیاں بحال ہوں گی تب مکمل بحالی کا عمل غیر معمولی اقدامات کا طالب ہوگا لیکن عالمی مالیاتی اداروں کے مطابق تمام اندازوں کو حالات نے مات کر دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیاامریکامالیاتی اورزرعی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکاہے؟اگر کورونا کے بعد یوکرین کی جنگ کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ میں جاری جنگی اخراجات کے ہاتھوں پیدا ہونے والا بحران امریکا کو مالیاتی اور زرعی اعتبار سے دیوالیہ چھوڑ کر رخصت ہوا تو بھرپور معاشی بحران کی حقیقت کو کیسے روکا جائے گا۔اس وقت امریکی پالیسی ساز جو کچھ کر رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ امریکامالیاتی اورزرعی سطح پر شدید ناکامی سے دوچار ہے۔امریکی پالیسی سازوں کا کہنا ہے کہ دانش کا تقاضایہ ہے کہ جنہیں مالیاتی امداد کی غیر معمولی ضرورت ہے اُنہیں مدد فراہم کی جائے اور جن کی پوزیشن ذرا بھی بہتر ہے،اُن سے کہا جائے کہ مختصر عرصہ کیلئے خرابی کے اثرات کو کسی نہ کسی طور جھیلیں۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ معیشت کو کم از کم عرصے تک ہولڈ پر رکھا جائے۔صرف ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔صحتِ عامہ کے معاملات پر خاطر خواہ توجہ دی جائے۔

واشنگٹن میں بہت سوں کی رائے یہ ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کا کریش کر جانا اصل مسئلہ ہے۔یہ سوچ غلط نکلی۔معیشت کی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت ٹرمپ اسٹاک مارکیٹ کو غیر معمولی اہمیت دیتے رہے۔کچھ مدت سے اسٹاک مارکیٹ میں جو کچھ ہوتا رہا اُس کے نتیجے میں اگر عارضی بنیاد پر کوئی بہتری لانے کی کوشش کی گئی یا اسٹاک مارکیٹ کو مصنوعی تنفس فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تو معاشی اعتبار سے اعتماد بحال ہونے کی بجائے مزید گر گیا۔ماہرین کے مطابق معیشت کو حقیقت میں بحال کرنا ہے،تو اعتماد کی بحالی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے۔

کسی بھی بڑی بحرانی کیفیت کے شدید منفی اثرات سے نمٹنے کی صلاحیت کے اعتبار سے ٹرمپ انتظامیہ پر عوام کا اعتماد بہت نچلی سطح پر رہا جو ان کے جانے کے بعد بائیڈن حکومت کو ورثے میں تو ملا لیکن باوجود لاکھ کوششوں کے وہ اس بحران سے مکمل طور پر باہر نہیں نکل سکے اور اب صدارتی انتخاب میں امیدواروں نے دھڑلے سے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے امریکا کی بربادی کا ذمہ دار قرار دیا۔اعتماد کے فقدان کا تعلق صرف مہارت تک یعنی معاشی پالیسی سازوں اور اندرون و بیرون ملک پروفیشنل سرمایہ کاروں تک محدود نہیں۔اس وقت 50 فیصد سے زائد امریکیوں کا خیال ہے کہ ٹرمپ اس منصب کیلئے موزوں نہیں جس کی وجہ کورونا سے نمٹنے کے حوالے سے ٹرمپ کی ناکام پالیسیوں کو قرار دے رہے ہیں۔باقی لوگوں کو چھوڑیے ،اُن کے پسندیدہ "فوکس نیوز" ٹی وی چینل کو دیکھنے والوں کے اعتماد میں بھی اضافہ کرنے میں بھی ٹرمپ ناکام رہا۔ٹرمپ نے اپنے دورِ اقتدار میں شدید تنقید کے باوجود بھی معاملات کو سنجیدگی سے نہیں لیا،حقائق کو غلط انداز سے بیان کرتے رہے اور پالیسی کے حوالے سے غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے گئے۔

اسٹاک مارکیٹ ہی کو سب کچھ گردانتے والے ٹرمپ کی سوچ کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے امریکی پالیسی سازوں کو معیشت کی تمام خامیوں اور خوبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے متوازن اور قابلِ قبول پالیسی ترتیب دینی چاہیے تھی۔پالیسی سازوں کو یہ بات کسی بھی حال میں نظرانداز نہیں کرنی چاہیے تھی کہ یہ سب کچھ کسی ریئلٹی ٹی وی کا پروگرام نہیں۔جس کے نتیجے میں اب امریکا کے معاشی اونٹ پر آخری تنکا کچھ یوں سامنے رہا ہے کہ چین،روس کے علاوہ دیگر دوملکوں نے آئندہ تیل کی خرید و فروخت اور اپنی تمام درآمد و برآمد میں ڈالر کو فارغ کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے گویاعالمی تجارت میں ڈالر کے استعمال سے یومیہ ڈھائی سوملین ڈالر کا کمیشن جو اب کم ہو کر نصف رہ گیا ہے،اب اس سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔گویااس کے بعد یہ پوچھنے کی ضرورت تو آن پڑی ہے کہ خود امریکا کی پانچ بڑی ریاستوں نے اپنے عوام کے ٹیکس کو مزید جنگی جنون میں خرچ کرنے پر شدید احتجاج کرتے ہوئے آخری حد تک جانے کا عندیہ دے دیا ہے تو ان حالات میں کیاامریکا ٹوٹنے جارہا ہے؟

بروز جمعرات 19 جمادی الاول 1446ھ 21 نومبر 2024ء

روس اور امریکا میں کشیدگی

ٹرمپ ابھی وائٹ ہاؤس پہنچے بھی نہیں ہیں کہ ان کے انتخابی وعدہ (دنیا بھر میں جنگ بند کرانے) کی تکمیل کیلئے مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ جو بائیڈن نے بالآخر یوکرین کو روس میں طویل فاصلے تک مار کرنے والے امریکی ساختہ میزائل فائر کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ پیوٹن نے یوکرین کو اے ٹی اے سی ایم ایس میزائل کو روس کے اندر استعمال کرنے کی اجازت دینے پر جو بائیڈن کو "مناسب اور ٹھوس" ردعمل کی تنبیہ کی تھی۔ پیوٹن نے فوری طور پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے روس کے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے اصول میں تبدیلیوں کی منظوری دیتے ہوئے نئے قواعد اور شرائط کا اعلان کر دیا ہے، جن کے تحت اب روس اپنے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کا فیصلہ کرے گا۔

روس کے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے اصول میں ترمیم ستمبر میں تجویز کی گئی تھی اور منگل کو یوکرین کے ساتھ جنگ کے ایک ہزارویں دن پر اس پر مہر ثبت کی گئی ہے۔ روسی وزارت خارجہ کے مطابق روسی سرزمین کے اندر اس طرح کا حملہ "امریکا اور اس کی حواری ریاستوں کی روس کے خلاف براہ راست جنگ میں شمولیت تصور کی جائے گی۔ دمتری پیسکوف نے کہا کہ نیا جوہری ڈاکٹرائن "بروقت" شائع کی گئی ہے اور پوتن نے اس سال کے اوائل میں اس کو اپ ڈیٹ کرنے کی درخواست کی تھی تاکہ اس کو موجودہ حالات سے ہم آہنگ بنایا جائے۔

روسی انتظامیہ کی جانب سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اگر امریکا کی جانب سے فراہم کردہ میزائل روس پر داغے جاتے ہیں تو ماسکو اس حملے کو یوکرین کی جانب سے حملہ نہیں بلکہ اسے امریکی حملہ تصور کرے گا۔ کریملن کی جانب سے جاری ہونے والے بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ "روس اور پوتن نے اپنے مؤقف کو بہت واضح کر دیا ہے اور امریکا کا یہ فیصلہ اس تنازعے میں واشنگٹن کی شمولیت کی ایک نئی سطح کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ "واضح" ہے کہ سبکدوش ہونے والی بائیڈن انتظامیہ "جلتی پر تیل کا کام" کر رہی ہے اور اس تنازعے میں پہلے سے موجود کشیدگی کو مزید بڑھانے کیلئے اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

امریکی قومی سلامتی کے نائب مشیر جون فائنر نے کریملن کے اس بیان پر ردعمل کا اظہار کیا ہے جس میں امریکا پر یوکرین روس جنگ میں جلتی پر تیل چھڑکنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ "امریکا شمالی کوریا کی افواج کی اس جنگ میں شمولیت کی روسی حکمتِ عملی پر نظر رکھے ہوئے ہے اور امریکا کی جانب سے روس پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہم اس کا جواب دیں گے۔ بائیڈن اس حوالے سے سنجیدہ ہیں کہ جتنا بھی ممکن ہو سکے وہ اپنی بقیہ مدت میں یوکرین کی مدد کر سکیں۔ اس کا ایک مقصد یوکرین کو عسکری طور پر مضبوط بنا کر کسی بھی ممکنہ امن مذاکرات میں اس کی پوزیشن بہتر بنانا ہے۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ "خطے میں یہ آگ روس کے یوکرین پر حملے کی وجہ سے لگی تھی اور بنیادی مسئلہ اس کا تسلسل، شمالی کوریا کی افواج کی میدانِ جنگ میں موجودگی اور ملک بھر میں فضائی حملوں میں آنے والی "شدت" ہے۔ اس لیے میں روس سے یہ سوال پوچھنا چاہوں گا کہ یہاں آگ پر کون تیل ڈال رہا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ یہ یوکرین کے لوگ ہیں۔" واضح رہے کہ یوکرین کئی ماہ سے روسی حدود میں حملے کیلئے امریکا کی جانب سے فراہم کیے جانے والے میزائلوں کے استعمال کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

آرمی ٹیکٹیکل میزائل سسٹم (اے ٹی اے سی ایم ایس) بنیادی طور پر زمین سے زمین پر مار کرنے والے بیلسٹک میزائل ہیں، جو 300 کلومیٹر کی دوری

تک ہدف کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ان میزائلوں کی یہی رینج انہیں یوکرین کیلئے اہم بنا دیتی ہے۔ آرمی ٹیکٹیکل میزائل سسٹم کو یا تو ایم 270 ملٹی پل لانچ راکٹ سسٹم یعنی ایک جگہ پر نصب سسٹم (ایم ایل آر ایس) یا پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر آسانی سے منتقل ہو جانے والے ایم 142 ہائی موبلٹی آرٹلری راکٹ سسٹم (ایچ آئی ایم اے آر ایس) سے فائر کیا جاتا ہے۔

یہ میزائل ٹھوس راکٹ پروپیلنٹ سے ایندھن بھرتے ہیں اور خاصے تیز رفتار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں روکنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ نیویگیشن کو لانچ سے پہلے پروگرام کیا جاتا ہے اور انرشیل اور سیٹلائٹ گائیڈنس کا استعمال کرتے ہوئے انہیں ہدف کی جانب داغا جاتا ہے، اور یہ اپنے ہدف کو تقریباً 10 کلومیٹر تک درست انداز میں نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میزائلوں کو دو مختلف اقسام کے وار ہیڈ میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے ایک کی مدد سے بڑی تعداد میں میزائل داغے جاتے ہیں اور اس کی مدد سے دشمن کے فضائی دفاعی نظام کو غیر مؤثر کیا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم یونٹری وار ہیڈ ہے، جو 225 کلوگرام کا ایک بڑا دھماکہ خیز ورژن ہے جو کسی بڑے مقام یا تنصیبات کو تباہ کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ یہ میزائل پہلی بار 1991 میں خلیج جنگ میں استعمال کیے گئے تھے۔ امریکا ابھی اس میزائل کو مزید بہتر کرنے پر کام کرتے ہوئے 500 کلومیٹر تک اس کی رینج بڑھانا چاہتا ہے۔ ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ یوکرین کو یہ میزائل ملیں گے یا نہیں۔ امریکی اجازت ملنے کے بعد اب یوکرین ان میزائلوں کو روس کے خلاف استعمال کر سکے گا۔ شاید پہلے مرحلے میں وہ کرسک میں ان میزائلوں کا استعمال کرے، جہاں یوکرینی افواج ایک ہزار مربع کلومیٹر خطے پر مورچہ زن ہے۔ یوکرین اور امریکا کو روس اور شمالی کوریا کی طرف سے کرسک کے علاقے میں حملوں کا خدشہ ہے۔ یوکرین ایسی صورت میں ان میزائلوں کا استعمال کر سکتا ہے اور وہ اس دوران روس کے فوجی اڈوں، انفراسٹرکچر اور اسلحے کے ڈپو کو ہدف بنا سکتا ہے۔

ان میزائلوں کے مقابلے میں روس نے بھی دفاعی انتظامات کر رکھے ہیں اور کسی بھی ایسے ممکنہ حملے کو روکنے کیلئے اس نے پہلے ہی فوجی تنصیبات جیسے لڑاکا جہاز بھی ملک کے اندر منتقل کر دیئے ہیں۔ تاہم مزید امداد بھیجنے کیلئے روس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کیونکہ ایسی امداد بھیجنے میں وقت لگتا ہے۔ ایک مغربی ملک کے سفارتکار کے مطابق "مجھے نہیں لگتا کہ یہ بہت فیصلہ کن ہو گا۔ ان کے مطابق یہ یوکرین کو دی جانے والی ایک علامتی مدد کے طور پر ہی دیکھا جانا چاہیے۔ اور یہ سب روس کے جنگی اخراجات میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

زمینی حقائق اس بات کی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ روس اب کسی بھی دن روسی کرسک کے علاقے سے یوکرین کی افواج کو بے دخل کرنے کیلئے ایک بڑا حملہ کر سکتا ہے۔ یوکرین امریکی فراہم کردہ میزائل کو حملے کے خلاف دفاع کیلئے استعمال کر سکتا ہے، جس میں فوجی اڈوں، بنیادی ڈھانچے اور گولہ بارود ذخیرہ کرنے والے مراکز سمیت روسی اہم ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ یہ ہتھیار یوکرین کو ایک ایسے وقت میں کچھ فائدہ دے سکتے ہیں جب روسی افواج ملک کے مشرقی حصے میں قدم جما رہی ہیں۔

یوکرین کے صدر ولادیمیر زیلینسکی امریکا کی جانب سے دور تک مار کرنے والے میزائلوں کے استعمال پر پابندی ہٹانے کے بارے میں کئی ماہ سے کوششیں

کررہے تھے تاکہ یوکرین کو روس میں اہداف کو نشانہ بنانے کا موقع مل سکے جبکہ پوتن کی جانب سے ماضی میں مغربی ممالک کو اس حوالے سے پابندی ہٹانے کے بارے میں خبردار کیا جاتا رہا ہے کہ روس اسے نیٹو کی اس جنگ میں براہِ راست مداخلت کے طور پر دیکھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیٹو ممالک اور امریکا روس کے خلاف لڑ رہے ہیں"۔ یہ لانگ رینج میزائل دراصل امریکی کمپنی لاک ہیڈ مارٹن بناتی ہے۔

ان میزائلوں کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ 300 کلومیٹر تک مار کرسکتے ہیں اور انہیں ان کی رفتار کی وجہ سے تباہ کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ امریکا کی جانب سے یہ ہتھیار یوکرین کو سپورٹ پیکج کے طور پر دیے جاتے رہے ہیں اور یہ پہلے یوکرین نے کریمیا میں استعمال کیے ہیں۔ یوکرین کرسک کے علاقے میں ایک دہائی سے زائد عرصے سے یہ میزائل اور امریکی اسلحے کا استعمال کررہا ہے۔ تاہم امریکا نے کبھی کیئو کو روس کے اندران میزائلوں کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔ یوکرین نے یہ مؤقف اختیار کررکھا تھا کہ "ان میزائلوں کی اجازت نہ دینا تو ایسا ہی ہے کہ جیسے لڑائی میں کسی کا ایک ہاتھ اس کی پشت پر باندھ کر اسے کہا جائے کہ اب لڑو"۔ زیلنسکی نے ابھی تک اس امریکی فیصلے کی تصدیق نہیں کی ہے تاہم انہوں نے یہ کہا تھا کہ حملے الفاظ سے نہیں کیے جاتے، میزائل خود اپنا پتہ دیں گے۔ اطلاعات کے مطابق امریکا کی پالیسی میں نئی تبدیلی اس وقت واقع ہوئی جب یوکرین کے زیرِ قبضہ کرسک کے علاقوں میں روس کی مدد کیلئے شمالی کوریا کے فوجی بھی خطے میں آئے۔ یوکرین کرسک کے علاقے پر اگست سے قابض ہے۔

آیئے آپ کو بتاتے ہیں کہ روس کا جوہری ڈاکٹرائن ہے کیا اور اس میں کیا تبدیلی کی گئی ہے؟

کریملن کے مطابق روس کے جوہری ڈاکٹرائن پر پہلی بار صدر پیوٹن نے 2020 میں دستخط کیے تھے جبکہ اس کے تازہ ترین ورژن کی چند دن قبل منظوری دی گئی ہے۔ اس تازہ ڈاکٹرائن میں بتایا گیا ہے کہ روس کن حالات میں اپنے جوہری ہتھیاروں کا استعمال کرسکتا ہے۔ 2022 میں جب سے روس نے یوکرین پر حملہ کیا تھا تب سے پیوٹن اور کریملن کے دیگر اہم اشخاص نے اکثر مشرقی طاقتوں کو اپنے پاس موجود جوہری ہتھیاروں کے حوالے سے خبردار کیا تھا تاہم کیئو کے اتحادی یوکرین کو اربوں ڈالر کے جدید ہتھیار دینے سے نہیں رکے اور ان میں سے کچھ ہتھیاروں کو روسی سرزمین پر استعمال کیا جاچکا ہے۔

تجدید شدہ دستاویز میں روس نے اپنے جوہری ہتھیاروں کو ڈیٹرینٹ (رکاوٹ پیدا کرنے کے ایک ذریعہ) کے طور پر بیان کیا ہے۔ دستاویز میں کہا گیا ہے کہ روس کی جانب سے ان کا استعمال ایک "انتہائی اور مجبوراقدام" ہوگا۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ روس جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے "خطرے کو کم کرنے اور بین الریاستی تعلقات میں کشیدگی بڑھنے سے روکنے کیلئے تمام ضروری کوششیں کرتا ہے جو جوہری تنازعات سمیت فوجی تنازعات کو جنم دے سکتے ہیں"۔

دستاویز کے مطابق اس طرح کی حکمت عملی "ریاست کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت" کو برقرار رکھنے کیلئے کی گئی ہے تاکہ ممکنہ حملہ آور کارروائی کرنے سے باز رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ "اگر کوئی فوجی تنازع جو کشیدگی اختیار کرنے لگے تو اسے ایسی شرائط کی بنا پر روکا جاسکے جو روس کیلئے قابل قبول ہوں"۔ ڈاکٹرائن میں مزید کہا گیا ہے کہ روس کی جوہری طاقت کے استعمال کی سٹریٹیجی کا مقصد ہے کہ "کوئی بھی ممکنہ حریف روس اور اس کے اتحادیوں کے خلاف کارروائی کرے تو اسے معلوم ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا"۔

دستاویز میں روس نے واضح نہیں کیا ہے کہ وہ جوہری ہتھیار کب اور کیسے استعمال کرے گا تاکہ مشرق کو روس کی اگلی چال کے بارے میں یقینی طور پر

معلومات نہ ہوں۔ تاہم اس تجدید شدہ ڈاکٹرائن میں یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ پیوٹن روایتی جھڑپوں میں بھی جوہری ہتھیاروں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹرائن کی تبدیلیوں پر مہینوں سے کام ہو رہا تھا۔ یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ منگل کو کیے جانے والا یہ اعلان امریکا کے یوکرین کو روس کے خلاف طویل فاصلہ طے کرنے والے میزائل استعمال کرنے کی اجازت کے بعد کیا گیا ہے۔

روسی جوہری ڈاکٹرائن کی تازہ ترین تبدیلیوں کے مطابق اگر ایک غیر جوہری ریاست کو روس پر حملہ کرنے کیلئے ایک جوہری طاقت کی حمایت حاصل ہے، تو اسے روس پر مشترکہ حملہ تصور کیا جائے گا۔ اب ان تبدیلیوں کے تحت روس پر روایتی میزائلوں، ڈرونز یا ہوائی جہازوں سے بڑا حملہ روس کی جانب سے جوہری ردعمل کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر بیلاروس پر حملہ ہو یا روس کی خود مختاری کو کوئی سنگین خطرہ لاحق ہو تو وہ جوہری ردعمل دے سکتا ہے۔ اس تبدیلیوں کے بعد روس کے خلاف کسی ایسے ملک کی جارحیت جو کسی اتحاد کا رکن ہو، ماسکو پورے گروپ کی طرف سے جارحیت تصور کرے گا۔ یعنی جوہری نظریے میں تبدیلیوں کے مطابق ممکنہ جوہری ردعمل کے دائرے میں آنے والے ممالک، اتحادوں، اور فوجی خطرات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

پیوٹن پہلے بھی جوہری ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دے چکے ہیں جس پر یوکرین نے تنقید کرتے ہوئے اسے "جوہری دھمکی" قرار دیا تھا اور اسے اپنے اتحادیوں کو مزید مدد فراہم کرنے سے روکنے کی روسی کوشش کہا تھا تاہم روسی وزیر خارجہ سرگئی لاروف نے کہا ہے کہ "ہم اس بات کے سخت حامی ہیں کہ جوہری جنگ سے ہر حال میں بچا جائے۔ ریوڈی جنیرو میں جی 20 اجلاس کے دوران ایک پریس کانفرنس میں سرگئی لاروف نے کہا کہ اس گروپ نے جس میں روس بھی شامل ہے، ایک اعلامیے پر دستخط کیے ہیں جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "ہم ایک ایسی دنیا کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں جو جوہری ہتھیاروں سے پاک ہو"۔ جوہری ڈاکٹرائن میں تبدیلی کے حوالے سے کریملن کے ترجمان دمتری پیسکوف نے کہا کہ دوسری اقوام ان تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کریں۔ یہ ایک انتہائی اہم تحریر ہے اس کا بغور تجزیہ کریں۔

اہم مغربی خبر رساں اداروں نے یوکرین کی جانب سے روس کے خلاف آرمی ٹیکٹیکل میزائل سسٹم کے استعمال کی تصدیق کی ہے کہ امریکا کی جانب سے یوکرین کو طویل فاصلے تک مار کرنے والے امریکی ساختہ میزائلوں کے ذریعے روس پر حملوں کی اجازت دینے کے ایک دن بعد، یوکرین نے پہلی بار یہ میزائل روسی علاقے کے اندر کسی ہدف پر داغ دیے ہیں۔ اس حملے میں شمال میں یوکرین کی سرحد سے متصل روس کے برائنسک کے علاقے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

روسی وزارت دفاع نے اس حملے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ یوکرین کی جانب سے یہ میزائل حملہ مقامی وقت کے مطابق 03:25 پر کیا گیا۔ اس حملے میں پانچ میزائلوں کو مار گرایا گیا اور ایک میزائل کو نقصان پہنچا جبکہ اس کے کئی ٹکڑوں سے علاقے میں موجود ایک روسی فوجی تنصیب میں آگ لگ گئی اور اس آگ کو فوری طور پر بجھا دیا گیا اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اس سے قبل یوکرین کی فوج نے تصدیق کی تھی کہ روسی علاقے کراچیف کے قریب سرحد سے 100 کلومیٹر دور ایک اسلحہ ڈپو پر ہونے والے حملے میں 12 دھماکے ہوئے۔ اس نے روسی علاقے برائنسک میں گولہ بارود کے گودام کو نشانہ بنایا تاہم اس نے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ آیا ان میں آرمی ٹیکٹیکل میزائل سسٹم کا استعمال کیا گیا تھا۔

ادھر روس کے وزیر خارجہ سرگئی لاوروف نے واشنگٹن پر تنازع کو بڑھانے کا الزام عائد کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "برائنسک کے خطے میں گذشتہ رات بار بار امریکی میزائلوں کا استعمال کیا گیا جو یقیناً اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ (امریکا) کشیدگی بڑھانا چاہتے ہیں۔ جیسا کے پیوٹن کئی بار کہہ چکے ہیں کہ

امریکیوں کے بغیر، ان ہائی ٹیک میزائلوں کا استعمال ناممکن ہے۔ روس "یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھے گا کہ ان میزائلوں کو امریکی فوجی ماہرین چلا رہے ہیں"۔

انہوں نے ریوڈی جنیرو میں جی 20 کے اجلاس کے دوران ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم اسے روس کے خلاف مغربی جنگ کے ایک نئے چہرے کے طور پر لیں گے اور ہم اس کے مطابق ردعمل ظاہر کریں گے"۔ یاد رہے کہ یوکرین پہلے ہی ایک سال سے زیادہ عرصے سے روس کے زیرقبضہ یوکرینی علاقوں میں ان میزائلوں کا استعمال کر رہا ہے۔ یہ میزائل 300 کلومیٹر تک کے اہداف کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور انہیں روکنا مشکل ہے۔ کیئو اب میزائلوں کا استعمال کرتے ہوئے روس میں اندر تک حملہ کرنے کے قابل ہے، بشمول کرسک کے علاقے کے ارد گرد، جہاں یوکرین کی افواج ایک ہزار مربع کلومیٹر سے زیادہ علاقے پر قابض ہیں۔ یوکرین اور امریکی حکام مبینہ طور پر خطے میں جوابی کارروائی کی توقع رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ روس کی طرف سے جوابی حملے کی صورت میں رخصت ہونے والے امریکی صدر جو بائیڈن نے جو کانٹے بچھا دیئے ہیں، ٹرمپ اپنا دامن ان سے کیسے بچائیں گے کہ انہوں نے تو نہ صرف امریکی عوام سے بلکہ پوری دنیا کے سامنے جنگیں بند کروانے کا عہد کیا ہے! کیا ٹرمپ اپنا وعدہ پورا کر سکیں گے یا پھر جنگی مافیا کے احکام پر سر جھکا کر پرانی تنخواہ پر کام کرنے میں اپنی عافیت سمجھیں گے اور دنیا ایک بار پھر اس کو ٹرمپ کی بڑھک سمجھ کر اگلے انتخاب کا انتظار کریں گے۔

بروز ہفتہ 21 جمادی الاول 1446ھ 23 نومبر 2024ء

سعودی عرب اور ایران کے تعلقات میں تبدیلی

1979 کے ایرانی انقلاب کے بعد سے سعودی عرب اور اس کے سنی عرب پڑوسی ایران کو خطے میں بڑا خطرہ سمجھتے رہے ہیں اور بالخصوص سعودی میں 2019 کے دوران تیل کی تنصیبات پر ڈرون حملہ خلیجی عرب ریاستوں کیلئے ایک ایسی دھمکی کے طور پر سمجھا گیا کہ ایران کی طرف سے کسی حملے کی صورت میں وہ اپنے دفاع میں کس قدر کمزور ہیں۔ پھر یمن اور سعودی عرب کی جنگ میں طوالت نے بھی ان خطرات میں کافی اضافہ کر رکھا تھا۔

خطے میں ان دو مسلمان ریاستوں کے وسائل کو جس بے دردی کے ساتھ آگ میں جھونکا جا رہا تھا اور شدید ترین جانی نقصان کے ساتھ دشمنی میں اضافہ ہو رہا تھا، ایسے مشکل حالات میں چین کی مداخلت نے نہ صرف ان بڑھتے ہوئے شعلوں پر پانی پھینک کر اس آگ کے مزید نقصانات اور تباہی سے اس خطے کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ درپردہ دشمنی کی وجوہات کو طے کرنے کیلئے مذاکرات کا راستہ بھی کھولا جس کا سب سے بڑا فائدہ جہاں خطے کے تمام ممالک کو ہوا وہاں اس کا سب سے بڑا نقصان ان استعماری قوتوں کا ہوا جو اس جنگ کی آڑ میں بے شمار فوائد سمیٹ رہے تھے۔

چین کی ثالثی میں سعودی عرب اور ایران نے اپنے اختلافات دور کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ اس سے 7 سالہ دشمنی کا دور اختتام پذیر ہوا۔ ان 7 برسوں میں یمن میں سعودی ایئر فورس نے ایرانی حمایت یافتہ حوثی باغیوں پر بمباری کی تھی۔ اب خطے میں کچھ چیزیں بالکل بدل چکی ہیں۔ گزشتہ دنوں سعودی آرمی چیف تہران گئے اور اپنے ایرانی ہم منصب سے ملاقات کی۔ دونوں ممالک اب دفاعی اور سکیورٹی اُمور پر تعاون بڑھانے پر بات چیت کر رہے ہیں۔

آج جب عرب اور اسلامی سمٹ غزہ اور لبنان میں جنگوں کے خاتمے کا مطالبہ کر رہا ہے تو وہیں ٹرمپ کے دوسرے صدارتی دور کے دوران مشرقِ وسطیٰ میں تبدیلیوں کے حوالے سے امید اور غیر یقینی بھی عیاں ہے۔ غزہ اور لبنان میں جاری اسرائیلی حملوں کے درمیان جہاں ایک طرف سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں مسلم اور عرب ممالک کا اجلاس ہو رہا ہے تو وہیں دوسری طرف ایک دوسرے کے حریف سمجھے جانے والے ملک سعودی عرب اور ایران کے اعلیٰ حکام کے درمیان اہم ملاقاتیں اور بات چیت بھی ہو رہی ہے۔

سعودی فوج کے ایک اعلیٰ سطح کے وفد نے حال ہی میں ایران کا دورہ کیا ہے جبکہ ایران کے صدر مسعود پزشکیان نے سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان سے بات بھی کی ہے۔ ایرانی میڈیا کے مطابق سعودی وفد نے ایران کے فوجی حکام سے دونوں ممالک کے عسکری تعلقات پر تبادلہ خیال کیا۔ ایرانی مسلح افواج کے شعبہ تعلقات عامہ کے مطابق سعودی مسلح افواج کے چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل فیاض بن حامد الرویلی نے ایران کی مسلح افواج کے چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل محمد بغیری سے دفاعی تعلقات پر تبادلہ خیال بھی کیا۔

ایرانی میڈیا اس دورے کو "غیر معمولی" قرار دے رہا ہے کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان آخری بار براہِ راست فوجی رابطے دسمبر 2023 میں ٹیلیفون کالز کے ذریعے ہوئے تھے۔ سعودی عرب کی وزارت دفاع کے مطابق دونوں ممالک کے درمیان ہونے والی یہ ملاقات فوجی اور دفاعی تعاون پر بات چیت کیلئے ہے لیکن شاید یہ معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں۔ گزشتہ دنوں یمن کے صوبہ حضرموت کے شہر صیون میں سعودی عرب کی فوج کے ایک کیمپ پر حملہ ہوا، جس میں ایک سعودی افسر اور ایک فوجی ہلاک جبکہ تیسرا زخمی ہوا، گویا یہ واضح تنبیہ ہے کہ استعمار اس خطے میں اپنے مفادات کی ترویج کیلئے کسی بھی امن پروگرام کو سبوتاژ کر سکتا ہے۔

واضح رہے کہ ایران، یمن میں حوثی باغیوں کی حمایت کرتا ہے جبکہ وہاں کی حکومت کو سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے۔ سعودی قیادت والی اتحادی فوج نے کیمپ پر حملے کے حوالے سے بیان جاری کرتے ہوئے اسے "بزدلانہ" قرار دیا تھا۔ ادھر عرب اور مسلم ممالک کے درجنوں سربراہان سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک اجلاس کیلئے جمع ہیں جہاں یہ اندازے لگائے جا رہے ہیں کہ ٹرمپ کا بطور امریکی صدر دوسرا دور کیسا ہوگا اور اس کے مشرق وسطیٰ کیلئے کیا معنی ہوں گے۔ یورپ میں ٹرمپ کو ایک ایسے رہنما کے طور پر دیکھا جاتا ہے جن کے بارے میں کوئی قیاس آرائی نہیں کی جا سکتی مگر ایسے خدشات کے برعکس خلیجی عرب ممالک انہیں ایک مستحکم رہنما سمجھتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ میں سکیورٹی کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے اور اس کے تناظر میں ٹرمپ کی جانب سے اس خطے میں امریکی اتحادیوں کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنا اور انتہا پسند قوتوں پر توجہ ہی آگے بڑھنے کا بہترین راستہ ہے۔ تاہم سعودی عرب میں ٹرمپ کو جو بائیڈن کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ امریکی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی امریکی صدر نے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھتے ہی کینیڈا یا میکسیکو کی بجائے ٹرمپ نے 2017 میں بطور صدر اپنے پہلے غیر ملکی دورے کیلئے ریاض کا انتخاب کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں یہ آئیڈیا روپرٹ مرڈوک نے دیا تھا۔

اپنے داماد جیرڈ کشنر کے باعث ٹرمپ کے سعودی فرمانروا اور ولی عہد محمد بن سلمان کے ساتھ بہترین تعلقات قائم ہیں۔ ایم بی ایس نے بائیڈن کو ان کے اس بیان کیلئے کبھی معاف نہیں کیا جس میں ان کا کہنا تھا کہ سعودی عرب کو انسانی حقوق کی پامالیوں کا جواب دینا ہوگا اور بالخصوص سعودی صحافی جمال خاشقجی کے ترکی میں سعودی سفارت خانے کے اندر بہیمانہ قتل کی طرف واضح اشارہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ٹرمپ کے دورِ صدارت کے بارے میں ملے جلے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف ٹرمپ نے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرکے اور مقبوضہ گولان پہاڑیوں پر اسرائیلی خود مختاری تسلیم کرکے جہاں اسرائیل کو خوش کیا وہیں اس اقدام سے انہوں نے عرب دنیا کو پریشان کر دیا مگر پھر ٹرمپ نے 2020 میں "ابراہیم معاہدہ" کیا جس کے مطابق متحدہ عرب امارات، بحرین اور مراکش نے اسرائیل کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات قائم کیے ہیں اور سوڈان بھی اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے پر راضی ہوا مگر ایران کے حوالے سے ٹرمپ کا رویہ جارحانہ رہا ہے اور اپنے اس رویے کو اس نے خطے کے عرب ممالک کے دل جیتنے کیلئے برقرار رکھا۔

2018 میں ٹرمپ نے امریکا کو ایران کے ساتھ جوہری معاہدے سے یہ کہہ کر نکال لیا کہ یہ تاریخ کا بدترین معاہدہ ہے اور انہوں نے خطے کی بہت سی حکومتوں کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس معاہدے کا مقصد ایران کے جوہری عزائم کو روکنا تھا مگر یہ ایران کے بیلسٹک میزائل پروگرام سے نمٹنے میں ناکام رہا جبکہ اس معاہدے کے باعث پاسداران انقلاب پیسے سے مالا مال ہوئے جسے انہوں نے خطے میں اپنی پراکسیوں کو فنڈز فراہم کرنے کیلئے استعمال کیا۔ جس کے جواب میں 2020 میں ٹرمپ نے پاسدارانِ انقلاب کی قدس فورس کے سربراہ جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت کا حکم دیا جس نے خلیجی عرب ریاستوں کو خوش مگر ایران کو ناراض کر دیا تھا۔

لیکن آج کا مشرق وسطیٰ چار سال پہلے کے اس مشرقِ وسطیٰ سے بہت مختلف ہے جب ٹرمپ وائٹ ہاؤس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اسرائیل کی حماس اور حزب اللہ کے خلاف جنگ جاری ہے جبکہ اس نے یمن میں حوثیوں اور ایران میں ان کے سہولت کاروں کے خلاف کارروائیاں کی ہیں۔ خطے میں بائیڈن انتظامیہ کا تاثر ایسا ہے کہ وائٹ ہاؤس اپنے قریبی اتحادی اسرائیل کو غزہ اور لبنان کی جنگوں کے دوران روکنے میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکا۔ خیال ہے کہ

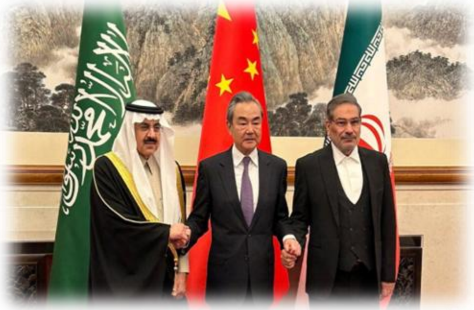

ٹرمپ کی وائٹ ہاؤس واپسی سے اسرائیل کو مزید "فری ہینڈ" ملے گا کہ وہ ایران میں ان اہداف (تیل اور جوہری تنصیبات) کو نشانہ بنا سکے جنہیں بائیڈن انتظامیہ نے روک رکھا تھا۔

سابق اسرائیلی انٹیلی جنس افسر جوشوا اسٹینرچ ٹرمپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ "وہ خطے میں اسرائیل کے اہم اتحادی اور اسرائیل کی کھل کر حمایت کرتے ہیں اور ایران کی عدم استحکام کا باعث بننے والی کوششوں کے خلاف سخت مؤقف رکھتے ہیں۔ ان کی واپسی کو اس تناظر میں دیکھا جائے گا کہ اس سے ایران کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کیلئے ٹھوس کوششیں ہوں گی"۔ سعودی عرب کے اعلیٰ سطح کے وفد کے ایران پہنچنے کے بعد ایرانی صدر مسعود پزشکیان نے سعودی عرب کے ولی عہد محمد بن سلمان سے بذریعہ ٹیلی فون رابطہ کیا اور اس بات چیت کے دوران عرب اسلامی کانفرنس پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس کانفرنس کیلئے عرب اور مسلم ممالک کے رہنما کے علاوہ ایرانی نائب صدر محمد رضا عارف اس کانفرنس میں شرکت کیلئے ریاض پہنچ گئے ہیں۔

تاہم پیر کے روز ریاض میں مسلم اور عرب ممالک کے اجلاس میں سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے غزہ میں اسرائیل کے اقدامات کو "نسل کشی" قرار دیتے ہوئے اس کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور اسرائیل کو ایران پر حملوں کے خلاف خبردار بھی کیا، جو تہران اور ریاض کے درمیان بہتر تعلقات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غزہ میں گزشتہ برس جنگ کے آغاز کے بعد سے سعودی حکام کی جانب سے پہلی بار اتنا سخت بیان سامنے آیا ہے۔ سعودی عرب کی زیر قیادت ریاض میں عرب اور اسلامی ممالک کے رہنماؤں کے اجلاس سے خطاب میں محمد بن سلمان نے لبنان اور ایران پر اسرائیلی حملوں کی مذمت بھی کی۔ اس کانفرنس کی بنیادی ترجیح فلسطین اور لبنان کے علاقوں میں اسرائیلی جارحیت کو روکنا، عام لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا اور خطے میں امن واستحکام کے قیام کیلئے عالمی برادری پر دباؤ ڈالنا ہے۔

چین کی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کی ثالثی کے بعد ایک دوسرے کے حریف سمجھے جانے والے ایران اور سعودی عرب گزشتہ سال سے قریب آنا شروع ہو گئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات 2016 سے بہت خراب تھے جب ایرانی مظاہرین نے تہران اور مشہد میں سعودی سفارتی مشنوں پر حملہ کیا تھا۔ گزشتہ اکتوبر کے آغاز میں ایران کے وزیر خارجہ عباس عراقچی ریاض پہنچے تھے اور ولی عہد سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس کے بعد سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں قدرے بہتری آئی۔ سعودی وزارتِ دفاع کے مطابق گزشتہ اکتوبر میں سعودی عرب نے بحیرہ عرب میں کئی ممالک کے ساتھ بحری مشقیں کی ہیں جن میں ایران بھی شامل ہے۔ تاہم اسی دوران ایران کی خبر رساں ایجنسی اسنا (ISNA) نے اطلاع دی تھی کہ ایران کی فوج روس اور عمان کے ساتھ شمالی بحر ہند میں مشترکہ فوجی مشقیں کر رہی ہے جس میں سعودی عرب سمیت چھ دیگر ممالک بھی شامل ہیں۔ ایرانی فوجی کمانڈر ایڈمرل شہرام ایرانی نے کہا تھا کہ سعودی عرب نے بحیرہ احمر میں مشترکہ فوجی مشقوں کی درخواست کی تاہم فوجی مشقوں کی کوئی مخصوص تاریخ نہیں بتائی گئی۔

سعودی عرب کے اعلیٰ سطح کے فوجی وفد کا دورہ ایران ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب اسرائیل کی جانب سے ایک نیا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ وہ علاقائی سلامتی کیلئے بحیرہ احمر میں امریکا کی سربراہی میں ایک اتحاد بنایا جا رہا ہے جس میں اسرائیل، اردن، مصر اور سعودی عرب شامل ہوں گے۔ اسرائیل کے مطابق بحیرہ احمر میں فوجی تعاون کا مقصد بحری نقل وحمل، تیل، گیس اور سٹریٹجک اثاثوں کو ایرانی خطرے سے بچانا ہے۔

اسرائیلی نیوز ویب سائٹ "زمانے اسرائیل" نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ یہ "علاقائی دفاعی اتحاد" عراق اور یمن میں ایران اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے لاحق خطرات سے نمٹنے کیلئے بنایا جارہا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ ایک دہائی میں سعودی عرب میں محمد بن سلمان کے عروج کے ساتھ ہی ریاض اور تہران کے تعلقات تبدیل ہوئے ہیں۔ امریکا کے ساتھ تاریخی تعلقات رکھنے کے باوجود سعودی ولی عہد اس خطے کی اہم ترین شخصیت بن گئے جنہوں نے ایران کے معاملے پر دل وجان سے کام کیا۔ اگرچہ چین کی ثالثی میں ایران اور سعودی عرب دو سال سے بھی کم عرصے میں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے لیکن یہ مذاکرات اور ان کے نتائج کسی اتحاد کی وجہ سے نہیں کیونکہ تہران اور ریاض کی خارجہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سعودی عرب روایتی طور پر مشرق وسطیٰ میں امریکا کے سب سے بڑے اتحادیوں میں سے ایک ہے۔ اپنی خارجہ پالیسی میں وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ امریکا کے مفادات اور مطالبات پر سوال نہ اٹھائے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب اور ایران کے درمیان علاقائی مقابلے کی تاریخ اسلامی جمہوریہ کی تاریخ سے بھی زیادہ طویل ہے۔ اسرائیل کی لبنان میں جاری فوجی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ غزہ میں فلسطینیوں کی ہلاکتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اس تنازعے میں ابھی تک جنگ بندی کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔

اس سب کے دوران امریکا کا صدارتی الیکشن ایک ایسا شخص جیت چکا ہے جو اسرائیل کی مکمل حمایت کرتا ہے اور ایران کے ساتھ ایک سخت معاہدے کا وعدہ کرکے بھی آیا ہے۔ بہت سے ماہرین کا کہنا ہے کہ وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ کی واپسی کا مطلب ہے کہ مشرق وسطیٰ میں حالات مزید کشیدہ ہو جائیں گے۔ اگر یہ پیشگوئیاں درست ثابت ہوئیں تو خطے کے بہت سے ممالک، خاص طور پر سعودی عرب جیسا وہ ملک جو امریکا کے ساتھ اچھے اور قریبی تعلقات رکھتا ہے، کو ایک مشکل فیصلہ کرنا ہوگا "کیا انہیں ایران کا ساتھ دینا چاہیے یا اس فوجی کشیدگی میں غیر جانبدار رہنا چاہیے؟

لیکن ایک ایسے وقت میں جب مسلم دنیا میں اسرائیل کے خلاف غصہ انتہا کو پہنچ چکا ہے تو اس صورتحال میں سعودی عرب، مصر، اردن اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک کی ایران اور اسرائیل کے بارے میں "غیر جانبداری" کی انہیں بھاری قیمت چکانا پڑ سکتی ہے لیکن اس کا واضح جواب محمد بن سلمان نے اپنی تقریر دیا ہے کہ وہ امریکا اور اسرائیل کے کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر پہچانے جانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ پوزیشن نہ صرف خطے میں ان کی پوزیشن پر مثبت اثر ڈال سکتی ہے بلکہ خطے میں طاقت پر مبنی تعلقات میں بھی سعودی عرب کے کردار کیلئے بھی اہم ہے۔

خاموش رہنے اور ایران اور اسرائیل کے درمیان جاری کشیدگی کو نظرانداز کرنے کی بجائے سعودی عرب اب کھل کر اسرائیل کے خلاف، ایران کے حق میں سامنے آیا ہے۔ محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے محمد بن سلمان نے "بین الاقوامی برادری" سے خطاب کیا اور عملی طور پر مغربی دنیا کو اپنی تقریر کے حقیقی سامعین کے طور پر منتخب کیا۔ یہ کام دراصل سعودی عرب کے چہرے کو از سرِ نو تعمیر کرنے اور بین الاقوامی سطح پر اس ملک کی پوزیشن کو نئے سرے سے متعین کرنے کی ان کی کامیاب وسیع مہم کا تسلسل ہے، جو کئی سال پہلے شروع کی گئی تھی۔ اس تقریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد بن سلمان اب ایران کے خلاف توازن قائم کرنے کیلئے اسرائیل یا امریکا سے قربت کی تلاش میں نہیں۔ اس کے برعکس اس بار وہ اسرائیل کی طاقت میں اضافے سے پریشان ہیں: ایک ایسا عمل جو اب بھی جاری ہے اور اگر اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تو اس سے خطے پر اسرائیل کا غلبہ بڑھ سکتا ہے جس کے تدارک کیلئے یقیناً ایک مؤثر اتحاد کی کوششیں جاری ہیں جس کیلئے یقیناً خطے کے تمام ممالک سر جوڑ کر بیٹھیں ہیں کہ آئندہ ممکنہ خطرات سے بچنے کیلئے میدانِ عمل میں ایسا جامع ٹھوس ردعمل سامنے لایا جائے جو اس طوفان کا منہ پھیر سکے۔

بروز سوموار 23 جمادی الاول 1446ھ 25 نومبر 2024ء

عرب دنیا میں فلسطین: یکجہتی یا سیاسی مفادات؟

گزشتہ 13 ماہ سے شب وروز اسرائیلی درندگی کے دل دہلا دینے والے انسانیت سوز مناظر دیکھتے ہوئے آنکھیں پتھرا گئی ہیں لیکن مظلوموں کی آہ وفریاد اور نالے پڑوسی عرب ریاستوں کے بہرے کانوں کی سماعتوں سے ٹکرا کر سوئے ہوئے ضمیر کو کچوکے لگا کر ناکام واپس لوٹ رہے ہیں اور معصوم بچوں کے لاشے اٹھائے ہوئے ان کے والدین یا عزیز واقارب ان عرب ریاستوں کے حکمرانوں او عوام کو پکار کر یہ سوال پوچھ رہے ہیں کہ آخر تم کہاں چلے گئے ہو؟ اسرائیلی بمباری سے تباہ حال عمارتوں کے ملبے سے زندہ بچ نکلنے والے، اپنے ہاتھوں میں شہید بچے اٹھائے اور بے بسی سے کیمرے کے سامنے چیختے غزہ کے ہر شخص کے منہ اللہ کی حمد وثناء کے ساتھ ساتھ عربوں کی بے حسی کے ماتمی کلمات بھی نکل رہے ہیں۔

غزہ کے باسی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بار بار پوچھ رہے ہیں اور اس بات پر حیران ہیں کہ ان کے عرب ہمسایہ ممالک اسرائیلی بمباری کے خلاف ان کا دفاع کیوں نہیں کر رہے؟ گزشتہ برس 7 اکتوبر کو اسرائیل پر حماس کے حملے کے بعد سے تمام نظریں مشرق وسطیٰ پر لگی تھیں اور سب کے ذہن میں یہ سوال تھے کہ اسرائیل کی جانب سے ردعمل کتنا شدید اور طویل ہوگا؟ اور خطے کے عرب ممالک کے عوام اور حکومتیں کیا ردعمل دیں گی؟ لیکن آج تک پہلے سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں مل سکا: اسرائیلی بمباری نے غزہ کی پٹی میں تباہی برپا کر دی اور اب تک 50 ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہو چکے ہیں لیکن اس کے تھمنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ اب اس کا سلسلہ شام، یمن کے علاوہ لبنان میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔

دوسرے سوال کے جواب کا کچھ حصہ واضح ہے، اگر کوئی یہ توقع رکھتا ہے کہ عرب دنیا کے دارالحکومتوں میں بڑے پیمانے پر احتجاج یا مظاہرے ہوں گے تو انہیں مایوسی ہوگی۔ اگرچہ عرب ممالک کی آبادی کی بڑی تعداد کی حمایت اور جذبات فلسطین کے ساتھ یکجہتی کے ہیں لیکن ان ممالک میں مظاہروں کو محدود رکھا گیا۔ جہاں تک عرب ممالک کی حکومتوں کا تعلق ہے تو ان کا ردعمل یا تو بہت کمزور یا مایوس کن رہا۔ اسرائیل پر روایتی تنقید یا قطر اور مصر کی حکومتوں کی جانب سے اس تنازعے میں ثالثی کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کے علاوہ کسی نے بھی فلسطینیوں کا ساتھ نہیں دیا۔

دکھ کی بات تو یہ ہے کہ سفاک اسرائیل کے دلدوز خون آشام مناظر کے بعد اب تک کسی بھی عرب ملک نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات ختم نہیں کیے یا کوئی ایسا اقدام نہیں اٹھایا جس سے اسرائیل پر سفارتی یا معاشی دباؤ بڑھتا یا اس جنگ کو روکنے میں مدد ملتی۔ آخر خطے میں فلسطین کے مسئلے نے اپنی اہمیت کیوں کھو دی؟ مشرق وسطیٰ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب پیچیدہ ضرور ہے لیکن وقت کا مؤرخ ان حقائق کو آئندہ نسلوں تک ان تمام عرب ریاستوں کے کردار کو ضرور محفوظ کر رہا ہے اور یہ عرب حکمران اپنے ورثے میں ان کیلئے کیسے ندامت کے کوہِ گراں اور صدمات کے بحر وبر چھوڑ کر جائیں گے، اس پر بھی غور وفکر کیلئے ان کے پاس وقت نہیں۔ اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے صرف وقت کے فراعین کے ہاتھ میں پکڑی ڈگڈگی کے سامنے ناچتے ہوئے ان کا سانس تک پھول گیا ہے لیکن وہ اپنی عافیت اسی عمل میں سمجھتے ہیں کہ صیاد کو ہر حال میں راضی رکھنا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ عرب ممالک کی ایک شناخت، ایک زبان، اور بڑی حد تک ایک مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے شناخت کو جوڑا لیکن خطے میں یورپی نوآبادیاتی اثرات سے پیدا ہونے والے خدشات بھی موجود رہے ہیں لیکن ان ممالک کی حکومتوں کے مفادات بھی ایک دوسرے سے متضاد رہے ہیں۔ فلسطینیوں اور عرب ممالک کے درمیان تعلقات بھی آسان نہیں رہے، خاص طور پر ان کے ساتھ جنہوں نے 1948 میں اسرائیل کی ریاست کے اعلان کے بعد بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کو خوش آمدید کہا۔

لبنان کی خانہ جنگی اور فلسطینی عسکریت پسندوں اور اردنی بادشاہت کے درمیان جھڑپیں بعض اوقات خطے کی متضاد تاریخ کی یاد دلاتی ہیں لیکن مسئلہ فلسطین کئی دہائیوں سے عرب ممالک کیلئے متحد ہونے کا عنصر بھی تھا۔ اس عرصے کے دوران اسرائیلی ریاست کو سابقہ نوآبادیاتی طاقتوں کی توسیع کے طور پر دیکھا گیا جو مشرق وسطیٰ سے دستبردار ہو گئی تھیں لیکن اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے اسرائیل کو ایک ایجنٹ کے طور پر چھوڑ دیا گیا تھا جن میں برطانیہ، فرانس اور اب امریکا شامل ہے۔

ماضی میں اسرائیل کے خلاف مصر، شام اور اردن جیسے ممالک نے جو جنگیں لڑی ہیں ان میں قومی مفادات کے ساتھ ساتھ فلسطینیوں کا بھی دفاع کیا گیا۔ تاہم وہ جنگیں اب ماضی کی بات ہیں۔ مصر اور اردن نے دہائیوں قبل اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ مراکش، متحدہ عرب امارات اور بحرین نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے جبکہ چند سال پہلے تک خطے میں اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ سعودی عرب بھی 7 اکتوبر میں غزہ اور اسرائیل کی جنگ کے آغاز سے قبل اسرائیل کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن غزہ میں جنگ چھڑ جانے کی بناء پر یہ سفارتی طوفان فی الحال عارضی طور پر رک گیا ہے۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں نازرین سینٹر فار اسرائیل سٹڈیز کے ڈائریکٹر ڈوو یکس مین کے مطابق "کئی دہائیوں سے اور حالیہ تنازعہ کے آغاز سے لیکر آج تک ہر عرب ملک نے اپنے اپنے مفادات کی پیروی کی۔ وہ فلسطینیوں کی حمایت اور یکجہتی کی بات کرتے ہیں، اور ایسا نہیں کہ یہ جذبات حقیقی نہیں ہیں لیکن وہ اپنے قومی مفادات کو دیکھتے ہیں"۔ جبکہ اس خطے سے جڑے ہوئے کئی محقق اور تجزیہ نگار اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ عرب اور مسلم دنیا میں اب بھی عوامی رائے اسرائیل کے سخت خلاف ہے۔

عرب ممالک کے عوام کے دل میں غزہ کے تباہ حال شہریوں کیلئے بہت ہمدردی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومتیں فلسطینیوں کیلئے کچھ زیادہ کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ممالک اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیں، اور کم از کم ردعمل دیتے ہوئے سفارت کاروں کو ان کے ممالک سے نکال دیا جائے لیکن یہ اب تک نہیں ہوا۔

اس کی یقینی وجہ یہ ہے کہ عرب حکومتوں نے فلسطینیوں کو کافی عرصہ پہلے چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ایسا ہیجان انگیز موڑ تھا جس نے خطے کی پوری صورتحال کو بدل کر رکھ دیا۔ آج یہ سب کچھ اچانک نہیں ہو گیا بلکہ آج کے خونی مناظر کی بنیاد وہ عوامی بغاوت ہے جس نے 2010 اور 2012 کے درمیان مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اسے "عرب سپرنگ" کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی اور ان بغاوتوں کی ناکامی نے خطے کو عدم استحکام کا شکار کر دیا۔ بہت سے ممالک اب بھی خانہ جنگی میں پھنسے ہوئے ہیں، جیسے یمن، شام یا عراق۔ شام اور عراق جو دو سیاسی نظریات کے حامل مرکزی اور طاقتور ملک تھے اور امریکا کو چیلنج کر سکتے تھے، آج منظر نامے سے غائب ہو چکے ہیں۔ لیبیا نہ صرف غائب برباد کر دیا گیا بلکہ معمر قذافی کو دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے جان بوجھ کر اس طرح پیش کیا گیا کہ دیگر مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی پیغام پہنچا دیا گیا کہ اب تمہارے سامنے ہماری اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ مصر اقتصادی عدم استحکام میں جبکہ سوڈان خانہ جنگی میں پھنسا ہوا ہے۔ دنیا کی پہلی ایٹمی ریاست پاکستان کو بھی مسلسل عدم استحکام کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور اندرونی دہشتگردی اور معاشی عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہے تا کہ اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اس

معاملے میں سیاسی ابتری کیلئے سیاستدانوں اوراہم اداروں کے درمیان خطرناک حدتک فاصلے بڑھادیئے گئے ہیں اوراب یہ صحیح اوراصل دشمن کو جاننے کے باوجوداسی صیاد کے پھندے میں اپنی بقاءڈھونڈرہے ہیں۔

اس مستقل بحران کی حالت میں عرب معاشرے فلسطینیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوئے ایسی بے بس محسوس کررہے ہیں کہ ان کے پاس خودظالم آمریتوں میں زندگی گزارنے کے سواکوئی دوسراراستہ باقی نہیں بچا۔عرب دنیاافسوسناک حالت میں ہے،لوگوں کے پاس عزت کے ساتھ جینے کی آزادی یاصلاحیت یاآرزونہیں لیکن اس کے باوجود،فلسطینوں کے حق میں سماجی ردعمل حکومت کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتوررہاحالانکہ یہ بنیادی طورپر سوشل میڈیاپررہاہے۔

عرب سپرنگ کے بعدسے خطہ کے بہت سے ممالک کی سڑکیں ایسی سرگرمیوں کیلئے محدودہوگئی ہیں جہاں آمرانہ حکومتوں نے کبھی فلسطینیوں کے دفاع میں مظاہروں میں لوگوں کومایوسی کااظہارکرنے کی اجازت دی تھی،وہیں آج انہیں خدشہ ہے کہ اس طرح کے مظاہروں سے کچھ اورہوجائے گابلکہ انہیں یہ خوف لاحق ہے کہ ان کاحال بھی لیبیا، شام یاعراق جیسانہ ہوجائے جہاں شبینہ نان ونفق کیلئے وہاں کے عوام ترس گئے ہیں لیکن ان ہنگامہ خیزبرسوں میں صرف یہی چیزنہیں بدلی،جب لاکھوں لوگ عرب تیونس،مصر،لیبیا،شام،بحرین اورمراکش جیسے ممالک میں جمہوریت اورسماجی حقوق کامطالبہ کرنے سڑکوں پرنکل آئے تھے۔

عرب سپرنگ واقعی ایک زلزلہ تھااوراس نے بہت سے ممالک کے حالات اورترجیحات کوبدل کررکھ دیا۔کچھ پرانی حکومتیں ختم ہوگئیں اوردوسروں نے سوچاکہ ان کے ساتھ بھی ایساہونے جارہاہے،اس لیے وہ گھبراگئے،دائیں بائیں دیکھااورتحفظ تلاش کیا۔ایک طے شدہ پالیسی کے تحت عالمی استعماری طاقتوں نے ان تمام عرب ریاستوں میں زمین کوہموارکرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بزدلی کے کھلیانوں میں خوف کابیج بوکرایسی فصل کاشت کی کہ جس کے بعدان حکمرانوں کواس یقین کی فصل کاٹنے پرمجبورکردیاگیاکہ دراصل اسرائیل،خطے میں ان کاایسااتحادی ہے جوایران کے ایٹمی خطرے سے ان کی حفاظت کرسکتاہے۔گویاخطے میں ایک تیرسے کئی شکارکرنے میں کامیاب ہوگئے۔

عرب سپرنگ کے چندسال بعدہی جب ٹرمپ امریکی صدرتھے،امریکاکی ثالثی کے تحت بحرین اورمتحدہ عرب امارات نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کامعاہدہ کیا۔اس معاہدے میں بعدازاں مراکش اورسوڈان بھی شامل ہوئے تھے۔اس کے جواب میں امریکاکی جانب سے جواب دینے میں زیادہ دیرنہیں لگی اورواشنگٹن نے مغربی صحاراپرمراکش کی خودمختاری کوتسلیم کیا،جوکہ خودارادیت پرریفرنڈم کوناممکن بنادیتاہے۔جب ہم ان ممالک کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کودیکھتے ہیں توہمیں پتاچلتاہے کہ اس کے تحت اسرائیل نے انہیں ایسے نگرانی کے نظام بیچے ہیں جویہ اپنے عوام کی خفیہ نگرانی کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

اسرائیلی کمپنی این ایس اوگروپ کے تیارکردہ پیگاسس پروگرام کااستعمال کرتے ہوئے جاسوسی کے مبینہ واقعات نے مراکش،متحدہ عرب امارات

اور بحرین حتیٰ کہ سعودی عرب کو بھی متاثر کیا حالانکہ اس کے اسرائیل کے ساتھ سرکاری تعلقات نہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق ریاض نے یہ پروگرام 2017 میں خریدا تھا اور اگلے سال استنبول میں سعودی قونصل خانے میں سعودی مخالف صحافی جمال خاشقجی کے قتل کے بعد اس تک رسائی کھودی تھی۔ تاہم ولی عہد محمد بن سلمان نے نیتن یاہو کو فون کیا جس کے بعد وہ اس سافٹ ویئر تک دوبارہ رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قومی مفادات کے علاوہ ایک اور چیز جس نے عرب ممالک کو مسئلہ فلسطین سے دور رہنے پر مجبور کیا، وہ تھا اپنے اپنے ممالک میں اسلام پسند ملیشیاؤں کا عروج۔ 1967 کی جنگ کے بعد اور یاسر عرفات کی قیادت میں فلسطینی مزاحمت کی پہلی لہر کو قوم پرست تصور کیا جا سکتا ہے مگر آج کی مزاحمت زیادہ تر مذہبی بنیادوں پر ہیں۔ جو لوگ آج مسئلہ فلسطین کیلئے لڑ رہے ہیں وہ بنیادی طور پر اسلام پسند ہیں، چاہے حماس ہو یا حزب اللہ، جن کے تصورات اسلام سے آتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے شہادت جس سے امریکا، اس کے اتحادیوں سمیت اسرائیل برسوں سے کوشاں ہیں کہ اس جذبہ شہادت کو مسلمانوں کے دلوں سے ختم کیا جائے۔ اسی لئے تقسیم ہند سے قبل ہی برطانیہ کی مدد سے خود کاشتہ پودہ قادیان میں لگا کر اس کا زہر مسلمان امت کے ایمان وایقان میں شامل کرنے کی اب تک کوششیں جاری ہیں اور پاکستان میں اس فرقہ کو منتخب اسمبلی میں آئینی اور مذہبی بحث کے بعد مشترکہ طور پر اقلیت قرار دے دیا گیا اور اب اس پودے کی برطانیہ میں مسلسل آبیاری کی جا رہی ہے۔

حماس کے اسلامی تنظیم اخوان المسلمون کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ان ریاستوں کے حکمرانوں کو باور کرا دیا گیا ہے (اس وقت خطے کی کئی حکومتوں کے ساتھ تصادم میں حماس شامل ہے) یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت سی حکومتیں حماس کو ایک خطرے کے طور پر دیکھتی ہیں۔ وہ حماس کو اخوان المسلمون کے آخری گڑھ کے طور پر دیکھتے ہیں جو اب بھی قائم ہے اور یہ عسکری طور پر مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمون کی منتخب حکومت کے صدر مرسی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے ایجنٹ السیسی کو نہ صرف لایا گیا بلکہ سعودی عرب اور دیگر خطے کی عرب ریاستوں کو بھی اس تبدیلی کی مالی مدد اور بر ملا حمایت کے فرمان کے احکام صادر کر دیئے گئے اور آج تک اخوان المسلمون پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، عالمی میڈیا بھی اس کی اشاعت سے اپنے آقاؤں کے بائیکاٹ کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہے۔

اسرائیل ایک طرح سے حماس کو تباہ کرکے اپنا گھناؤنا کام کر رہا ہے۔ حماس اور حزب اللہ کے ایران کے ساتھ روابط بھی عرب ممالک میں شکوک و شبہات کو جنم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر خلیجی ریاستوں کیلئے ایران اسرائیل سے بڑا خطرہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بہت سی عرب حکومتوں نے "اسرائیلی اور امریکی بیانیہ کو اپنایا کہ یہ تحریکیں خطے میں ایران کے ہتھیار ہیں اور یہ فلسطینیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے علاقائی امن کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کیلئے بنائی گئی ہیں"۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ یہ وہ بیانیہ ہے جسے عرب دنیا میں زیادہ تر سرکاری پریس نے بڑھاوا دیا، ایک ایسا خطہ جہاں شاید ہی کوئی آزاد میڈیا ہو۔ پروفیسر ولید قاضیہ کے مطابق "سعودی میڈیا کیلئے مثال کے طور پر، بنیادی تشویش فلسطینیوں کی نہیں بلکہ یہ ہے کہ ایران کس طرح خطے پر کنٹرول حاصل کر رہا ہے"۔ اگرچہ اب حماس کو ایران سے حمایت اور مالی معاونت حاصل ہے لیکن جب اس فلسطینی گروہ کا قیام ہوا تھا تب اس کے متعدد عرب ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات تھے لیکن بعد ازاں اب ان ممالک کو اس تحریک کی بڑھتی طاقت سے خدشات پیدا ہو گئے تھے۔

دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ اسرائیل کے بڑھتے ہوئے ظلم و تشدد کے بعد جب ان کیلئے عرب ممالک نے اپنے دروازے بند کر دیے تھے اور کوئی بھی

انہیں اسرائیل سے لڑنے کیلئے ہتھیار نہیں دینا چاہتا تھا تو وہ انہیں حاصل کرنے کیلئے کچھ بھی کر گزرنے کیلئے ان کی مجبوری بنادیا گیا تو ان کے پاس اپنے جان ومال کو بچانے کیلئے اس کے سوا اور کیا چارہ کار بچا تھا۔ یہی بات حزب اللہ اور دیگر گروپوں کیلئے بھی ہے جو ایران سے حمایت حاصل کرتے ہیں لیکن فلسطینیوں کا دفاع بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جب ایران کو ان کے حمایتی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو عرب عوام اب تصویر میں نہیں آتے اور میرے خیال میں کچھ عرب تحریکیں ہیں جو حقیقی طور پر فلسطینیوں کی حمایت کرنے اور ان کیلئے جان دینے کو تیار ہیں جیسے کہ حزب اللہ، حوثی یمن اور عراق میں کچھ شیعہ تحریکیں۔

جیوسٹریٹیجک مفادات اور عرب ممالک کے بحران کے علاوہ مسئلہ فلسطین کو بھی وقت گزرنے کے ساتھ فراموش کر دیا گیا۔ وہ تصورات جو کبھی مشرق وسطیٰ کے دلوں کو گرماتے تھے، جیسے عرب قوم پرستی اب محض ماضی کی بازگشت ہیں۔ خطے کی زیادہ تر نوجوان نسل فلسطینیوں سے ہمدردی رکھتی ہے لیکن وہ تنازعات کی وجوہات اور اصل کو نہیں جانتی کیونکہ یہ چیزیں اب سکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ آج معاشرہ حتیٰ کہ شناخت بھی گلوبلائزیشن کے ساتھ بدل چکی ہے۔

ایسا ہی کچھ نئے رہنماؤں کے ساتھ ہوا۔ خلیجی ممالک میں مثال کے طور پر، سعودی عرب میں محمد بن سلمان جیسے لیڈروں کی پوری نئی نسل موجود ہے، جو زیادہ تر مغرب میں تعلیم یافتہ ہیں، جو عرب نہیں اور فلسطین کو ایک مسئلہ کے طور پر نہیں دیکھتے۔ اب وہ برملا کہتے ہیں کہ "اب ان کی ترجیحات کے ساتھ ساتھ ان کے عزائم بھی مختلف ہیں"۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

بروز بدھ 25 جمادی الاول 1446ھ 27 نومبر 2024ء

جوہری خطے میں ڈرونز: جنگی ٹیکنالوجی کی نئی حقیقت

ٹرمپ کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کے بعد ان کی کابینہ کی اہم نامزدگیوں کے پیشِ نظر یہ بات آسانی سے سمجھ آرہی ہے کہ وہ اس مرتبہ پھر چین پر تجارتی پابندیوں کے علاوہ اس کی بڑھتی ہوئی معاشی ترقی پر قدغن لگانے کیلئے جاری امریکی پالیسیوں کو بڑھاوا دیں گے اور خطے میں چین کے محاصرے کیلئے "کواڈ" جیسے اتحاد پر تیزی سے کام شروع کریں گے۔ خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اقدامات کو روکنے کیلئے مودی اپنی جغرافیائی حیثیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کرائے کے سپاہی کے طور پر کردار ادا کرنے کیلئے تیار بیٹھا ہے اوران دنوں اپنے جنگی جنون میں مبتلا دنیا بھر سے اسلحے کے ڈھیر لگا کر پڑوسیوں کو مرعوب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا ان دنوں عسکری ڈرونز کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہے اور یقیناً ان حالات میں پاکستان ایک خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب دونوں ممالک کی جانب سے نہ صرف کئی غیر ملکی ڈرونز خریدے گئے ہیں بلکہ خود بھی اس ٹیکنالوجی کو تیار کیا جا رہا ہے جو بِنا پائلٹ کے دشمن پر نگرانی، جاسوسی یا اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ایشیا کی تین پڑوسی اور جوہری طاقتوں پاکستان، انڈیا اور چین کی طرف سے اپنی جنگی صلاحیت بڑھانے کیلئے بِنا پائلٹ ڈرونز کے استعمال میں تیزی یقیناً ان دیکھی قیامت کی آمد کی نشاندہی کرتی ہے۔ کیونکہ افواج میں وسیع پیمانے پر ڈرونز کی شمولیت نے جنوبی ایشیا میں جنگ کا طریقۂ کار بدل دیا ہے اور آئندہ کسی بھی تنازع یا جھڑپ کی صورت میں ڈرون کا استعمال کہیں زیادہ ہوگا۔ ان تینوں ملکوں میں بڑے پیمانے پر ڈرون کی موجودگی اور ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی اور نگرانی میں ان کا بڑھتا ہوا استعمال مستقبل قریب میں ٹکراؤ اور کشیدگی کا سبب بن سکتا ہے۔

آخر یہ خطرناک حد تک جنگی صلاحیتیں کیا ہیں، ان کے مضمرات دنیا کے امن کو کس طرح نگل کر اندھیروں میں تبدیل کر سکتے ہیں، آیئے اس تحریر میں ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ روایتی حریف سمجھے جانے والے پڑوسی ممالک انڈیا اور پاکستان کے پاس کیا ڈرون صلاحیتیں ہیں اور حالیہ عرصے میں دونوں نے کِن ان مینڈ ایریئل وہیکلز (یو اے ویز) کا اضافہ کیا ہے۔

دراصل عسکری مقاصد کیلئے استعمال ہونے والے ڈرونز انتہائی اونچائی پر دیر تک پرواز کرنے اور ریڈار میں آئے بغیر زمین پر فوج کی سرگرمیوں، ان کی تعیناتیوں، اہم تنصیبات، نئی تعمیرات اور فوجی ٹھکانوں وغیرہ کی مؤثر نگرانی اور مخصوص ہدف کو تباہ کرنے میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔

دفاعی ماہرین کے مطابق ایک فوجی ڈرون تین بنیادی کام کر سکتا ہے:

☆ نگرانی کرنا اور حریف کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا

☆ جاسوسی کرنا، یعنی یہ دیکھنا کہ دوسری طرف اسلحہ یا فوجی کہاں تعینات ہیں

☆ ہدف کی نشاندہی اور اسے تباہ کرنا

کئی ڈرونز یہ تینوں کام کرتے ہیں مگر بعض کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ اگر ہم ڈرونز کے لحاظ سے انڈیا اور پاکستان کی عسکری صلاحیتوں کا موازنہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حریف ممالک نے ماضی قریب کے دوران اس میں اضافہ کیا ہے۔ انڈیا اور پاکستان دونوں ہی ڈرونز کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق آئندہ دو، چار برس میں انڈیا کے پاس تقریباً 5 ہزار ڈرونز ہوں گے جبکہ پاکستان کے پاس تعداد میں تو انڈیا سے کم ہیں لیکن پاکستان کے پاس موجود ڈرونز انڈیا سے کہیں بہتر اور مختلف صلاحیتیں رکھنے والے ہیں اور یہ 10 سے 11 مختلف ساخت کے ہیں۔

اگر ہم انڈیا کی مثال لیں تو مودی نے رواں سال اکتوبر میں امریکی دورے کے دوران امریکا سے ساڑھے تین ارب ڈالر مالیت کے 31 "پریڈیٹر "ڈرون خریدنے کا معاہدہ کیا ہے جو کہ بلندی پر کام کرتے ہیں جسے "ہائی الٹیٹیوڈ لانگ انڈیورینس "ڈرون کہتے ہیں انڈین دفاعی امور کے ماہر کے مطابق انڈیا کے پاس اس طرح کے ڈرونز کا کوئی مقامی طور پر تیار کردہ متبادل نہیں ہے اور نہ ہی اسے بنانے کیلئے کسی دوسرے ملک کے ساتھ کوئی شراکت داری ہے۔ جہاں تک اس کی نگرانی کی صلاحیتوں کا تعلق ہے، یہ ڈرون اب تک کا سب سے بہتر ڈرون ہے۔ نگرانی کے علاوہ اس میں ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت ہے۔ انڈیا نے ان کے ساتھ 500 ملین ڈالر کے ان ڈرونز کے ذریعے ہدف کو تباہ کرنے میں استعمال ہونے والے بم اور لیزر گائیڈڈ میزائل بھی خریدے جائیں گے۔ امریکا کے یہ پریڈیٹر ڈرونز انتہائی مہنگے ہیں۔ انڈین کرنسی میں ایک ڈرون کی قیمت تقریباً 950 کروڑ روپے ہے۔ 31 میں سے 15 ڈرون انڈین بحریہ میں شامل کیے جائیں گے اور باقی 16 بری فوج اور فضائیہ میں برابر تقسیم ہوں گے۔ جموں ایئر بیس پر 2021 کے ڈرون حملے کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں، جموں کے بعد ہم نے بہت سے ڈرون شکن ڈرونز تیار کیے ہیں جو مجھے یقین ہے کہ انڈین فضائیہ نے تعینات کر دیے ہیں۔

پریڈیٹر ڈرونز دنیا کے سب سے کامیاب اور خطرناک ڈرون تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا استعمال افغانستان، عراق، شام، صومالیہ اور کئی دیگر ملکوں کے ٹھکانوں اور اہداف کو تباہ کرنے میں کیا گیا تھا۔ انڈیا اس سے پہلے اسرائیل کے "ہیرون "خرید چکا ہے اور اسرائیل ایرو سپیس ایجنسی سے لائسنس کے تحت وہ اب یہ ڈرون خود انڈیا میں بنا رہا ہے۔

مئی 2020 میں لداخ میں چین کے ساتھ سرحدی ٹکراؤ کے بعد ڈرون اور یو اے ویز کی اہمیت انڈیا میں بہت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت انڈیا میں بحریہ پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے کیونکہ بحر ہند میں چینی بحریہ اور انڈین بحریہ کے جہاز سرگرم ہیں اور انڈیا کی توجہ اس خطے پر کافی زیادہ ہے۔ امریکا بھی انڈیا سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس خطے میں چینی بحریہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں انڈیا اور پاکستان کی افواج میں ڈرون کی شمولیت اور اس کے اثرات کیا ہوں گے!

آیئے! ان حالات میں انڈیا اور پاکستان کی افواج میں ڈرون کی شمولیت اور اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں!
انڈیا کے ڈرون پروگرام کا ایک اہم پہلو سوارم ڈرونز کی شمولیت ہے۔ یہ ان آرمڈ ایریئل وہیکل ہے اور یہ بڑی تعداد میں اکھٹے اُڑتے ہیں۔ یہ پیچیدہ مشن پر کام کرنے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ انہیں انڈیا کی دفاعی حکمت عملی، خاص کر پاکستان کی طرف سے کسی خطرے کو ناکام بنانے کا اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسے انڈیا کی فرم نیو سپیس ریسرچ اینڈ ٹیکنالوجیز نے تیار کیا ہے۔ یہ ڈرون دشمن کے دفاعی نظام کو ناکارہ بنا کر جوہری بم لانچ کرنے والے پلیٹ فارموں کو تباہ کرنے سمیت بہت سارے ڈرون سے ایک ساتھ حملہ کر کے کئی اہداف کو برباد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈرون یا بغیر پائلٹ کے چھوٹے جہاز جنہیں "یو اے وی" کہا جاتا ہے، نسبتاً سستے ہوتے ہیں، ان کا استعمال کرنا آسان ہوتا ہے اور ان میں ایسی صلاحیتیں ہیں جو روایتی جنگی حکمت عملی کو پوری طرح الٹا دیتی ہیں۔ اگرچہ حمیم ایئر بیس پر حملے کیلئے استعمال کیے گئے ڈرون ڈیزائن کے اعتبار سے بنیادی قسم کے تھے لیکن وہ جنگ کے ایک ایسے مستقبل کی علامت تھے جس میں ایک سے زیادہ ڈرون ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہم آہنگی میں ہدف پر حملہ کرتے ہیں اور لحہ بہ لحہ انسانی مداخلت کے بغیر خود مختار انداز اور غیر معمولی تیزی رفتاری سے کام کرتے ہیں۔

دفاعی زبان میں اس طرح کے ڈرونز یا "یو اے وی" کو "سوارم ڈرون" کہا جاتا ہے جس میں ڈرونز کا ایک گروہ، جس میں 10 یا 100 یا 1000 سے زیادہ ڈورنز ایک ساتھ پرواز کرتے ہوئے ہدف کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس میں ہر ڈرون آزادانہ طور پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ گروہ کے باقی ڈرونز کے ساتھ اس طرح سے ہم آہنگ ہوتا ہے کہ ہر لمحے انسانی آپریٹر کی مداخلت کے بغیر یہ اپنا کام مؤثر طریقے سے انجام دیتا ہے ۔ انڈین فضائیہ کیلئے سوارم ڈرون تیار کرنے والی کمپنی کے بانی کے مطابق "سوارم ڈرون ہی جنگ کا مستقبل ہیں اور انڈیا بھی اس میں حصے داری لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ انڈیا کی ڈرونز کی صلاحیت، چاہے وہ مقامی سطح پر تیار ہو یا درآمد کیا گیا ہو، بنیادی طور پر کم اور درمیانی اونچائی تک جانے والے ڈرونز تک محدود ہے۔ بلندی پر پرواز کرنے کی صلاحیت والے جدید ڈرونز کیلئے انڈیا کو دوسرے ممالک پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ فوج نے ان کی کمپنی کے ساتھ بلندی پر پرواز کرنے والے اور عمودی پرواز کرنے والے ڈرونز فراہمکرنے کے کئی معاہدے کیے ہیں جو سرحدی علاقوں کی نگرانی میں فوج کیلئے ایک مفید ہتھیار ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ ڈرونز ممکنہ طور پر انتہائی بلندی پر منفی درجہ حرارت میں بھی پرواز کر سکتے ہیں اور آسمان پر طویل عرصے تک بغیر 'ٹریس' ہوئے اپنا کام انجام دے سکتے ہیں۔ کمپنی کے ڈرونز کو شہری مقاصد کے ساتھ ساتھ کشمیر میں مجاہدین آزادی کا پتہ لگانے کیلئے استعمال کیا جا چکا ہے۔

جبکہ دوسری طرف پاکستان ترکی اور چین سے ڈرونز درآمد کرتا ہے جبکہ اس نے جرمنی اور اٹلی سے بھی ڈرون خریدے ہیں۔ پاکستان کے پاس ترک ساختہ جدید "بیراکتر" ڈرونز ٹی بی ٹو اور اکینجی ہیں جبکہ اس نے چین سے "ونگ لونگ ٹو" اور "سی ایچ 4" جیسے ڈرون بھی حاصل کیے ہیں۔ تاہم پاکستانی ماہرین نے براق اور شہپر جیسے بعض ڈرونز خود بھی بنائے ہیں۔ 2022 کے دوران پاکستان نے فلیگ شپ ڈرون "شہپر ٹو" کی نمائش کی تھی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ ایک ہزار کلومیٹر تک پرواز کر کے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ یہ اپنے ہدف کو لیزر بیم سے لاک کر کے اس کو میزائل کی مدد سے تباہ کر سکتا ہے ۔ پاکستان آرڈیننس فیکٹری کی جانب سے پہلے "ابابیل" کے نام سے سرویلنس ڈرونز بنائے گئے تھے جنہیں جنگی مقاصد کیلئے مسلح کیا گیا تھا۔

جدید لڑاکا ڈرون شاہپر تھری اہم حربی خصوصیات اور ہتھیاروں سے لیس ہے، درمیانی پرواز کے ساتھ جدید ہتھیاروں اور نظام سے لیس یہ ڈرون 30 گھنٹے تک طویل فاصلہ طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاہپر ڈرون 1650 کلو گرام وزنی ہتھیار لے جا سکتا ہے جب کہ اس میں مقامی طور پر تیار کردہ خصوصی ایویونکس اور جدید فلائٹ کنٹرول سسٹم نصب ہے۔ واضح رہے کہ ملک کا دفاعی مصنوعات کا ادارہ گلوبل انڈسٹریل اینڈ ڈیفنس سلوشن اس سے قبل شاہپر ون اور ٹو بھی متعارف کرا چکا ہے۔

یاد رہے کہ پاکستان کی فضائیہ ڈرون اور روایتی ذرائع کے اشتراک سے انڈیا کے ایس 400 اور پرتھوی کے جدید فضائی دفاعی نظام کو مؤثر طریقے سے ٹارگٹ کر کے انڈیا کے فضائی دفاعی نظام کو مفلوج کر سکتی ہے۔ عالمی دفاعی تجزیوں کے مطابق پاکستان دنیا میں چوتھا ڈرون پاور مانا جاتا ہے۔ ان کے پاس بہت جدید قسم کے ڈرون ہیں اور ان کے ڈرون فضائیہ، فوج اور کچھ حد تک بحریہ میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ پاکستان کی ڈرون صلاحیت بڑھ رہی ہے

اور اس کا فوکس اس صلاحیت میں مسلسل اضافہ کرنے پر ہے اور خود انڈین دفاعی تجزیہ نگار پاکستان کی اس برتری کا اعتراف کر چکے ہیں اور پاکستانی ماہرین مسلسل اپنی ان صلاحیتوں میں اضافہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ان ڈرونز کی رواز کرنے کی صلاحیت تقریباً 50 گھنٹے تک کی ہے۔ جنگی جہاز انہیں تباہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ان

کی پرواز کی اونچائی کی حد سے بہت اوپر اڑتے ہیں۔ ان جدید ڈرونز کے باعث پاکستان کو کافی حد تک "سٹریٹیجک اور ٹیکٹیکل سبقت ملتی ہے"۔ اس رپورٹ کے مطابق "جنوبی ایشیا میں جدید ڈرون کی بڑی تعداد میں شمولیت "خطے کے عسکری استحکام کیلئے خطرہ پیدہ کر رہی ہے۔ جیسے جیسے ڈرون فوجی حکمت عملی کا کلیدی حصہ بنتا جا رہا ہے ویسے ویسے عسکری ٹکراؤ سے بچانے اور جنگی توازن کے روایتی نظام کے بکھرنے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جوہری جنوبی ایشیا میں جوہری ٹھکانوں اور اثاثوں سمیت عسکری اہداف پر ٹارگٹڈ حملے کرنے کی ڈرون کی مؤثر صلاحیت نے کسی جنگ کی صورت میں تباہی کے امکانات کو وسیع کر دیا ہے"۔

عسکری امور کے جریدے "فورس" کے ایڈیٹر کے مطابق "ابھی جو ڈرونز ہیں وہ یا تو زمین سے گائیڈ کیے جاتے ہیں یا پھر وہ فضا یعنی سٹیلائٹ سے گائیڈ کیے جاتے ہیں۔ اگر دشمن کے پاس مواصلات کو جام کرنے کی صلاحیت ہو تو وہ ڈرونز کو غیر مؤثر کر سکتا ہے اور پاکستان کے پاس یہ صلاحیت موجود ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے انڈیا نے جب بالا کوٹ سٹرائیک کی تھی تو پاکستان کے پاس فضائی مواصلاتی نظام کو جام کرنے کی صلاحیت تھی۔ پاکستان نے انڈین پائلٹ کے مواصلاتی نظام کو جام کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان نے ان دونوں جنگی طیاروں کو مار گرایا اور ان کا پائلٹ بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پاکستان نے اس سے اگلے دن ہی اعلانیہ جوابی حملہ کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا جس کے بعد انڈیا اور اس کے اتحادی بالخصوص امریکا کو بھی اپنے لنگڑے گھوڑے کی حیثیت کا پتہ چل گیا۔

دوسری طرف "چین بھی ملٹری ٹیکنالوجی میں بہت آگے نکل چکا ہے۔ عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کے مطابق پاکستان اور چین ایک دوسرے کے ساتھ ڈرون بنانے کی ٹیکنالوجی پر مل کر کام کر رہے ہیں۔ پاکستان کے پاس آج بہت زیادہ صلاحیت ہے۔ ان کی فضائیہ بہت مضبوط ہو گئی ہے اور اس میں بہت بڑا کردار چین کا ہے۔ چین گزشتہ 15 برس سے ملٹری ٹیکنالوجی پر کام کر رہا ہے۔ 5 اگست 2019 کے بعد چین اور پاکستان کے درمیان فوجی اشتراک بہت مضبوط ہوا ہے جس کا منہ بولتا ثبوت پاکستان میں مکمل طور پر تیار ہونے والا جنگی طیارہ "جے ایف تھنڈر 17" دنیا میں اپنی کارکردگی کا لوہا منوا چکا ہے اور پاکستان نہ صرف اس ٹیکنالوجی میں خود کفیل ہو چکا ہے بلکہ کئی دیگر ممالک کو یہ طیارے فروخت کرنے کے معاہدے بھی کر چکا ہے"۔

جے ایف 17 تھنڈر بلاک تھری ایک ایکٹو الیکٹرونکلی سکینڈ ایرے (اے ای ایس اے) ریڈار اور لانگ رینج بی وی آر سے لیس 4.5 جنریشن کا ملٹی رول لڑاکا طیارہ ہے جو مختلف قسم کے جنگی مشنز میں حصے لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لاک تھری کے جے ایف 17 طیارے سب سے زیادہ ایڈوانس ماڈل کے ہیں اور اس کی مدد سے پاکستان ایئر فورس کو علاقے میں بدلتی ہوئی صورتحال میں مزاحمت کی قوت میں توازن برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ بلاک تھری جے ایف 17 کا اگلا ورژن ہے۔ جس میں نئے ریڈار لگائے جائیں گے، اس ورژن کا جہاز نئے اور جدید ہتھیاروں اور میزائلوں سے بھی لیس ہو گا۔ الیکٹرانک وارفیئر کی صلاحیت کو بھی بڑھایا جائے گا اور ہر زاویے سے اس میں بہتری لائی جائے گی"۔

تاہم اب جو وارفیر ہے اس میں فزیکل فیلڈ میں یعنی جہاں جہاں لڑائی میں انسان کام کرتے تھے، وہ اب انسان سے مشین کی طرف شفٹ ہو رہی ہے۔ فزیکل کا مطلب زمین، سمندر، آسمان، زیر سمندر اور خلا، ان سب میں ڈرون کا استعمال بڑے پیمانے پر ہونے جا رہا ہے۔ یہ مختلف ملکوں میں ان کی ٹیکنالوجی کی مناسبت سے الگ الگ سٹیجز میں ہو رہا ہے۔ ابھی ڈرون پوری طرح مواصلات کے ذریعے کنٹرول کیے جا رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈرون کی ریس

نہیں ہے بلکہ یہ وارفیئر میں ہونے والی تکنیکی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ دنیا اب ڈرون وارفیئر کے مرحلے میں ہے اور ڈرون وارفیئر موجودہ وقت اور مستقبل کا وارفیئر ہے۔

یوکرین اور غزہ کی جنگوں میں ڈرونز کا بہت استعمال ہو رہا ہے۔ ڈرونز ان جگہوں پر زیادہ کارگر ثابت ہوتے ہیں جہاں جس فریق پر حملہ ہو رہا ہو ان کے پاس فضائی دفاعی نظام بہت کمزور ہو۔ ڈرونز کا جو استعمال آپ غزہ اور کئی دوسری جگہوں پر دیکھ رہے ہیں، وہاں جن پر حملہ ہو رہا ہے، ان کے پاس ایئر ڈیفنس سسٹم، یا آرمڈ ایئر فورس جو کہ ڈرون سے زیادہ باصلاحیت ہو، موجود نہیں لیکن اگر آپ انڈیا اور چین کی مثال لیں تو چین کے موجودہ جدید ڈرونز انڈیا کے انہیں علاقوں میں کارگر ثابت ہوں گے جہاں کوئی ایئر فورس نہ ہو، یا جنگی جہاز نہ ہوں۔ باقی جگہوں پر وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔ پاکستان، چین یا انڈیا میں فضائی دفاعی نظام مثلاً ریڈار، کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم (جو کہ ایئر سپیس کو کنٹرول کرتے ہیں) اور فضائیہ بہت مضبوط ہے۔ یہاں تک کہ ڈرونز بھی دشمن کے ڈرون کو روک سکتے ہیں۔ یہاں ان کا رول بنیادی طور پر فضا میں بہت اونچائی پر پرواز بھر کے دشمن کے مخصوص علاقوں پر نظر رکھنے اور مخصوص ٹارگٹ کی جاسوسی کرنے اور اہم تصاویر حاصل کرنے تک محدود رہے گا۔

گذشتہ آٹھ دس برس میں جنگوں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے اور ڈرون اب ان کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ڈرون اب روایتی جنگ کے بڑے پلیٹ فارم جیسے ٹینک، آرٹیلری وغیرہ کو کافی حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس پر دونوں ممالک کافی حد تک توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ انڈیا اور پاکستان کے درمیان اس جنگی ڈرون کی دوڑ بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے جو مودی کا وہ جنگی جنون اور برہمنی چانکیہ سوچ ہے جو وہ اس خطے میں پڑوسیوں پر دھاک بٹھانے کیلئے جاری رکھے ہوئے ہے۔

ریموٹ کنٹرول وارفیئر بڑھے گا کیونکہ آنے والے دنوں میں ٹیکنالوجی کے ساتھ مشین انسان کی جگہ لے لے گی۔ تاہم اس میں کوئی دورائے نہیں کہ پاکستان اور انڈیا کیلئے عسکری ڈرونز کا بڑھتا استعمال "خوفناک خطرہ پیدا کر سکتا ہے" کیونکہ اس میں "غلطی کا امکان ہے"۔ دونوں جوہری ممالک ہیں اور اگر "غلطی سے بھی کوئی ڈرون کسی جوہری تنصیب کے اوپر آ گیا تو یہ خوفناک غلطی گمبھیر مسئلہ پیدا کر دے گی جس کے نتائج ماسوائے مکمل انسانیت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

بروز جمعتہ المبارک 27 جمادی الاول 1446ھ 29 نومبر 2024ء

انا کی موت، زندگی کی حقیقت

ان کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ کوئی وعظ و نصیحت نہیں کوئی فوں فاں نہیں کوئی بقراطی نہیں........ دبدبہ نہ طنطنہ سرٹیفکیٹ نہ کوئی ڈگری نہ ہی کبھی کہا: آؤ یہ دیکھو صفحہ نمبر فلاں پر یہ لکھا ہے، دیکھو غور سے کچھ بھی تو نہیں۔ ان کے پاس عاجزی تھی، انکساری تھی، نفی تھی۔ بہت چھوٹے چھوٹے جملوں میں محبت وایثار ووفا۔ کبھی خفا نہیں ہوئے، لاکھوں غلطیاں کیں گستاخیاں کیں بد تمیزی بند کتابیں تھیں، محبت بھری شفیق باتیں۔ اپنا پن لیے ہوئے سراپا کس مٹی کے بنے تو کسی گنتی میں نہیں آتی۔ سب کچھ کیا لیکن ان رب کی نشانیوں نے کبھی نہیں دھتکارا۔ جتنی زیادہ سرکشی کی، ان سے اتنا زیادہ پیار ملا۔ جو بچہ خود ہی ہوئے تھے اور ہیں۔ کہتے تھے: اچھا بچہ لاکھ کا اور بد سوالا کھ کا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھا تھا: یہ کیا کہتے ہیں آپ؟ مسکرائے اور کہا: اچھا ہو اس کی کیا فکر کرنی! جو بد ہے اسے دینا ہے ناپیار، اس کا رکھنا ہے خیال، کہیں دلدل میں نہ دھنس جائے، کسی گڑھے میں نہ گر جائے، اندھیرے میں گم نہ ہو جائے راہ کھوٹی نہ کر بیٹھے خود کو برباد نہ کر بیٹھے....... بہت خیال رکھنا ہے اس کا۔

عجیب سی باتیں کرنے والے لوگ جنہیں لوگ پاگل سمجھتے ہیں، چریا کہتے ہیں۔ بات کو پالینے والے پاگل، محبت میں بسے ہوئے چریا۔ جب موت آئے گی تو مر جاؤ گے، کوئی سفارش نہیں چلے گی، کوئی کام نہیں آئے گا، نہ کوئی رشوت نہ کوئی دھمکی۔ اگر مرنے کا مزا پانا ہے تو ابھی کیوں نہیں مر جاتے مر کر دیکھو کیسا سکون ہے کیسی راحت کیسی حلاوت۔ ہر کوئی جنت کا طلبگار لیکن اس نعمت کے حصول کیلئے مرنا ضروری ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھا کیسے؟ کہہ دیا یہ تو تم خود جانو، کہہ کر خاموش ہو گئے پھر ایک دن میں نے انہیں جالیا تو کہنے لگے خود کو مردہ سمجھنا شروع کر دو، پھر طریقہ بھی سمجھایا، بہت مزا آیا۔ ہاں اس میں ہے حلاوت شیرینی اور سکون۔

مردے کبھی کسی کو ایذا نہیں پہنچاتے، آزار نہیں دیتے، غیبت نہیں کرتے چغلی نہیں کھاتے، سازشیں نہیں کرتے۔ نظر تو زندہ آؤ اور سب کے کام آؤ، سمجھو خود کو مردہ۔ کوئی طلب نہیں، کسی صلہ وستائش کی پروا نہیں، کسی کی گالی طعنہ کچھ بھی نہیں۔ بس دیتے جاؤ، دیتے جاؤ۔ پاتے، جاؤ گے۔ رب کی مخلوق تو طرح طرح کی ہے ناں۔ رنگا رنگ ہے سب ایک جیسے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں مخلوق میں رہتے ہوئے ان کی خدمت کرتے ہوئے رب کو پانا ہے، کوئی کچھ کہے گا، کوئی کچھ سمجھے گا تو سمجھنے دو، پروا نہ کرو۔ کوئی الزام کوئی طعنہ تمہاری راہ کھوٹی نہ کرے اور کوئی تعریف تمہیں غبارے کی طرح پھلا نہ سکے تو بس رب کو دیکھو رب کے بندوں کو دیکھو۔ کوئی بھوکا ہے تو اسے نصیحت نہ کرو اسے کھانا کھلاؤ، پیاسے کو پانی پلاؤ، دور وٹھے ہوؤں میں پل بن جاؤ اور خود قلی بن کر دوسروں کا بوجھ اٹھاؤ، اپنے لیے نہیں بندوں کیلئے طلب کرو، اپنے لیے ہی نہیں۔

بندوں کیلئے تھکو اور دیکھو تھکتا وہ ہے جو کسی چیز کا طلب گار ہو۔ تجارت و کاروبارِ زندگی تھکا دیتے ہیں اور دیکھو محبت میں انسان کبھی نہیں تھکتا کبھی بھی نہیں۔ ہر دم ہر لحہ تیار رہتا ہے، محبت اسے تھکنے ہی نہیں دیتی۔ محبت کا تعلق کبھی پرانا نہیں ہوتا کبھی نہیں مرجھاتا۔ ہر دم تازہ دم رہتا ہے، محبت کا بوٹا سدا بہار ہے اسے خزاں نہیں گھیر سکتی۔ بے لوث بے غرض محبت نخلستان ہے ٹھنڈا میٹھا بہتا دھارا پر سکون ندی اور گہری جھیل۔ محبت بن جاؤ سراپا محبت و دعا۔ مخلوق کیلئے ہاتھ پھیلاؤ، ان کا سائبان بن جاؤ۔ کسی کو دو میٹھے بولوں کی ضرورت ہے تو ضرور بولو۔

کوئی اداس ہے تو اسے لطیفہ سناؤ، امید دلاؤ۔ ہنس کر بات کرواور اسے ہنساؤ۔ اپنا زخم چھپاؤ، دوسرے کے زخم پر مرہم رکھو۔ مردہ بن جاؤ جو کوئی شے طلب نہیں کرتا۔ کوئی آ گیا پھول رکھ کر چلا گیا، اگر بتی جلا کر خوشبو پھیلا گیا بن مانگے ہی۔ تو رب بنائے گا بگڑی، پار لگائے گا نیا۔ اس اندھیری رات میں سے روشن کرے گا سحر۔

وہ تو مردے میں سے زندہ وجود نکال لیتا ہے اور زندوں کو خاک میں ملا دیتا ہے، لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالو، تمہارا پردہ اللہ رکھے گا۔ محتاجوں کو بے آسرا مخلوق کو سینے سے لگاؤ ان کیلئے جیو اپنے لئے مرجاؤ۔ نعمتیں ملیں تو شکر، نہ ملیں تو صبر اور صبر سے بڑھ کر دولت کیا ہو گی! جب وہ کائنات کا خالق ومالک صبر کرنے والوں کے سنگ ہے تو پھر کیسی اداسی کیسی مایوسی! ہاں اپنی "انا" چاہے عام ہو یا خاص، اس کو ختم کرنا ہو گا۔

بیشتر وقت لوگ سوالات کرتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے، نشست ختم ہو رہی تھی کہ آخر میں انھوں نے لوگوں سے یہ سوال پوچھ لیا۔ اللہ کی راہ میں سب سے مشکل کام کیا ہے؟ جوابات آئے اور بیشتر لوگوں کی رائے تھی کہ اپنی جان دے دینا اس راہ کا سب سے مشکل اور بڑا کام ہے۔ وہ خاموش رہے اور اس رائے پر لوگوں کا اجماع ہوتے دیکھتے رہے۔ جب سب بول چکے تو انہوں نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دینا شروع کیا۔

بے شک جان دینا بہت بڑی بات ہے۔ اللہ کیلئے جان دینے کے تو کیا ہی کہنے اور اس کا کیا ہی بڑا اجر ہے مگر غور کیجیے کہ انسانی تاریخ میں جو ہزاروں جنگیں ہوئیں ہیں، ان میں کروڑوں لوگوں نے پورے شعور سے اپنے ملک، قوم، بادشاہ اور متعدد دیگر بڑے مقاصد کی خاطر جان دی ہے اور آج بھی دیتے ہیں۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی رائے لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ اب اس رائے کو جاننے کے منتظر تھے۔ وہ ہم سب کا انتظار ختم کرتے ہوئے بولے!

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک اندرونی شخصیت اور دوسرا ظاہری جسم۔ جان دینا ظاہری جسم کی قربانی ہے، بے شک یہ بڑی بات ہے، مگر جان دینے پر ابھارنے کیلئے ایک قادرالکلام مقرر کی زوردار تقریر، جذبات میں ہلچل پیدا کر دینے والی فیصلہ کن گھڑی اور محبت و نفرت کے جذبے کی شدت کا کوئی لمحہ کافی ہوتا ہے مگر اپنی اندرونی شخصیت کو قربان کرنا جسے عام الفاظ میں انا کو قربان کرنا کہتے ہیں، اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ انسان کسی بنا پر کسی خاص لمحے میں یہ کر بھی لے تو اگلے لمحے میں انا زندہ ہو جاتی ہے۔ کسی جذبے کی وجہ سے کسی خاص شخص کے سامنے یہ کر بھی کر لے تو دوسرے شخص کے سامنے انا تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے انا کو ختم کر دیا ہے، مگر وہ پوری طرح موجود ہوتی ہے۔

تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انا ختم ہوئی یا نہیں؟

بتاتا ہوں، مگر پہلے یہ سمجھ لیں کہ انا دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عام اور دوسری خاص۔ عام انا اپنا اظہار بہت کھل کر کرتی ہے، اس لیے اس کو جاننا بڑا آسان ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے تکبر کہتے ہیں۔ یعنی خود کو کسی بھی پہلو سے بڑا سمجھنا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا۔ کوئی بھی اس کی نشاندہی کر سکتا ہے اور ہم مخلص ہوں تو فوراً اپنی اصلاح کر سکتے ہیں چنانچہ جب ہم خود کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو اس عام انا سے نجات پا لیتے ہیں جبکہ خاص انا کو لوگ سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ خود کو حقیر وفقیر کہنے والوں کی انا بھی آسمان تک بلند ہوتی ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہو پاتی۔

اس انا کو کیسے پہچانا جائے ؟ایک اور شخص نے سوال کیا۔

اس کی پہچان آسان نہیں مگر اس کی کچھ موٹی موٹی نشانیاں بتا دیتا ہوں۔ پہلی یہ کہ آپ کسی اور انسان کی خوبیوں کے اعتراف کی عادت نہ رکھتے ہوں۔ دوسری یہ کہ جب آپ پر تنقید کی جائے تو آپ ناقد کی بات سمجھنے سے پہلے ہی اس کی بات کا جواب سوچنے لگیں اور تیسری یہ کہ جب کوئی شخص آپ کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرے تو آپ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح اس میں بھی فوراً کوئی خرابی اور خامی تلاش کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ہر رویہ یہ بتاتا ہے کہ آپ انا کے مریض ہیں لیکن چونکہ تکبر ایک سماجی برائی سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ اسے چھپا کر رکھتے ہیں لیکن جس نے اپنے مرض کو سمجھ لیا وہ یقیناً اس سے نجات پالے گا!

بہت مزے کی بات کہتے تھے: کم کو زیادہ جانو اور میں آج تک اس پر عمل نہیں کر سکا۔ بولتا رہتا ہوں۔ چلئے آج اتنا ہی.... زندگی بخیر رہی تو ملتے رہیں گے دنیا کے کام تو چلتے رہیں گے آپ سب سدا خوش رہیں۔ آباد رہیں۔ دل شاد رہیں۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا بس نام رہے گا اللہ کا۔

بکھرائے تیرے رنگ ہواؤں نے ہر طرف
کوئی نہیں ہے ترے سوا خشک و تر میں بھی
سیراب ہو گئے ہیں تری اک نظر سے ہم
کیا کیا قیامتیں ہیں تری اک نظر میں بھی

بروز اتوار 29 جمادی الاول 1446ھ یکم دسمبر 2024ء

یورپ میں چین کی بڑھتی موجودگی

جنوری 2018ء میں برسلز کا شاندار بوزار تھیٹر تاریخی لمحات سے متعلق عوامی جمہوریہ چین کی ویڈیو کا بیک ڈراپ تھا۔ یہ موقع تھا چینی نئے سال کے جشن کا۔ ایک گلوکار فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کی پشت پر چلائی جانے والی ویڈیو میں چین کی کامیابیوں کو نمایاں طور پر پیش کیا جارہا تھا۔ ویڈیو میں چین کے پہلے جوہری دھماکے، عالمی تجارتی تنظیم میں شمولیت، پہلے طیارہ بردار جہاز کی تیاری اور دیگر معاملات سے دنیا کو آگاہ کیا جارہا تھا۔ حاضرین میں موجود سفارت کار، فوجی نمائندے اور دیگر حکام دم سادھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ چین کی کامیابیوں کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ متاثر ہو بھی رہے ہوں مگر اِس سے کہیں بڑھ کر وہ حیرت زدہ بھی تھے اور تشویش میں بھی مبتلا تھے۔ چین کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت، معیشت کے پنپتے ہوئے حجم اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت نے یورپ کے بہت سے پالیسی سازوں کو خوابِ غفلت سے جگا دیا ہے۔ یورپی یونین ایک زمانے سے غیر اعلانیہ طور پر، مشنری انداز سے چین کے بارے میں سوچتی آئی ہے۔ چین کے مستقبل کے حوالے سے مختلف اندازے لگائے جاتے رہے ہیں مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر اندازے خام خیالی یا خوش فہمی پر مشتمل تھے۔

چین کی معاشی و عسکری قوت میں غیر معمولی اضافے کے ساتھ بیجنگ، واشنگٹن اور برسلز کی اسٹریٹجک تکون میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ٹرمپ کی صدارت کے دوران امریکا نے چین کو اسٹریٹجک مد مقابل کے روپ میں زیادہ دیکھا ہے۔ یورپ کے بیشتر قائدین ٹرمپ کسی بھی وقت کچھ بھی کہہ دینے کی وجہ سے اُن پر مکمل بھروسہ نہیں کرتے تھے جس کے نتیجے میں بیشتر یورپی ممالک نے حکمت عملی کے حوالے سے زیادہ خود مختاری کا راستہ اختیار کیا۔ ٹرمپ نے افغانستان اور شام سے فوج نکالنے کا اچانک اعلان کر کے امریکا کی 17 سالہ ملٹری ڈاکٹرائن کے حوالے سے یوٹرن لیکر جیمز میٹس نے کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور بعد ازاں یورپ کی سلامتی کے حوالے سے معاملات کو پریشان کن کرنے میں بھی ٹرمپ کے بیانات کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ ایک مرتبہ پھر چار سال تک ڈونالڈ ٹرمپ دونوں ایوانوں میں اکثریت کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں براجمان ہوں گے، کیا یہ اپنے انتخابی وعدوں کے مطابق دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکیں گے، اس کا جواب آنے والے پر وقت پر موقوف ہے۔

دسمبر 2018ء میں بیجنگ نے یورپی یونین سے تعلقات کے حوالے سے وائٹ پیپر شائع کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح چین نے یورپی طاقتوں کے ساتھ مختلف شعبوں میں مل کر کام کیا بالخصوص ہائی ٹیکنالوجی کے شعبے میں۔ اب بیجنگ تائیوان اور تبت کے مسئلے پر برسلز سے کیا امید رکھتا ہے اور کس طور چین نے اظہارِ رائے کی آزادی کیلئے خطرہ بننے والی جعلی اور من گھڑت خبروں کے سدباب کیلئے بھی یورپی یونین کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ وائٹ پیپر میں یہ بھی درج ہے کہ امریکا کے یکطرفہ اقدامات کے آگے بند باندھنے کیلئے یورپ کو چین کا ساتھ دینا چاہیے۔ چینی قیادت نے اس وائٹ پیپر میں یہ عندیہ بھی دیا کہ جہاں کہیں بھی امریکا کے انخلا سے خلا پیدا ہوگا، وہاں وہ اپنا کردار ادا کر کے خلا پُر کرنے کو تیار ہے۔ جرمی رفکن کے مطابق چین نے مابعدِ جدیدیت کے لمحاتِ سعید میں دو عشروں تک "یورپی خواب" کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یورپی یونین کے بعض حکام کہتے ہیں کہ یورپی یونین جیو پالیٹکس نہیں کرتی اور جو کچھ بھی یورپی یونین کرتی ہے، اُس کے سیاسی عواقب برآمد نہیں ہوتے۔ یوں یورپی یونین اپنے علاقے کو بڑی طاقتوں کیلئے پلے گراؤنڈ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یورپ نے خاصی مشقت سے جو خُوئے اطاعت پروان چڑھائی ہے، اُس نے چین کو بھی کھل کر کھیلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے ہیں۔ روس نے یوکرین کے حوالے سے طاقت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا اور یوکرین سے جُڑے ہوئے چند اور یورپی ممالک کو بھی

کسی حد تک متاثر کیا مگر یورپی یونین کے مجموعی ماحول پر اس کا کچھ خاص منفی اثر مرتب نہیں ہوا۔

یورپی یونین کے حکام بھلے ہی کہتے رہیں کہ یورپی یونین کے اقدامات کے سیاسی نتائج برآمد نہیں ہوتے مگر حقیقت یہ ہے کہ اب بعض یورپی ممالک نے انفرادی سطح پر اور یورپی یونین نے اجتماعی سطح پر چین کو ایک بڑے حریف کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ چین کی ''میڈاِن 2025ء'' حکمت عملی نے یورپ کی ہائی ٹیک انڈسٹری کیلئے بیداری کا کردار ادا کیا ہے۔ یورپ اور بھارت دونوں ہی چین کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ دونوں کیلئے چین کی بڑھتی ہوئی سیاسی، عسکری اور معاشی قوت نے ویک اپ کال کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایسے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا بھارت کا ''یواشکتی'' آدرش اور یورپین ڈریم متصادم ہوں گے؟ دسمبر 2018ء میں یورپین کونسل نے ''ای یو اسٹریٹیجی آن انڈیا'' کے حوالے سے اخذ کیے جانے والے خیالات کو قبول کیا۔ کیا اِس سے یورپی یونین اور بھارت کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا؟ اب تک عام خیال یہ تھا کہ یورپی یونین نے چین کو زیادہ اہمیت دی ہے اور بھارت کو مجموعی طور پر نظر انداز کیا ہے۔ بھارت کے حوالے سے نئی حکمت عملی اپنانے سے یہ تاثر ابھرے گا کہ یورپی یونین بھارت کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسے نئے عالمی نظام کو پروان چڑھانے کے حق میں ہے، جو اصولوں کی بنیاد پر کام کرتا ہو۔ علاوہ ازیں یورپی یونین سلامتی سے متعلق سیٹ اپ کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کر رہی ہے لیکن مودی سرکار کی طرف سے کینیڈا کے علاوہ دیگر ممالک میں خفیہ ایجنسی "را" کے دہشتگردی میں ملوث ہونے کے بعد یورپی یونین کی سلامتی کے اداروں نے انڈیا سے فی الحال اپنے کئی تحفظات کا اظہار کر دیا ہے۔ دوسری طرف ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس وائٹ پیپر کے مندرجات کی بنیاد پر چینی قیادت کس نوعیت کے اقدامات کی راہ ہموار کرتی ہے۔

فروری 2017ء میں فرانس، اٹلی اور جرمنی نے یورپی یونین سے کہا کہ وہ یورپ میں براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اسکریننگ سے متعلق سفارشات مرتب کرنے کیلئے کمیشن قائم کرے۔ تینوں یورپی طاقتوں نے اگرچہ کسی ملک کا نام نہیں لیا تاہم یہ بات طے ہے کہ وہ چینی باشندوں کی طرف سے کی جانے والی براہِ راست سرمایہ کاری کے حوالے سے غیر معمولی تشویش میں مبتلا تھے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ یورپ کے بعض ممالک میں چینیوں کی سرمایہ کاری اِتنی زیادہ ہے کہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کی تجویز پر کھل کر بحث نہیں کی جا سکی۔ یورپی کونسل، یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمان... تینوں ادارے اس حوالے سے باضابطہ مذاکرات اور بحث کی منزل سے دور رہے۔ ناقدین کہتے ہیں کہ اس حوالے سے پائی جانے والی موجودہ دستاویز میں ذرا بھی دم نہیں کیونکہ اُس کی ساری طاقت ختم کر دی گئی ہے۔

یورپ میں براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اسکریننگ کے حوالے سے تجویز ایسے وقت سامنے آئی ہے، جب یورپی یونین کے بہت سے رکن ممالک کے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ یورپی ممالک میں تو براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت ہے تاہم اس کے مقابلے میں چین میں سرمایہ کاری کی گنجائش دی جاتی ہے نہ کھلی منڈی تک رسائی ہی دی جاتی ہے۔ چین کے بیشتر کاروباری ادارے دراصل ریاستی مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ یورپ میں چینیوں کی سرمایہ کاری 2008ء میں 70 کروڑ ڈالر تھی۔ 2017ء میں یہ 30/ارب ڈالر کی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ یونان کی بندرگاہ پیراس میں چینیوں کی سرمایہ کاری اصل بلغراد اور بڈاپیسٹ سے ہوتے ہوئے باقی یورپ تک راہداری کو معرضِ وجود میں لانے کیلئے تھی، مگر اب صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس سرمایہ کاری کے شدید اثرات یونان اور ہنگری محسوس کر رہے ہیں۔ ویسے چینیوں کی بیشتر سرمایہ کاری جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں ہے اور زور اس بات پر ہے کہ جو ٹیکنالوجی امریکا سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو وہ یورپ سے حاصل کر لی جائے۔ دوطرفہ سرمایہ کاری کے حوالے سے معاملہ اُس وقت زیادہ اُجاگر

ہوا جب جرمنی کے معروف روبوٹکس میکر "کوکا" کو چینی ملکیت کے ادارے "میڈیا" نے خریدا۔ تجزیہ کاروں کو معلوم ہوا کہ جرمن انجینئر اب پیپلز لبریشن آرمی کیلئے روبوٹکس تیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچھا سودا نہیں تھا۔

اب جرمنی نے بھی براہِ راست بیرونی سرمایہ کاری پر گہری نظر رکھنا شروع کر دی ہے۔ اس بات کو سمجھنا اب کچھ دشوار نہیں کہ چینی قیادت اور پوری قوم چینی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ یورپ کے اپنے آنگن کے نزدیک بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم میں روس کے ساتھ جنگی مشقوں کے پروگرام اور ساتھ ہی ساتھ بحیرۂ بالٹک میں بھی مشقوں کے پروگرام، جس کے نتیجے میں متعدد یورپی ریاستیں بھی لرزش محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ یورپی یونین کے حکام بھی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ چین اب روس کے ساتھ مل کر یورپ کو متاثر کرنے والے ماحول میں کام کر رہا ہے۔ فروری 2018ء میں جرمنی کے دو تھنک ٹینکس نے بھی اپنی رپورٹس میں بتایا کہ چین اب یورپ کے معاملات پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس قدر واضح ہے کہ یورپی یونین کے پالیسی ساز اسے کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جرمن چانسلر نے بلقان کے خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے حوالے سے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ میونخ سیکورٹی کانفرنس 2018ء میں جرمن وزیر خارجہ سگمار گیبریل نے چینی صدر شی جن پنگ کے پیش کردہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ چین ایک ایسا نظام تیار کر رہا ہے جو ہمارے نظامِ جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے اصولوں کی بنیاد پر استوار نہیں۔ بہر کیف، چین نے اپنی بھرپور معاشی قوت کو بروئے کار لا کر یورپ میں اختلاف رائے پیدا کر دیا ہے۔ اب بہت سے معاملات پر تمام یورپی طاقتیں ہم آہنگ ہو کر بات نہیں کر رہی، مثلاً مارچ 2017ء میں ہنگری نے ایک ایسے مشترکہ خط پر دستخط سے انکار کیا جو زیرِ حراست وکلا پر تشدد کے حوالے سے تھا۔ جون 2017ء میں یونان نے اقوام متحدہ میں ایک ایسے بیان کی راہ مسدود کر دی، جس میں چین کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کی مذمت کی گئی تھی۔ جولائی 2016ء میں یورپی یونین کے ایک ایسے بیان کو ہنگری، یونان اور کروشیا نے ویٹو کیا، جس میں بحیرۂ جنوبی چین میں چین کے ملکیتی دعوؤں پر تنقید کی گئی تھی۔ ان تمام مثالوں سے یورپی یونین کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے سے متعلق چین کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کئی شعبے ایسے ہیں جن میں یورپ اب بھی واضح طور پر برتری کا حامل ہے۔ نئی ہائی ٹیکنالوجی کے حوالے سے یورپ اپنی برتری برقرار رکھنے پر پوری تندہی سے کام کر رہا ہے اور یورپ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا ترقی اور سلامتی کے حوالے سے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر لازم ہے۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی کے حوالے سے یورپ بہت زیادہ محتاط ہے۔ 5۔جی ٹیکنالوجی کے حوالے سے یورپ نے واضح حکمتِ عملی تیار کر رکھی تھی اور اس پر مکمل طور پر کنٹرول برقرار رکھے ہوئے تھے لیکن شنید ہے کہ چین اس کا متبادل تیار کرنے میں نہ صرف کامیاب ہو چکا ہے بلکہ اس کی صلاحیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

یورپی یونین پر گہری نگاہ رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ہو سکتا ہے کہ یورپی یونین کے حکام کو اپنے آپشن بہت زیادہ پرکشش محسوس نہ ہوتے ہوں مگر وقت آ گیا ہے کہ وہ محض تماشائی بنے رہنے کی روش ترک کریں اور میدانِ عمل میں نکلیں۔ یورپ کو اب طے کرنا پڑے گا کہ مابعدِ جدیدیت کے دور میں سلامتی اور ترقی دونوں حوالوں سے مل جل کر کام کرنے کا طریقہ درست تھا یا یہ طریقہ ترک کرنا پڑے گا اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ یورپی طاقتوں کا مل جل کر چلنا نئے عالمی نظام کو کسی حد تک بہتر بنا سکے گا یا نہیں۔

تاہم چین نے یہ طے کر رکھا ہے کہ مستقبل میں دنیا میں سپر پاور کہلانے کیلئے جنگ اور جارحیت کی بجائے صلح جوئی سے تجارتی منڈیوں کو اپنے حق میں استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے، اس کیلئے چینی صدر نے 2014ء میں یورپی یونین کے صدر دفتر کا دورہ کر کے چین اور یورپی یونین کے مابین چار اہم شراکت داریاں قائم کرنے کی ٹھوس تجاویز پیش کرتے ہوئے اپنے مستقبل وژن کا تعارف کروایا جس پر وہ آج بھی سختی سے قائم ہے۔ گزرتے وقت نے چینی صدر کی پیش کردہ تجاویز کو درست ثابت کر دیا اور موجودہ حالات میں اس کی عملی اہمیت اور بھی اہم ہو گئی ہے۔

افغانستان سے انخلاء کے فوری بعد چین نے اپنی تجارتی دانشمندی سے اس خلاء کو بڑی تیزی کے ساتھ پُر کیا ہے اور اب اس خطے میں پاکستان، ایران، افغانستان کے ساتھ تمام ملحقہ ریاستوں میں اپنی تجارتی راہداری قائم کر کے ان ملکوں کی منڈیوں میں اپنا مضبوط مقام بنا لیا ہے جبکہ امریکا نے ایک بار پھر یوکرین کے ذریعے روس کو نیچا دکھانے کیلئے اپنے کچھ یورپی اتحادیوں کی مدد سے ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا ہے لیکن جن مقاصد کے حصول کیلئے امریکا پر امید تھا، وہ فی الحال خاک میں ملتے دکھائی دے رہے ہیں اور خود بین الاقوامی مالیاتی ادارے روس کی معیشت کو پہلے سے بہتر قرار دیتے ہوئے زمینی حقائق سے متفکر نظر آ رہے ہیں جبکہ یوکرین کی جنگ کے آغاز میں سارے یورپ کو روس کی طرف سے گیس کی بندش کی سپلائی کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ یورپ کھل کر امریکا کا ساتھ دینے سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ادھر دوسری طرف آج دنیا میں غیر یقینی اور عدم استحکام بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے چین اور یورپی یونین کے درمیان قریبی رابطے اور اس کے نتیجے میں باہمی تجارتی فوائد اور مستقبل کے عالمی چیلنجوں سے نمٹنے کیلئے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور چینی صدر کی دس سال قبل دی گئی تجاویز اور چینی وژن نے ثابت کر دیا ہے کہ باہمی اتفاق اور تعاون اور ملکی ترقی کیلئے اپنے ممالک کے عوام کیلئے خوشحالی کے نئے باب کھولے جا سکتے ہیں جس کیلئے غیر ضروری خدشات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب چین یورپی یونین کے سب سے اہم تجارتی شراکت داروں میں سے ایک ہے، اور اس کے برعکس عالمی تجارتی مندی کے منفی اثرات کے باوجود چین اور یورپی یونین کے مابین مجموعی تجارتی حجم 2023 میں 783 بلین ڈالر تک جا پہنچا ہے جس میں دوطرفہ سرمایہ کاری کا اسٹاک 250 بلین ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔ یورپی یونین کا چین کے ساتھ تجارتی خسارہ ہے، چین سے درآمدات برآمدات سے بہت زیادہ ہیں۔ 2023 میں، یورپی یونین نے چین سے 515.9 بلین یورو درآمد کیے، جبکہ 223.6 بلین یورو برآمد کیے تھے اور جاری سال میں اس میں اضافہ کی خبریں آ رہی ہیں۔

چین نے ثابت کیا ہے کہ وہ کاروباری تعاون، سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعاون اور سپلائی میں یورپ کا قابل اعتماد، کلیدی، ترجیحی اور صنعتی شراکت دار بننے کیلئے تیار ہے کیونکہ دونوں فریقین باہمی کامیابی اور مشترکہ خوشحالی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دونوں کے مابین تعاون ڈیجیٹل معیشت، سبز ترقی اور ماحولیاتی تحفظ، نئی توانائی اور مصنوعی ذہانت جیسے ابھرتے ہوئے شعبوں میں تیزی سے آگے بڑھنے کی مکمل صلاحیت ہے۔ یورپی یونین چیمبر آف کامرس ان چائنا (ای یو سی سی) کی جانب سے جاری کردہ بزنس کانفیڈنس سروے 2023 کے مطابق سروے میں شامل 90 فیصد سے زائد یورپی کمپنیاں چین کو اپنی سرمایہ کاری کی منزل بنانے سروے میں شامل 80 فیصد سے زیادہ چینی کمپنیاں یورپ میں اپنے کاروبار کو بڑھانے کا ہوم ورک مکمل کر چکی ہیں۔

چین دنیا کا سب سے بڑا ترقی پذیر ملک ہے اور یورپ کسی بھی دوسرے براعظم کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ممالک کا خطہ ہے۔ چین اور یورپی یونین دونوں بکھری ہوئی عالمی معیشت اور تحفظ پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر کے سامنے محتاط رہ کر کھلے پن کے ساتھ منصفانہ مسابقت اور آزاد تجارت کو برقرار رکھنے

کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ سلامتی کے تصور کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے گلوبلائزیشن کے خلاف مشترکہ مزاحمت کیلئے تیاری کے مراحل میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو اور گلوبل ڈیویلپمنٹ انیشی ایٹو کے حصول کیلئے مشترکہ ہدف کے تعاقب میں یورپی یونین اور دیگر یورپی ممالک کی فعال شرکت کا بھی خیر مقدم کر رہا ہے اور یورپی یونین کی گلوبل گیٹ وے حکمت عملی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کیلئے بھی تیار نظر آتا ہے تاکہ ترقی پذیر ممالک ترقی کے اپنے سفر کو تیز کرنے میں مدد کیلئے متعلقہ طاقتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بدلتی ہوئی اور غیر مستحکم بین الاقوامی صورتحال کے پیش نظر چین اور یورپ کو مزید تعاون کی ضرورت ہے۔ دونوں فریقوں کو کثیر الجہتی پر عمل کرنے، کھلے پن اور ترقی کی وکالت کرنے اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کو آسان بنانے کیلئے مل کر کام کرنا ہوگا۔ انہیں مشترکہ طور پر ایک مساوی اور منظم کثیر قطبی دنیا کی تعمیر کرنا ہوگی اور عالمی سطح پر فائدہ مند اور جامع اقتصادی عالمگیریت کو فروغ دینا ہوگا۔

قدرت نے پاکستان کو ایک بار پھر ایک سنہری موقع دیا ہے کہ وہ اپنے جغرافیائی وجود کی وجہ سے ان فوائد کو سمیٹ سکے اور اب تک سی پیک پراجیکٹ کی تکمیل میں مجرمانہ تاخیر کا فوری ازالہ کرتے ہوئے ایسے ہنگامی اور انقلابی اقدامات اٹھائے تاکہ برادر عرب ممالک کی طرف سے آنے والی سرمایہ کاری کو بھی ایک ایسا رخ میسر آجائے جس کے بعد یورپی ممالک کی سرمایہ کاری بھی پاکستان کا رخ کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی افراتفری اور بدامنی کو ختم کرنے کا ساز گار ماحول پیدا کیا جائے اور تمام سیاسی جماعتیں کم از کم ملکی معیشت پر اتفاق کرتے ہوئے ایک ایسا باہمی لائحہ عمل تیار کریں کہ ملک میں جو بھی حکومت آئے لیکن ان معاشہ اہداف کو کبھی بھی سیاست کی بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا۔

بابا اقبال یاد آگئے:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے\
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات\
یا وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل\
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات\
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست\
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

بروز سوموار یکم جمادی الآخر 1446ھ 2 دسمبر 2024ء

انصاف کی جنگ: عالمی عدالت اور اسرائیل

اسرائیلی فوج کی غزہ میں جوابی کاروائیوں کے بعد پیدا ہونے والی جنگی صورت حال وقت کے ساتھ گھمبیر تر ہوتی جارہی ہے اور اسی دوران نہ صرف حماس بلکہ کئی عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے اسرائیلی حکام پر مسلسل جنگی جرائم کے الزام عائد کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا اور بالآخر عالمی فوجداری عدالت کی جانب سے نیتن یاہو اور سابق اسرائیلی وزیر دفاع یوآو گیلنٹ کے وارنٹ گرفتاری کے اجرا کے بعد متعدد مغربی ممالک نے کہا ہے کہ وہ آئی سی سی کے اس فیصلے پر عملدرآمد کریں گے۔

باوثوق ذرائع کے مطابق 45ہزار سے زائد فلسطینی شہید اور 80 ہزار سے زائد زخمی ہو چکے ہیں۔ جن میں 134 صحافی 146 میڈیا کارکن، 120 ماہرین تعلیم، اور 224 سے زیادہ انسانی امدادی کارکنان شامل ہیں، علاوہ ازیں اقوام متحدہ کے 179 ملازمین بھی شامل ہیں۔ کسی بھی مسلح جنگ کے دوران عام شہریوں کے تحفظ کیلئے بنائے گئے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی جنگی جرم کہلاتی ہے۔ جنگ کے قوانین مختلف بین الاقوامی معاہدوں میں درج ہیں جن میں 1949 کا جنیوا کنونشن اور 1899 اور 1907 کا ہیگ کنونشن شامل ہیں۔ عام شہریوں کی زندگی بچانے اور ان پر جنگ کے اثرات کم کرنے کیلئے فریقین بین الاقوامی انسانی قوانین کے پابند ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کے ان قوانین پر عمل کس حد تک ہورہا ہے، یہ جاننا ضروری ہے کہ جنگی جرائم کیا ہوتے ہیں، اس حوالے سے عالمی قوانین کیا ہیں، یہ کس صورت میں لاگو ہوتے ہیں اور مجرم کو سزا دلوانے کا عمل کیا ہے؟

انٹرنیشنل کریمنل کورٹ 1998 میں نیدرلینڈز کے شہر ہیگ میں قائم کی گئی تھی۔ یہ ایک آزاد ادارہ ہے جہاں ان افراد پر مقدمہ چلایا جاتا ہے جن پر عالمی برادری کے خلاف انتہائی سنگین جرائم کے الزامات ہوں۔ یہ ادارہ جنگی جرائم، نسل کشی، انسانیت کے خلاف جرائم اور جنگ کے دوران جارحیت کے خلاف تحقیقات کرتا ہے۔ کوئی بھی ملک ملزمان کے خلاف اپنی عدالتوں میں مقدمہ چلا سکتا ہے۔ آئی سی سی اس وقت کارروائی کرتی ہے جب کوئی ملک کارروائی نہ کرنا چاہتا ہو اور یہ عدالت آخری آپشن ہوتی ہے۔

بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے مطابق جنگی جرائم کے حوالے سے متعلقہ ٹریٹی "روم سٹیچوٹ" ہے جس کے تحت انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے آرٹیکل 7، 6 اور 8 جنگی جرائم کی واضح تشریح کرتے ہیں۔ جنگی جرائم کی عمومی تشریح مختلف مقدمات کے دوران بین الاقوامی فورمز یا ٹریبونلز یا مختلف ادوار میں بنائے گئے کریمنل کورٹس میں کی گئی جسے بعد میں آئی سی سی کے قانون میں بھی شامل کیا گیا۔ اس کی مثالیں نیورمبرگ ٹرائل جیسے بے شمار اور ٹریبونلز ہیں جنھوں نے جنگی جرائم کی شناخت کر کے ان کی تشریح کی جنھیں بعد میں روم سٹیچوٹ میں ایک خاص اور قابلِ شناخت زبان دے دی گئی۔ اس میں یہ تفصیل بھی درج ہے کہ آیا شناخت کیے جانے والے جرائم سے منسلک ایکشن اس جرم کا حصہ بنتے ہیں یا نہیں، جیسے یوگوسلاویہ اور روانڈا کے جنگی جرائم کے ٹریبونل وغیرہ تاہم یاد رہے کہ بین الاقوامی قانون کسی بھی ملک کے قانون سے مختلف ہوتا ہے جس میں جرائم درج ہوتے ہیں اور لکھی گئی زبان کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جرم ہوا یا نہیں۔

بین الاقوامی قانون میں ایسا بالکل نہیں ہے یہاں ذرائع میں ٹریٹی، رسم ورواج، جوڈیشل فیصلے، عالمی اداروں کی پریکٹیسز ان سب کو ملا کر غور کرنے کے بعد جنگی جرائم کی تشریح کی جاتی ہے اور اس کے خدوخال کی شناخت کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق کسی مخصوص قومیت، نسل یا مذہبی گروہ سے تعلق رکھنے والوں کو اس ارادے سے ہلاک کرنا کہ وہ مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہو جائیں، "نسل کشی" قرار پاتا ہے۔ نسل کشی کا مرکزی نکتہ بھی یہی ہے

کہ جرم اس نیت اور ارادے سے کیا جارہا ہو کہ کسی مخصوص گروہ کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اسے مٹا دینا مقصود ہو۔ اقوام متحدہ کے "کنونشن آن پریوینشن اینڈ پنشمنٹ آف دی کرائم آف جینوسائڈ، 1948" میں اس جرم کی روک تھام اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے سزا بھی بتائی گئی ہے۔

1998 میں "انٹرنیشنل کرمنل ٹریبونل فار روانڈا" نے دیگر ایسے اقدامات کی وضاحت بھی کی جن کو نسل کشی گردانا جاسکتا ہے۔ ان اقدامات میں مخصوص گروہ کے اراکین کے جسمانی اور ذہنی تشخص کو سنجیدہ چوٹ پہنچانا، ایسے حالات پیدا کردینا جو اس گروہ کی مکمل یا جزوی تباہی کا باعث بنیں، اس گروہ میں بچوں کی پیدائش روکنے کے اقدامات کرنا، ایک گروہ کے بچوں کو جبری طور پر کسی دوسرے گروہ کو منتقل کردینا شامل ہیں۔

بین الاقوامی قانون میں نسل کشی کی تعریف کو پہلی بار جرمن نازیوں کے خلاف نیورمبرگ مقدمے کے دوران استعمال کیا گیا۔ اب تک اسرائیل اور فلسطین سمیت 153 ممالک اقوام متحدہ کے اس کنونشن پر دستخط کرچکے ہیں۔ تاہم سب ممالک نے "روم سٹیچوٹ" پر دستخط نہیں کیے جس کے تحت انٹرنیشنل کرمنل کورٹ کا قیام ہوا جو ایسے جرائم کے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ان میں امریکا، چین، روس اور اسرائیل بھی شامل ہیں۔ ہولو کاسٹ، روانڈا، کمبوڈیا، بوسنیا، عراق میں یزیدیوں اور میانمار میں روہنگیا کے خلاف کارروائیوں کو حالیہ تاریخ میں نسل کشی کی مثالیں قرار دیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی جنگی جرائم قانون کے آرٹیکل 7 کے تحت جنگ کے نقصانات اور اثرات کو محدود رکھنے کیلئے ایسے عام شہریوں کو تحفظ دیا گیا ہے جو براہ راست جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ عام شہریوں پر تشدد یا حملے جرم تصور کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسا اسلحہ بھی ممنوعہ قرار دیا گیا ہے جس کے استعمال سے عام شہری متاثر ہوسکتے ہیں جیسا کہ بارودی سرنگیں، کیمیائی ہتھیار۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق زخمیوں اور بیماروں، بشمول زخمی فوجیوں کا خیال رکھنا لازم ہے۔ کسی کو یرغمال بنالینا یا پھر بے دخلی بھی جنگی جرائم میں شامل ہے۔ 1950 کے جینیوا کنونشن کے مطابق بچوں اور ثقافتی ورثے کو خصوصی حفاظت دی گئی ہے۔ ایسے جرائم کو طے کرنے کا اختیار بھی انٹرنیشنل کرمنل کورٹ کے پاس ہے۔

اسی طرح آرٹیکل 8 کے مطابق جنگی جرائم صرف جنگ کے دوران سرزد ہوسکتے ہیں لیکن انسانیت کے خلاف جرائم امن کے دوران بھی ہوسکتے ہیں جن میں عام شہریوں پر تشدد، جبری گمشدگی، قتل، بے دخلی یا جنسی تشدد اور ریپ جیسے جرائم شامل ہیں۔ جنگی جرائم سے متعلق قوانین کے ماہرین کے مطابق اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ جرائم عام شہریوں کے خلاف منظم حملے کے طور پر کیے گئے ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کسی ملک میں پولیس کسی پر تشدد کرے تو یہ مقدمہ تشدد کے خلاف عالمی کنونشن کے زمرے میں آئے گا کیونکہ کہ یہ ایک واقعہ ہے۔ تاہم اگر تشدد منظم انداز میں وسیع آبادی کے خلاف ہوا ہو تو یہ انسانیت کے خلاف جرم تصور کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلح گروہ عام آبادی میں گھس کر لوٹ مار کرے، لوگوں کو اغو کرے اور خواتین کا ریپ کرے تو یہ بھی انسانیت کے خلاف جرم ہوگا۔

آئی سی سی کسی بھی فرد یا ریاست کے خلاف تفتیش کا آغاز کرسکتی ہے، جن میں ممالک کے سربراہان سے لیکر ایسے جنرل بھی شامل ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے احکامات سے تجاوز یا خلاف ورزی کی۔ جب یہ ثابت ہوجائے کہ جنگی جرم ہوا ہے تو مجرم کو آئی سی سی میں لے جانے یا سزا دلوانے کا عمل کیا ہے؟ اس حوالے سے "سزا کسی ایک شخص کو دی جاتی ہے (مثلاً بٹالین کمانڈر یا جنرل) ریاست سے توقع ہی نہیں کی جاتی کہ وہ غیر ذمہ دارانہ حرکات کی اجازت دے گی کیونکہ ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔

اگر کوئی ریاست ایسے ایکشنز کی اجازت دیتی ہے، انہیں تسلیم کرتی ہے اور اپنی سٹیٹ پالیسی بنالیتی ہے تو ایسی صورت میں وہ ریاست بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ اس صورت میں دنیا بھر کی ریاستوں کو اس ریاست کے خلاف صف آرا ہونا پڑے گا، سفارتی تعلقات ختم کر کے اور پابندیوں کے ذریعے حتیٰ کہ اگر ضرورت پڑے تو طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اسے بتانا پڑے گا یہ غلط ہے اور اسے ان ایکشنز سے رکنا پڑے گا۔ اگر ان تمام اقدامات کے باوجود وہ ریاست بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی جاری رکھتی ہے تو دیگر ممالک مل کر وہاں مشترکہ فوجی بھیجنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں جس سے اس ملک کو جنگی جرائم سے روکا جا سکے اور عام شہریوں کی حفاظت کیلئے جس حد تک بھی جانا پڑے جایا جائے۔ یہاں R2P یعنی "ریسپانسبلٹی ٹو پروٹیکٹ" کا اصول لاگو ہوتا ہے جسے اقوام متحدہ کے سیکریٹری نے منظور کیا ہے۔

یاد رہے کہ 5 فروری 2021ء کو بین الاقوامی فوجداری عدالت یعنی انٹرنیشنل کرمنل کورٹ نے فیصلہ سنایا تھا کہ اسے فلسطینی علاقوں میں جنگی جرائم اور مظالم کے بارے میں فیصلہ کرنے کا دائرہ اختیار حاصل ہے۔ عالمی عدالت فوجداری کے اس اکثریتی فیصلے سے عدالت کیلئے اسرائیل کے "زیر قبضہ فلسطینی علاقوں" میں جنگی جرائم کی تحقیقات کا راستہ ہموار ہو چکا ہے اور مزید براں عدالت کا دائرہ کار 1967 سے اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں یعنی غزہ اور مشرقی یروشلم سمیت مغربی کنارے تک پھیل گیا ہے۔ عدالت نے کہا کہ فیصلہ عدالت کے بانی دستاویزات کی رو سے قواعد پر مبنی تھا اور اس کا مطلب ریاست یا قانونی حدود کا تعین کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے۔

عدالت کی پراسیکیوٹر فتوؤ بینسودا نے اس سے قبل اس بارے میں تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ فلسطینی خطے میں جنگی جرائم مرتکب کیے جانے کے دعوؤں کو "یقین کرنے کی معقول وجوہات" ہیں۔ یہ فیصلہ عدالتی پراسیکوٹر بینسودا کے اس بیان کے ٹھیک ایک سال بعد سامنے آیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ ابتدائی جائزے میں (فلسطینی خطے میں جنگی جرائم) کی تحقیقات کو کھولنے کیلئے تمام معیارات کو پورا کرنے کیلئے خاطر خواہ معلومات جمع کی گئی ہیں۔

عالمی فوجداری عدالت کی جانب سے نیتن یاہو اور سابق اسرائیلی وزیر دفاع یوآو گیلنٹ کے وارنٹ گرفتاری کے اجرا کے اعلان کے بعد متعدد مغربی ممالک نے کہا ہے کہ وہ آئی سی سی کے اس فیصلے پر عملدرآمد کریں گے۔ اسرائیل کے مغربی اتحادی برطانیہ کے علاوہ بیلجیئم، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، آئرلینڈ، سپین اور کینیڈا نے بھی اعلان کیا ہے کہ وہ اس معاملے میں بین الاقوامی قوانین کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کی پاسداری کریں گے۔ آئی سی سی کی جانب سے نیتن یاہو اور یوآو گیلنٹ کے وارنٹ گرفتاری کے اجرا کے اعلان کے بعد سے اسرائیل کے سیاستدانوں کی جانب سے شدید ردِ عمل سامنے آ رہا ہے۔ اگرچہ نیتن یاہو اور یوآو گیلنٹ کے ساتھ ساتھ حماس کے فوجی کمانڈر محمد دیف کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کیے گئے ہیں تاہم عالمی فوجداری عدالت کے اس فیصلے کو حماس، فلسطینی اسلامی جہاد اور غزہ کے عام شہریوں کی جانب سے سراہا گیا۔

برطانوی وزیر اعظم کیئر سٹامر کے ترجمان سے جب پوچھا گیا کہ کیا نیتن یاہو کے برطانیہ میں داخل ہونے کی صورت میں انہیں حراست میں لے لیا جائے گا تو ترجمان نے "مفروضوں" پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا تاہم انہوں نے وضاحت کی کہ "حکومت اپنی قانونی ذمہ داریاں پوری کرے گی"۔ دوسری

جانب جب کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو سے پوچھا گیا کہ اگر نیتن یاہو آئے تو کیا انہیں گرفتار کیا جائے گا تو ٹروڈو نے کہا کہ "ہم بین الاقوامی قانون کی پاسداری کریں گے اور بین الاقوامی عدالتوں کے تمام ضابطوں اور احکام کی پابندی کریں گے"۔

تاہم حماس نے اپنے فوجی کمانڈر محمد دیف کے وارنٹ کے اجرا پر تبصرہ کیے بغیر اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ دوسری جانب حماس کو اپنے کمانڈر ابراہیم المصری عرف محمد دیف کے گرفتار ہونے کا کوئی خاص خدشہ نہیں۔ اسرائیل کا ماننا ہے کہ وہ پچھلے سال مارے گئے تھے حالانکہ حماس نے آج تک ان کی موت کی تصدیق نہیں کی۔ ان کو گرفتار کرنے کے علاوہ آئی سی سی کا ارادہ تھا کہ حماس کے دور ہنما یحییٰ سنوار اور اسماعیل ہنیہ کے خلاف کاروائی کریں تاہم ان کی موت کی تصدیق پہلے ہی ہو چکی ہے۔

ایک بیان میں حماس کی جانب سے کہا گیا کہ "ہم دنیا کے تمام ممالک سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صہیونی جنگی مجرموں، نیتن یاہو اور گیلنٹ کو عدالت میں

ایک بیان میں حماس کی جانب سے کہا گیا کہ "ہم دنیا کے تمام ممالک سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صہیونی جنگی مجرموں، نیتن یاہو اور گیلنٹ کو عدالت میں لانے کے آئی سی سی کے ساتھ تعاون کریں اور غزہ کی پٹی میں شہریوں کے خلاف نسل کشی کے جرائم کو فوری طور پر روکنے کیلئے کام کریں"۔ غزہ سے تعلق رکھنے والے عام فلسطینی شہریوں نے بھی اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

غزہ شہر سے بے گھر ہونے والے اور اس وقت دیر البلاح کے مرکزی علاقے میں رہنے والے 40 سالہ محمد علی نے کہا کہ "ہمیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہمیں بھوکا رکھا گیا ہے۔ ہمارے گھر تباہ کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے اپنی اولادیں، اپنے بیٹے اور اپنے پیارے کھو دیے ہیں۔ ہم اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ظاہر ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ آئی سی سی کے فیصلے پر عمل کیا جائے گا"۔ منیرہ الشامی، جن کی بہن گذشتہ ماہ اسرائیلی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئی تھیں، نے کہا کہ آئی سی سی کا یہ فیصلہ ان کی "بہن و فاسمیت دسیوں ہزار متاثرین کیلئے انصاف" کی طرف اشارہ ہے۔

برطانیہ سمیت کل 124 ممالک آئی سی سی کے دستخط کنندگان ہیں تاہم ان میں امریکا، روس، چین اور اسرائیل شامل نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکنیکی اعتبار سے اگر نیتن یاہو یا گیلنٹ آئی سی سی کے دستخط کنندگان ممالک میں سے کسی بھی ملک میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں وہاں سے گرفتار کر کے عدالت کے حوالے کیا جانا چاہیے۔ تاہم بین الاقوامی سطح پر وکلا نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ گرفتاری وارنٹ میں نامزد دونوں شخصیات میں سے کسی کو بھی مقدمے کیلئے دی ہیگ میں پیش کیا جائے گا۔

آخری بار جب نیتن یاہو نے امریکا کا دورہ کیا تھا جہاں انہیں مکمل استثنیٰ حاصل ہے تاہم گذشتہ سال انہوں نے برطانیہ سمیت کئی ممالک کا دورہ کیا تھا جن میں سے کئی آئی سی سی کے دستخط کنندگان میں شامل ہیں لیکن کہا جا رہا ہے کہ اس کے کافی کم امکان ہیں کہ نیتن یاہو دوبارہ ان ممالک جا کر اس قسم کا خطرہ مول لیں گے۔ اس کے علاوہ دستخط کنندگان ممالک بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ اس طرح کی صورتحال پیدا ہو جہاں انھیں نیتن یاہو کو گرفتار کرنا پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آئی سی سی کا یہ فیصلہ اسرائیل کی بین الاقوامی حیثیت کیلئے ایک بڑا دھچکا ہے۔ ان دو شخصیات اور خاص طور پر اسرائیل کی جانب سے غزہ میں اپنی فوجی مہم کو اچھائی اور برائی کے درمیان لڑائی کے طور پر پیش کرنے کی جاری کوششوں کیلئے بھی لیکن فلسطینیوں کو اور خاص

طور پر وہ شہری جن کا غزہ سے تعلق ہے، انہیں اپنے صحیح ثابت ہونے کا احساس ہو رہا ہے کیونکہ اب ایک بین الاقوامی ادارے کو بھی اسرائیل کے جنگی جرائم کے الزامات میں کچھ وزن نظر آرہا ہے۔

نظریاتی طور پر اتنے بڑے ایکشن یعنی کسی دوسرے ملک میں نسل کشی کو روکنے کیلئے فوج بھجوانے جیسے عمل کو اقوامِ متحدہ کے مینڈیٹ میں ہونا چاہیے لیکن اگر یو این ایسا نہیں کرتا اور اسرائیل دنیا کے ردِ عمل سے بے خوف، بے فکر ہو کر باز نہیں آرہا تو شاید چند ممالک خود ایسا کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں (چند دن قبل یمن کی جانب سے فائر کیے گئے راکٹ کو امریکی بحری جہاز نے انٹرسیپٹ کیا) مگر اس سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہو گا۔ آئی سی سی کی جانب سے جنگی جرائم کے مجرم قرار دیے گئے سربراہانِ مملکت میں سربیا کے سابق صدر سلوبودان میلوسووچ، لائبیریا کے سابق صدر چارلس جی ٹیلر، بوسنیا کے سابق سرب صدر رادووان کراڈزچ، سوڈان کے سابق سربراہ مملکت عمر البشیر، لیبیا کے سابق رہنما معمر قذافی، پیرو کے سابق صدر البرٹو فوجیموری اور دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمن ایڈمیرل اور صدر کارل ڈونیٹز اور جاپانی وزیر اعظم اور جنرل ہیڈیکی ٹوجو اور کونی آکی کوئسو وغیرہ شامل ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نیتن یاہو کے ان جنگی جرائم میں ان ممالک کے سربراہوں کو بھی شامل کیا جائے گا جنہوں نے کھلم کھلا نہ صرف اسرائیل کو اسلحہ فراہم کیا بلکہ غزہ، لبنان، شام اور یمن میں حملوں کی تائید بھی کی؟ اگر ایسا ہوا تو حالیہ منتخب امریکی صدر کی کابینہ کی نئی نامزدگیوں کے وارنٹ کون جاری کرے گا جو حماس کو جانور سے تشبیہ دیتے ہوئے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا کھلم کھلا اعلان کرتے رہے ہیں اور اب بھی اپنے اسی پرانے مؤقف پر قائم ہیں۔

بروز بدھ 3 جمادی الآخر 1446ھ 4 دسمبر 2024ء

چین کی عالمی عسکری ڈپلومیسی اور امریکا

ٹرمپ کی اپنی کابینہ میں نامزدگیوں سے مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک میں مزید پریشانی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ان نامزدگیوں سے واضح ہوتا جا رہا ہے کہ چین کے خلاف وہ اپنی پالیسیوں پر عملدرآمد کرنے کی پوری کوشش کریں گے جس کو وہ اپنے پہلے دورِ اقتدار میں پورا نہیں کر سکے۔ تاہم چین میں بہت سے لوگوں کیلئے ٹرمپ محض ایک تفریحی کردار ہیں اور یہاں سوشل میڈیا پر ان کے ڈانس کی میمز بھی شیئر کی جاتی ہیں۔ ایک چینی سیاسی تجزیہ نگار کے مطابق "مجھے ٹرمپ اچھے لگتے ہیں مگر وہ عدم توازن کا شکار ہیں۔ کون جانتا ہے کہ وہ کیا کر گزریں؟"

ٹرمپ نے وزیر خارجہ کیلئے مارکو روبیو کو نامزد کیا ہے جنہوں نے اپنے پہلے ہی ایک بیان میں بیجنگ کو ایک ایسا خطرہ قرار دے رکھا ہے جو اس صدی کی سمت کا تعین کرے گا۔ ٹرمپ نے مائیک والٹز کو قومی سلامتی کا مشیر نامزد کیا ہے جنہوں نے اس ماہ کے آغاز میں یہ لکھا تھا کہ امریکا کو فوری طور پر یوکرین اور مشرق وسطیٰ میں تنازعات کو ختم کروا کر بالآخر اصلی خطرے کی طرف یعنی چین کی کمیونسٹ پارٹی کو قابو کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

عالمی تجزیہ نگار خبردار کر رہے ہیں کہ ٹرمپ کے دوسرے دورِ اقتدار کیلئے چین ابھی سے تیاری کر رہا ہے۔ ان تحفظات کے باوجود ٹرمپ کی واپسی چین کیلئے کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ توقع ہے جب جنوری میں ٹرمپ اقتدار میں آجائیں گے تو دنیا دونوں ممالک کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ کیلئے تیار رہے۔ ٹرمپ کی جیت سے بہت پہلے ہی چین اور امریکا کے درمیان مسابقت میں اضافہ دیکھنے میں آیا تھا۔ بائیڈن انتظامیہ کے دور میں ان تعلقات میں خاص طور پر چینی اشیا پر ٹیرف عائد کرنے کے فیصلے اور یوکرین جنگ اور تائیوان کے مستقبل سے متعلق جیسے "جیوپولیٹکل" عدم اتفاق سے زیادہ تناؤ دیکھنے میں آیا۔

اس سب کے باوجود دونوں ملکوں میں بات چیت بھی جاری رہی۔ امریکا کے متعدد سینیئر اہلکار بیجنگ گئے۔ چینی صدر شی نے امریکا کے نئے صدر کے ساتھ مل کر کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جو بائیڈن کے ساتھ اپنی آخری ملاقات میں واشنگٹن کو اس پر بھی خبردار کیا کہ 'نئی سرد جنگ نہ لڑی جائے اور یہ کبھی جیتی نہیں جا سکے گی۔ چین کا راستہ روکنا غیر دانشمندانہ، ناقابل قبول اور ناکامی کا راستہ ہو گا"۔ بیجنگ طویل عرصے سے امریکا اور اس کے اتحادیوں پر "چین کا راستہ روکنے" کا الزام عائد کرتا آرہا ہے۔ چینی اشیا پر ٹیرف کے نفاذ، جدید اے آئی چپس تک رسائی میں رکاوٹوں اور ساؤتھ چائنا سی اور اس کے علاوہ بننے والے فوجی اتحادوں کو بھی چین اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ سب اس کا رستہ روکنے کیلئے کیا جا رہا ہے۔ اب روبیو اور والٹز جیسی نامزدگیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نئی امریکی انتظامیہ چین کی طرف زیادہ سخت اور تناؤ والی حکمت عملی اختیار کرے گی۔

یہ دونوں نئے نامزد حکام چین کو امریکی سلامتی اور اس کی معیشت کیلئے خطرے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ چین کے بیشتر صنعتی گروپ کو ٹرمپ کے ان وعدوں پر عمل کا ڈر ہے جس میں انہوں نے یہ عزم کیا تھا کہ وہ چینی اشیا پر بھاری ٹیکس عائد کریں گے، یوں اس کا براہ راست چین کی برآمدات پر اثر پڑے گا جس کا چین کی معیشت میں اہم کردار ہے۔ یقیناً چین کے عالمی کاروباری افراد ممکنہ خطرے کی تیاری کیلئے ابھی سے تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن اس کا کیا رخ ہو گا، یہ ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہیں۔

ادھر دوسری طرف ماضی میں ٹیمپل آف ہیون کے شمال میں شہر ممنوعہ واقع ہے جہاں چین کا شاہی خاندان تقریباً پانچ صدیوں تک مقیم رہا۔ 2017 میں

یہاں صدر شی نے ٹرمپ کی میزبانی کی تھی۔ یہ اعزاز چین کے قیام سے آج تک کسی اور امریکی صدر کو حاصل نہیں رہا۔ صدر شی نے اس علاقے کو عام عوام کیلئے بند کروا دیا تھا اور انہوں نے صدر ٹرمپ کو یہاں کا دورہ کروایا جس کی براہ راست ٹی وی پر کوریج ہوئی تھی۔ ٹرمپ کو یہاں شام کے کھانے میں کنگ پاؤ چکن پیش کیا گیا تھا۔ اس دوران ان کی نواسی ارابیلا کشنر کی ایک ویڈیو بھی سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی جس میں وہ ایک چینی گانا گنگنا رہی تھی۔ اسے دونوں اطراف سے چین اور امریکا کے درمیان تعلقات کا عروج قرار دیا گیا تھا مگر 2019 میں یہ تعلق اس وقت تلخی میں بدل گیا جب چینی شہر ووہان سے کورونا وائرس کا پھیلاؤ شروع ہوا اور پھر یہ 2020 میں دنیا بھر میں پھیل گیا۔ ٹرمپ نے بار بار اسے "چینی وائرس" کہا اور تجارت میں بھی "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" والی جنگ کا آغاز کیا اور چینی اشیا پر 300 بلین ارب ڈالر کا ٹیرف کا نفاذ بھی کیا۔

جب ٹرمپ اپنے دوسرے دور کا آغاز کر رہے ہوں گے تو ان کا سامنا ایک مضبوط صدر شی سے ہو گا، جو تیسری بار چین کے صدر بنے ہیں اور اب ممکنہ طور پر وہی تاحیات چین کے سربراہ ہوں گے۔ چین کے پاس پہلے سے ہی دنیا کی سب سے بڑی برّی اور بحری فوج ہے اور اب واشنگٹن اس بات پر بھی پریشان ہے کہ چین اب سب سے بڑا جوہری ہتھیاروں کا ذخیرہ بھی بنا رہا ہے۔ جب ٹرمپ اپنی کابینہ کے ناموں کا اعلان کر رہے تھے تو عین اسی وقت چین کے سرکاری میڈیا نے ایک ویڈیو نشر کی جس میں ملک کے سب سے بڑے ایئر شو میں نئے برق رفتار جنگی طیارے جے 35 اے کو دکھایا جا رہا تھا جو کبھی سیدھا اوپر آسمان کی طرف اور کبھی اوپر سے زمین کی طرف تیزی سے رخ کرتا تھا۔

امریکا کے بعد چین دنیا کا دوسرا ملک ہے جس کے اپنے بیڑے میں دو برق رفتار جنگی طیارے موجود ہیں۔ دنیا کے پہلے دو برق رفتار جنگی طیارے جے 20-ایس بھی نمائش میں موجود تھے۔ گذشتہ ہفتے کیلیفورنیا کے "مڈلبری انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز" نے ایسی سیٹلائٹ تصاویر دیکھی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چین ایک نئے طیارہ بردار بحری جہاز کیلئے جوہری "پروپلشن" پر کام کر رہا ہے۔ کارنیگی انڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس کے تونگ ژاؤ کا کہنا ہے کہ مطالعات سے چین کی "فرسٹ یوز پالیسی" یعنی خطرے کی صورت میں جوہری ہتھیاروں کے استعمال کی حکمت عملی اختیار کرنے سے اور جوہری خطرات میں اضافے پر سنگین خدشات کو جنم دیا ہے۔ ان کے مطابق "جب تک ٹرمپ خود اس میں دلچسپی نہیں لیتے جس کے امکان کم ہیں تو اس وقت تک دونوں ممالک جوہری ہتھیاروں کی دوڑ کی شدید مسابقت کے دھانے پر آ جائیں گے، جس کے عالمی استحکام پر بھی اثرات مرتب ہوں گے"۔

صدر شی کی قیادت میں حالیہ برسوں میں چین اب ساؤتھ چائنا سی اور تائیوان کا اپنا حصہ ہونے کے دعوؤں میں مزید جارحانہ انداز اختیار کر گیا ہے۔ امریکا کو اب ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی ہے کہ چین نے تائیوان پر فوجی حملے کی بھی تیاری شروع کر رکھی ہے، جسے چین اپنے ہی ایک علیحدہ ہو جانے والے صوبے کے طور پر دیکھتا ہے جو بالآخر اس کے زیر انتظام آ جائے گا۔ کیا ٹرمپ اور ان کی کابینہ کے ہوتے ہوئے امریکا تائیوان کا دفاع کرے گا؟ یہ سوال ہر امریکی صدر سے پوچھا جاتا ہے۔ ٹرمپ نے اس سوال پر مختلف جواب دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ فوجی طاقت کا استعمال نہیں کریں گے کیونکہ شی جانتے تھے کہ وہ "پاگل" ہیں اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ سزا کے طور پر چینی درآمدات پر انتہائی سخت ٹیرف عائد کریں گے۔

غیر ملکی جنگوں میں حصہ نہ لینے سے متعلق ٹرمپ کے بیانات کے باوجود زیادہ تر ماہرین کو یہ امید ہے کہ واشنگٹن تائے پے کو فوجی امداد پہنچاتا رہے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ امریکا قانونی طور پر بھی اس جزیرے کو دفاعی ہتھیار فروخت کرنے کا پابند ہے۔ دوسرا اب تک کسی بھی انتظامیہ سے زیادہ ٹرمپ انتظامیہ نے تائیوان کو اسلحہ فروخت کیا ہے اور تائیوان کو فوجی امداد جاری رکھنے کیلئے مضبوط دوطرفہ حمایت بھی موجود ہے اس لئے ٹرمپ تائیوان کو ہتھیاروں کی فروخت کے سلسلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لائیں گے۔

یاد رہے کہ گذشتہ دو برس کے دوران چین اور امریکا کے مابین بڑھتے ہوئے سیاسی تناؤ کے درمیان بیجنگ دنیا بھر میں اپنی فوجی سفارت کاری میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہ رجحان خاص طور پر روس، ایشیا پیسیفک خطے اور بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو (بی آر آئی) منصوبے کے تحت دیکھنے کو ملا ہے جس میں چین اپنے تجارتی شراکت داروں پر توجہ مرکوز کر رہا ہے۔ جنوری 2023 میں چین کی جانب سے اپنی "زیرو کووڈ پالیسی" کو ختم کرنے کے بعد سے اعلیٰ سطحی ملاقاتیں، عسکری سطح پر سفارتی تبادلے، خیر سگالی کے دورے، مشترکہ بحری مشقیں اور دیگر تربیتی مشقوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جنوری 2023 سے اکتوبر 2024 تک کے ریکارڈ کی جانچ پڑتال سے فوجی رسائی میں اضافہ کے واضح حقائق سامنے آتے ہیں۔

چین کے اعلیٰ عہدیداروں کی غیر ملکی ہم منصبوں کے ساتھ ملاقاتیں، خیر سگالی کے دورے اور دیگر اہم عسکری تقریبات شامل ہیں تاہم ان میں دیگر ممالک کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقیں شامل نہیں ہیں۔ چین کی عسکری سفارتکاری کے حوالے سے پیپلز لبریشن آرمی ڈیلی کی ویب سائٹ، سرکاری ویب سائٹ ہوانکیو وینگ اور چین کی وزارتِ دفاع کی سرکاری ویب سائٹ سے اعدادوشمار کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ 2023ء کے آغاز سے 31/ اکتوبر کے درمیان چین نے بڑی سرعت کے ساتھ ایک خاص حکمت عملی کے تحت اپنی منزل کے حصول کیلئے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ چین نے 2023 میں 148 اور 31/ اکتوبر 2024 تک 169 عسکری سفارتی سرگرمیاں کیں جو ہمیں اس کی حکمتِ عملی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ چین نے روس کے ساتھ گذشتہ دو برسوں میں مختلف اوقات پر 11 ملاقاتیں، 6 فوجی مشقیں اور 6 خیر سگالی دورے کیے ہیں۔ اس دوران چین اور روس کی فوج کے مابین ہونے والی متعدد سرگرمیوں میں سے تقریباً نصف اعلیٰ سطحی ملاقاتوں پر مشتمل تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں 6 مشترکہ مشقیں اور چھ پورٹ کالز بھی شامل تھی۔

یہ اضافہ دونوں ممالک کی 2022 کی "نو لمٹس" شراکت داری کے بعد دیکھنے کو ملا ہے جو امریکی اثرورسوخ کا مقابلہ کرنے اور علاقائی اور عالمی سلامتی کو برقرار رکھنے کیلئے دونوں ممالک کے مشترکہ مفادات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سب کو خاص طور پر روس یوکرین جنگ کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ ویتنام اور کمبوڈیا کے ساتھ بھی چین کی فوجی سفارت کاری میں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔ عسکری سرگرمیوں کی بات کی جائے تو روس کے بعد یہ دونوں مُمالک دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔

ویتنام کے ساتھ عسکری سفارت کاری کے حوالے سے سرگرمیوں میں 9 ملاقاتیں، 9 عسکری سطح کے تبادلے اور 3 خیر سگالی کے دورے شامل ہیں جبکہ کمبوڈیا کے ساتھ 3 خیر سگالی کے دوروں کے علاوہ 2 تربیتی سیشن کیے گئے۔ چین کے قریبی دوست ملک پاکستان کے ساتھ ایک عسکری تقریب کے علاوہ ملاقاتوں پر زور دیا گیا۔ اسی طرح باوجود اس کے امریکا چین کے گرد حصار قائم کرنے کیلئے "کواڈ" کا قیام عمل میں لا چکا ہے اور اس کیلئے وہ انڈیا کو استعمال کرنے کیلئے پوری طرح سرگرم بھی ہے لیکن انڈیا اور امریکا کے ساتھ بھی چین کے اعلیٰ سطحی اہلکاروں کی ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ جنوبی افریقا چین کے ساتھ ملاقاتوں اور خیر سگالی کے دوروں میں مصروف رہا جبکہ انڈونیشیا نے بنیادی طور پر خیر سگالی کے دورے کیے۔ کووڈ 2019 سے پہلے چین نے شمالی کوریا کے ساتھ تین اعلیٰ سطحی عسکری اجلاس کیے جس میں مرکزی فوجی کمیشن کے وائس چیئرمین ژانگ یوشیا نے شرکت کی۔ اپنی کووڈ پابندیاں اٹھانے

کے بعد سے چین نے شمالی کوریا کے ساتھ عوامی طور پر تو فوجی سفارت کاری دوبارہ شروع نہیں کی ہے جو دونوں ممالک کے تعلقات میں جمود کی عکاسی کرتا ہے۔ تاہم ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ چین ایسا شمالی کوریا کے ذریعے روس کی بالواسطہ حمایت کرنے پر مغربی پابندیوں سے بچنے کیلئے کر رہا ہے۔

چین اور شمالی کوریا کے تعلقات کی 75 ویں سالگرہ کے موقع پر 6/اکتوبر 2024 کو چین نے چینی کمیونسٹ پارٹی (سی سی پی) کے سرکردہ رہنما ژاؤ لیجی کو پیانگ یانگ بھیجا لیکن دونوں طرف سے کسی فوجی رہنما نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی۔ شمالی کوریا کی 2024 کے شیانگ شان میں عدم موجودگی نمایاں تھی۔ یہ فورم ایک سالانہ سیکورٹی سمٹ ہے جس میں شمالی کوریا عام طور پر شرکت کرتا ہے۔ اسی طرح، ایران کے ساتھ چین کی آخری عسکری سرگرمی اپریل 2022 میں ہوئی تھی، جب اس وقت کے چینی وزیر دفاع وی فینگے نے اس وقت کے صدر ابراہیم رئیسی سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک کوئی عوامی دوطرفہ فوجی سفارت کاری نہیں ہوئی ہے، حالانکہ ایران مارچ 2023 اور مارچ 2024 میں چین اور روس کے ساتھ مشترکہ بحری مشقوں کا حصہ تھا۔

بحیرہ جنوبی چین میں اپنے تسلط کو مزید مضبوط کرنے کیلئے اہم ترین 'آسیان' ممالک کے ساتھ فوجی تعلقات استوار کر رہا ہے۔ ویتنام اور انڈونیشیا کے ساتھ تنازعات کے باوجود بیجنگ دونوں ممالک کے ساتھ فوجی سفارت کاری کو برقرار رکھتا ہے، جو اس کے اہم ایشیائی تجارتی شراکت داروں میں سے ہیں۔ چین کے سب سے قریبی سیاسی اتحادی سمجھے جانے والے لاؤس اور کمبوڈیا ان پانچ آسیان ممالک میں شامل ہیں جن میں ویتنام، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا بھی شامل ہیں۔

2024 میں سب سے زیادہ فوجی سفارت کاری کی سرگرمیاں ایشیا اور اوشیانا میں مرکوز کی گئی ہیں۔ یورپ میں چین کی تقریباً نصف عسکری سرگرمیاں روس کی وجہ سے ہیں۔ تاہم اس دوران برطانیہ، بیلاروس، سربیا اور فرانس کے ساتھ بھی قابل ذکر ملاقاتیں ہوئیں۔ اپریل 2023 میں روس کی فیڈرل سکیورٹی سروس کے ساتھ طے پانے والے سمندری قانون نافذ کرنے والے معاہدے کے بعد، 2024 میں چینی ساحلی محافظوں کے گشت میں بھی اضافہ ہوا۔ 2024 میں چین اور روس کی فضائی افواج، ساحلی محافظوں اور بحریہ کے درمیان مشترکہ گشت بحیرہ بیرنگ، شمالی بحرالکاہل، آرکٹک، پیسیفک اور شمال مغربی بحرالکاحل میں پھیل گیا۔ پیپلز لبریشن آرمی نیوی نے چینی عسکری سفارت کاری میں تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے اور اب یہ اس حوالے سے پیپلز لبریشن آرمی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

گشت اور تربیت کے علاوہ، چینی بحریہ نے پورٹ کالز اور میڈیکل مشنز کے ذریعے خیر سگالی کی کوششوں کو وسعت دی ہے۔ اپنے میڈیکل سہولیات فراہم کرنے والے جہازوں کے ذریعے مفت صحت کی دیکھ بھال کی پیشکش کی ہے۔ اکتوبر 2024 تک، اس نے 22 پورٹ کالز اور 12 میڈیکل وزٹ مکمل کیے، 2023 میں 17 پورٹ کالز اور آٹھ میڈیکل وزٹس کیے گئے۔ خلیج عدن میں نیوی کے مشنز نے اپنی خیر سگالی کی سرگرمیوں کو مزید بڑھایا ہے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کیا ہے اور چین کے ترقیاتی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ عام طور پر چینی بحریہ اپنے سمندری راستوں کو قزاقی سے بچانے اور بین الاقوامی جہازرانی کی حفاظت کو یقینی بنانے کیلئے حفاظتی مشن کے تین بیڑے بھیجتی ہے لیکن 2024 میں خلیج عدن میں صرف ایک مشن تعینات کیا گیا تھا جسے تجزیہ کار چینی بحریہ کے آپریشنل تبدیلی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

یہ حکمت عملی کسی بحری بیڑے کو طویل عرصے تک خطے میں رہنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے اور اسے ملک جبوتی میں موجود اس کے اڈے سے لاجسٹک

مدد بھی ملتی ہے۔ چین عالمی طور پر اپنی سافٹ پاور بڑھانے کیلئے ملک میں کانفرنسز، فورمز، کھیلوں کی سرگرمیاں، ایئر شوز، پریڈز اور دفاعی نمائشوں سمیت متعدد فوجی تقریبات کی میزبانی کرتا رہا ہے اور 2023 کے مقابلے میں 2024 میں ان میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ان میں سے چین نے 2023 میں 7/اور اکتوبر 2024 میں تقریبات کی میزبانی کی۔ چین نے 18 بین الاقوامی ایونٹس میں فوجی نمائندے بھیجے۔ ان میں 3 دفاعی نمائشیں اور 5 فضائی شو شامل تھے، جو بنیادی طور پر ایشیا، اوشیانا، مشرق وسطیٰ اور افریقا میں منعقد کیے گئے تھے۔

اگرچہ چین کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے غربت کا خاتمہ کر دیا ہے مگر ملک بھر میں لاکھوں مزدور اور فیکٹری ورکرز، جنہوں نے چین کے عروج میں حصہ ڈالا، پریشان ہیں کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس کا مستقبل اور چین کی معیشت کا مستقبل جزوی طور پر اس بات پر منحصر ہو سکتا ہے کہ ٹرمپ چینی اشیاء پر اپنے ٹیرف کے بارے میں کتنے سنجیدہ ہیں۔ عالمی ماہرین کے مطابق اس بار بیجنگ (ہر طرح کی صورتحال کیلئے) تیار ہے۔ چین نے پہلے ہی اپنے زرعی درآمدات کے ذرائع کو متنوع بنانا شروع کر دیا ہے (خاص طور پر برازیل، ارجنٹائن اور روس سے) اور غیر امریکی اتحادی ممالک میں اپنی برآمدات کے حجم میں اضافہ کیا ہے۔ مقامی طور پر حالیہ مقامی حکومت کے قرضوں کی دوبارہ سرمایہ کاری بھی ٹرمپ انتظامیہ کے ساتھ ممکنہ تجارتی جنگ پر منفی اثرات کو دور کرنے کی راہ ہموار کر رہی ہے۔ بیجنگ کو ایک اور امید بھی ہو سکتی ہے۔ ارب پتی ایلون مسک اب ٹرمپ کے انتہائی قریبی ساتھی ہیں۔ ان کی کمپنی ٹیسلا چین پر انحصار کرتی ہے۔ اس کی تمام الیکٹرانک گاڑیاں "ای ویز" کا تقریباً نصف حصہ چین میں تیار ہوتا ہے۔ چینی رہنما اس پر غور کر سکتے ہیں کہ کیا ایلون مسک ٹرمپ کے تجارتی عزم میں فرق ڈال سکتے ہیں۔

لیکن 21ویں صدی کی عظیم طاقت کی جدوجہد صرف تجارت پر نہیں ہے۔ صدر شی کے خواب میں چین کو دنیا کی غالب طاقت بنانا بھی شامل ہے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ٹرمپ کا ایک اور دورِ صدارت بیجنگ کو ایک موقع فراہم کر سکتا ہے۔

بروز ہفتہ 6 جمادی الآخر 1446ھ 7 دسمبر 2024ء

بشار الاسد کا اقتدار اور فرار؟

گزشتہ برس سے جاری انسانیت سوز خونریزی ابھی جاری ہے کہ ایک مرتبہ پھر شام میں اچانک چھڑ جانے والی جنگ نے قیامت برپا کر دی ہے۔ حلب میں تازہ حملے کے پیچھے ہئیت تحریر شام کا ایک خاص منصوبہ کار فرما نظر آتا ہے کہ اس وقت ایران اور اس کے تمام پراکسی گروپ اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہیں اور روس بھی یوکرین کی جنگ میں پھنسا ہوا ہے اور ان تمام کی ان کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے کا یہی صحیح وقت ہے۔ شام میں گزشتہ چند دنوں میں پیش آنے والے واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں جاری تنازع تھم نہیں رہا بلکہ شدت اختیار کر رہا ہے۔

2011 کے بعد تقریباً ایک دہائی کی جنگ کے باوجود شام کے حکمران بشار الاسد اپنا اقتدار بچانے میں کامیاب رہے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے والد سے ورثے میں ملنے والی حکومت کو بچانے کیلئے ملک کو توڑنے کیلئے تیار تھے۔ انہوں نے روس، ایران اور لبنان کی حزب اللہ جیسے طاقتور اتحادیوں پر انحصار کیا جنہوں نے داعش سمیت امریکی اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کے حمایت یافتہ گروہوں سے نمٹنے میں شام کی مدد کی لیکن پھر ایران کو اسرائیلی حملوں کا سامنا کرنا پڑا جبکہ حزب اللہ، جو اپنے بہترین جنگجو شام میں لڑائی کیلئے بھیجا کرتی تھی، کو بھی اسرائیلی حملوں کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ روس نے گزشتہ چند دنوں میں شام میں باغیوں کے خلاف فضائی حملے کیے ہیں لیکن اس کی عسکری طاقت مکمل طور پر یوکرین سے نبرد آزما ہے۔ ایسے میں شام میں جاری جنگ مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ خطے اور بین الاقوامی تنازعوں کے بیچ شام کی خانہ جنگی شہ سرخیوں میں اپنی جگہ برقرار نہیں رکھ سکی۔ چند مقامات پر جنگ معطل ہوئی لیکن یہ معاملہ ادھورا رہا۔

بشار الاسد کی حکومت 2011 کی طرح سے مکمل طاقت پھر سے حاصل نہیں کر پائی اگرچہ اس کی جیلیں قیدیوں سے بھر چکی تھیں۔ لیکن چند روز قبل تک شام کے اہم شہر اور مرکزی شاہراہیں بشار الاسد کے کنٹرول میں تھے لیکن ہیئت التحریر الشام نے 27 نومبر کے بعد ترکی کی سرحد سے منسلک ادلب صوبے سے نکل کر چند ہی دن میں شامی فوجیوں کو ناقابلِ یقین شکست سے دوچار کر کے خطے کے دیگر ممالک کو بھی حیران کر دیا ہے۔ اس برق رفتار حملے کے دو دن بعد ہی حلب کے قدیم شہر سے جنگجوؤں کی تصاویر سامنے آنے لگی تھیں جو 2012 سے 2015 تک شامی فوج کا "ناقابل تسخیر اڈہ" سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت یہ شہر حکومتی فوج اور باغیوں کے درمیان لڑائی کا مرکز تھا۔ حلب پر قبضے اور شامی فوج کی شکست کے بعد ماحول کافی پرسکون دکھائی دیا۔ سوشل میڈیا پر گردش کرنے والی ایک تصویر میں یونیفارم میں ملبوس مسلح جنگجو ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں فرائیڈ چکن کیلئے قطاریں بنا کر انتظار کرتے دکھائی دیے۔

ہیئت التحریر الشام نے 2016 میں القاعدہ سے اپنی راہیں جدا کر لی تھیں اور ایسا وقت بھی آیا جب ان دونوں کے بیچ لڑائی بھی ہوئی۔ ہیئت التحریر الشام کو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل سمیت امریکا، یورپی یونین، ترکی اور برطانیہ نے "دہشتگرد" قرار دے رکھا ہے۔ اس کے سربراہ ابو محمد الجولانی عراق اور شام میں طویل تاریخ رکھتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں انہوں نے جہادی نظریے سے ہٹ کر زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے گروہ کو حمایت دلوانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ گروہ اپنی زبان اور اعلانات میں اسلامی یا جہادی نظریات کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ اپنے ماضی سے دوری اختیار کرے اور اپنے حملے کو شامی حکومت کے خلاف مزاحمت کے طور پر پیش کرے۔ واضح رہے کہ شام کے شہری شدت پسندانہ جہادی نظریات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ 2011 میں حکومت مخالف مظاہروں کے بعد جب جمہور پسند احتجاج کی قیادت جہادی گروہوں کے ہاتھ آ گئی تو بہت سے شامی

شہری اس سے دور ہوتے چلے گئے یا انہوں نے مجبوراً حکومت کا ساتھ دیا کیونکہ انہیں داعش جیسی انتہا پسندانہ سوچ سے خوف آتا تھا۔

حالیہ حملہ، جس کی قیادت ہیئت التحریر کر رہی ہے، شمالی شام کے سیاسی منظر نامے سے تعلق رکھتا ہے۔ شمال مغرب میں "شامی ڈیموکریٹک فورسز" کا غلبہ ہے جس کی سربراہی کرد کر رہے ہیں اور انہیں امریکا کی حمایت حاصل ہے۔ اس علاقے میں 900 امریکی فوجی بھی تعینات ہیں۔ اس تنازع میں ترکی بھی ایک بڑا کھلاڑی ہے جس نے سرحدوں پر اپنے فوجی تعینات کر رکھے ہیں اور چند عسکری گروہوں کی حمایت بھی کرتا ہے۔ شام سے سامنے آنے والی اطلاعات کے مطابق ہیئت التحریر نے سرکاری ہیلی کاپٹروں سمیت عسکری ساز و سامان کی وافر مقدار پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب دمشق کے راستے پر اگلے اہم شہر حما کی جانب رخ کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شام کی حکومت اور اس کے اتحادی فضائی طاقت سے جوابی کارروائی کریں گے۔ باغیوں کے پاس ایئر فورس نہیں ہے۔ تاہم ایسی خبریں سامنے آ رہی ہیں کہ باغیوں نے ڈرون کی مدد سے شام کے ایک سینئر انٹیلیجنس افسر کو مار دیا ہے، ایسے میں شام کی صورت حال بین الاقوامی سطح پر خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی ہے۔ شام میں باغیوں نے کئی سال بعد حکومتی افواج کے خلاف ایک بڑا حملہ کیا ہے جس سے یہ تاثر زائل ہوا کہ ان کی عسکری طاقت ختم ہو چکی تھی۔

ہیئت تحریر الشام کے غیر متوقع حملے نے شام کے دوسرے بڑے شہر، حلب پر قبضہ کرتے ہوئے سرکاری فوج کو بے دخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس حملے کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے 2016 کے بعد شام میں پہلی بار فضائی کارروائیاں کیں جن میں حلب میں باغیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ شام کی خانہ جنگی کے آغاز کے 14 برس بعد ایک بار پھر سے چھڑ جانے والی جنگ نے ان خدشات کو جنم دیا ہے کہ یہ تنازع آسانی سے ختم ہونے والا نہیں۔ 2018 سے شام خانہ جنگی کی وجہ سے تین حصوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک جانب بشار الاسد کی حکومت کے زیر کنٹرول علاقے ہیں تو دوسری جانب ہیئت تحریر جبکہ تیسرا علاقہ کردوں کے زیر اثر ہے لیکن وہ کیا وجوہات ہیں جن کے باعث شام میں خانہ جنگی کا خاتمہ مشکل ہے؟

شام ایک عالمی شطرنج بن چکا ہے جہاں مخالف طاقتیں اپنے سٹریٹیجک مقاصد کے حصول میں مقامی اتحادیوں کی مدد کر رہی ہیں۔ ایک جانب بشار الاسد کی حکومت ہے جسے ایران اور روس کی حمایت حاصل ہے تو دوسری طرف وہ مسلح حزب مخالف گروہ ہیں جن کی پشت پناہی ترکی، سعودی عرب اور امریکا کر رہے ہیں۔ جیسے جیسے تنازع بڑھتا گیا، داعش اور القاعدہ بھی میدان میں داخل ہو گئے اور عالمی خدشات بھی بڑھتے چلے گئے۔

شام کے کرد شہری امریکی حمایت کی مدد سے اپنی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں جس سے اس بحران کی پیچیدگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ روس اور ایران نے بشار الاسد کی حکومت کو برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے جبکہ ترکی شمال میں اپنی سرحد سے ملحقہ علاقوں کے نزدیک مسلح گروہوں کی مدد کرتا آیا ہے۔ 2020 میں روس اور ترکی نے ادلب میں جنگ بندی کا معاہدہ کروایا اور مشترکہ پیٹرولنگ کیلئے ایک سیکیورٹی راہداری قائم کی۔ اگرچہ اس معاہدے کے بعد بڑے پیمانے پر جھڑپیں ختم ہو گئی تھیں لیکن شام کی حکومت مکمل کنٹرول حاصل نہیں کر پائی۔ ایسے میں موجودہ صورتحال میں کمزور حکومت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیئت تحریر پھر متحرک ہوئی کیوں کہ بشار الاسد کے اہم حامی، روس اور ایران، دیگر تنازعوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

بشار الاسد کی حکومت کئی سال سے بیرونی سہاروں پر بھاری انحصار کر رہی تھی لیکن اسرائیلی کارروائیوں کے نتیجے میں حزب اللہ کو پہنچنے والے نقصان اور اور یوکرین میں روس کی توجہ کی وجہ سے شام کی حکومت تنہا رہ گئی تھی اور یہی موقع تھا جب ہیئت تحریر نے اچانک حملہ کیا اور علاقوں پر قبضہ کرنا شروع

کیا۔ تاہم جنگ دوبارہ شروع ہونے کی وجہ شمال میں مقامی عدم استحکام ہے جو حل نہیں ہو سکا اور ساتھ ہی بیرونی امداد کی کمی ہے جس پر بشار الاسد کا انحصار تھا۔

کئی سال کی خانہ جنگی نے شام کو تباہ حال کر دیا ہے، معیشت کا برا حال ہے اور لاکھوں لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ ایسے میں بحالی کا راستہ بھی واضح نہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق جنگ سے قبل شام کی آبادی دو کروڑ 20 لاکھ تھی جس کا نصف بے گھر ہو چکا ہے۔ تقریباً 20 لاکھ لوگ اب بھی بنیادی سہولیات سے محروم کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ 60 لاکھ ملک چھوڑ کر لبنان، اردن اور ترکی جا چکے ہیں۔ صرف ترکی میں 50 لاکھ سے زیادہ شامی شہری بطور پناہ گزین موجود ہیں۔ ان حالات میں جبکہ صورتحال بھی غیر واضح ہے اور بہت سے مقامات پر لڑائی جاری ہے، اس لئے یہ خدشہ بڑھ گیا ہے کہ جنگ سے متاثرہ افراد بھی ان کیمپوں کا رخ کریں گے جہاں پہلے ہی 20 لاکھ افراد موجود ہیں، وہاں اب مزید لوگوں کی گنجائش نہیں ہے۔

موجودہ لڑائی سے قبل شام میں تقریباً ایک کروڑ 50 لاکھ سے زیادہ لوگوں کو انسانی امداد کی ضرورت تھی جو کہ ایک بڑی تعداد ہے۔ ایک کروڑ 20 لاکھ افراد کو غذائی قلت کا سامنا تھا۔ فروری 2023 میں ترکی اور شام میں آنے والے زلزلے نے حالات مزید بگاڑ دیے تھے۔ شام میں تقریباً 6 ہزار لوگ ہلاک ہوئے اور 80 لاکھ سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔

بشار الاسد کی حکومت اقتدار برقرار رکھنے کیلئے تشدد اور جبر پر انحصار کرتی آئی ہے جس سے نہ صرف تنازع طول پکڑتا چلا گیا بلکہ ان کے خلاف عوام میں غصہ بھی بڑھتا گیا۔ 2021 کی اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال، گنجان آباد آبادیوں پر فضائی حملوں سمیت ایسی حکمت عملی کے شواہد موجود ہیں جن میں عام شہریوں کو خوراک سے محروم رکھنے کے مقصد سے باغیوں کے زیر اثر علاقوں کا گھیراؤ کیا گیا اور انسانی امداد کی فراہمی میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ یورپین کونسل آن فارن ریلیشنز کے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا پروگرام کے مطابق "آمرانہ طرزِ حکومت اس تنازع میں مرکزی کردار کا حامل ہے کیونکہ بشار الاسد حکومت نے تسلسل سے سمجھوتہ کرنے یا شراکت اقتدار سے انکار کیا ہے"۔ 2020 تک، اقوام متحدہ کے تخمینوں کے مطابق 3 لاکھ سے زیادہ عام شہری عسکری کارروائیوں کی وجہ سے ہلاک ہو چکے تھے جبکہ اس سے بڑی تعداد میں بھوک، بیماری اور صحت کی بنیادی سہولیات سے محرومی کا شکار تھے۔ رائل یونائیٹڈ سروسز انسٹیٹیوٹ کے مطابق شامی حکومت اچھی گورننس سے زیادہ اپنے دوام پر توجہ دیے ہوئے ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ شام میں جاری تنازع میں سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ تفریق بھی کارفرما ہے۔ جنگ کے ابتدائی دنوں سے کُرد اکثریتی علاقوں پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہے جبکہ نام نہاد دولتِ اسلامیہ کے بچ جانے والے جنگجو شام کے وسیع صحراؤں میں اب بھی موجود ہیں اور لوگوں کیلئے خطرے کا باعث ہیں۔ ملک کے شمال مشرقی صوبے ادلب عسکری تنظیموں کا گڑھ بن چکا ہے جن کی قیادت صوبے کی حکمران ہیئت تحریر کر رہی ہے۔ اس وقت ان تنظیموں کی آپسی لڑائی نے صورتحال کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔

ترک حمایتی گروپ سمیت کئی گروہوں کی ایس ڈی ایف سے جھڑپیں ہوتی آئی ہیں۔ ایس ڈی ایف میں کردش گروپ وائے پی جی کے جنگجو شامل ہیں

جنہیں ترکی شدت پسند تنظیم کہتا آیا ہے۔ ہیئت تحریر کی حالیہ کارروائیوں کے شروع ہونے کے کچھ ہی روز بعد ترک حمایت یافتہ فری شامی آرمی نے دعویٰ کیا کہ اس نے حلب کے مضافاتی علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے تاہم یہ علاقے بشار الاسد کی فوج کے کنٹرول میں نہیں تھے بلکہ یہاں ایس ڈی ایف قابض تھی جس سے ان تنظیموں کے درمیان موجود اختلافات واضح ہوتے ہیں۔

ادھر دوسری طرف شام میں باغی فورسز نے ملک کے دوسرے بڑے شہر حلب کے "اکثریتی" علاقے پر قبضہ کر لیا ہے۔ 2016 کے بعد گزشتہ ہفتہ کی شام روس نے پہلی مرتبہ حلب پر فضائی حملے بھی کیے ہیں۔ شامی ادارے کا کہنا تھا کہ ملک میں حالیہ شروع ہونے والی لڑائیوں میں اب تک 20 عام شہریوں سمیت 300 سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ 2016 میں بشار الاسد کی افواج نے حلب سے باغیوں کو علاقہ بدر کر دیا تھا اور اس کے بعد سے یہاں پر کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا تھا۔ اب شامی فوج نے تصدیق کی ہے کہ باغی شہر کے "بڑے حصے" میں داخل ہو گئے ہیں اور اس دوران درجنوں فوجی ہلاک اور زخمی بھی ہوئے ہیں۔ شامی عسکری ذرائع کے مطابق حلب میں ایئرپورٹ جانے والے اور شہر کے اندر جانے والے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ باغی کسی بھی بڑی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر "شہر کے اکثریتی علاقوں" میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ علاقے میں کوئی لڑائی دیکھنے میں نہیں آئی کیونکہ شام کی سرکاری افواج وہاں سے نکل گئی تھیں۔ سٹی کونسل، پولیس سٹیشنز اور انٹیلیجنس دفاتر سب بند ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔

2011 میں جمہوریت کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں کے بعد شروع ہونے والی خانہ جنگی میں 5 لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس وقت بشار الاسد کے مخالفین نے اس خانہ جنگی کا فائدہ اُٹھایا تھا اور ملک کے بڑے حصوں پر قبضہ کر لیا تھا تاہم بعد میں شامی حکومت نے روس، ایران اور دیگر اتحادیوں کی مدد سے تقریباً تمام علاقوں کا کنٹرول واپس لے لیا تھا صرف ادلب وہ واحد علاقہ تھا جس کا کنٹرول ہیئت تحریر کے پاس تھا۔ اس صوبے میں کچھ علاقوں میں ترکی کے حمایت یافتہ جنگجو بھی موجود ہیں۔ جمعے کو حلب میں روس نے 23 فضائی حملے کیے تھے۔ روس کا کہنا ہے کہ اس نے شام میں "انتہا پسند قوتوں" پر حملہ کیا ہے۔ کریملن کے ترجمان کے مطابق روس "شام میں امن قائم رکھنے کیلئے حکومت" کی حمایت جاری رکھے گا۔

حلب شہر پر تازہ حملے ہیئت تحریر کی قیادت میں ہوئے ہیں جس کا شامی تنازع میں ایک عرصے سے کردار رہا ہے۔ ہیئت تحریر کا وجود 2011 میں جبهة النصرہ کے نام سے سامنے آیا تھا، جو کہ القاعدہ سے منسلک ایک گروہ تھا۔ داعش کے سابق سربراہ ابو بکر البغدادی کا بھی اس گروہ کو بنانے میں کردار تھا۔ اس گروہ کو شام میں بشار الاسد کا سب سے خطرناک ترین مخالف سمجھا جاتا تھا۔ 2016 میں جبهة النصرہ کے سربراہ ابو محمد الجولانی نے القاعدہ سے قطع تعلق کر لیا اور اس تنظیم کو تحلیل کر کے دیگر گروہوں سے اتحاد کر کے ہیئت تحریر کی بنیاد رکھ دی۔ القاعدہ سے تعلق توڑنے کے بعد ہیئت تحریر کا مقصد دنیا میں خلافت قائم کرنا نہیں بلکہ شام میں مذہبی حکومت قائم کرنا ہے لیکن ہیئت تحریر کی اس کاروائی میں ایران اور اس کی پراکسیز کو بھی شدید دھچکا پہنچا ہے۔

گزشتہ 4 برسوں میں ایسا لگ رہا تھا جیسے شام میں جنگ اب ختم ہو گئی ہے اور بشار الاسد کی حکومت ملک کے بڑے حصوں پر کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بشار الاسد کی اس فتح کے پیچھے روسی فضائیہ اور اہم اتحادی ایران کی عسکری قوت کا بھی ہاتھ تھا۔ دوسری جانب ایران یہ ماننے کو تیار نہیں کہ حلب کا کنٹرول شامی حکومت کے ہاتھ سے چلا گیا ہے۔ ایرانی نیوز ایجنسی کے مطابق لبنان میں ایرانی سفیر مجتبیٰ امانی کا کہنا ہے کہ حلب پر دہشت گردوں کے قبضے "کی غلط افواہیں "سائبر آرمی" کی جانب سے پھیلائی جا رہی ہیں۔ اب شامی حکومت مضبوط ہے اور روسی حکومت بھی شام کا دفاع کرنے کیلئے پُرعزم ہے۔ مزاحمتی محاذ اور ایران شامی حکومت اور اس کے عوام کی حمایت جاری رکھیں گے۔

لیکن دوسری جانب عرب میڈیا حلب میں باغی جنگجوؤں کی پیش قدمی کو "ایران کیلئے ایک دھچکا" قرار دے رہا ہے۔ "الشرق الاوسط کے مطابق شام میں باغیوں کی پیش قدمی روس اور شامی حکومت کے ساتھ ساتھ ایران کیلئے بھی ایک "دھچکا" ہے۔ حلب اور دیگر علاقوں میں جاری تازہ لڑائیاں شام میں ایران اور دیگر غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت کا نتیجہ ہیں۔ ابھی یہ تحریر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ خبر ملی کہ مجاہدین دمشق میں داخل ہو گئے ہیں اور سرکاری ٹی وی اور ریڈیو سے بشاالاسد کی حکومت کا تختہ الٹنے اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا اعلان ہو گیا ہے۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ شام میں بشارالاسد کی حکومت محض چند دنوں میں گر گئی لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں اور اس کے پیچھے کئی عوامل شامل ہیں۔ سالوں سے اپنی ہی عوام کے خلاف جاری جنگ نے بشار الاسد کی فوج کو بہت کمزور کر دیا تھا تاہم اس کے باوجود جتنی جلدی یہ ہوا، وہ بہت حیران کن ہے۔

شام کے تیسرے بڑے شہر حمص پر باغیوں کے قبضے کے کچھ ہی دیر بعد اطلاع آئی کہ مجاہدین دمشق میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ خبر ملتے ہی بشارالاسد ایک طیارے میں دمشق سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ شامی انقلاب اور اپوزیشن فورسز کے قومی اتحاد کے سربراہ ہادی البحرانے کہا ہے کہ بشارالاسد کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی "شام کے تاریک دور" کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ دمشق میں صورتحال محفوظ ہے اور تمام افراد اپنے گھروں میں بنا کسی فرقہ وارانہ یا مذہبی تفریق کے محفوظ ہیں، کسی کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں ہو گی۔

دمشق میں موجود تمام مجاہدین کو حکم دیا گیا ہے کہ کوئی بھی عوامی اداروں میں داخل نہ ہو اور ہوائی فائرنگ پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ اقتدار کی باضابطہ منتقلی تک عوامی ادارے وزیرِ اعظم محمد الجلالی کے ماتحت کام کرتے رہیں گے۔ محمد الجلالی نے اعلان کیا ہے کہ عوام جس کو بھی چنیں گے وہ اقتدار کی منتقلی کے کسی بھی طریقہ کار کیلئے تیار ہیں۔ یاد رہے کہ سب سے زیادہ منظم اور طاقتور "ہیئت تحریر" انقلاب کی قیادت کر رہی ہے۔ دیگر گروہوں کے مقابلے میں اس پر غیر ملکی طاقتوں کا اثر ورسوخ بہت کم ہے۔ دیگر گروپس ترکی کے زیرِ اثر چل رہے ہیں۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ گروپس موجود کرد گروہوں کے ساتھ کیسے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی جانب سے 2015 میں منظور ہونے والی قرارداد کے تحت امن کا ایک منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ شام کے لوگ ہی ملک کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ آزادانہ انتخابات اور ایک نیا منشور لایا جائے گا لیکن اس قرارداد پر عمل کرنے سے بشار الاسد اور ان کے خاندان کو اقتدا چھوڑنا پڑتا لیکن بشارالاسد اقتدار کی قربانی کیلئے تیار نہیں ہو رہا تھا لیکن آج وقت نے ثابت کر دیا کہ بالآخر ہزاروں بے گناہوں کی آہوں کو بھی منزل نے اپنی بانہوں میں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

بروز سوموار 8 جمادی الآخر 1446ھ 9 دسمبر 2024ء

کرم کا تنازع: فرقہ وارانہ کشیدگی یا عالمی سیاست کا کھیل؟

صوبہ خیبر پختونخواہ کے وزیر اعلیٰ کا اسلام آباد میں صوبے کے وسائل استعمال کرتے ہوئے مسلح جتھوں کے ساتھ یورش کرنا، خانہ جنگی کی طرف ایسا خطرناک قدم تھا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے حالانکہ اسلام آباد یورش سے چند دن قبل ان ہی کے صوبے کرم میں خوفناک فرقہ واریت کے واقعے میں 32/ افراد ہلاک ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود اسلام آباد کے خونی احتجاج کے بعد انہوں نے اب سول نافرمانی کا اعلان کرتے ہوئے عجیب منطق کے ساتھ بیان داغ دیا ہے کہ ہم محمود غزنوی کی طرح حملے جاری رکھیں گے۔

یاد رہے خیبر پختونخوا کے ضلع کرم کا شمار پاکستان کے قدیم ترین قبائلی علاقوں میں ہوتا ہے جسے برطانوی دورِ حکومت نے 1890 کی دہائی میں باقاعدہ طور پر آباد کیا تھا۔ انگریز سرکار نے باقاعدہ ایک سازش کے تحت یہاں زمینوں کی تقسیم دو مختلف فرقوں میں تقسیم کی تاکہ اس خطے سے ان کے خلاف کوئی منظم کاروائی نہ ہو سکے۔ مقامی قبائل میں تنازعات کا آغاز بھی انہی دنوں شروع ہو گیا تھا گویا کُرم میں مقامی قبائل کے درمیان تنازعات کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ پرانی ہے لیکن رواں برس جولائی سے یہ علاقہ وقفے وقفے سے ہونے والی خونریز جھڑپوں اور فرقہ وارانہ حملوں کی وجہ سے مسلسل خبروں میں ہے۔

صرف 2024 میں ضلع کرم کے مختلف علاقوں میں پیش آئے پر تشدد واقعات میں 200 سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں۔ کرّم میں مسافر گاڑیوں کے قافلے پر حملے اور پھر قبائلی لشکر کی جانب سے متعدد مقامات پر لشکر کشی اور آتشزنی کے واقعات کے بعد یہ خبر عام ہے کہ یہ فرقہ وارانہ جھگڑا پاڑہ چنار سے باہر آرہا ہے جس کی افغانستان سے باقاعدہ پشت پناہی ہو رہی ہے اور طالبان سرحد پار کر رہے ہیں۔ وہیں سوشل میڈیا پر ایسی ویڈیوز بھی سامنے آئیں جن میں مبینہ طور پر ایک چیک پوسٹ پر پاکستان کے پرچم کی جگہ کالعدم تنظیم زینبیون کا جھنڈا نصب کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ ضلع کُرم میں 21 نومبر کو گاڑیوں کے قافلے پر ایک حملے میں 50 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق شیعہ مکتبہِ فکر سے تھا۔ اس سے قبل اکتوبر میں کُرم میں سُنّی قبائل سے تعلق رکھنے والے مسافروں کے قافلے پر بھی حملہ کیا گیا تھا جس میں حکام کے مطابق خواتین، بچوں سمیت 16/ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

21 نومبر کو پیش آئے واقعے کے اگلے روز مسلح لشکر نے ضلع کُرم میں سُنی آبادی والے علاقے بگن پر حملہ میں 32/ افراد ہلاک اور سینکڑوں دُکانیں اور مکانات نذرِ آتش کر دیے۔ کرم کی لڑائی میں شدت پسند عناصر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ فریقین کی صفوں میں شدت پسند تنظیموں کے ایسے جنگجو بھی شامل ہیں جو اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ایماء پر پاکستان میں دہشتگردی میں ملوث ہیں۔ ادہر حکام کا دعویٰ ہے کہ کُرم میں جاری تنازع میں کالعدم تنظیموں زینبیون، (ٹی ٹی پی)، داعش، لشکرِ جھنگوی، سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد سے جُڑے عناصر بھی ملوث ہیں۔ تاہم اس تنازعہ میں شام، عراق اور افغانستان میں تنازعات کے سبب مقامی سطح (کرم میں) پر بھی تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔ نہ صرف ان (غیر ملکی) تنازعات میں حصہ لینے والے جنگجوؤں نے کُرم میں اپنی شقاوت دکھائی ہے بلکہ انہوں نے اس حملے میں بھی امریکی جدید اسلحے کا استعمال کیا ہے جو امریکی افواج انخلاء کے وقت ان کے حوالے کر گئے تھے۔ ضلع کُرم سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے علاقوں میں کالعدم تنظیموں سے جُڑے افراد کی موجودگی کی تصدیق تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ پر تشدد واقعات کا الزام بھی ایک دوسرے پر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ضلع کُرم کے علاقے باگزئی سے ایک باخبر ذریعہ کے مطابق وسطی کُرم میں ٹی

ٹی پی کی موجودگی ضرور ہے لیکن یہ بہت محدود ہے تاہم شیعہ علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ لشکر کشی کرتے ہیں، اُن کو کون روکے گا؟ بگن کے قریب واقع ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے معلم بھی اپنے علاقوں میں کالعدم تنظیموں کے حامیوں کی موجودگی کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "خود کو زینبیون اور طالبان سے منسوب کرنے والے لوگ اسلام کی مقدس ہستیوں کو غلیظ گالیاں اور ہتک آمیز زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر پھر مقامی لوگ بھی مشتعل ہو جاتے ہیں اور اُن کے خیال میں اکتوبر میں کونج علیزئی میں مسافر ویگن پر اور نومبر میں لوئر کُرم کے علاقوں بگن اور اوچت میں مسافر بسوں پر ہونے والے حملوں کی وجہ بھی یہی ہے۔ اُن کے مطابق لوئر اور وسطی کرم میں فوجی آپریشن ہو چکے ہیں اور ایسے ہی آپریشن کی ضرورت اپر کُرم میں بھی ہے۔

کُرم میں تعینات رہنے والے ایک اعلیٰ افسر نے افغانستان کے سرحدی علاقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان (سُنّی قبائل) کی جانب سے لڑنے کیلئے بھی اُدھر سے لوگ اِدھر آ جاتے ہیں۔ اُدھر سے آنے والے لوگوں کی آمد سے فریقین کی طاقت پر فرق تو پڑتا ہے لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ جو سارا علاقہ ہے، اس علاقے میں رہنا والا ہر بندہ ہر قسم کا اسلحہ چلانا جانتا ہے۔

تاہم افغان طالبان کا کُرم میں اہل تشیع فرقے کے خلاف جنگ میں "براہِ راست ملوث ہونا" مشکل ہے کیونکہ پاکستان خصوصاً کُرم جیسے سرحدی علاقوں میں شیعہ سنی فرقہ وارانہ فسادات افغانستان میں دونوں فرقوں پر براہ راست اثر ڈال سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی اقدام ہوتا ہے تو یہ افغانستان کے ایران کے ساتھ تعلقات پر منفی اثر ڈال سکتا ہے جو افغان طالبان کیلئے کسی طور قابل قبول نہیں ہوگا۔ تاہم ضلع کُرم میں منگل، مقبل اور زدران جیسے سُنی قبائل بھی موجود ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد افغانستان میں بھی رہائش پذیر ہیں۔

جب کُرم میں اہل تشیع لشکر کی جانب سے سنی قبائل کے گھروں کو جلانے، بعض افراد کے ہلاک کرنے، ان کی ویڈیوز سوشل میڈیا پر آنے اور ان کی عورتوں کو ساتھ لے جانے کی خبریں سامنے آتی ہیں، تو قبائلی روایات کے مطابق سرحد پار موجود ان قبائل کا اپنے ہم قبیلہ یا عزیز و اقارب کے انتقام میں اس تنازع میں شامل ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ افغانستان کی سرحد میں بسنے والے قبائل میں افغان طالبان کے جنگجو اور کمانڈر بھی شامل ہیں جن کے قریبی تعلقات کُرم میں موجود سُنی قبائل سے ہیں اور اسی سبب کُرم میں جاری شیعہ، سُنّی تنازع مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

اہم حکومتی عہدیدار کے مطابق علاقے میں بھاری اسلحے کی موجودگی ان کیلئے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے اور وہ اس کیلئے پڑوسی ملک افغانستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے کہ سرحد پار کون موجود ہے اور وہاں کیا کیا ہو تا رہا ہے تو اس کے کچھ تو نقصانات ہوں گے۔ جو حالیہ انخلا ہوا ہے امریکی افواج کا بے شمار خطرناک اسلحہ ان دونوں فریقین کے ہاتھ لگا ہے جس کا بے دریغ استعمال ہو رہا ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو جب 2007 میں سُنّی کالعدم تنظیموں اور ٹی ٹی پی نے ضلع کُرم میں قدم جمانے کی کوشش کی تو مقامی شیعہ رہنما حاجی حیدر کی قیادت میں مسلح اہل تشیع لشکر نے انہیں شکست دی تھی۔ حاجی حیدر کا شمار پاسداران انقلاب کی القدس فورس کے سابق سربراہ قاسم سلیمانی کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔

ادھر زینبیون بریگیڈ کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ مسلح گروہ شیعہ پاکستانی جنگجوؤں پر مشتمل ہے جو شام میں خانہ جنگی کے دوران ایران کے

اتحادی بشارالاسد کی حمایت میں ہزاروں سنی مخالفین کو بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ انہیں عراق اور شام میں مقدس مقامات کی حفاظت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ دوسری جانب ایران بھی زینبیون بریگیڈ سے اپنے تعلق کو خفیہ نہیں رکھتا اور ایرانی سرکاری میڈیا بشمول پاسداران انقلاب سے منسلک تسنیم نیوز ایجنسی بھی شام اور عراق میں مارے جانے والے پاکستانی جنگجوؤں کی خبریں اور کہانیاں نشر کرتا رہتا ہے۔

زینبیون بھی طالبان کی طرح کالعدم تنظیم ہے پھر اُن کے خلاف ویسی ہی کارروائی کیوں نہیں ہوتی؟ وہاں لوگوں کے پاس ایسے اسلحہ ہے جو مقامی پولیس کے پاس بھی نہیں ہے۔ ماضی میں اسی علاقے کے مقامی لڑکے شام میں داعش کے خلاف لڑنے جاتے رہے ہیں۔ یہاں کوئی عربی یا فارسی شہری موجود نہیں تاہم وہ کُرم میں زینبیون کی منظم موجودگی کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کے علاقوں میں شیعہ قبیلوں پر حملوں میں داعش اور دیگر افغان گروہ ملوث ہیں۔ جب ان سے سُنی قبیلوں پر ہونے والے حملوں کے حوالے سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "یہ قبائلی کلچر ہے کہ جس علاقے میں حملہ ہوتا ہے وہیں کے مقامی افراد کو ان حملوں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اور وہاں مخالف قبیلے کے لوگ حملہ کر دیتے ہیں۔

تاہم زینبیون اب بھی متحرک ہے، ان کی جانب سے اب سوشل میڈیا ایپ کے ذریعے کھل کر لوگوں کو بھرتی نہیں کیا جارہا تاہم ایران میں پڑھنے والے یا رہائش پذیر پاکستانی شیعہ افراد اب بھی بھرتی کیے جاتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق "زینبیون بریگیڈ" کبھی بھی 5 ہزار افراد سے زیادہ لوگوں پر مشتمل نہیں رہا، تاہم اب ان کی تعداد کم ہو کر ڈھائی ہزار سے چار ہزار تک آ گئی ہے۔

ضلع کُرم کا علاقہ پاڑہ چنار افغانستان کے دارالحکومت کابُل سے تقریباً 100 کلومیٹر دور ہے اور جب نائن الیون حملوں کے بعد امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر چڑھائی کی تو وہاں سے لوگوں نے کُرم میں بھی نقل مکانی کی۔ جب پاکستان کے قبائلی علاقوں میں 2000 کے وسط میں ٹی ٹی پی کا قیام عمل میں آیا تو ان علاقوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ کُرم میں تعینات رہنے والے ایک پولیس افسر نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ ضلع کُرم میں دونوں اطراف سے لڑنے والے افراد میں شامل کچھ لوگ غیر ملکی تنازعات میں لڑ کر آئے ہیں گویا یہ تمام افراد باقاعدہ تربیت یافتہ ہیں۔ تاہم ان لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن اُن کا تعلق جس بھی فرقے سے ہوتا ہے وہ اسی جانب سے لڑتے ہیں اور وہ بڑا بھاری اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔

اس وقت صورتحال پولیس کے قابو سے باہر ہے، پولیس کے پاس ایسا اسلحہ نہیں ہے جس سے ان لوگوں کو روکا جا سکے۔ پھر علاقے کا محل وقوع ایک اور مسئلہ ہے۔ وہ علاقہ ایسا ہے کہ آپ درمیان میں نہیں آسکتے، اگر آپ کو فورسز کو تعینات کرنا ہے تو آپ کو پہاڑ کے پیچھے سے چڑھنا پڑھتا ہے، ظاہر ہے اگر آپ ان کے سامنے سے آئیں گے تو آپ کو کسی ایک گروپ کی گولی لگ جائے گی۔ گو زینبیون کا پہلا مقصد نام نہاد داعش کے خلاف لڑنا تھا لیکن جب یہ لوگ واپس آنا شروع ہوئے تو بہت سے لوگ پنجاب اور کراچی میں تو پکڑے گئے لیکن پاڑہ چنار کے لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ریڈار پر نہیں آئے۔ باقی پاکستان کی نسبت اس علاقے کے لوگوں کا مذہب کی طرف رجحان زیادہ ہے اور یہ منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ بھی ہیں۔

پاکستان میں شیعہ برادری پر ہونے والے حملوں کی ذمہ داری ماضی میں نام نہاد داعش کی خراسان شاخ قبول کرتی رہی ہے۔ ماضی میں نام نہاد داعش دعویٰ کر چکی ہے کہ یہ حملے شام اور عراق میں پاکستانی افراد پر مشتمل زینبیون بریگیڈ کی کارروائیوں کے جواب میں کیے گئے ہیں۔ اگست 2021 کے بعد داعش اور پاکستانی سُنّی تنظیموں نے ایک بار پھر پاکستان میں اپنی کارروائیاں تیز کی ہیں جس کے سبب زینبیون نے بھی ملک میں اپنا محاذ سنبھال لیا ہے۔ ضلع کرم وہ علاقہ جو کہ چاروں اطراف سے ان سُنّی انتہاپسند تنظیموں کے نرغے میں ہے، اسی لیے زینبیون نے بھی اپنا رخ ضلع کُرم کی طرف کر

لیا ہے۔

ضلع کرُم کی صور تحال سے واقف اور ماضی میں وہاں تعینات رہنے والے حاضرِ سروس سکیورٹی افسران کے مطابق کُرم میں لڑائیوں کی بُنیادی وجہ زمینی تنازع ہے لیکن اس کے نتیجے میں ہونے والے تشدد میں بیرونی عناصر کے ملوث ہونے کے معاملے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ علاقے میں امن وامان بر قرار رکھنے کیلئے فریقین کو غیر مسلح کرنا انتہائی ضروری ہے اور جو لوگ علاقے سے باہر سے آکر لڑ رہے ہیں، اُن پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ سب سے پہلے تو انسدادِ دہشتگردی ایکٹ کے تحت بیرونِ ملک تربیت لے کر آنے والے جنگجوؤں کے خلاف سخت کارروائی کرنی چاہیے۔ اگر ان افراد کو نہ روکا گیا تو کُرم میں جاری فرقہ وارانہ کشیدگی شہری علاقوں تک بھی پھیل سکتی ہے اور پاکستان کے ازلی دشمن اس سلسلے میں پوری طرح سرگرم ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ملکی سیاست کی لڑائی لڑنے کی بجائے اپنا پورا زور دشمنوں کی اس سازش کو کچلنے پر صرف کیا جائے۔

بروز بدھ 10 جمادی الآخر 1446ھ 11 دسمبر 2024ء

ٹرمپ کا امن منصوبہ اور سعودی رد عمل

ڈونلڈ ٹرمپ 20 جنوری 2025ء کو اپنے دوسرے صدارتی دور کا آغاز کرنے دوبارہ وائٹ ہاؤس واپس آرہے ہیں اور ان کی متوقع کابینہ کی نامزدگیوں سے بالخصوص ایران کے اسرائیل پر جوابی حملوں کے وقت اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ کس قدر اپنے انتخابی وعدوں کی تکمیل کر سکیں گے اور کام کرنے جارہے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ قابلِ ذکر مشرق وسطیٰ میں امن ٹرمپ کے بیانات نے بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ آئندہ کن پالیسیوں پر کیلئے اُن کی وہ تجویز تھی جس پر ان کے پہلے صدارتی دور کے دوران عمل نہیں کیا گیا تھا۔ کیا اب ٹرمپ کی وائٹ ہاؤس واپسی پر اسرائیل کو سعودی عرب اور اسلامی دنیا کیلئے قابلِ قبول ریاست بنانے کا منصوبہ دوبارہ شروع ہوگا؟

ٹرمپ کے دوسرے صدارتی دور کا آغاز ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب غزہ کی پٹی میں ایک سال سے زائد عرصے سے جنگ جاری ہے اور چار سال پہلے کے مقابلے میں امریکا سمیت دنیا کو ایک مختلف حقیقت کا سامنا ہے۔ اس صورتحال میں یہ خدشات یقین کی حد کو چھونے لگے ہیں کہ ٹرمپ کے مشرق وسطیٰ کیلئے منصوبہ، جسے میڈیا میں "صدی کی ڈیل" کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے نفاذ کیلئے اسرائیل کی نہ صرف مکمل حمائت کریں گے بلکہ طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کریں گے اور اسے ہر حال میں مستقبل میں نافذ کرنے کی کوشش کریں گے اور اس منصوبہ کو انہوں نے فلسطینیوں کیلئے "شاید ایک آخری موقع" قرار دیا تھا۔ فلسطینیوں کی بے چینی مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ وہ اس منصوبہ کو اس بین الاقوامی قانون کی بنیاد پر فلسطینیوں کے حقوق سے متصادم سمجھتے تھے، خاص طور پر سرحدوں، پناہ گزینوں اور یروشلم کے مسائل کے حوالے سے روئے زمین سے بیت المقدس کے وجود کو مکمل ختم کرے وہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے جو تمام عالم اسلام کیلئے ایک چیلنج ہوگا۔

جہاں تک نتن یاہو کا تعلق ہے انہوں نے اس منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "صدی کا معاہدہ اس صدی کا ایک اہم موقع ہے، اور ہم اسے ضائع نہیں کریں گے"۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سیاسی امور کے تجزیہ کاروں کو توقع ہے کہ ٹرمپ اپنی اگلی مدت میں مشرق وسطیٰ کے اپنے امن منصوبے کو دوبارہ شروع کریں گے لیکن اسے ایک نئی شکل میں دوبارہ شروع کرنے کے امکانات کے بارے میں بہت سے مباحثے جاری ہیں۔

28 جنوری 2020 کو ٹرمپ نے مشرق وسطیٰ امن منصوبے کا اعلان کیا تھا جس میں سخت شرائط کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست کے قیام، مغربی کنارے کی بستیوں اور وادی اُردن کے اسرائیل کے ساتھ الحاق کرنے، اور فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی کے حق کا اطلاق نہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس منصوبے میں فلسطینیوں کو ایک ریاست قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے لیکن اس منصوبے میں اسرائیل کو ایک "یہودی ریاست" کے طور پر تسلیم کرنے سمیت "تمام قسم کی دہشتگردی کو واضح طور پر مسترد کرنے" کی شرائط شامل تھیں۔ اس منصوبے کے مطابق مجوزہ فلسطینی ریاست کو "غیر عسکری" کر دیا جائے گا اور اسرائیل کے پاس وادی اُردن کے مغربی علاقے میں سکیورٹی اور فضائی حدود کے کنٹرول کی ذمہ داری ہوگی جبکہ حماس، جو غزہ کی پٹی کا انتظام سنبھالتی ہے کو "غیر مسلح" کیا جائے گا۔

ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت میں مجوزہ فلسطینی ریاست کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس کے مطابق 1967 سے اسرائیل کے زیر قبضہ تمام فلسطینی علاقوں پر فلسطینی ریاست قائم نہیں ہوگی اور نہ ہی اس سے متصل ہوگی۔ اس منصوبے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ یروشلم "اسرائیل کا غیر منقسم دارالحکومت رہے گا" جبکہ فلسطینی دارالحکومت مشرقی یروشلم کے حصے میں ہوگا۔ اس منصوبے میں کہا گیا کہ "فلسطینی دارالحکومت کفر عقب، شوافات

کے مشرقی حصے اور ابو دیس میں ہو سکتا ہے اور اسے یروشلم یا ریاست فلسطین کی طرف سے کوئی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس منصوبے میں فلسطینی پناہ گزینوں کے "اپنے گھروں کو واپسی" کے حق کی شرط نہیں رکھی گئی تھی اور تین تجاویز دی گئیں تھی جن میں: نئ فلسطینی ریاست میں واپسی، ان کا میزبان ممالک میں انضمام، یا اسلامی تعاون تنظیم میں شرکت کے خواہشمند ممالک میں تقسیم شامل تھی۔ اس منصوبے میں یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے کنٹرول کے بارے میں کہا گیا کہ "صورتحال جوں کی توں رہے گی، اور اسرائیل یروشلم میں مقدس مقامات کی حفاظت جاری رکھے گا اور مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور دیگر مذاہب کیلئے عبادت کی آزادی کی ضمانت دے گا"۔ منصوبے کے تحت، اردن یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں برقرار رکھے گا۔

اسرائیلی امور کے مصنف اور نذیر مجالی کا کہنا ہے کہ ٹرمپ کے نئے دور میں اس امن منصوبے کی واپسی کے امکانات بہت زیادہ ہیں لیکن ضروری نہیں کہ یہ اسی شکل اور شرائط میں دوبارہ پیش کیا جائے۔ مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ واشنگٹن کے مطابق دنیا "صدی کے معاہدہ" نامی امن منصوبے کو ایک ترمیم شدہ، تبدیل شدہ شکل میں دیکھیں گے اور ٹرمپ اسے "ڈیل آف دی سنچری 2" کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ برطانوی تجزیہ نگار کے مطابق اس ممکنہ نئے مسودے میں "فلسطینیوں کے سیاسی حقوق کے معاملے کو بالآخر حتمی طور پر ختم کرنے اور انہیں کچھ اقتصادی حقوق دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امن منصوبہ اپنی پرانی شکل میں "اب درست نہیں رہا"۔ اور فی الحال نئے زمینی حقائق نئی تجاویز کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔

ٹرمپ صرف معاہدوں کے حوالے سے سوچتے ہیں اور یہ فرض کرتے ہیں کہ انہیں معاملات کا بہتر علم ہے اور اس سوچ کے تحت وہ مذاکرات کا حصہ بنیں گے اور ایسے معاونین کے گروہ سے متاثر ہوں گے جن کی اکثریت صیہونی نظریے کی حامی ہے۔ اس امن معاہدے میں اثر انداز ہونے والے دیگر فریقین جن میں فلسطینی، عرب اور اسلامی ممالک ہیں کہ وہ اسے کسی حالت میں قبول نہیں کریں گے اور زمینی حالات اور بگاڑ سے علاقائی اور عالمی امن کو درپیش عالمی امن کیلئے ناقابل برداشت ہو گا۔ تاہم گذشتہ سال کے واقعات اس کی بنیاد ہوں گے اگر ٹرمپ انتظامیہ ایک نئی ڈیل تجویز کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے سابقہ امن منصوبے کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایک اور نئے معاہدے کے بارے میں بات کر رہے ہیں، جس میں زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے دو ریاستی حل کی طرف فریقین کو حقیقی انداز میں مجبور کیا جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ اسرائیل کے اب تک کے عمل میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کی پشت پناہی شامل ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسرائیلی امور کے ماہر تجزیہ کار مجالی کے مطابق مسئلہ فلسطین کا "دو ریاستی حل ہی مثالی حل ہے۔ دو ریاستی حل کا معاملہ اب بھی حقیقت پسندانہ اور مناسب حل ہے، حالانکہ موجودہ اسرائیلی حکومت امن پسند حکومت نہیں ہے۔ دو ریاستی حل کو دنیا نے قبول کیا ہے، اور اسے ترک نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ "اسے ترک کرنا ان لوگوں کی خدمت ہے جو مکمل اسرائیلی سرزمین کے نظریے کے حامی ہیں، جو فلسطینی عوام کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتے"۔

یقیناً سعودی عرب اور خطے کے دیگر ممالک بھی اس تجویز کی حمایت کرتے ہیں کہ دو ریاستی حل وہ آپشن ہے جو ابھی بھی میز پر ہے کیونکہ یہ سب کے مفادات کو مدنظر رکھتا ہے، اور واضح طور پر فلسطینی ریاست کے قیام کے اصول کو متعین کرتا ہے اور جو عرب فریقین کیلئے سب سے اہم نکتہ ہے۔ یہ وہ بنیاد ہو گی جس سے اسرائیل کے تعلقات معمول پر لانے اور اسے تسلیم کرنے کے معاملے پر نئے سعودی امریکی مذاکرات شروع ہو سکتے ہیں۔ خطے کے

موجودہ حالات کے پیشِ نظر دوریاستی حل کا آپشن ہی بچاہے جسے عرب ممالک، خاص طور پر سعودی عرب خطے کے دیگر ممالک قبول کرسکتے ہیں۔

دوریاستی حل ایک ایسا حل ہے جس سے خطے کے علاوہ بیشتر اسلامی ممالک سیاسی طور پر چمٹے ہوئے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمینی حقائق میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آرہااور نہ ہی مستقبل میں یہ ہوگا، اوراس طرح یہ اپنی مجوزہ شکل میں ہی ختم ہونے کی طرف بڑھ رہاہے۔ٹرمپ اپنے دورحکومت میں اقوام عالم کی طرف سے منظوردوریاستی حل کے آپشن کو ختم کرنے کیلئے کوئی نیامنصوبہ بھی پیش کر سکتے ہیں جوخطے کے جغرافیہ سے جڑاہوانظر آئے جس میں اسرائیل کو طاقتور ملک بناکر خطے میں امریکی حاکمیت کو مضبوط کیاجائے۔اسرائیل نے غزہ جنگ کو غزہ سے لے کر مقبوضہ مغربی کنارے اور لبنان سے لیکر گولان کی پہاڑیوں تک اور حتیٰ کہ اردن کے ساتھ سرحد تک کو دوبارہ کھینچنے کیلئے ایک سیکورٹی بہانے کے طور پر استعمال کیاہے۔اسرائیل کو سیکورٹی کے نظریے کے مطابق دوبارہ ترتیب دینے کی خواہش ہے، اوراس طرح سے فلسطینی ریاست کے وجودیادوریاستوں کے درمیان بقائے باہمی کاتصوراور خیال کم ہوجائے گااوراسرائیل ٹرمپ انتظامیہ پر زمینی مسائل کیلئے ایک عملی حل نکالنے کیلئے دباؤڈالے گا۔

اس سلسلے میں قوی امکان ہے کہ ٹرمپ کے منصوبے میں اسرائیل کے زیرقبضہ مغربی کنارے کے بڑے علاقوں کاالحاق شامل کرنے کے بعد، اسرائیل سرحدوں کو دوبارہ بنانے، زمینوں کو ملحق کرنے، اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے، اورنئے بفرزونزبنانے کیلئے سیکورٹی جغرافیہ کو دوبارہ ترتیب دینے کے عمل سے فائدہ اٹھائے گا۔جس کیلئے ٹرمپ نے آرکنساس کے سابق گورنرمائیک ہکابی کو اسرائیل میں اگلے امریکی سفیر کے طور پر منتخب کیاہے، جنہوں نے 2017 میں کہاتھاکہ "مغربی کنارے جیسی کوئی چیز نہیں ہے، یہ یہودیہ اور سماریہ ہے۔اسرائیلی بستیوں کے نام جیسی کوئی چیز نہیں ہے، یہ برادریاں ہیں، یہ محلے ہیں، یہ شہرہیں۔قبضے جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی کنارے پر فلسطینی آبادی پر مشتمل علاقوں کے علاوہ جہاں پر خودمختاری کا مکمل اعلان نہیں کیاجاسکتا، اسرائیل ایساکچھ کرنے پر بھی زورڈال سکتاہے کہ مغربی کنارے کااسرائیل کے ساتھ الحاق جاری رہے جہاں تمام اختیارات اسرائیل کے پاس ہوں۔جس کاثبوت یہ ہے کہ اس ماہ مغربی کنارے میں اسرائیلی بستیوں کے ذمہ دار اسرائیلی وزیربیزلیل سموٹریچ نے اپنی وزارت کو مغربی کنارے میں بستیوں پر مکمل اسرائیلی خودمختاری مسلط کرنے کی تیاری شروع کرنے کی ہدایت کی ہے۔

ادھردوسری طرف سعودی عرب یہ سمجھتاہے کہ اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی وسیاسی تعلقات کی بحالی صرف ان دوممالک کے درمیان ہی نہیں بلکہ یہ اسلامی دنیااوریہودیت کے درمیان تعلقات کی بحالی ہے، لہٰذایہ صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی اہمیت کے حامل بھی ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ سعودی عرب مسئلہ فلسطین کیلئے دوریاستی حل پر مضبوط مؤقف اپنائے ہوئے ہے اورریاض میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں ولی عہد محمد بن سلمان کے خطاب نے امریکااوراس کے اتحادیوں مغربی ممالک کو واضح پیغام دیاہے۔

ولی عہد کواس بات کامکمل ادراک ہوچکاہے کہ سعودی عرب کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی وسیاسی تعلقات بحال ہونے کافائدہ ریاض سے زیادہ امریکا

اوراسرائیل کو پہنچتا ہے کیونکہ یہ اسرائیل کو صرف عرب دنیا ہی میں نہیں بلکہ اسلامی دنیا میں ایک قابل قبول ملک بنادے گا اور سعودی عرب کیلئے یہ ایک بہت بڑی اور بھاری قیمت ہے جبکہ اسرائیل کو ایک فلسطینی ریاست جس کا دارالحکومت مشرقی یروشلم ہو، کو تسلیم کرکے خطے میں امن کی یہ ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔

اس امکان کے باوجود کہ فلسطینی کسی بھی عرب ملک کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات معمول پر آنے کو قبول نہیں کریں گے، موجودہ وقت میں اس مسئلے کا نقطہ نظر مختلف ہونا چاہیے۔ وہ ممالک جن کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات ہیں وہ آزاد ریاستیں ہیں جن کے اپنے مفادات ہیں، اور فلسطینیوں کو ان میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، اگر وہ (ممالک) سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں ان کا مفاد ہے تو یہ ان کا اندرونی معاملہ ہے۔ اگر فلسطینیوں کو لگتا ہے کہ یہ تعلقات ان کے قومی حقوق پر اثرانداز ہوسکتے ہیں تو وہ دوستانہ طریقے سے ان ممالک کی اس طرف توجہ مبذول کروائیں۔

اہم سفارتی ذرائع کے مطابق ان سفارتی تعلقات کی بحالی کو استعمال کرتے ہوئے اسلامی ممالک "اسرائیلی قبضے سے فلسطین کی آزادی اور ایک فلسطینی ریاست کے قیام اور فلسطینی نظریات پیش کرکے ان کی مدد کرسکتے ہیں اور جس منصوبے کے بارے میں بات کی جارہی ہے اس میں اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان ایک جامع امن پلان شامل ہے، جس کے بدلے میں اسرائیل کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے، اور ہمیں اسی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

یاد رہے کہ اس ماہ سعودی وزیر خارجہ شہزادہ فیصل بن فرحان نے بھی اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کیلئے فلسطینی ریاست کے قیام کی شرط رکھی تھی۔ سعودی عرب نے امریکی انتخابات سے پہلے یہ کہا تھا کہ دوریاستی حل کی شرط تعلقات میں بحالی کا نقطہ آغاز ہے، نہ کہ فلسطینی ریاست کے قیام کو سفارتی تعلقات کے ساتھ مشروط کرنا۔ سعودی عرب کو احساس ہے کہ طاقت کا توازن اس کے حق میں نہیں ہے، اور اس لیے وہ دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کی طرح اصولی مؤقف اختیار کیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس وقت غزہ میں جنگ کے دوران ان پتوں کو استعمال کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

ٹرمپ کے ممکنہ اگلے امن منصوبے سے متعلق اُردن اور مصر کی جانب سے کسی بھی نتائج یا کردار سے متعلق خدشات، خصوصاً فلسطینیوں کو ان ممالک میں بھیجنے کے امکان پر سرکاری امریکی مؤقف اب بھی قاہرہ اور عمان کے اصرار کو مدنظر رکھتا ہے۔ مسئلہ فلسطین کو ختم کرنے اور کسی بھی تصفیے کو مسترد کرنے کا بوجھ "فلسطینیوں کو ان ممالک کی طرف جانے کیلئے دھکیلنے" کا باعث بن سکتا ہے۔ اس وقت "سٹیٹس کو" کی پالیسی اپنائی جارہی ہے اور سب نے غزہ جنگ، رفح بارڈر کی بندش اور مغربی کنارے کے شمالی علاقوں پر اسرائیلی کنٹرول کی مخالفت کی ہے۔

آنے والے برسوں میں تمام رہنما اس مسئلہ کے عملی حل کے بارے میں سوچیں گے جو زمینی حقائق اور جغرافیائی تبدیلیوں کو مدنظر رکھ کر نکالا جائے گا اور جسے اسرائیل پیش کرے گا۔ جب "صدی کے معاہدے" کی تجویز پیش کی گئی تھی تو اس وقت اردن نے اپنے وزیر خارجہ ایمن صفادی نے "کسی بھی یکطرفہ اسرائیلی اقدامات کے خطرناک نتائج سے خبردار کیا تھا اور 1967 کی سرحدوں پر مبنی دوریاستی حل کی پاسداری پر زور دیا تھا۔ مصری وزارت خارجہ نے کہا تھا کہ "قاہرہ مسئلہ فلسطین کو بین الاقوامی قانونی جواز اور اس کے فیصلوں کے مطابق حل کرنے کے حوالے سے امریکی اقدام کی اہمیت

کو سمجھتا ہے۔ تاہم امریکی اسرائیل نواز تھنک ٹینک کے حلقوں میں بڑھتے ہوئے نقطہ نظر کی بات کی جائے تو وہ عرب ممالک کو فلسطینیوں کے تئیں اپنی انسانی ذمہ داریاں ادا کرنے پر زور دے رہے ہیں لیکن خطے کے ممالک کو اس بات کا بخوبی ادراک ہو گیا ہے کہ ایسے مرحلے میں ان کو کیسے دباؤ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اسلامی کانفرنس ریاض میں ولی عہد محمد بن سلمان نے اسی دباؤ کے جواب میں امریکا اور اس کے تمام اتحادیوں سمیت اسرائیل کو جو واضح پیغام دیا ہے وہ دراصل ایران کی حمائت سے کہیں زیادہ خطے کے ممالک کو اسرائیل کے خطرہ سے آگاہ کرنا مقصود ہے اور سعودی عرب نے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کا اعلان ہے۔ امریکا اور مغربی یورپ سعودی عرب کی طرف سے غیر متوقع اعلان کے پیچھے چین کی اس خاموش سفارتکاری کی کامیابی بھی سمجھتا ہے جس کو خطے کے تمام ممالک سے امریکی اثرورسوخ کے دفن اور کفن کی علامات سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے۔ کیا امریکا اسرائیل کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی پالیسی پر عملدرآمد کرنے کی کوشش کرے گا یا پھر اسرائیل امریکا میں اپنے دوستوں کو مدد کیلئے پکارے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو ٹرمپ کا وائٹ ہاؤس میں قیام مختصر بھی ہو سکتا ہے

بروز جمعرات 11 جمادی الآخر 1446ھ 12 دسمبر 2024ء

مالیاتی عالمی نظام میں یو آن اور ڈالر کا مستقبل

میں اپنے گزشتہ کئی کالمز میں نومنتخب ٹرمپ کی نئی کابینہ کی نامزدگیوں کے بعد ان خدشات کا اظہار کرچکا ہوں کہ دنیا میں سرد جنگ کے امکانات میں اس قدر اضافہ ہوجائے گا کہ امریکا کا "واحد سپرپاور "کا دعویٰ ختم ہوتا نظر آئے گا۔ یہ بھی مکافاتِ عمل ہے کہ جس افغانستان میں روس کو بدترین شکست کے بعد ٹوٹنے کا صدمہ برداشت کرناپڑااورامریکا دنیا کی واحد سپرپاور بن گیا، اسی افغانستان سے رسوائی کے ساتھ نکلنے کے بعد اب یوکرین میں اپنے عالمی ٹائیٹل کے دفاع کی آخری جنگ لڑرہاہے۔

ٹرمپ نے 20 جنوری کو حلف اٹھانے سے قبل اس حوالے سے سوشل میڈیا پر برکس کے 9 ممالک کو دھمکی دی ہے "اگرانہوں نے امریکی ڈالر کے مقابلے میں لین دین کیلئے کسی نئی کرنسی کا انتخاب کیاتوان پر 100 فیصد تک ٹیرف عائد کردیاجائے گا۔ یہ خیال کہ برکس ممالک ڈالر سے دور ہونے کی کوشش کریں گے اور ہم دیکھتے رہیں گے، اب نہیں چلے گا۔' واضح رہے کہ عالمی طاقتیں چین اورروس برکس کا حصہ ہیں جس میں برازیل، انڈیا، جنوبی افریقا، ایران، مصر، ایتھیوپیا اور متحدہ عرب امارات بھی شامل ہیں۔ صدارتی انتخابات سے قبل مہم کے دوران ٹرمپ نے وسیع پیانے پر ٹیرف لگانے کا عندیہ دیا تھا لیکن حالیہ دنوں میں اس بارے میں دھمکی آمیز بیانات میں اضافہ ہوگیاہے۔ یادرہے کہ برازیل اورروس کے سرکردہ سیاستدان تنظیم کی اپنی کرنسی بنانے کا مشورہ دے چکے ہیں جس کا مقصد عالمی تجارت میں امریکی ڈالر پر انحصار کم کرنا ہے لیکن تنظیم کے اندر اختلافات کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔

تاہم ٹرمپ نے اپنے سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر لکھاہے کہ 'ہم ان ممالک سے یہ ضمانت چاہیں گے کہ وہ نہ تو نئی برکس کرنسی بنائیں گے اور نہ ہی امریکی ڈالر کی جگہ لینے کیلئے کسی دوسری کرنسی کی حمایت کریں گے ورنہ ان کو سوفیصد ٹیرف کا سامنا کرناہوگا اوروہ امریکی معیشت میں تجارت کو خیرباد کہنے کی توقع رکھیں اور کسی اور کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔ ٹرمپ کے چند حامیوں کا ماننا ہے کہ یہ اعلانات مذاکرات کی حکمت عملی ہیں جن کا مقصد اعلان سے زیادہ بات چیت کیلئے ماحول پیدا کرنا ہے۔ ٹرمپ کے حالیہ اعلان کے بعد ریپبلکن سینیٹر ٹیڈ کروز نے کہاکہ 'میکسیکو اور کینیڈا کے خلاف ٹیرف کی دھمکی نے فوری نتائج دیے تھے۔

آخر یہ ٹیرف کیاہوتاہے اوراس دھمکی کے کیااثرات ہوسکتے ہیں؟ ٹیرف کسی بھی ملک کا وہ اندرونی ٹیکس ہوتاہے جوملک میں آنے والی مصنوعات پر عائد کیا جاتاہے یعنی امریکا میں اگر 50 ہزار ڈالر قیمت کی گاڑی درآمد کی جاتی ہے جس پر 25 فیصد ٹیرف عائد ہے تو 12500 ڈالر اضافی خرچ ہوگا۔ ٹیرف ٹرمپ کی معاشی سوچ کا مرکزی حصہ ہیں اور وہ انہیں امریکی معیشت کو ترقی دینے، مقامی طور پر نوکریوں کو تحفظ دینے اور ٹیکس آمدن بڑھانے کیلئے کارآمد سمجھتے ہیں ۔ ماضی میں یہ دعویٰ کرچکے ہیں کہ 'یہ ٹیکس ایک دوسرے ملک کی جیب پر بھاری پڑیں گے، مقامی سطح پر نہیں۔

تاہم ماہرین معیشت اس دعوے کو گمراہ کن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اضافی قیمت اس مقامی کمپنی کو اداکرناہوتی ہے جو مصنوعات درآمد کرتی ہے نہ کہ غیرملکی کمپنی کو۔ اس اعتبار سے دیکھاجائے تو یہ ایک ٹیکس ہے جو مقامی کمپنیوں امریکی حکومت کو اداکرتی ہیں۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے دورِ صدارت میں ٹیرف لگائے تھے جنہیں بعد میں جو بائیڈن انتظامیہ نے بھی برقرار رکھا تھا۔ توکیاامریکی ڈالر کا متبادل ممکن ہے؟ لیکن اس سے قبل یہ جانتے ہیں کہ متعدد کی طاقتور کرنسی کیسے بنا؟

دوسری جنگ عظیم اختتام پذیر ہو رہی تھی کہ اتحادیوں کو یہ نظر آنا شروع ہوا کہ ان کی اپنی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ جب بحالی کا عمل شروع ہو گا تو بین الاقوامی تجارت کس کرنسی میں ہو گی۔ اس وقت 44 ممالک کے نمائندے 22 دن کیلئے امریکا میں بریٹن وڈز قصبے کے ماؤنٹ واشنگٹن ہوٹل میں اکھٹے ہوئے۔ یہاں جنگ کے بعد عالمی معیشت اور تجارت کے مستقبل پر مذاکرات ہوئے۔ یورپی ممالک جنگ کے نتیجے میں تباہ حال تھے جبکہ امریکا کے پاس دنیا میں سونے کے سب سے بڑے ذخائر تھے۔

ایڈ کونوے اپنی کتاب 'دی سمٹ' میں لکھتے ہیں کہ 22 دن تک شدید سیاسی لڑائی اور بحث ہوئی۔ اس دوران دو شخصیات میں دوبدو لڑائی بھی ہوئی جس میں برطانوی جان کینز ایک عالمی کرنسی کا تصور لیے ہوئے تھے جبکہ دوسری جانب امریکی محکمہ خزانہ کے ہیری ڈیکسٹر تھے۔ اس کانفرنس کے بعد طے ہوا کہ امریکی ڈالر بین الاقوامی تجارت کیلئے استعمال کیا جائے گا اور اسی ملاقات میں بنائے جانے والے ادارے، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، جنگ کے بعد معاشی مشکل کا سامنا کرتے ممالک کو امریکی ڈالر میں ہی قرض دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ "کیا ڈالر کا کوئی متبادل ہے؟"

ذخائر رکھنے کیلئے مغربی کرنسیوں کا واحد متبادل یو آن ہو سکتا ہے لیکن اس کیلئے چین کو بہت کچھ بدلنا ہو گا۔ اصلاحات اور شفافیت، بچت کی ترغیبات، سرمائے کی نقل و حرکت کے کنٹرول کے خاتمے کی ضرورت ہے۔ لیکویڈیٹی ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ چین اپنی مالیاتی منڈیوں اور سرمائے کی برآمدات دونوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری پر پابندی لگاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق اگر یہ پابندیاں ہٹا دی جاتی ہیں، تو نجی سرمایہ ان کے دائرہ اختیار میں جائے گا تاہم ماہرین اقتصادیات تسلیم کرتے ہیں کہ یو آن آہستہ آہستہ ایک ریزرو کرنسی بن سکتا ہے۔ امریکی اور یورپی ماہرین اقتصادیات نے ایک حالیہ تحقیق کے مطابق چین اپنی کرنسی میں تجارتی تصفیوں کو فعال طور پر فروغ دے رہا ہے، اس طرح اس کے تجارتی شراکت داروں کے مرکزی بینکوں میں یو آن جمع ہو رہے ہیں۔

انہی ماہرین کے مطابق 'چین کی اپنی کرنسی کو بین الاقوامی بنانے کی کوشش یو آن کے غلبہ کو یقینی نہیں بنائے گی، بلکہ ایک کثیر قطبی کرنسی کی دنیا جہاں ڈالر، یورو اور یو آن ایک ساتھ موجود ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے مگر ایسا ہونا ابھی بہت دور ہے۔ یو آن میں پیسے رکھنے کے قابل ہونا ایک چیز ہے، اس کی خواہش کرنا دوسری چیز۔ دوسری طرف دنیا بھر میں ڈالر کی خرید و فروخت کی صلاحیت لامحدود ہے جبکہ یو آن کی تجارت چین سے باہر صرف ہانگ کانگ اور چند درجن چھوٹے مراکز میں ہوتی ہے۔

20ویں صدی کے وسط سے دنیا پر امریکی کرنسی یعنی ڈالر کا غلبہ ہے اور گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران متعدد مواقع پر اس غلبے کے ٹوٹنے، ختم ہونے یا کمزور پڑنے کی پیش گوئیاں کی جاتی رہی ہیں۔ یکم جنوری 1999 میں یورپی کرنسی 'یورو' کے متعارف ہونے کے بعد اور 2008 میں امریکا سے شروع ہونے والے عالمی مالیاتی بحران کے بعد بھی امریکی ڈالر کے حوالے سے خدشات کا اظہار کیا گیا۔ گذشتہ سال روس کے یوکرین پر حملے کے بعد بھی ڈالر کے خاتمے کی بات کی گئی مگر یہ کرنسی بدستور بڑی کرنسی کی صورت میں دنیا میں موجود ہے۔

مگر آیئے دیکھتے ہیں کہ پچھلی دہائی میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں اور ڈالر کی تنزلی کے حوالے موجودہ پیشین گوئیاں کیا توجہ دینے کے قابل ہیں؟ ڈالر کے مقابلے میں تین حقائق کا حوالہ دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے، امریکا کے بڑے حریف چین نے اقتصادی اور کاروباری حجم کے لحاظ سے یورپی یونین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب چین امریکی مارکیٹ پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔ دوسرا، امریکا میں موجود سیاسی تنازعات امریکا کی انتہائی قابل بھروسہ قرض لینے والے اور قرض

دینے والے کے طور پر ساکھ کو نقصان پہنچاتے ہیں جس کی ایک مثال گذشتہ ماہ ڈیفالٹ کے خطرے کی صورت میں سامنے آئی۔

تیسرا، امریکابہت تیزی سے ان ممالک کو سبق سکھانے کیلئے ڈالرز کا استعمال کر رہا ہے جو اس کے مطابق امریکایا اس کے اتحادی ممالک کی سالمیت کیلئے خطرہ ہیں، یعنی سادہ الفاظ میں امریکا براہ راست جنگ میں ملوث ہونے یا کسی ملک پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے بے دریغ پیسے کا استعمال کر رہا ہے مگر ڈالر کی ساکھ میں مبینہ کمی کے پیچھے کار فرمایہ تینوں حقائق کچھ اتنے متاثر کن نہیں ہیں۔ گزشتہ ماہ امریکا ممکنہ ڈیفالٹ سے بچ گیا اور ایسا کرنے سے اس نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ وہ دنیا کا بنیادی اور قابل بھروسہ قرض دہندہ ہے۔ پھر ان شکوک کی کیا وجہ ہے کہ ڈالر اپنی مقبولیت کھو رہا ہے؟

ڈالر کے دواہم افعال ہیں جو اسے دنیا کی بنیادی کرنسی بناتے ہیں۔ سب سے پہلے، ڈالر ایک ریزرو کرنسی ہے یعنی جس کے پاس اضافی پیسہ ہے وہ اسے ڈالر کی شکل میں محفوظ رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرا، ڈالر اکاؤنٹ کی کرنسی ہے اور نہ صرف امریکابلکہ بیشتر دنیا کے ممالک اشیا اور خدمات کی ادائیگی ڈالر کے ذریعے کرتے ہیں۔ چین، روس، برازیل، انڈیا اور دیگر ترقی پذیر معیشتوں کی روپے اور یوآن کے ذریعے تجارت کرنے کی کوششوں کے باوجود ڈالر کی بطور سیٹلمنٹ کرنسی پوزیشن اب بھی مضبوط ہو رہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ ان وجوہات پر بحث کی جائے، پہلے ڈالر کے اہم کام، یعنی بطور ریزرو کرنسی استعمال کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

گزشتہ سال کے آخر تک دنیا میں تقریباً 12 کھرب ڈالر مالیت کے کرنسی ذخائر جمع ہو چکے تھے۔ اس ریزرو کا تقریباً 60 فیصد امریکی ڈالر کی شکل میں ہے، لگ بھگ 20 فیصد یورو، 3 فیصد یوآن جبکہ باقی دوسری کرنسیاں ہیں تاہم، آئی ایم ایف کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ریزروز میں ڈالر کا حصہ کم ہو رہا ہے اور 1995 کے بعد اس وقت یہ اپنی کم ترین سطح پر ہے۔ ڈالر کے ذخائر میں کمی کی حد اور رفتار پر گرما گرم بحث جاری ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ روس کے خلاف غیر معمولی مالی پابندیوں کی وجہ سے اس ضمن میں اب حالات بہت زیادہ کشیدہ ہیں۔

مورگن سٹینلے اور آئی ایم ایف میں کام کرنے والے کرنسی ماہرین کے مطابق 'ڈالر ریزرو کرنسی کے طور پر اپنا مقام پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے کھو رہا ہے۔ ان کے اندازے کے مطابق 2016 سے ڈالر نے ریزرو مارکیٹ میں اپنا حصہ 11 فیصد کھو دیا ہے اور یہ سلسلہ 2008 کے بعد سے دگنا ہوا ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے کرنسی ماہرین اس سے اتفاق نہیں کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ روس کے یوکرین پر حملہ کرنے کے بعد سے ریزرو کرنسی کی دنیا میں کچھ بھی زیادہ نہیں بدلا ہے۔

کونسل آن فارن ریلیشنز میں کرنسی کے ماہرین اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے مطابق درحقیقت 2022 سے ڈالر کے ذخائر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آئی ایم ایف کے اعداد و شمار میں ڈالر کے بطور ریزرو کمی کی وضاحت روس کے خلاف پابندیوں کے جواب میں امریکی کرنسی کو ترک کرنے سے نہیں بلکہ اس اہم اثاثے کی دوبارہ تشخیص سے ہوئی ہے جس میں جمع شدہ ڈالر کے ذخائر محفوظ ہیں، یعنی امریکی حکومت کے بانڈز۔ ان بانڈز کی قیمت گر رہی ہے کیونکہ امریکی قرضے پر شرح سود میں اضافہ ہوا ہے۔ 2022 میں، یہ دیگر ریزرو کرنسیوں کو جاری کرنے والے ممالک کے مقابلے میں تیزی سے

ہوا، جس کی وجہ سے ذخائر میں ڈالر کا حصہ کم ہوا ہے۔ اگر آپ امریکی حکومت کے بانڈز کی اس صورتحال کو آئی ایم ایف کے اعدادوشمار کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو آپ کو ڈالر کہیں بھاگتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ علاوہ ازیں 2022 میں کسی اور بڑی کرنسی کی عالمی سطح پر اتنی مانگ نہیں تھی جتنی ڈالر کی تھی۔

مالیاتی نظام کے مؤرخ نیل فرگوسن کا کہنا ہے کہ ڈالر کی بالادستی کے خاتمے کے بارے میں نصف صدی سے بھی زیادہ بات کی جارہی ہے۔ اپنے حالیہ دورہ

مالیاتی نظام کے مؤرخ نیل فرگوسن کا کہنا ہے کہ ڈالر کی بالادستی کے خاتمے کے بارے میں نصف صدی سے بھی زیادہ بات کی جارہی ہے۔ اپنے حالیہ دورہ
چین کے دوران برازیل کے صدر سے متعدد مواقع پر یہ سوال پوچھا گیا کہ "ہر کوئی ڈالر میں تجارت کیوں کرتا ہے، یہ فیصلہ کس نے کیا؟" حقیقت یہ ہے کہ یوروکی گردش کے 20 سالوں کے دوران، ڈالر نے عالمی ذخائر میں اپنا حصہ صرف 10 فیصد کھویا ہے، یعنی 21ویں صدی کے آغاز میں ذخائر میں اس کا تقریباً 70 فیصد تھا، اور اب یہ تقریباً 60 فیصد ہے۔ اس کا تعلق سٹاک سے ہے، حساب کتاب کی حد تک کچھ نہیں بدلا اور ڈالر اب بھی غالب کرنسی ہے۔
بینک فار انٹر نیشنل سیٹلمنٹس کے مطابق پچھلی تین دہائیوں میں ڈالر کا حصہ 80 فیصد سے 90 فیصد ہو گیا ہے۔ گزشتہ ایک دہائی میں بھی یہ مقبول رہا اور 2010 میں ڈالر کا تمام بین الاقوامی ادائیگیوں میں 85 فیصد حصہ تھا جو 2022 میں بڑھ کر 88 فیصد ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈالر اکاؤنٹ کی مرکزی کرنسی ہے جس کے باعث اس کی مرکزی ریزرو کرنسی کے طور پر بھی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے، کیونکہ دنیا سمجھتی ہے کہ اس کرنسی کو برے دنوں کیلئے بچانا اچھا ہے۔

اس کے علاوہ، ڈالر میں تمام ادائیگیاں دنیا کے سب سے بڑے امریکی بینکوں کے ذریعے کی جاتی ہیں، اور امریکی حکام اس کرنسی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ڈالر کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے تو دنیا اب تک ڈالر ہی میں کیوں تجارت کر رہی ہے؟ اسٹیفن لی جین دلیل دیتے ہیں کہ ڈالر وقت کے ساتھ تصفیہ کی کرنسی (سیٹلمنٹ کرنسی) کے طور پر اپنی جگہ کھو دے گا، تاہم ایسا مستقبل قریب کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ زور دیتے ہیں کہ کیونکہ دنیا میں امریکی مالیاتی منڈیوں کا سائز، استحکام یا کھلے پن کے لحاظ سے کوئی متبادل نہیں ہے اس لیے ڈالر کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ اس کی واضح مثال تیل ہے۔

انڈیا روسی خام تیل کی ادائیگی روپے میں کر سکتا ہے اور چین سعودی عرب کو تیل کے عوض یوآن میں ادائیگی کر سکتا ہے، مگر اس سب کے باوجود تیل کی عالمی منڈی کی اہم کرنسی اب بھی ڈالر ہے کیونکہ چند گنے چنے ممالک کی آپسی براہ راست تجارت کی نسبت تیل کے مالی معاہدوں کا حجم کہیں زیادہ ہے۔
ترقی پذیر ممالک میں صرف چین ہی دنیا کے مالیاتی مرکز کے طور پر امریکا کو چیلنج کر سکتا ہے لیکن اس کیلئے اسے سامان تجارت کی فراہمی کے مالی معاہدوں کیلئے اپنی کھلی اور لیکویڈ مارکیٹ بنانے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک کہ اگر سعودی عرب، دنیا کا سب سے بڑا تیل برآمد کرنے والا ملک، اپنا سارا تیل دنیا کے سب سے بڑے تیل کے خریدار یعنی چین کو یوآن میں فروخت کرنے پر راضی ہو جاتا ہے، تب بھی عالمی تیل کی منڈی میں شنگھائی انرجی ایکسچینج کا حصہ موجودہ 5 فیصد سے بڑھ کر صرف سات فیصد ہو جائے گا۔
اگر ایسا ہے تو کیا امریکا ڈالر کی وجہ سے خود ہی خوفزدہ ہے؟ سابق امریکی وزیر خزانہ لیری سمرز کے مطابق یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ڈالر نے بطور ریزرو کرنسی پاؤنڈ کی جگہ کیسے لی۔ تاریخ واضح ہے: ڈالر ریزرو کرنسی کے طور پر اپنی حیثیت کھو سکتا ہے لیکن جب ایسا ہو گا تو دنیا کو بہت سے دوسرے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ڈالر کا اپنی عالمی حیثیت کھو دینا صرف اس صورت میں ممکن ہو گا جب امریکا دنیا میں اپنا اثر ورسوخ کھو بیٹھے گا۔ یہ کافی نہیں

ہے کہ امریکا دنیا میں ڈالر کی بالادستی کی حمایت کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ ڈالر ایک بین الاقوامی کرنسی کے طور پر زبردست فوائد حاصل کر رہا ہے، جس کی بڑی وجہ بڑی، لیکویڈ اور اچھی طرح سے کام کرنے والی مالیاتی منڈیاں ہیں۔ اگر امریکا نئی غلطیاں کرتا رہتا ہے اور ماضی کا تجزیہ کرنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ وقت آئے گا جب دنیا ڈالر سے دور ہو جائے گی۔ بہت سے ممالک پہلے ہی اس سے دور ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، اگرچہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ 'چین یا سعودی عرب جیسے بڑے تجارتی سرپلس والے ممالک کے پاس اپنی بچت محفوظ رکھنے کیلئے اور کچھ نہیں ہے۔ کھربوں ڈالر کے اثاثوں کو ذخیرہ کرنے کا دنیا میں کوئی آسان اور لیکویڈ متبادل موجود ہی نہیں ہے۔ بعض معروف ماہرین تو یہاں تک دلیل دیتے ہیں کہ ڈالر کی بالادستی خود امریکا کیلئے نقصان دہ ہے کیونکہ دنیا کی اہم ترین ریزرو کرنسی کا اجرا کنندہ ہونا کوئی استحقاق نہیں بلکہ ایک بوجھ ہے۔

ڈالر کے اثاثوں کی مانگ امریکا کو بڑے تجارتی اور بجٹ خسارے کو پورا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ بیجنگ میں کارنیگی سینٹر کے امریکی ماہر معاشیات مائیکل پیٹس کے مطابق "یہ اچھا نہیں ہے۔ امریکا میں داخل ہونے والے غیر ملکی سرمائے سے سرمایہ کاری میں اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف بچت کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے اور ملکی قرض میں اضافہ کرتا ہے۔ مالی منڈیاں صرف ایک حد تک معیشت کی مدد کرتی ہیں، جس کے بعد وہ ملک کے بجائے بینکوں کو فائدہ پہنچانے کا باعث بنتی ہیں۔" ان کے مطابق "کمزور ہوتا ہوا ڈالر عالمی معیشت کو فائدہ دے گا لیکن یہ ان ممالک کیلئے انتہائی تکلیف دہ ہو گا جن کے پاس تجارتی سرپلس ہے۔" اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں کیا ڈالر کا کوئی متبادل ہے؟

مورخ فرگوسن کا اس پر بہت اچھا قول جو در حقیقت سابق امریکی وزیر خزانہ لیری سمرز کا تھا جن کے دستخط ڈالر کے نوٹ پر نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق "جو کچھ آپ کے پاس ہے اسے آپ اس سے بدل نہیں سکتے جو آپ کے پاس موجود نہیں ہے۔ ڈالر کا کوئی متبادل نہیں ہے کیونکہ "یورپ ایک میوزیم ہے ، جاپان ایک نرسنگ ہوم ہے، چین ایک جیل ہے اور بٹ کوائن ایک تجربہ ہے"۔

ذخائر رکھنے کیلئے مغربی کرنسیوں کا واحد متبادل یوآن ہو سکتا ہے لیکن اس کیلئے چین کو بہت کچھ بدلنا ہو گا۔ اصلاحات اور شفافیت، بچت کی ترغیبات، سرمائے کی نقل و حرکت کے کنٹرول کے خاتمے کی ضرورت ہے۔ لیکویڈیٹی ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ چین اپنی مالیاتی منڈیوں اور سرمائے کی برآمدات دونوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری پر پابندی لگاتا ہے۔ اگر یہ پابندیاں ہٹا دی جاتی ہیں، تو نجی سرمایہ ان کے دائرہ اختیار میں جائے گا۔ تاہم ماہرین اقتصادیات تسلیم کرتے ہیں کہ یوآن آہستہ آہستہ ایک ریزرو کرنسی بن سکتا ہے۔ امریکی اور یورپی ماہرین اقتصادیات نے ایک حالیہ تحقیق کے مطابق چین اپنی کرنسی میں تجارتی تصفیوں کو فعال طور پر فروغ دے رہا ہے، اس طرح اس کے تجارتی شراکت داروں کے مرکزی بینکوں میں یوآن جمع ہو رہے ہیں۔

ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ چین اپنی کرنسی کو بین الاقوامی بنانے کی کوشش میں یوآن کے غلبہ کو یقینی نہیں بنائے گا بلکہ ایک کثیر قطبی کرنسی کی دنیا جہاں ڈالر، یورو اور یوآن ایک ساتھ موجود ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے مگر ایسا ہونا ابھی بہت دور ہے۔ یوآن میں پیسے رکھنے کے قابل ہونا ایک چیز ہے، اس کی خواہش کرنا دوسری چیز۔ دنیا بھر میں ڈالر کی خرید و فروخت کی صلاحیت لامحدود ہے، جبکہ یوآن کی تجارت چین سے باہر صرف ہانگ کانگ اور چند درجن چھوٹے مراکز میں ہوتی ہے۔ تاہم ان وجوہات کی بناء پر مؤرخ فرگوسن کی بات قرین حقیقت ہے کہ ڈالر، یورو اور یوآن کے درمیان غلبے کی دوڑ کو "کچھوے کی دوڑ" کہہ سکتے ہیں اور امریکا کے حریف ڈالر کا متبادل تلاش کر رہے ہیں۔ ترقی یافتہ جمہوریتوں اور امریکا کے اتحادیوں کو ڈالر سے بالکل کوئی الرجی نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈالر کے زوال کیلئے دنیا میں امن قائم ہونا اشد ضروری ہے اور امریکی جنگی مافیا یہ ہونے نہیں دے گا۔

بروز ہفتہ 13 جمادی الآخر 1446ھ 14 دسمبر 2024ء

مشرق وسطیٰ: اسرائیل، فلسطین اور عالمی سیاست

قارئین کو اگر یاد ہو تو یکم اکتوبر 2024ء کو میں "گریٹر اسرائیل کا منصوبہ" کے عنوان سے جو آرٹیکل لکھا تھا اور آج شام سے بشارالاسد کے فرار اور موجودہ جاری حالات کو اسی تناظر کو دیکھ لیں تو خاکسار نے اپنے دلائل اور خدشات میں جو کچھ عرض کیا تھا، اس منظر نامہ کا آغاز شروع ہو گیا ہے۔ تاہم حماس کے سات اکتوبر 2023 کے حملے کے بعد سے خطے میں جاری کشیدگی اور بدلتی صورت حال میں اسرائیل کے اس تصور کو پہلے سے کہیں زیادہ حقیقت کے قریب سمجھا جارہا ہے۔ طاقت کے توازن میں تبدیلی اور علاقائی منظر نامے کی تشکیل نو اسرائیل کا کوئی نیا خواب نہیں ہے۔ وقت اور حالات نے میرے ناقدین کو ایک مرتبہ پھر کڑوے سچ کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔

متعدد بین الاقوامی فورمز پر اسرائیلی حکام اپنے ملک اسرائیل کے نقشے پکڑے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان تمام نقشوں میں کسی فلسطینی ریاست یا علاقے کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اسرائیلی وزیر اعظم نیتین یاہو نے اپنی تقریر میں اسرائیل کے دو نقشے پیش کیے۔ ان میں سے ایک نقشے میں ان تمام ممالک کو سبز رنگ میں دکھایا گیا جو اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے کا حصہ ہیں یا اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات کو بحال رکھنے کے خواہاں ہیں۔ سبز رنگ والے ممالک میں مصر، سوڈان، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، بحرین اور اردن شامل ہیں۔ دوسرے نقشے میں نیتن یاہو نے نہ صرف ایران اور خطے میں اس کے اتحادی ممالک شام، عراق، یمن اور لبنان کو سیاہ رنگ میں پیش کیا بلکہ ان علاقوں کو 'مکروہ' کہہ کر مخاطب کیا۔

موجودہ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیل نے شام پر اپنے فضائی حملوں کا آغاز کر دیا ہے۔ عالمی میڈیا میں اسرائیل نے تصدیق کی ہے کہ وہ شام پر مشتبہ کیمیائی ہتھیاروں اور میزائل بنانے والے مبینہ اہداف پر فضائی حملے کر رہا ہے۔ اسرائیلی وزیر خارجہ گیڈون سار نے بڑی مکاری سے ان حملوں کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ انھیں خدشہ ہے کہ بشار الاسد کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ ہتھیار 'شدت پسندوں کے ہاتھ' لگ سکتے ہیں اور اسرائیل ایسا ہونے سے روکنا چاہتا ہے۔ اسرائیلی وزیر دفاع اسرائیل کاٹز کا کہنا ہے کہ اسرائیلی فوج شام کے 'بھاری سٹریٹجک ہتھیاروں' کو تباہ کر دے گی جن میں میزائل اور فضائی دفاعی نظام بھی شامل ہیں۔

میڈیا رپورٹس بتاتی ہیں کہ پچھلے دو دنوں کے دوران اسرائیل نے شام میں درجنوں فضائی حملے کیے ہیں جن میں ایک حملہ دمشق میں مبینہ طور پر ایک ایسے مقام پر کیا گیا ہے جس کے بارے میں اسرائیل کا دعویٰ ہے کہ اسے ایرانی سائنسدان راکٹ بنانے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ دمشق کے قریب کیے گئے ایک اسرائیلی فضائی حملے کے بعد شام سے آنے والی میڈیا رپورٹس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس حملے میں 'کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کے ایک تحقیقی مرکز' کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ اسرائیلی فضائی حملے ایسے وقت ہوئے ہیں جب اقوام متحدہ کے کیمیائی ہتھیاروں پر نظر رکھنے والے ادارے نے شام میں حکام کو خبر دار کیا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ کیمیائی ہتھیاروں کے مشتبہ ذخیرے محفوظ ہیں۔

برطانیہ میں قائم ایک مانیٹرنگ گروپ 'سیریئن آبزرویٹری فار ہیومن رائٹس' (ایس او ایچ آر) نے پیر کو کہا ہے کہ اسرائیلی فوج نے ساحلی اور جنوبی شام میں پھیلے متعدد مقامات پر راتوں رات حملے کیے ہیں۔ سابق حکومت کے خاتمے کے اعلان کے چند گھنٹوں بعد ہی اسرائیل نے شدید فضائی حملے شروع کیے اور جان بوجھ کر ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ڈپوز کو تباہ کر دیا جبکہ گذشتہ روز ہیئت تحریر الشام نے شام میں کیمیائی ہتھیاروں کے متعلق اپنے ایک بیان

میں ’ہتھیاروں اور حساس مقامات کی نگرانی میں بین الاقوامی برادری کے ساتھ تعاون کیلئے مکمل یقین دہانی کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ’ہمارا کیمیائی ہتھیاروں یا کسی بھی نوعیت کی تباہی پھیلانے کے ہتھیاروں کے استعمال کا کوئی ارادہ یا خواہش نہیں ہے۔ہم کسی بھی صورت میں ان سائٹس یا ہتھیاروں کو غیر ذمہ دارانہ ہاتھوں میں نہیں جانے دیں گے۔ہم انھیں محفوظ بنانے کیلئے کام کر رہے ہیں۔‘

یہ اعلان اس خدشے کے بعد سامنے آیا تھا کہ مبینہ طور پر حلب کے جنوب میں کیمیائی ہتھیاروں کا ذخیرہ شامی باغی گروہوں کے ہاتھ آ گیا ہے۔اقوام متحدہ کے کیمیکل واچ ڈاگ آرگنائزیشن فار دی پروہیبیشن آف کیمیکل ویپنز (او پی سی ڈبلیو) کے مطابق کیمیائی ہتھیار ایک ایسا ہتھیار ہے جو اپنی زہریلی خصوصیات کے ساتھ کسی کو مارنے یا نقصان پہنچانے کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔او پی سی ڈبلیو کے مطابق ایسے گولہ بارود، آلات اور دیگر سامان جو زہریلے کیمیکلز سے ہتھیار بنانے کیلئے خاص طور پر تیار کیے گئے ہوں وہ بھی کیمیائی ہتھیاروں کی تعریف میں شامل ہیں۔یاد رہے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال بین الاقوامی انسانی قانون کے تحت ممنوع ہے، چاہے کوئی جائز فوجی ہدف موجود ہو یا نہ ہو۔

کیمیائی ہتھیار (سی ڈبلیو) کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ زہریلے کیمیکلز کی بنیاد پر تیار کیا جاتا ہے جو کسی بم یا توپ کے گولے جیسے ڈیلیوری سسٹم کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے یا داغا جاتا ہے۔اگرچہ یہ تعریف تکنیکی طور پر درست ہے لیکن اس صورت میں اس میں صرف محدود چیزیں شامل ہوں گی جنھیں کیمیائی ہتھیاروں کے کنونشن (سی ڈبلیو سی) کے تحت کیمیائی ہتھیار قرار دیا گیا ہے۔

سی ڈبلیو سی کے تحت کیمیائی ہتھیاروں کی تعریف میں تمام زہریلے کیمیکلز اور ان کے پیش رو شامل ہیں ماسوائے تب جب انھیں کنونشن کی اجازت کے تحت دیے گئے مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے اور اس اجازت نامے میں مقدار کا تعین بھی شامل ہوتا ہے۔

کیمائی ہتھیار کتنی اقسام کے ہوتے ہیں؟ کیمیائی ہتھیاروں کی مختلف اقسام ہیں:

☆نرو ایجنٹس: اعصابی نظام کو نقصان پہنچاتے ہیں (جیسے: سارین، وی ایکس)

☆ بلسٹر ایجنٹس: جلد، آنکھوں اور انسانی جھلیوں میں شدید جلن اور درد پیدا کرتے ہیں (جیسے: مسٹرڈ گیس)

☆چوکنگ ایجنٹس: سانس کے نظام کو متاثر کرتے ہیں (جیسے: فاسجین، کلورین)

☆بلڈ ایجنٹس: جسم کی آکسیجن استعمال کرنے کی صلاحیت کو متاثر کرتے ہیں (جیسے: سائنائیڈ مرکبات)۔

☆رائٹ کنٹرول ایجنٹس: عارضی جلن پیدا کرنے والے غیر مہلک ایجنٹس (جیسے: آنسو گیس)

☆چوکنگ یا دم گھٹنے والے ایجنٹ جیسے فاسجین پھیپھڑوں اور نظام تنفس پر حملہ کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ مہلک نرو ایجنٹ ہوتے ہیں جو دماغ کے پیغامات کو جسم کے پٹھوں تک پہنچانے میں مداخلت کرتے ہیں۔ان کا ایک چھوٹا سا قطرہ بھی بہت مہلک ہو سکتا ہے۔مثال کے طور پر 0.5 ملی گرام سے بھی کم ایک ایجنٹ ایک بالغ شخص کو مارنے کیلئے کافی ہے۔یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ سارین کو سائنائیڈ سے 20 گنا زیادہ مہلک سمجھا جاتا ہے۔اس کے کے چند منٹوں کے اندر ہی دم گھٹنے سے انسان کی موت ہو سکتی ہے۔ان تمام کیمیکل ایجنٹوں کو توپ خانے کے گولوں، بموں اور میزائلوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مبینہ کیمیائی ہتھیاروں کی مدد سے بشار الاسد نے کس طرح اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھی؟ بشار الاسد کی حکومت اور اُن کے روسی اتحادیوں پر الزام

ہے کہ انہوں نے مارچ 2011 سے شام میں شروع ہونے والی خانہ جنگی کے دوران مخالفین کے خلاف کئی مرتبہ کیمیائی ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ تاہم اسد حکومت اور روس نے ان رپورٹس کی ہمیشہ تردید کی ہے۔ تاہم فی الحال یہ معلوم نہیں ہے کہ شام کے پاس کتنے کیمیائی ہتھیار موجود ہیں اور یہ کہاں ہیں۔ البتہ خیال کیا جاتا ہے کہ سابق صدر بشار الاسد نے کیمیائی ہتھیاروں کے ذخیرے رکھے ہوئے تھے اور 2013 میں انھوں نے کیمیائی ہتھیاروں کے حملے سے متعلق جو اعلان کیا تھا وہ 'غلط' تھا۔

یاد رہے اگست 2013 میں دمشق کے قریب شامی حزب اختلاف کے زیر قبضہ علاقے 'غوطہ' میں کیے گئے ایک مبینہ کیمیائی حملے میں (جس میں نرو ایجنٹ سارین شامل تھا) 1400 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مغربی ممالک اور شامی حکومت کے مخالف گروہوں نے اس حملے کا ذمہ دار بشار الاسد حکومت کو ٹھہرایا تھا تاہم اسد نے اس حملے کا الزام حزب اختلاف پر عائد کیا تھا۔ دمشق نے اس وقت اس حملے میں ملوث ہونے کی سختی سے تردید کی تھی۔ اُس وقت امریکا نے شام کو فوجی کارروائی کی دھمکی دی تھی لیکن پھر اسد کے اہم اتحادی روس نے اسے ملک میں موجود کیمیائی ہتھیاروں کے خاتمے پر رضامند کر لیا۔

بین الاقوامی دباؤ اور دھمکیوں کے تحت بشار الاسد کیمیائی ہتھیاروں کے ذخائر کو ختم کرنے پر رضامند ہوئے اور او پی سی ڈبلیو کے کیمیائی ہتھیاروں کے معاہدے پر دستخط کیے جس کے بعد شام میں 1300 ٹن کیمیکل کو تباہ کیے گئے تھے تاہم عالمی اداروں کے مطابق ملک میں مبینہ کیمیائی ہتھیاروں کے حملے جاری رہے اور بعد میں ہتھیاروں کے معائنہ کاروں نے ایسے شواہد دریافت کیے جو او پی سی ڈبلیو کی نگرانی میں 1997 کے کیمیائی ہتھیاروں کے کنونشن کی خلاف ورزی کی نشاندہی کرتے تھے۔

2014 سے او پی سی ڈبلیو کے فیکٹ فائنڈنگ مشن نے شام میں زہریلے کیمیکلز کے استعمال کے الزامات کی تحقیقات کی ہیں۔ انھوں نے اس بات کا تعین کیا ہے کہ ستمبر 2013 سے اپریل 2018 کے درمیان 37 واقعات میں کیمیکلز کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا یا ان حملوں میں ان کے کے استعمال کا امکان ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کے بین الاقوامی کمیشن برائے انکوائری کے مطابق شام میں 18 دیگر واقعات میں بھی کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا ہے۔

2018 میں عالمی میڈیا کے تجزیے میں 164 رپورٹوں کا جائزہ لیا گیا جس کے بعد اس بات کی تصدیق ہوئی کہ 2014 سے 2018 کے درمیان شام کی خانہ جنگی میں کم از کم 106 بار کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ حملے شمال مغربی صوبے ادلب میں ہوئے۔ اعداد و شمار کے مطابق ہمسایہ صوبوں حما اور حلب اور دمشق کے قریب مشرقی غوطہ کے علاقے میں بھی بہت سے واقعات میں کیمیائی حملے ہوئے۔ یاد رہے یہ تمام علاقے جنگ کے دوران مختلف اوقات میں اپوزیشن کے گڑھ رہے ہیں۔

جن مقامات پر مبینہ کیمیائی حملوں کے نتیجے میں سب سے زیادہ ہلاکتیں ہوئی ہیں وہ صوبہ حما میں کفر زیتا اور مشرقی غوطہ میں دوما تھے۔ دونوں قصبوں میں

مخالف جنگجوؤں اور حکومتی فورسز کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ سب سے مہلک واقعہ 4 اپریل 2017 کو صوبہ ادلب کے قصبے خان شیخون میں پیش آیا۔ 4 اپریل 2017 کو شمالی شام کے خان شیخون میں گیس کے حملے میں تقریباً 100 افراد مارے گئے۔ او پی سی ڈبلیو اور اقوامِ متحدہ کے مشترکہ تحقیقاتی مشن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس دن رہائشیوں کی ایک بڑی تعداد سارین سے متاثر ہوئی تھی لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والا زہریلا کیمیکل کلورین تھا۔

اقوام متحدہ کے کیمیکل واچ ڈاگ آرگنائزیشن فار دی پروہیبیشن آف کیمیکل ویپنز کی تحقیقات کے مطابق خانہ جنگی کے دوران شام کی حکومتی فورسز نے سرین نروایجنٹ اور کلورین بیرل بموں کا استعمال کیا، جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ او پی سی ڈبلیو کے مطابق ان کی انویسٹیگیشن اور آئیڈینٹیفکیشن ٹیم (آئی آئی ٹی) کی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ 4 فروری 2018 کی رات سراقب کے خلاف حملوں کے دوران ایلیٹ ٹائیگر فورسز یونٹ کے زیر کنٹرول شامی عرب فضائیہ کے فوجی ہیلی کاپٹر نے کم از کم ایک سلنڈر گرا کر قصبے کے مشرقی حصے کو نشانہ بنایا۔

یاد رہے کلورین کا دوہرا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسے جائز پرامن مقاصد کیلئے بھی استعمال کی جاتا ہے لیکن سی ڈبلیو سی کے مطابق بطور ہتھیار اس کے استعمال پر پابندی ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا تھا کہ 'یہ سلنڈر پھٹنے سے زہریلی گیس کلورین خارج ہوئی جو ایک بڑے علاقے میں پھیل گئی جس سے 12 افراد متاثر ہوئے تھے لیکن یہ معمہ ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ دیگر 105 حملوں کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟ جے آئی ایم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلسٹر ایجنٹ سلفر مسٹرڈ پر مشتمل دو حملے نم نہاد داعش نے کیے تھے اور اعداد و شمار کے مطابق ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ داعش نے تین دیگر مبینہ حملے بھی کیے تھے۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردوغان نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں اسرائیل کے عزائم کو نفرت انگیز قرار دیتے ہوئے خبردار کیا کہ "وہ دجلہ اور فرات کے درمیان ہمارے وطن کی سرزمین ہتھیانے کا خواب دیکھتے ہیں اور کیونکہ وہ غزہ کو قبول نہیں کرنا چاہتے، وہ اس کا اظہار اپنے نقشوں سے کر رہے ہیں" ۔ کارنیگی مڈل ایسٹ سینٹر کے ایک سینیئر فیلو کے مطابق "اس وقت نیتن یاہو جو نئے مشرق وسطیٰ کی صورت میں مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا مقصد فلسطینی علاقوں کو اسرائیل کی کالونی بنانا ہے۔ اسرائیل خاص طور پر مغربی کنارے میں اپنے آبادکاری کے منصوبے کو توسیع دینے کے ارادوں سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ عرب اور بین الاقوامی تنقید کے باوجود بستیوں کی تعداد بڑھانے کے ارادے کا اعلان کر چکا ہے۔

واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ پالیسی کے مطابق "اسرائیل کی دائیں بازو کی حکومت میں متعدد وزرا دو ریاستی حل پر یقین نہیں رکھتے اور اب ہم 1993 میں اوسلو معاہدے کے بعد سے ایک فلسطینی ریاست سے دور نظر آتے ہیں۔ لگتا یہ ہے امریکا ان اسرائیلی نقشوں کو منظور نہیں کرے گا جن میں فلسطینی علاقے شامل نہ ہوں کیونکہ نئے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں اسرائیلی نظریہ ایرانی خطرات سے پاک خطہ قائم کرنا مقصود ہے لیکن سکیورٹی امور کے ماہر اور ریٹائرڈ اسرائیلی انٹیلیجنس افسر میری آئزن نے اس موقف کی نفی کی اور کہا کہ 'اسرائیل ایک نیا مشرق وسطیٰ مسلط کرنا نہیں چاہتا تاہم اسرائیل یہ یقینی بنانا چاہتا ہے کہ ایران کی سخت گیر حکومت مشرق وسطیٰ کی علاقائی ترتیب پر اثرانداز نہ ہو۔

دراصل نیتن یاہو کے الفاظ کا مقصد ایران کے جوہری پروگرام کو ختم کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اب وہ اپنی اس تاریخی حیثیت کو دوبارہ بحال کرنا چاہتا ہے جو سات اکتوبر 2023 کو حماس کے حملوں کے بعد متاثر ہوئی اور جس میں اسرائیل کو عالمی سطح پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ بیروت کے جنوبی مضافاتی

علاقے میں کیے جانے والے ایک بڑے اسرائیلی حملے میں حزب اللہ کے سیکریٹری جنرل حسن نصر اللہ کی ہلاکت کو جنگ میں ایک اہم جغرافیائی اور سیاسی موڑ سمجھا جارہا ہے۔

یاد رہے کہ ایران نے اسرائیل پر متعدد بیلسٹک میزائلوں سے یکم اکتوبر کو حملہ کیا۔ اس حملے کو ایران اپنی سرزمین پر حماس کے سیاسی سربراہ اسماعیل ہنیہ کی ہلاکت کا بدلہ قرار دے رہا ہے جبکہ اسرائیل نے 'اپنی مرضی کے وقت اور مقام پر' جواب دینے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ امریکا اپنی سٹریٹیجک برتری کو یقینی بنانے کیلئے اسرائیل کی حمایت کرتا ہے اور بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث اس نے خطے میں اپنی فوج کی تعیناتی میں بھی خاطر خوا اضافہ کیا ہے تاہم یہ حمایت اس بات پر مشروط ہے کہ اسرائیل ان حدوں (سرخ لکیروں) کو عبور نہ کرے جن کا اعادہ امریکا سرکاری سطح پر کرتا رہا ہے۔ وہ حدیں ایرانی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنانا اور دو ریاستی حل کی جانب جانا ہیں۔

تاہم ٹرمپ نے اپنے گذشتہ اقتدار میں خطے میں حالات معمول پر لانے کے منصوبوں کے تناظر میں اقتصادی اور فوجی سپورٹ کی پیشکش کی اور اس دوران عرب ممالک پر زور دیا کہ اسرائیل ان کیلئے علاقائی خطرہ نہیں بلکہ اس کے برعکس، ایران کا مقابلہ کرنے میں ایک سٹریٹجک پارٹنر ہے۔ جس کے نتیجے میں مراکش، متحدہ عرب امارات اور بحرین نے اسرائیل کے ساتھ ابراہم معاہدے پر دستخط کیے۔ لیکن سات اکتوبر 2023 کے حملے اور اس کے نتیجے میں اسرائیل غزہ جنگ کے بعد سے حالات کشیدہ ہیں۔ اسرائیل سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہا ہے جو خطے میں شیعہ اکثریتی ایران کی بڑھتی ہوئی شمولیت اور اثر و رسوخ کی مخالفت کرتا ہے اور مشرق وسطیٰ میں اس کی بالادستی سے خوفزدہ ہے۔

تاہم سعودی عرب نے فنانشل ٹائمز کے ایک مضمون میں باضابطہ طور پر اعلان کیا ہے کہ ملک اسرائیل کے ساتھ اس وقت تک سفارتی تعلقات قائم نہیں کرے گا جب تک فلسطینی ریاست قائم نہیں ہو جاتی۔ سات اکتوبر 2023 سے ہونے والی جغرافیائی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں نے مصر، شام، لبنان اور اردن سمیت دیگر عرب ممالک کی سوچ کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان ممالک نے 1948 میں فلسطین کی تقسیم کے فیصلے میں احتجاجاً اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم اسرائیل کے سرکاری اعداد و شمار سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ نصف رواں مالی سال کے دوران اسرائیل اور پانچ عرب ممالک کے درمیان تجارت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان ممالک میں متحدہ عرب امارات، مصر، بحرین اور مراکش شامل ہیں۔ اسرائیلی اخبار ماریو نے متحدہ عرب امارات اور اسرائیل کے درمیان طے پانے والے ایک معاہدے پر رپورٹ کی ہے جس کے مطابق اس معاہدے کے تحت دونوں ممالک کے درمیان تجارتی راستہ سعودی عرب اور اردن سے گزر کر مصر تک پھیلا ہوا ہے۔ اسرائیل کی گیس کو مصر کے کچھ پاور گرڈز کیلئے سپلائی کا ایک بڑا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

خطے کے دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو ایک نئے علاقائی نظام کی تشکیل کیلئے سفارت کاری، اقتصادی شراکت داری اور ایک مضبوط دفاعی اور فوجی کارروائی کو یکجا کرنا چاہیے۔ مڈل ایسٹ سینٹر کارنیگ نے تیزی سے بڑھتی علاقائی اور عالمی تبدیلیوں کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ صورتحال مزید عالمی تنازعات کو جنم دے رہی ہے۔ ان کے مطابق مشرق وسطیٰ میں ہونے والی تبدیلیوں کو بین الاقوامی صورتحال سے الگ تھلگ نہیں دیکھا جا سکتا، اس سے امریکا، روس، چین اور یورپ کی مقامی سیاست میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ علاقائی اور عالمی تبدیلیوں سے ہم جنگ کے رجحان کو ہوا دے رہے ہیں اور یہ خوف بھی لاحق ہے کہ کہیں ممکنہ جنگ دنیا کو تاریک کرنے کا سبب نہ بن جائے!

بروز سوموار 15 جمادی الآخر 1446ھ 16 دسمبر 2024ء

خوف کی زنجیریں

اور اسلامی انقلاب کی پیش قدمی رک گئی۔ فرانس کی سرزمین پر 10 / اکتوبر 732ء میں ،، بلاط الشہداء ،، کہلانے والی تاریخ ساز جنگ لڑی گئی۔ طورس اور پواشیرز کے درمیان واقع رومی شاہراہ پر مقابل فوجوں کے درمیان رن پڑا۔ یہ جگہ جبلِ طارق سے جہاں طارق بن زیاد 30 / اپریل 711ء کو اترا تھا، ایک ہزار میل شمال میں تھی۔ ممتاز مؤرخین گبن اور لینین پول کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان یہ جنگ جیت جاتے تو پیرس اور لندن میں گرجا گھروں کی جگہ مسجدیں نظر آتیں اور وہاں کی عظیم دانش گاہوں میں بائبل کی جگہ قرانِ کریم کی تفسیر پڑھائی جاتی۔ سیّد امیر لکھتے ہیں ،، طورس کے میدانوں پر عربوں نے اس وقت عالمی سلطنت گنوادی جبکہ یہ ان کی مٹھی میں تھی۔ حکم عدولی اور باہمی خلفشار جو مسلم معاشرہ کا ابدی ناسور اور لعنت رہے ہیں، اس تباہی کا باعث بنے۔

دولت کی ہوس اور باہمی انتشار نے کام دکھایا۔ ان کوتاہیوں نے کہاں کہاں ملتِ اسلامیہ کا راستہ نہیں روکا، کیا کیا زخم نہیں کھائے، ہم نے جہاں بھی شکست کھائی مڑ کر دیکھا تو کمین گاہ میں کچھ اپنے نظر آئے۔ حرص وہ بلا ہے جو انہیں سوچنے کی مہلت تک نہیں دیتی کہ بے حدوحساب دولت کس کام آئے گی، خاص طور پر وہ جس کے انبار غیر ملکی بینکوں میں لگائے گئے، چوری چھپے کے کھاتوں میں دھرے ہیں۔ باہم خلفشار بھی کہاں کم ہوا، کس نے کس کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپا، اپنے پرائے جس کا داؤ لگا وہی موقع پاتے ہی اپنے کرم فرماؤں پر چڑھ دوڑا، اقتدار تو دولت سے بھی بری بلا ہے۔

جوں جوں طاقت خواہ وہ خلافت کی شکل میں تھی یا بادشاہوں کے روپ میں براجمان تھی، کمزور پڑنے لگی، ناچاقی اور انتشار نے سر اٹھایا، ہر طرف یورش بپا ہونے لگیں، چھوٹے چھوٹے راجواڑے وجود میں آتے گئے، وسائل بکھرتے گئے اور مرکزی حکومت کا دائرہ اختیار سکڑتا گیا۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم ہوں یا آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، دونوں ہوا کا جھونکا آتے ہی تنکوں کی طرح اڑ گئے۔ ایک بے بسی کے عالم میں تاتاریوں کے گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا، دوسرا پابجولاں وطن سے سینکڑوں میل دور رنگون میں حوالۂ زنداں ہوا۔ بہادر شاہ ظفر شاعر تھا، شکست اور محرومی کا اظہار کر گیا، اسے دفن کیلئے ،، کوئے یار ،، میں دو گز زمین نہ ملنے کا نوحہ کہنے کی مہلت تو مل گئی۔ خلیفہ المستعصم تو بے چارگی میں بھی دو قدم آگے نکلا۔ کہتے ہیں کہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ جب وہ اپنے آپ کو تاتاریوں کے حوالے کر چکا تو اسے ہلاکو خان کے حضور پیش کیا گیا۔ ہلاکو نے سونے کی کچھ ڈلیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے کھاؤ" .... مجبور قیدی نے پریشان ہوتے ہوئے عرض کیا "سونا کھایا نہیں جاتا" جواب ملا تو ،، پھر ڈھیروں جمع کیوں کر رکھا تھا، اگر ہمیں بھجوا دیا ہوتا تو آج عیش و آرام سے جی رہے ہوتے، ایسا نہیں کرنا تھا تو اپنے دفاع کیلئے خرچ کیا ہوتا"۔

مال و دولت کی ہوس نے کیا کیا گل نہیں کھلائے، حرص کی نہ کوئی سیما ہے نہ حد..... یہ وہ شعلہ ہے جو لپکتا ہی جاتا ہے۔ انسان مجموعہ اضداد ہے۔ مرغوب چیزوں پر فریفتہ ہونا جہاں ایک فطری امر ہے وہیں جو دوسخا کا بیج بھی اس کے من کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ کون کس ڈگر پر چلے، فیصلہ اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ"۔ لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے فریفتہ کیا ہوا ہے جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ (آل عمران۔14) اصل دولت تو اللہ کی رضا اور "رضوان" ہے، جس خوش نصیب کو یہ

خزانہ مل گیا اس کے دونوں جہان سنور گئے، جو اس سے محروم رہا، وہ بازی ہار گیا۔ پردہ اٹھنے کی دیر ہے جب اسی سونے چاندی سے جس کے انبار لگاتے نہیں تھکتے، ان کی پیشانیاں داغی جائیں گی، پھر یاد آئے گا کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا ہی بہتر تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ہلاکو خان اسی دارِ فانی میں اس "سونے کو تناول فرمانے" کی فرمائش کرے۔

میں گرفتار ہے اور بڑا انسان کسی اعلیٰ مقاصد کے حصول میں کوشاں چھوٹے اور بڑے انسان میں غالباً فرق ہی اتنا ہے کہ چھوٹا آدمی "حب الشہوات" ۔پہلا جاہ و مال پر جان و دل سے فدا ہے، دنیا بھر کی دولت سمیٹنا چاہتا ہے، بڑے سے بڑے عہدے تک پہنچنا چاہتا ہے، پہنچ پائے تو اس کے چھن جانے کے انسانیت جو بھی راہ میں حائل ہو، اسے وہ اسے دوام دینا چاہتا ہے، اس کیلئے سب کچھ روا رکھتا ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب، خیال سے ہی ہلکان رہتا ہے۔ کچل دیا جائے، ہر حربہ روا رکھا جائے تاکہ اس کا اقتدار طول پکڑ تا جائے اور مال و اسباب میں اضافہ ہوتا رہے۔ بدقسمتی سے دورِ حاضر میں اقتدار اور دولت لازم و ملزوم ٹھہرے ہیں۔

اہل سیاست میں اکثر اسے ناقابلِ تردید حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں کہ قارون کا خزانہ پاس نہ ہو تو اقتدار تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ مفروضہ نہائت خطرناک کھیل کو جنم دیتا ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی بے رحم دوڑ شروع ہو جاتی ہے جس میں حصولِ مقصد کیلئے سب کچھ روا رکھا جاتا ہے۔ بدعنوانی، رشوت، چور بازاری، راہزنی اور اس قبیل کی ساری بلائیں سیلاب کی صورت امڈ آتی ہیں۔ ملک کیا معاشرہ بھی غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔ اضطراب کے عالم میں لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں۔ ناجائز کمائی کو چھپانے کیلئے کونے کھدرے تلاش کرنا پڑتے ہیں۔

مالِ حرام جہاں سے کمایا، وہاں وہ خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔ اس کی اڑان لازم ہے، موسمی پرندوں کی طرح یہ خوشگوار ماحول کی تلاش میں محفوظ مقامات پر چلا جاتا ہے۔ اس کے "مالکوں" پر چھائیاں پڑنے لگیں تو وہ بھی بدیش سدھار جاتے ہیں۔ وطنِ عزیز غریب سے غریب تر ہوتا جاتا ہے، ایک طرح لٹیروں کا دیس بن جاتا ہے جن میں کئی ایک شب بھر میں ارب پتی بننا چاہتے ہیں، جس کا بھی بس چلے وہ اندھیرے اجالے میں چوکتا نہیں۔ اقتدار میں آنے والوں میں سے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو اس کارِ خیر میں ایک دوسرے کو مات دینے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ نجی محفلوں میں کھلے بندوں تذکرہ ہوتا ہے کہ فلاں بازی لے گیا اور فلاں پیچھے رہ گیا۔ وزارتوں اور قلمدانوں کی قیمت لگتی ہے، نیاز مندوں کو دودھ دینے والی گائیں عطا ہوتی ہیں اور وہ جنہیں "شاہ جہانِ وقت" کو شیشے میں اتارنے کا فن نہیں آتا، وہ عنائتِ خسروانہ سے محروم رہتے ہیں۔ حالات کی مجبوری کے پیشِ نظر اگر انہیں کچھ دینا بھی پڑے تو کوئی بے فیض سا عہدہ جس کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی چنداں فرق نہیں پڑتا، ان کا مقدر بنتا ہے۔

سیاست ایک بہتا دریا ہے جس کا پانی کبھی اتنا شفاف تھا کہ کناروں پر کھڑے اشجار جھک جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھتے تھے۔ صاف ستھرے، وضعدار لوگ جنہیں اپنی عزت کا پاس تھا، ملک و قوم کی خدمت کیلئے اس میدان میں اترتے تھے۔ شرافت، متانت، عوام کی خیر خواہی اور کارِ ثواب کی تمنا ان کیلئے زادِ راہ ہوتے تھے۔ اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے۔ دولت مند نہ ہوں تو دل کے غنی ہوتے تھے۔ ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ خدمتِ خلق کے عوض کوئی معاوضہ یا مالی فائدہ حاصل کریں۔ بڑے غیور اور پاک طینت لوگ تھے۔ اللہ رحمت کرے ان عظیم ہستیوں پر جو آزادی کی نعمت سے

قوم کو ہمکنار کر گئے۔ حرص وہوس کی زنجیریں اگر وہ نہ توڑ چکے ہوتے تو منزل تک پہنچنے سے بہت پہلے بک گئے ہوتے۔ خریداروں کی نہ آج کمی ہے نہ اس وقت تھی، مال بکاؤ ہو تو گاہک بہت، ڈرانے والے اس دور میں بھی بہت تھے۔

امریکی سلطنت تو ابھی زچگی کے عالم میں ہے پھر بھی ایک دنیا ڈری سہمی سجدے میں پڑی ہے۔ قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کو تو برطانوی سامراج کا سامنا تھا جس کی سلطنت میں واقعی کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ وہ لاکھ مہذب حکمران سہی مگر قید خانے ان کے بھی تھے۔ آزادی کے متوالے سیاستدانوں سے حاکم لوگ پیار و محبت کی پینگیں نہیں بڑھاتے تھے۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والے تو بہتوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھتے تھے۔ اگر ہمارے محسن ڈر گئے ہوتے یا خدانخواستہ بک گئے ہوتے تو پاکستان نہ بن پاتا۔ پاک سرزمین کی حفاظت وہی جذبہ مانگتی ہے۔ یہ دھرتی شاداور آباد اسی صورت میں رہ سکتی ہے جب ہر سطح پر اس کی قیادت حرص وہوا اور خوف کی زنجیریں یوں توڑ دے کہ ان کے ٹوٹنے کی چھنک دنیا کے کونے کونے میں سنائی دے۔ اللہ کرے ہم ایسا کر پائیں!

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے حال جانتا ہے!!!

بروز جمعرات 18 جمادی الآخر 1446ھ 19 دسمبر 2024ء

شام میں ممکنہ تقسیم کا خطرہ اور اسرائیلی کردار

جونہی بشارالاسد خاندان کا 53 سال سے زائد محیط ظلم و جبر اور استبداد کا دور ختم ہوا، اسرائیل نے فوری طور پر ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گولان کی پہاڑیوں پر قائم ایک غیر فوجی بفر زون سمیت شام کی سرحدی حدود میں موجود چند اہم پوزیشنز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسرائیل شام میں "عسکری اہداف" پر اب تک سینکڑوں حملے کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیلی فوج نے اسرائیل اور شام کے درمیان واقع گولان کی پہاڑیوں میں اقوام متحدہ کے زیرِ نگرانی قائم غیر فوجی زون یا بفر زون پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔

اسرائیل کا کہنا ہے کہ فوجی کاروائیوں کا مقصد اسرائیلی شہریوں کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے تاہم کچھ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل اپنے ایک دیرینہ دشمن (شام) کو کمزور کرنے کیلئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے اسرائیل کی جانب سے شام کے بحری بیڑے پر بھی ایک بڑے حملے کی تصدیق کی گئی ہے۔ اسرائیلی دفاعی افواج (آئی ڈی ایف) نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اُس کے جنگی طیاروں نے پیر کی رات البیضا اور اللاذقیہ کی بندرگاہوں کو نشانہ بنایا جہاں شامی بحریہ کے 15 بحری جہاز لنگر انداز تھے تو ایسے میں اہم سوال یہ ہے کہ اسرائیل شام پر مسلسل حملے کیوں کر رہا ہے؟ نیتن یاہو نے پھر ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اسرائیلی ڈیفنس فورسز کو گولان کے پہاڑیوں میں واقع بفر زون اور دیگر نزدیکی کمانڈنگ پوزیشنز میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔ اسرائیل کو باغیوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کیلئے یہ اسرائیل کی جانب سے اٹھایا گیا ایک عارضی اقدام ہے تاہم سعودی عرب سمیت کئی عرب ممالک نے اس نوعیت کے اسرائیلی اقدامات کی مذمت کی ہے۔

ہیئت التحریر کی جانب سے دمشق کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد سے اسرائیلی فوج کے جنگی طیاروں نے دمشق میں موجود شامی فوج کی تنصیبات اور ہیئت التحریر کے اہداف حلب، حماہ، دمشق، لتاکیا، طرطوس اور دیگر مقامات پر 350 فضائی حملے کیے ہیں۔ دراصل اسرائیلی حملوں کا مقصد شام کی فوج کی لڑنے کی صلاحیت کو ختم کرنا ہے۔ شام کی سرحدی اور فضائی حدود کی مسلسل پامالی کی جا رہی ہے جبکہ اسرائیل نے دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے دعویٰ کیا ہے کہ اس کے حملوں کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ شام میں موجود کیمیائی ہتھیار شدت پسندوں کے ہاتھ نہ لگیں۔

اسرائیل کے مطابق سابق بشارالاسد کے مبینہ کیمیائی ہتھیاروں کا ذخیرہ اب کس کے پاس جائے گا، اس کے بارے میں کوئی مصدقہ اطلاعات نہیں کہ شام میں کہاں اور کتنے کیمیائی ہتھیار موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ خود اسرائیل کے پاس جو مہلک ہتھیار ہیں، کیا ان کو تباہ کرنے کیلئے بھی اسرائیل پر حملہ کرنا جائز تصور کیا جائے گا؟ چند دن پہلے اقوامِ متحدہ کے ہتھیاروں کے ادارے نے شامی حکام کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اُن کے پاس کیمیائی ہتھیار موجود ہیں تو انہیں محفوظ بنانے کی ضرورت ہے۔

شام کی فوج پر الزام ہے کہ انہوں نے ملک کے دیگر علاقوں میں بھی سیرین گیس اور کلورین گیس سے بنے کیمیائی ہتھیار استعمال کیے تھے۔ بشارالاسد کی فوج نے 2013 میں دمشق کے مضافاتی علاقے غوطہ میں ایک حملے میں سیرین گیس استعمال کی تھی اور اس حملے میں ایک ہزار سے زائد افراد کے مارے جانے کی اطلاعات تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بشارالاسد نے یہ ہتھیار اس لیے رکھے تھے تا کہ اسرائیل کے ساتھ تنازع میں کسی حد تک طاقت کا توازن پیدا ہو سکے لیکن وہ ان ہتھیاروں کو (اسرائیل کے خلاف) استعمال کرنے میں کبھی پہل نہیں کرنے کے خواہاں تھے لیکن اب شام میں ایک بالکل ہی مختلف حکومت ہے۔ اسرائیلی مؤقف یہ بھی ہے کہ ہیئت التحریر کے پاس بھی کیمیائی ہتھیار موجود ہیں کیونکہ انہوں نے بھی اپنے مخالفین پر کیمیائی ہتھیار

استعمال کیے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ گولان کی پہاڑیوں میں تو کہیں بھی کیمیائی ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود نہیں تو پھر اقوام متحدہ کی طرف سے قائم کردہ بفر زون پر قبضہ کرنے کا کیا مقصد ہے؟

گولان کی پہاڑیاں شام کا وہ علاقہ ہے جس پر اسرائیل نے 1967 سے قبضہ کر رکھا ہے۔ گولان کی پہاڑیاں 1200 مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ شامی دارالحکومت دمشق سے تقریباً 60 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ 1967 کی جنگ کے دوران شام نے گولان کی پہاڑیوں سے اسرائیل پر حملہ کیا تاہم اسرائیل یہ حملہ پسپا کرنے میں کامیاب رہا اور اس حملے کے ردعمل میں اسرائیل نے 1200 کلومیٹر کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ شام نے 1973 کی مشرق وسطیٰ جنگ (یوم کپور) کے دوران گولان کی پہاڑیوں کا قبضہ دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تاہم وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا تھا۔ بعد ازاں 1974 میں شام اور اسرائیل نے جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کیے اور تب سے اقوامِ متحدہ کی نگران فوج وہاں تعینات ہے۔

بعد ازاں 1974 میں شام اور اسرائیل نے ایک جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت دونوں ممالک کی افواج کو گولان کی 80 کلومیٹر طویل سرحدی پٹی کے دونوں اطراف سے انخلا کی ضرورت تھی اور اس علاقے کو "ایریا آف سپریشن" قرار دیا گیا اور اس کے بعد سے اقوام متحدہ کا "ڈس انگیجمنٹ آبزرور فورس" نامی یونٹ اس معاہدے کی تعمیل کی نگرانی کے سلسلے میں وہاں موجود ہے۔ تاہم معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 1981 میں اس علاقے کو اسرائیل نے یکطرفہ طور پر اپنا علاقہ قرار دے دیا تھا تاہم اسرائیل کے اس اقدام کو عالمی سطح پر تسلیم نہیں کیا گیا اور اسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تاہم 2019 میں ٹرمپ انتظامیہ نے اس ضمن میں سابقہ امریکی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے اس علاقے پر اسرائیل کا حق تسلیم کر لیا۔ شام کے مطابق وہ آئندہ اسرائیل سے اُس وقت تک کوئی امن معاہدہ نہیں کرے گا جب تک وہ گولان کے پورے خطے سے انخلا نہیں کرتا۔ نومبر 2024 میں شام نے اقوام متحدہ سے شکایات کی تھیں کہ اسرائیل بفر زون کے قریب اور بعض مقامات پر اس کے اندر خندقیں کھود رہا ہے۔

جب گولان پہاڑیوں پر شام کا کنٹرول تھا تو 1948 سے 1967 تک وہ پورے شمالی اسرائیل پر گولہ باری کرنے کیلئے باقاعدگی سے توپ خانے کا استعمال کرتا تھا۔ دمشق ان پہاڑیوں سے تقریباً 60 کلومیٹر شمال میں واقع ہے اور ان پہاڑیوں کی بلندی سے دمشق سمیت جنوبی شام کے زیادہ تر حصے واضح دکھائی دیتے ہیں، اس جغرافیے کی وجہ سے اسرائیل کو یہ مقام شامی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کیلئے ایک بہترین مقام فراہم کرتا ہے۔ ان پہاڑیوں پر کنٹرول اسرائیل کو شام کی جانب سے کسی بھی ممکنہ فوجی حملے کے خلاف قدرتی بفر فراہم کرتا ہے (جیسا کہ 1973 کی جنگ کے دوران ہوا تھا)۔

دوسری جانب گولان کی پہاڑیاں اس خطے میں، جو زیادہ تر بنجر زمین پر مشتمل ہے، پانی کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔ ان پہاڑیوں کی بلندیوں سے بہہ کر نیچے آنے والا بارش کا پانی دریائے اردن میں داخل ہوتا ہے، جس کی بدولت اس دریا کے اِرد گرد کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ یہاں انگور اور دیگر پھلوں کے باغات پنپتے ہیں جبکہ یہ زمین مویشیوں کیلئے چراگاہیں بھی فراہم کرتی ہے۔ ماضی میں شام اور اسرائیل کے درمیان کسی بھی امن معاہدے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ شام کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ اسرائیل 1967 سے پہلے کی پوزیشن پر واپس جائے اور قبضہ کیے گئے علاقے کو مکمل خالی کرے۔ تاہم اگر ایسا ہوتا ہے تو شام کو بحیرہ طبریا کے مشرقی ساحل کا کنٹرول مل جائے گا اور اسرائیل تازہ پانی کے ایک اہم ذریعے سے محروم ہو جائے گا۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان سرحد مزید جانب مشرق ہونی چاہیے تاکہ خطے کے اہم ذرائع اور وسائل سے محروم نہ ہو سکے۔ اسرائیل میں رائے عامہ یہی ہے کہ اسرائیل کو گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ برقرار رکھنا چاہیے کیونکہ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ حکمت عملی کے لحاظ سے یہ بہت اہم ہے کہ اسے واپس نہ کیا جائے۔

گولان کی پہاڑیوں پر ماضی میں آباد زیادہ تر شامی عرب باشندے 1967 کی جنگ کے دوران اس علاقے سے نقل مکانی کر گئے تھے۔ گولان کے علاقے میں اب 30 سے زائد اسرائیلی بستیاں موجود ہیں جن میں ایک اندازے کے مطابق 20 ہزار افراد رہائش پذیر ہیں۔ اسرائیلیوں نے 1967 کے تنازعے کے اختتام کے فوراً بعد اس علاقے میں آبادیاں بنانی شروع کر دیں تھیں تاہم یہ یہودی بستیاں بین الاقوامی قانون کے تحت غیر قانونی تصور کی جاتی ہیں

یہ یہودی آباد کار یہاں بسنے والے تقریباً 20 ہزار شامیوں کے ساتھ رہتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق دروز فرقے سے ہے اور جو گولان پر اسرائیلی قبضے کے دوران یہاں سے نکلے نہیں تھے۔ شام کا کہنا ہے کہ یہ سرزمین (گولان کی پہاڑیاں) ہمیشہ سے اس کی ملکیت ہیں اور وہ بارہا اس علاقے کو واپس لینے کے عزم کا اظہار کر چکا ہے جبکہ اسرائیل کا کہنا ہے کہ گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کے دفاع کیلئے بہت اہم ہیں اور ان کا کنٹرول ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہے گا۔

اس علاقے سے شامی فوج اس وقت نکل گئی تھی جب باغی گروہوں کے دستے دمشق کی جانب بڑھ رہے تھے اور بشار الاسد کا اقتدار ختم ہو رہا تھا اور اسی موقع پر اسرائیلی کی دفاعی افواج نے گولان کی پہاڑیوں پر غیر فوجی بفر زون کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ نتن یاہو ایک مرتبہ پھر اقوام عالم کو گمراہ کرنے کیلئے کہہ رہا ہے کہ اُس کی خواہش ہے کہ شام میں آنے والی حکومت کے ساتھ پُرامن اور ہمسایوں والے تعلقات قائم کر سکیں۔ تاہم اگر ایسا نہیں ہو تا تو اسرائیلی ریاست اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہر ممکن اقدامات اٹھائیں گے۔ اسرائیل میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ شام کی جانب سے فورسز گولان میں داخل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہے کہ مستقبل میں ہیئت التحریر گولان پہاڑیوں سے اسرائیل کے اند داخل نہ ہو سکے، اس لئے اسرائیلی فوج سرحد میں مزید اندر تک داخل ہو گئی ہے لیکن اس بیانئے پر یقین کرنے کیلئے کوئی بھی تیار نہیں۔

اسرائیلی فوج یہ بھی تسلیم کر رہی ہے کہ وہ گولان کی پہاڑیوں میں غیر فوجی بفر زون سے باہر کے علاقے میں بھی موجود ہے تاہم ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت آگے نہیں گئے ہیں۔ ان کی افواج 'عارضی دفاعی پوزیشن اختیار کر رہی ہیں اور یہ عارضی بندوبست اس وقت تک کیلئے ہے جب تک کوئی مناسب انتظام نہیں ہو جاتا۔ اسرائیل کی خواہش ہے کہ وہ شام میں ابھرنے والی نئ قوتوں کے ساتھ پرامن اور ہمسائیگی پر مبنی تعلقات رکھیں لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ہم اسرائیل کی ریاست اور اسرائیل کی سرحد کے دفاع کیلئے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کریں گے۔

شام سے سامنے آنے والی رپورٹس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسرائیل گولان کی پہاڑیوں سے آگے پیش قدمی کرتے ہوئے دمشق سے 25 کلومیٹر کی دوری تک پہنچ گیا ہے لیکن اسرائیلی فوجی ذرائع نے اس بات کی تردید کی اور کہا ہے کہ فوج بفر زون سے آگے بڑھی ہے مگر اس حد تک نہیں۔ کئی عرب ممالک کی جانب سے اسرائیل کے شام میں حالیہ اقدامات کی بھرپور مذمت کی گئی ہے۔ مصر کی وزارت خارجہ نے اسے 'شام کی سرزمین پر قبضہ اور 1974 کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی' قرار دیا۔

نیتن یاہو نے کہا کہ "اس نے یہ اقدامات اسرائیل کی سرحدوں کو محفوظ بنانے کیلئے اٹھائے ہیں کیونکہ شام پر باغی گروہوں کے قبضے کے بعد 1974 کا معاہدہ 'فعال' نہیں رہا" بہت سے تجزیہ کار اسرائیل کے اس اقدام کے حوالے سے دیے گئے جواز کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں اور نیتن یاہو کے مؤقف کو کوئی بھی تسلیم کرنے کا تیار نہیں کہ وہ شام کی جانب سے حماس کے 7 اکتوبر کو ہونے والے حملے جیسے کسی بھی حملے کو روکنا چاہتا ہے۔
شام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ معاہدے کی پاسداری نہیں کرے گا، اور اسرائیل کی جانب سے ان اقدامات کو اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے کیا گیا پیشگی اقدام قرار دیکر غیر فوجی بفرزون میں کسی بھی قسم کی فوجی کارروائی کا کوئی جواز نہیں بلکہ کھلی جارحیت ہے۔

شام کے باغی گروپوں کی جانب سے گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل سے قبضہ چھڑانے کے امکانات مستقبل قریب میں انتہائی کم ہیں۔ ہیئت التحریر ملک کے اندرونی معاملات میں اس حد تک مصروف ہے کہ اسرائیل کے ساتھ ایک نیا تنازع پیدا کرنے کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں ہے تاہم اسرائیل کی جانب سے شام کے علاقوں میں موجودگی شام میں آنے والی مستقبل کی حکومتوں کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات کو خراب کرے گی۔
اسرائیلی وزیر خارجہ گیڈون سارنے کہا ہے کہ اُن کی فوج شام کے فوجی اڈوں پر فضائی حملے صرف اور صرف اپنے شہریوں کے دفاع کے لیے کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل سٹریٹجک ہتھیاروں کے نظام پر حملہ کرتا ہے جیسے باقی ماندہ کیمیائی ہتھیار یا طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل اور راکٹ تاکہ وہ شدت پسندوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ تاہم مشرقِ وسطیٰ پر گہری نگاہ رکھنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ شام میں بڑے پیمانے پر کیمیائی ہتھیار موجود نہیں ہیں۔ اُن کے مطابق وہ صرف دو یا تین مقامات پر ہیں لیکن 250 سے زائد فضائی حملے کرکے آپ ملک (شام) کو بہت زیادہ کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے قبل بھی ایسا ہی لغو الزام عراقی صدر صدام حسین پر لگا کر عراق کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کے ساتھ کئی ملین عراقیوں کو شہید کر دیا گیا تھا اور اب تک اس کے پٹرول پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اسرائیل احتیاطی تدابیر کے طور پر بدترین حالات سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ سب بے سود ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ نئی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلق استوار کرنے کا طریقہ نہیں۔ ہیئت تحریر الشام' کی قیادت میں اسد خاندان کی سفاکانہ کہلائی جانے والی اور دہائیوں پر محیط حکمرانی کے خاتمے کے بعد اب شام کے مستقبل کے بارے میں کئی اہم سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ہیئت تحریر الشام کے رہنما ابو محمد الجولانی نے اپنے بیانات میں شام کو متحد کرنے کا عہد کیا ہے تاہم یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا وہ اس مقصد کو حاصل کر پائیں گے یا نہیں۔ اقوام متحدہ نے شام میں تمام گروہوں کے درمیان تعاون کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

تیزی سے بدلتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر شام کے مستقبل کی پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔ تاہم ماہرین نے ملک کے مستقبل کے تین ممکنہ منظرناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ شام کے حق میں سب سے بہتر تو یہ ہو گا کہ ہیئت تحریر الشام ملک میں موجود دیگر سیاسی قوتوں کے ساتھ مل کر کام کرے اور ذمہ داری کے ساتھ حکومت کرے۔ جنگ کے بعد شام میں اب قومی مفاہمت کے ماحول کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ یہ بدلہ لینے اور لوٹ مار کی اس روایت کو توڑنے کا موقع ہے جس کی مثال پڑوسی ریاستوں میں ملتی ہے۔ ایسا نہ کیا گیا تو نئے تنازعات جنم لے سکتے ہیں۔

اپنے ابتدائی بیانات میں جولانی نے شام کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد اور باہمی احترام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ شام میں موجود متعدد گروہوں کے ایجنڈے ایک دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتے۔ تاہم اس بات کا قوی خدشہ ہے کہ لیبیا کی طرح شام بھی مختلف متحارب دھڑوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کوئی ایسا دھڑا برسرِ اقتدار نہ آجائے جو اسرائیل سے دشمنی رکھتا ہو۔ اسرائیل اور اس کے اتحادی یقیناً شام میں موجود

دھڑوں میں نفاق پیدا کر کے خانہ جنگی جیسی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ اس خانہ جنگی کی آڑ میں گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو مزید آگے بڑھایا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خطے کے دیگر ممالک جن کو فی الحال نیتن یاہو نے اقوام متحدہ مین اپنی تقریر کے دوران سبز رنگ میں دکھا یا ہے، ان کو کب اس خوش گمانی سے نجات ملے گی۔

بروز جمعتہ المبارک 19 جمادی الآخر 1446ھ 20 دسمبر 2024ء

ہتھیاروں کی دوڑ اور امریکی دوہرا معیار

امریکی محکمہ خارجہ کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی تیاری اور اس کے پھیلاؤ کے خطرات کے پیش نظر ایگزیکٹو آرڈر کے تحت چار پاکستانی اداروں پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں جن میں اس میزائل پروگرام کی نگرانی کرنے والا ایک سرکاری ادارہ بھی شامل ہے۔ پاکستان کے بیلسٹک میزائل پروگرام سے متعلقہ اداروں اور سپلائرز پر امریکی پابندیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آرہا اور اس سال تیسری مرتبہ بیلسٹک میزائلوں کی تیاری کی معاونت کے الزام میں پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

امریکی الزام ہے کہ اسلام آباد میں واقع نیشنل ڈیویلپمنٹ کمپلیکس (این ڈی سی) نے پاکستان کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل پروگرام کی تیاری کیلئے مختلف آلات حاصل کیے ہیں جن میں خاص قسم کے وہیکل چیسیز شامل ہیں جو میزائل لانچنگ کے معاون آلات اور ٹیسٹنگ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ این ڈی سی شاہین سیریز کے میزائلوں سمیت پاکستان کے دیگر بیلسٹک میزائلوں کی تیاری میں ملوث ہے۔ بیان کے مطابق کراچی میں واقع اختر اینڈ سنز پرائیویٹ لمیٹڈ نے این ڈی سی کیلئے پاکستان کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل پروگرام کیلئے مختلف آلات فراہم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی میں واقع فیلیئٹس انٹرنیشنل پر الزام ہے کہ اس نے بیلسٹک میزائل پرورگرام میں مدد کی غرض سے این ڈی سی اور دیگر اداروں کیلئے میزائل سازی میں مطلوب سامان کی خریداری میں سہولت کاری کی ہے۔

امریکی محکمہ خارجہ کی جانب سے جاری کردہ بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ پابندیاں نیشنل ڈویلپمنٹ کمپلیکس (این ڈی سی) سمیت تین فرموں پر عائد کی جارہی ہیں جو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری اور ان کیلئے آلات کی ترسیل میں ملوث ہیں۔ امریکی تھنک ٹینگ کارنیگی انڈاؤمنٹ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے جو بائیڈن کے قومی سلامتی کے نائب مشیر جان فائنر کا کہنا ہے کہ پاکستان نے لانگ رینج میزائل سسٹم اور ایسے دیگر ہتھیار بنالیے ہیں جو اسے بڑی راکٹ موٹرز کے (ذریعے) تجربات کرنے کی صلاحیت دیتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو پاکستان کے پاس جنوبی ایشیا سے باہر امریکا کو بھی اپنے اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت آجائے گی، اور اس چیز سے پاکستان کے ارادوں پر حقیقی سوالات اُٹھتے ہیں۔

"ایسے امریکا مخالف ممالک کی فہرست جن میں روس، شمالی کوریا اور چین جو جوہری ہتھیار بھی رکھتے ہیں، ان کے پاس براہِ راست امریکا کو نشانہ بنانے کی صلاحیت بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ مشکل ہو گا کہ ہم پاکستان کے اقدامات کو امریکا کیلئے خطرے کی حیثیت سے نہ دیکھیں۔ مجھ سمیت ہماری انتظامیہ کے سینیئر رہنماؤں نے متعدد بار ان خدشات کا اظہار پاکستان سے کیا ہے۔ پاکستان طویل عرصے سے امریکا کا پارٹنر رہا ہے اور وہ مشترکہ مفادات پر پاکستان کے ساتھ مزید کام کرنے کی بھی خواہش رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ پاکستان ایسی صلاحیت کیوں حاصل کر رہا ہے جو ہمارے خلاف استعمال ہو سکے؟ بدقسمتی سے ہمیں لگتا ہے کہ پاکستان ہمارے اور بین الاقوامی برادری کے خدشات کو سنجیدگی سے لینے میں ناکام ہوا ہے"۔

دراصل امریکی حکام کا حالیہ الزام تکنیکی حقائق کے خلاف ہے۔ پہلی وجہ تکنیکی، دوسری تزویراتی یا سٹریٹیجیکل اور تیسری وجہ معاشی یا پولیٹیکل ہے۔ تکنیکی طور پر ایسا ممکن نہیں کیونکہ پاکستان کے بیلسٹک میزائلوں میں جدت لانے کا مقصد انڈیا کے علاوہ کسی دور دراز کے ملک کو نشانہ بنانا نہیں بلکہ انڈیا

کے تیزی سے ترقی پذیر میزائل ڈیفنس نظام کا سدباب کرنا یا ناکام بنانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن جتنا بھی جدید ڈیفنس سسٹم بنالے، آپ کا بیلیسٹک یا کروز میزائل اسے ناکام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کا رینج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسرائیل کے پانچ تہوں پر مشتمل ڈیفنس سسٹم کی مثال ہمارے سامنے ہے جس میں ایرو اور آئرن ڈوم سے لیکر ڈیوڈز سلنگ، انٹر سیپٹر اور اینٹی ایئر کرافٹ گنز بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی میزائل پانچ تہوں سے نکل کر اپنے ہدف کو نشانہ بنا کر اسے تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کا ایم آئی آر ویز سے لیس ہونا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ پاکستانی میزائل ابابیل ہے۔

ایم آئی آر ویز کا مطلب ایک ایسا میزائل ہے جو بیک وقت کئی وار ہیڈز لیجا سکتا ہے جو آزادانہ طور پر پروگرامڈ ہوتے ہیں اور ان وار ہیڈز کی تعداد تین سے آٹھ اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور روس کے کیس میں 12 تک بھی ہے۔ یہ میزائل آزادانہ طور پر اپنے اپنے ہدف کی جانب جاتے ہیں اور ہر ایک کا ہدف کی جانب سفر کا راستہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آپ ایک میزائل کے ذریعے سے جب اسے لانچ کرتے ہیں اور جب اس کی ری انٹری وہیکل دوبارہ فضا میں داخل ہوتی ہیں تو وہ (ری انٹری وہیکل) مختلف سمتوں میں پھیل کر اپنے اپنے ہدف کو نشانہ بناتی ہیں۔ اس کی مثال فائٹر طیاروں کی فارمیشن جیسی ہے جو ہدف پر پہنچنے سے پہلے، وہاں پہنچ کر، حملے کے دوران اور بعد میں مختلف ہوتی ہے۔ فائٹر طیارے کسی ٹارگٹ پر پہنچ کر سرفیس، ایئر میزائل اور اینٹی ایئر کرافٹ گن سے بچنے کیلئے اس انداز میں ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں کہ وہ سب دشمن کی فائرنگ کی زد میں آئے بغیر مختلف سمتوں سے ٹارگٹ کو نشانہ بنا سکیں۔ امریکا کے پاس ایسا میزائل Minuteman III ہے اور انڈیا نے حال ہی میں اس ٹیکنالوجی میں جدت لانی شروع کی ہے۔

پاکستان اگر اسی کو بہتر بنا رہا ہے تو اس کا مقصد انڈیا کے علاوہ کسی اور ملک کو ہدف بنانا بالکل نہیں مگر انڈیا کے سسٹم میں آنے والی جدت (چاہے وہ ایس 400 کے حوالے سے یا کسی اور سے) کو ناکام بنا کر ان کی ٹارگٹ تک پہنچنے کی صلاحیتوں کا سدباب ہے۔ پاکستان کسی ایسی ٹیکنالوجی پر کام نہیں کر رہا جو پہلے سے انڈیا کے پاس نہیں ہے اور انڈیا نہ صرف آئی سی بی ایم (بین البراعظمی بیلسٹک میزائل) بنا رہا ہے بلکہ انہیں ٹیسٹ بھی کر چکا ہے جن کی رینج 5000 کلومیٹر سے زیادہ ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کا ٹارگٹ پاکستان یا چین نہیں ہیں جبکہ دوسری جانب پاکستان نے اس رینج کے کسی میزائل کا آج تک تجربہ نہیں کیا۔

پھر پاکستان پر یہ الزام تکنیکی حقائق کے بھی خلاف ہے۔ جب تک ایک سسٹم (میزائل) ایک رینج پر ٹیسٹ نہیں ہو جاتا تب تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس ملک نے یہ صلاحیت حاصل کرلی ہے اور پاکستان نے اب تک ایسا کوئی میزائل ٹیسٹ نہیں کیا جس کی رینج انڈیا سے باہر ہو۔ انڈیا ایس ایس بی این (نیوکلیئر ڈپاورڈ بیلسٹک میزائل سب میرین) یا بیلسٹک میزائل فائر کرنے کی صلاحیت رکھنے والی آبدوزیں بھی بنا رہا ہے۔ میزائلوں کی بحث میں زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائلوں کو تو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے مگر سمندر کی سطح کے نیچے یا جوہری آبدوزیں رکھنے والے صلاحیتوں کے حامل ممالک سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے جن میں رینج کا چکر ہی نہیں ہوتا کیونکہ کسی بھی ملک کے قریب آبدوز لے جاکر وہاں سے یہ میزائل فائر کیے جاسکتے ہیں۔ اس کی مثال انڈیا کی "اریہنت" اور "اریگاتھ" ایٹمی آبدوزیں ہیں جو اب انڈیا کے بحری بیڑے کا حصہ ہیں۔ یاد رہے امریکا، برطانیہ، فرانس، روس اور چین کے پاس بھی ایٹمی آبدوزیں موجود ہیں یعنی یہ پانچ ممالک دنیا کے کسی بھی ملک پر جوہری حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دو ایٹمی آبدوزوں کو اپنے بحری بیڑے میں شامل کرنے کے بعد انڈیا نے بھی یہ صلاحیت حاصل کرلی ہے یعنی وہ ان ممالک کی صف میں شامل ہو گیا ہے جو امریکا سمیت دنیا کے کسی بھی ملک پر ایٹمی حملہ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صرف زمین کی سطح سے زمین تک مار کرنے والے میزائلوں پر بحث انتہائی اہم تزویراتی حقائق

سے پہلو تہی ہے۔

یاد رہے اس سے قبل رواں سال ستمبر میں امریکا نے ایک چینی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کئی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کیں تھیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ پاکستان کے بیلسٹک میزائل پروگرام کیلئے آلات اور ٹیکنالوجی کی فراہمی میں ملوث ہیں۔ اس کے علاوہ اسی برس اپریل میں چین کی تین اور بیلاروس کی ایک کمپنی جبکہ اکتوبر 2023 میں پاکستان کو بیلسٹک میزائل پروگرام کے پرزہ جات اور سامان فراہم کرنے کے الزام میں چین کی تین مزید کمپنیوں پر اسی طرح کی پابندیاں عائد کی تھیں۔ اس کے علاوہ دسمبر 2021 میں امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے جوہری اور میزائل پروگرام میں مبینہ طور پر مدد فراہم کرنے کے الزام میں 13 پاکستانی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ تاہم پاکستان نے اس امریکی اقدام کو "مایوس کن" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ حالیہ امریکی پابندیوں کا مقصد خطے میں عسکری عدم توازن کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس سلسلے میں میرا 6/ اکتوبر 24ء کا کالم "امریکی پابندیوں کا اثر: چین اور پاکستان کا جوابی ردعمل" اور 14/ نومبر 24ء کو "ایٹمی پاکستان: امریکی اور اسرائیلی مفادات کا اصل چیلنج" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تاہم حالیہ امریکی پابندیاں کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ 70 کی دہائی سے جاری ہے جب انڈیا کے میزائل پروگرام (جس کیلئے وہ روسی اور کئی دوسرے ذرائع سے مدد حاصل کر رہا تھا) کے جواب میں پاکستان نے اپنا میزائل پروگرام شروع کیا اور ہمیشہ سے چین کے ساتھ قریبی تعلقات بھی رہے۔ چین اور پاکستان کی کمپنیوں اور افراد پر لگائی گئی ان پابندیوں کا دونوں ملکوں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ پاکستانی ادارے اور نیشنل ڈویلپمنٹ کامپلیکس میزائل ٹیکنالوجیز کیلئے مغرب پر انحصار نہیں کرتے لہذا کسی پر بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

شمالی کوریا پر کتنی پابندیاں لگیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پاکستان کا میزائل پروگرام مکمل طور پر مقامی ہے، اس کا انحصار مقامی وسائل اور مہارت پر ہے اور یہ امریکی پابندیوں سے متاثر نہیں ہو گا تاہم اس طرح کے اقدامات افسوسناک ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ علاقائی تزویراتی حقائق سے جدا ہیں جیسے کہ ملک کی حفاظت وسکیورٹی اور انڈین میزائلوں کی بڑھتی ہوئی بین البراعظمی حدود جو علاقائی اور عالمی امن، سلامتی اور استحکام کیلئے بڑھتے ہوئے خطرات ہیں لیکن امریکا کی گود میں پناہ لینے والے یہود وہنود ان پابندیوں سے ماوراء ہیں۔

دراصل امریکا کے یکطرفہ اقدام عالمی امن کیلئے بدقسمتی اور تعصب پر مبنی ہیں۔ پاکستان کی سٹریٹیجک صلاحیتوں کا مقصد ملک کی خودمختاری کا دفاع اور جنوبی ایشیا میں امن قائم رکھنا ہے۔ حالیہ امریکی پابندیوں کا مقصد خطے میں فوجی عدم تعاون کو بڑھاوا دینا ہے جس سے امن اور سلامتی کی کوششوں کو نقصان پہنچے گا پھر نجی کاروباری اداروں پر اس طرح کی پابندیاں مایوس کن ہیں۔ ماضی میں ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے دعوؤں کے باوجود دوسرے ممالک کیلئے جدید فوجی ٹیکنالوجی کے حصول کیلئے درکار لائسنس کی شرط ختم کی گئی اور ایسے دوہرے معیار اور امتیازی سلوک سے نہ صرف عدم پھیلاؤ کے مقصد کو ٹھیس پہنچے گی بلکہ خطے اور عالمی امن وسلامتی کو بھی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔

اس سے قبل رواں برس ستمبر میں امریکا نے آرمز ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ اور ایکسپورٹ کنٹرول ریفارم ایکٹ کے تحت چین کے تین اداروں، ایک چینی شخصیت اور ایک پاکستانی ادارے پر بیلسٹک میزائل کے پھیلاؤ کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں پابندیاں عائد کی تھیں۔ امریکا کا الزام تھا کہ بیجنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف آٹومیشن فار مشین بلڈنگ انڈسٹری بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور ان کی ترسیل میں ملوث ہے اور اس نے شاہین تھری اور ابابیل میزائل سسٹمز اور ممکنہ طور پر اس سے بھی بڑے سسٹمز کیلئے راکٹ موٹرز کی جانچ کیلئے آلات کی خریداری کے سلسلے

میں پاکستانی ادارے نیشنل ڈویلپمنٹ کامپلیکس کے ساتھ مل کر کام کیا ہے

امریکی بیان میں یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ یہ ادارہ بڑے سسٹمز کیلئے آلات خریدنے میں بھی ملوث ہے۔ اس وقت جن دیگر کمپنیوں پر پابندی عائد کی گئیں ان میں چین کی ہوبئی ہواچانگدا انٹیلیجنٹ ایکوپمنٹ، یونیورسل انٹرپرائز، ژیان لونگدے ٹیکنالوجی ڈویلپمنٹ اور پاکستانی کمپنی انوویٹیو ایکوئپمنٹ بھی شامل ہیں جبکہ امریکی پابندیوں کی زد میں آنے والے چینی شخص کا نام لووڈونگمی تھا۔

اس وقت امریکی محکمہ خارجہ نے یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل پروگرام کے بارے میں امریکا کے خدشات کئی سالوں سے "واضح اور مستقل" ہیں اور پاکستان کے بیلسٹک میزائل پروگرام کی مخالفت امریکی پالیسی کا حصہ رہی ہے۔ یہاں یہ بھی یادرہے کہ امریکانے رواں برس اپریل میں چین کی تین اور بیلاروس کی ایک کمپنی جبکہ اکتوبر 2023 میں پاکستان کو بیلسٹک میزائل پروگرام کے پرزہ جات اور سامان فراہم کرنے کے الزام میں چین کی تین مزید کمپنیوں پر اسی طرح کی پابندیاں عائد کی تھیں۔ اس کے علاوہ دسمبر 2021 میں امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے جوہری اور میزائل پروگرام میں مبینہ طور پر مدد فراہم کرنے کے الزام میں 13 پاکستانی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کی تھیں۔

دراصل یہ جاننا ضروری ہے کہ پاکستان کا وہ میزائل پروگرام جو حالیہ امریکی پابندیوں کا نشانہ بن رہا ہے، وہ کیا ہے؟ اس میں کون کون سے میزائل شامل ہیں اور امریکا کو ان سے کیا خدشات ہیں؟ اور امریکی پابندیاں پاکستان کے میزائل پروگرام کو کیسے متاثر کر سکتی ہیں؟ پاکستان کا وہ میزائل پروگرام جس کا تذکرہ ستمبر 2024 میں امریکی خارجہ کے اعلامیے میں کیا گیا تھا اس میں میڈیم رینج یا درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے بلیسٹک میزائل شاہین تھری اور ابابیل شامل ہیں جو ملٹیپل ری انٹروہیکل یا ایم آروی میزائل کہلاتے ہیں۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ پاکستان کے میزائل ہتھیاروں میں یہ سب سے بہترین صلاحیتوں والے میزائل ہیں۔ پاکستان کی فوج کے شعبہ تعلقات عامہ (آئی ایس پی آر) کے مطابق پاکستان نے 2017 میں ابابیل میزائل کا پہلا تجربہ کرنے کے بعد گزشتہ برس 18 اکتوبر 2023 کو بھی زمین سے زمین پر درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے ابابیل میزائل کی ایک نئی قسم کا تجربہ کیا تھا جس کے بعد رواں برس 23 مارچ کو پاکستان ڈے پریڈ کے موقع پر پہلی مرتبہ اس کی نمائش کی گئی۔

سٹریٹیجک اور ڈیفینس سٹڈیز کے ماہرین کے مطابق یہ جنوبی ایشیا میں پہلا ایسا میزائل ہے جو 2200 کلومیٹر کے فاصلے تک متعدد وارہیڈز یا جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مختلف اہداف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ابابیل میزائل تین یا اس سے زائد نیوکلیئر وارہیڈز یا جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق یہ ایم آر وی میزائل سسٹم ہے جو دشمن کے بیلسٹک میزائل ڈیفنس شیلڈ کو شکست دینے اور بے اثر کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس میزائل میں موجود ہر وار ہیڈ ایک سے زیادہ اہداف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ میزائل ایسے ہائی ویلیو اہداف، جو بیلسٹک میزائل ڈیفنس شیلڈ سے محفوظ بنائے گئے ہوں، کے خلاف پہلی یا دوسری سٹرائیک کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایم آروی میزائل کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر ہدف کے قریب پہنچنے پر ان کے خلاف مخالف سمت میں میزائل ڈیفنس شیلڈ یا بیلسٹک میزائل سسٹم موجود ہو تو وہ انہیں کنفیوز کر سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک فاسٹ بالر گیند کو سوئنگ کرتا ہے جس میں وہ بیٹسمین کے ڈیفنس کو توڑنے کیلئے

اپنی رفتار کے ساتھ سوئنگ اور سیم پر بھی انحصار کرتا ہے۔ ایم آئی آر ویز میزائل میں کئی وارہیڈز ہوتے ہیں جو آزادانہ طور پر پروگرامڈ ہوتے ہیں اور آزادانہ طور پر ہی اپنے اپنے اہداف کی جانب جاتے ہیں اور ہر ایک کا فلائٹ پاتھ یعنی فضائی راستہ مختلف ہوتا ہے۔

انڈیا تقریباً ایک دہائی سے بھی زائد عرصے سے بلیسٹک میزائل سسٹم پر کام کر رہا ہے اور وہ نہ صرف اس کے تجربات کرتے رہتے ہیں بلکہ عوامی سطح پر ایسے بیانات بھی دیتے ہیں۔ انڈیا نے حال ہی میں پہلے ایم آر وی میزائل اگنی فائیو کا ایک سے زائد وارہیڈز کے ساتھ تجربہ کیا ہے۔ یہ انٹر کونٹیننٹل بیلسٹک میزائل ہے جس کی رینج کم از کم 5000-8000 کلومیٹر ہے، اس کے مقابلے میں ابابیل کی رینج محض 2200 کلومیٹر ہے اور یہ پوری دنیا میں سب سے کم رینج تک مار کرنے والا ایم آر وی ہے۔ ایسی غیر مصدقہ اطلاعات ہیں کہ انڈیا کا "اگنی پی" بھی ایم آر وی ہے جس کی رینج 2000 کلومیٹر تک ہے۔

ابابیل صرف اور صرف انڈیا کا مقابلہ کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا ہے لیکن امریکا کو 2021 سے جس میزائل پر تشویش ہو رہی ہے وہ شاہین تھری میزائل ہے جس کی رینج 2740 کلومیٹر ہے۔ دراصل ابابیل شاہین تھری میزائل کی اگلی جنریشن ہے۔ شاہین تھری کے تجربے کے وقت نیشنل کمانڈ اتھارٹی کے مشیر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد احمد قدوائی نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "یہ میزائل صرف اور صرف انڈیا کا مقابلہ کرنے کیلئے بنایا گیا ہے اور اس کا مقصد انڈیا میں اہم سٹریٹجک اہداف (خاص طور پر انڈمان اور نیکوبار جزیروں اور مشرق میں وہ مقامات جہاں ان کی نیوکلیئر سب میرین بیسز تعمیر کی جا رہی ہیں) کو نشانہ بنانا ہے تا کہ انڈیا کو چھپنے کیلئے کوئی جگہ نہ مل سکے اور یہ غلط فہمی نہ رہے کہ انڈیا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں وہ کاؤنٹر یا پہلی سٹرائیک کیلئے اپنے سسٹمز چھپا سکتے ہیں اور پاکستان ان مقامات کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔"

یاد رہے کہ انڈیا کے وزیر دفاع رجنات سنگھ سمیت انڈین عہدیدار کئی مواقع پر ایسے بیانات دیتے آئے ہیں جن میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ "انڈیا نے ایسی صلاحیتیں حاصل کر لی ہیں جو اسے پاکستان کے خلاف قبل از وقت حملہ کرنے کے قابل بناتی ہیں"۔ وہ سپر سونک براہموس میزائل کی مثال دیتے ہیں جو روایتی کے ساتھ نیوکلیئر ہتھیار بھی ہے اور اس کے علاوہ انڈیا بہت سے ایسے سسٹمز بنا رہا ہے جو پہلی سٹرائیک کیلئے زمین، فضا اور سمندر سے بھی لانچ ہو سکتے ہیں۔

اگر آپ کو یاد ہو تو 2022 میں ایک براہموس میزائل پاکستان میں آگرا تھا جس کے بارے میں انڈین وزارت دفاع کی جانب سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کی حدود میں گرنے والا براہموس میزائل حادثاتی طور پر انڈیا سے فائر ہوا تھا۔ انڈیا براہموس کو پاکستانی سٹریٹجک فورسز اور کمانڈ اینڈ کنٹرول کے خلاف روایتی کاؤنٹر فورس (پہلی) سٹرائیک کیلئے استعمال کر سکتا ہے اور پھر انڈیا یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم نے تو محض روایتی حملہ کیا ہے لیکن اس طرح کی روایتی سٹرائیک کو پاکستان کی طرف سے پہلا جوہری حملہ تصور کیا جائے گا۔ یہ وہ ساری صورتحال ہیں جن میں کسی بھی حملے کو روکنے کیلئے پاکستان کو تیار رہنا ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے اگر پاکستان دشمن کو دکھانے کیلئے اپنی صلاحتیوں کا اظہار کرتا رہے اور اسی مقصد سے پاکستان نے شاہین تھری اور ابابیل جیسے نیوکلیئر وارہیڈز بنائے ہیں اور ان کی نمائش کی ہے۔ انڈیا کے مقابلے میں پاکستان نے اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے یہ تمام تیاری کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ امریکا کو ان میزائلوں پر کیا تشویش ہے؟

امریکی وزارتِ خارجہ کے بیان میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ "آر آئی اے ایم بی نے شاہین تھری اور ابابیل میزائل سسٹمز اور "ممکنہ طور پر اس سے بھی

بڑے سسٹمز" کیلئے ڈائیامیٹر راکٹ موٹرز کے ٹیسٹ اور آلات کی خریداری کے سلسلے میں پاکستان کے ساتھ کام کیا ہے۔ ممکنہ طور پر اس سے بھی بڑے سسٹمز کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اسی میزائل کی اگلی جنریشن پر کام ہو رہا ہے"۔

ابابیل کا پہلا ٹیسٹ جنوری 2017 میں ہوا تھا اور اس کے بعد ابابیل کا دوسرا تجربہ چھ سال بعد گزشتہ برس اکتوبر 2023 میں ہوا، اور ان چھ سالوں کے دوران این ڈی سی میں اس ٹیکنالوجی پر مسلسل کام ہوتا رہا ہے۔ امریکا کا کہنا ہے کہ شاہین تھری تو پہلے سے آپریشنل تھا لیکن ابابیل کے دوسرے تجربے کے بعد جب مارچ میں اسے پریڈ میں دکھایا گیا تو اس کے بعد شاہین تھری اور ابابیل زیادہ نظروں میں آئے کیونکہ اس نمائش کا مطلب تھا کہ پاکستان اس مرحلے تک پہنچ چکا ہے جہاں اس پر ریسرچ اور ڈویلپمنٹ مکمل ہو چکی ہے اور ابابیل اب آپریشنل ہے"۔ یہ ہے امریکی تشویش کی اصل وجہ! امریکا کو خدشہ ہے پاکستان اس کے زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں والے ورژن پر کام کر رہا ہے۔

امریکی تشویش کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ابابیل تھری سٹیج میزائل سسٹمز ہیں اور موبائل لانچر والا سسٹم ایک بہت اہم صلاحیت ہے کیونکہ کسی بھی سرپرائز حملے کی صورت میں یہ سسٹم نا صرف بڑی آسانی سے مختلف مقامات پر کیموفلاج کیے جاسکتے ہیں بلکہ انہیں با آسانی ایسی جگہ بھی لے جایا جاسکتا ہے جہاں دشمن ان کا پتا نہ چلا سکے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ کوئی بھی تھری سٹیج میزائل سسٹم، زیادہ رینج والے سسٹم کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن ابابیل کے پہلے اور دوسرے ٹیسٹ کے بیچ چھ سال کا وقفہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان اب مقامی طور پر اس ٹیکنالوجی پر کام کر رہا ہے۔ اگر چین سے ہی ساری ٹیکنالوجی لے رہے ہوتے تو چھ سال کا انتظار کیوں کرتے؟ تاہم یقیناً اس سسٹم میں کوئی ایسی نئی ڈویلپمنٹ ہوئی ہے جس نے امریکی تشویش میں اضافہ کیا ہے کہ شاید پاکستان مزید صلاحیتیں حاصل کر رہا ہے اور مستقبل میں ان نیوکلیئر صلاحیتوں والے میزائلوں کے بہتر ورژن زیادہ بڑے وارہیڈز لے جاسکتے ہیں اور ابابیل شاید تین سے زیادہ وارہیڈز لے جانے کی صلاحیت حاصل کر لے۔

یاد رہے اپریل میں ان سسٹمز کے موبائل لانچرز پر پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ امریکا کی جانب سے جاری کردہ فیکٹ شیٹ میں کہا گیا تھا کہ بیلاروس میں قائم مِنسک وہیل ٹریکٹر پلانٹ نے پاکستان کو بیلسٹک میزائل پروگرام کیلئے خصوصی گاڑیوں کے چیسس فراہم کیے ہیں اور بیلاروس کے صدر کے ساتھ اعلیٰ سطحی وفد کے پاکستانی دورے کو بھی معنی خیز انداز سے دیکھا جارہا ہے جبکہ خود امریکا اس سے کہیں خطرناک ٹیکنالوجی انڈیا اور اسرائیل کو مہیا کر چکا ہے، پاکستان نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

امریکی پابندیوں میں پاورفل راکٹ موٹرز کا بھی تذکرہ ہے۔ امریکا کو ابابیل کی طویل رینج کے علاوہ پاکستان کے سپیس پروگرام پر بھی تشویش ہے۔ یاد رہے اپریل کی فیکٹ شیٹ میں چین کی گرانیکٹ کمپنی لمیٹڈ پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ یہ کمپنی پاکستان کی خلائی تحقیق کے ادارے سپارکو کے ساتھ مل کر راکٹ موٹروں کی جانچ پڑتال میں معاون آلات کی فراہمی میں ملوث پائی گئی ہے اور مزید یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ یہی کمپنی پاکستان کو بڑی راکٹ موٹرز آزمانے کیلئے پرزے فراہم کرتی رہی ہے۔

امریکا، اسرائیل اور انڈیا (ٹرائیکا) کو فکر ہے کہ پاکستان اپنا مقامی سپیس لانچ وہیکل نہ بنالے اور پاکستان پہلے سے 2047 سپیس پروگرام کا وژن رکھتا ہے۔ نیوکلیئر ڈیٹیرنس کیلئے سپیس پروگرام میں صلاحیتیں حاصل کرنا بہت اہم ہیں جو آپ کو ہدف کو درست نشانہ بنانے اور دفاعی نگرانی وغیرہ کے قابل بناتا ہے۔ امریکا کو خدشہ ہے کہ پاکستان فوجی اور سویلین مقاصد کیلئے اپنا سپیس وہیکل لانچ کرسکتا ہے جس سے اس کے پاس انٹرکونٹینٹل بیلسٹک میزائل

فائر کرنے کی صلاحیت آجائے گی۔

امریکی محکمہ خارجہ کے بیان میں میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول ریجیم کا بھی ذکر ہے۔ یہ میزائل ٹیکنالوجی کی برآمد پر کنٹرول رکھنے والے ممالک کا گروپ ہے۔ پاکستان اور چین دونوں نے ایم ٹی سی آر پر دستخط نہیں کیے مگر اس کے بغیر بھی چین اور پاکستان دونوں اس کا پاس کرتے ہیں اور کوئی ایسا سسٹم برآمد نہیں کیا گیا جس کی رینج 300 کلومیٹر سے زیادہ ہو مگر اس اقدام کی تعریف کرنے کی بجائے یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اور چین آپس میں تعاون کر رہے ہیں۔ اگر مسئلہ دونوں ملکوں کے تعاون سے ہے تو دوسری طرف انڈیا کا سارا میزائل پروگرام روس کے تعاون اور مدد سے بنا ہے اور اب امریکا نے اسے سول جوہری کلب کا رکن بنا کر ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر رکھا ہے۔ اس کی مثال انڈیا کا براہموس میزائل ہے، جب ابتدا میں روس سے یہ ٹیکنالوجی لی گئی تو اس کی رینج 290 کلومیٹر تھی مگر اب انڈیا اسے 800 کلومیٹر تک لے جا چکا ہے اور اس کے ہائپر سانک ورژن پر بھی کام ہو رہا ہے مگر یہاں ایم ٹی سی آر کی بات نہیں کی جاتی۔ یاد رہے کہ ایم ٹی سی آر میں 300 کلومیٹر سے زیادہ رینج والے میزائل کی برآمد پر پابندی ہے اور 500 کلو سے زیادہ کے وار ہیڈز کی بھی اجازت نہیں ہے۔ انڈیا کا اگنی فائیو کی مثال آپ کے سامنے ہے جس کی رینج 5000-8000 کلومیٹر ہے اور یہ تین سے پانچ اور شاید اس سے بھی زیادہ وار ہیڈز لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انڈیا ایٹمی آبدوزوں پر لگانے کیلئے بھی اس کے ورژن تیار کر رہا ہے۔

جبکہ پاکستان کے پاس تو کوئی ایٹمی آبدوز نہیں ہے۔ پاکستان کے تحمل کی تعریف تو نہیں کی جاتی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان کی کوششیں جنوبی ایشیا میں سٹریٹیجک استحکام برقرار رکھنے کیلئے ہیں۔ انڈیا کے جواب میں تیار کی گئیں ٹیکنالوجیز سے مسئلہ تو نہیں ہونا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکا کے نزدیک انڈیا کواڈ کا سب سے اہم رکن ہے۔ اس کے علاوہ انڈیا کی سافٹ پاور، معاشی طاقت پاکستان سے بہت زیادہ اور مغربی ممالک کے ہر تھنک ٹینک میں انڈینز کا غلبہ ہے جو عوام اور حکومتوں کی رائے عامہ بنانے پر بہت اثر رکھتے ہیں۔ یاد رہے کواڈ چار ممالک کا گروپ ہے جس میں انڈیا، آسٹریلیا، جاپان اور امریکا شامل ہیں۔

امریکا کی مختلف بین الاقوامی مقامات پر جیوسٹریٹیجک دلچسپیاں ہیں جیسے یوکرین روس، مشرقِ وسطیٰ اور تائیوان چین وغیرہ کی صورتحال ہے اور اسی باعث اس نے مختلف جگہوں پر ان ملکوں سے مختلف وعدے کر رکھے ہیں اور جنوبی ایشیا کے خطے میں چین کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کیلئے کواڈ بنایا ہے۔ چین کے ساتھ کشیدگی بھی پاکستان کے میزائل پروگرام پر پابندی کی ایک وجہ ہے۔ امریکی پابندیوں کا محور بنیادی طور پر پاکستان کے بجائے چینی کمپنیاں ہیں، تاکہ بیجنگ کو مجبور کر کے معاشی دباؤ ڈالا جائے۔

اس لئے معاشی و سیاسی حوالے سے یہ ممکن ہی نہیں کہ پاکستان امریکا کو نشانہ بنانے کا سوچے، کیونکہ پاکستان کی سب سے بڑی برآمدی مارکیٹ (تقریباً 6 ارب ڈالر) امریکا ہے اور وہاں مقیم پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد ملک میں رقوم بھیجتے ہیں اس کے علاوہ پاکستان اپنے معاشی مسائل کے حل (آئی ایم ایف) کیلئے امریکا کے ساتھ خیر سگالی کے تعلقات برقرار رکھنا اپنی خارجہ پالیسی کے ساتھ ساتھ قومی سلامتی کا اہم ہدف سمجھتا ہے۔ تاہم ایسا ممکن ہے کہ پاکستان (این ڈی سی) ابابیل میزائل سسٹم کا زیادہ جدت والا ورژن تیار کر رہا ہو جو کسی بھی انڈین بیلسٹک میزائل ڈیفنس شیلڈ کو شکست دے سکتا ہے اور ایک سے زیادہ وار ہیڈز کا بھاری پے لوڈ لے جا سکتا ہو تاہم اس کیلئے زیادہ طاقتور راکٹوں کی ضرورت ہو گی اور امریکی حکام این ڈی سی پر اسی کی تیاری کا الزام لگا رہے ہیں لیکن یہ انڈیا کیلئے بنائے گئے مخصوص میزائل سسٹم کو آئی سی بی ایم (بین البراعظمی بیلسٹک میزائل) میں تبدیل نہیں کر سکتا اور اس کیلئے بالکل نیا میزائل سسٹم چاہیے ہو گا۔

امریکا کے پالیسی ساز حلقوں میں انڈیا کے بڑھتے اثر ورسوخ کے نتیجہ میں بائیڈن انتظامیہ نے یہ قدم اٹھایا ہے اور پاکستانی کی دفاعی صلاحیتوں میں کمی لانے کیلئے انڈیا اب امریکا کا کندھا اور دباؤ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان کی دفاعی صلاحیتوں پر تنقید اور شکوک وشبہات کا اظہار کرنا اس بات کا ثبوت ہے واشنگٹن میں انڈین لابی بائیڈن کے آخری دنوں میں ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ مستقبل میں بھی ایسا ممکن نہیں ہے کہ پاکستان امریکا پر حملہ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لے کیونکہ پاکستان کا میزائل واٹامک پروگرام انڈیا کیلئے مخصوص ہے پاکستان کسی قسم کی ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل نہیں ہے۔

بروز اتوار 21 جمادی الآخر 1446ھ 22 دسمبر 2024ء

"عرب بہار کا عفریت اور گریٹر اسرائیل"

"پہنچی وہی پر خاک جہاں کا خمیر تھا" کے مصداق بشارالاسد کو روسی صدر پوٹن نے گود لے لیا اور پہلی مرتبہ بشارالاسد کا ٹیلی گرام اکاؤنٹ پر پیغام نشر ہوا ہے کہ ان کا ملک چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تاہم انہیں اپنی فوج کی پسپائی اختیار کرنے کے بعد ایسا کرنا پڑا۔ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس اکاؤنٹ کا کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے یا یہ بیان بشارالاسد نے خود لکھا بھی ہے یا نہیں۔ بشارالاسد سے منسوب یہ بیان انگریزی اور عربی دونوں میں شیئر کیا گیا ہے اور اس میں 8 دسمبر کے واقعات کی تفصیل دی گئی ہے کہ کیسے وہ روسی اڈے پر پھنس گئے تھے۔

خیال رہے 9 دسمبر کو مخالف گروہوں نے دارالحکومت دمشق کا کنٹرول سنبھالا تھا اور بشارالاسد اور اس کے باپ کے ظلم و جبر، رعونیت اور فرعونیت کا 53 سالہ اقتدار اپنے اختتام پر پہنچا تھا۔ بشارالاسد سے منسوب بیان میں کہا گیا ہے کہ جس وقت دمشق باغیوں کے کنٹرول میں گیا، وہ اس وقت لاطاقیہ میں ایک روسی فوجی اڈے پر موجود تھے تاکہ "فوجی آپریشن کی نگرانی" کر سکیں لیکن اس وقت تک شام کی فوج اپنی پوزیشن چھوڑ کر پیچھے ہٹ چکی تھی۔ روسی ہوائی اڈے حمیمیم پر بھی "شدید ڈرون حملے" ہو رہے تھے اور اسی وقت روس نے انہیں ماسکو لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

دراصل جب ہوائی اڈے سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تو روس نے درخواست کی کہ 8 دسمبر، اتوار کی شام کو فوراً اسے خالی کیا جائے اور وہاں موجود لوگوں کو روس پہنچایا جائے۔ یہ سب دمشق کے (باغیوں کے) کنٹرول میں آنے کے ایک دن بعد ہوا جب شامی فوج نے اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ دیا اور اس کے نتیجے میں تمام ریاستی ادارے مفلوج ہو گئے۔ اس بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ "ان واقعات کے دوران میں نے کسی بھی موقع پر صدارت چھوڑنے یا پناہ لینے پر غور نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی فرد یا فریق نے اس وقت تک مجھے ایسی پیشکش کی تھی لیکن جب ریاست دہشتگردوں کے ہاتھ میں آ گئی اور میری معنی خیز کردار ادا کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تو پھر میری وہاں موجودگی بھی بے معنی ہو گئی تھی"۔ سوال یہ ہے کہ کیا بشارالاسد جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ روس فرار ہو گئے ہیں، کیا وہ فوجی نگرانی کیلئے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیکر چلتے ہیں؟ کوئی بھی ذی شعور اس بہانے کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو گا بلکہ بشارالاسد اپنے ظلم و ستم کی بناء پر اپنے انجام سے بخوبی واقف تھا، اس لئے گزشتہ چند دنوں سے وہ شامی خزانے پر ہاتھ صاف کرتا ہوا فرار ہوا ہے۔

جب ہیئت تحریر شام کی قیادت میں باغیوں نے صرف 12 دنوں میں شامی شہروں اور صوبوں پر قبضہ کیا تو بشارالاسد کہیں نظر نہیں آئے تھے تاہم اس وقت یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ بشارالاسد ملک چھوڑ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہیئت التحریر اور ان کے دیگر ساتھی دمشق میں داخل ہوئے تو اس وقت بشارالاسد کے اپنے وزیر اعظم ان سے رابطہ کرنے سے قاصر تھے۔ اتوار کو علی الصبح جب مخالف فورسز دمشق شہر میں بغیر کسی مزاحمت میں داخل ہو رہے تھے تو ہیئت تحریر اور اس کے اتحادیوں نے اعلان کیا کہ "ظالم بشارالاسد (شام) چھوڑ گئے ہیں"۔ اس دوران دو سینیئر شامی فوجی افسران نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ بشارالاسد سیریئن ایئر کے ایک طیارے میں سوار ہو کر دمشق ایئرپورٹ سے اتوار کی صبح روانہ ہو گئے تھے۔

اس سوال کا ایک سادہ سا جواب تو یہی ہے کہ 2011 میں شروع ہونے والی خانہ جنگی کے دنوں میں روس بشارالاسد کا اہم اتحادی بن کر سامنے آیا تھا اور کریملن کے مشرق وسطیٰ کے اس ملک میں دو اہم فوجی اڈے بھی ہیں۔ 2015 میں روس نے بشارالاسد کی حمایت میں فضائی حملے شروع کیے جس سے ملک میں جاری جنگ کا حتمی نتیجہ بشارالاسد کے حق میں نکلا اور ان کے خلاف برسرپیکار گروپوں کو پے در پے شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کے بعد بشارالاسد حکومت نے اپنے مخالفین کا بڑے پیمانے پر صفایا کرنے کیلئے ظلم و ستم کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ برطانیہ میں قائم گروپ کے مطابق روس کی طرف سے کی

جانے والی کارروائیوں میں نو برس میں 21,000 سے زائد افراد ہلاک ہوئے جن میں 8700 عام شہری بھی شامل تھے۔ تاہم روس کی توجہ یوکرین میں بٹی ہونے کی وجہ سے روس یا تو اب بشارالاسد سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھا یا پھر وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ نومبر کے آخر میں وہ بشارالاسد کے خلاف باغیوں کے حملوں کو روک پاتا۔

بشارالاسد کے روس اور خاص طور پر ماسکو سے گہرے روابط کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ 2019 میں فنانشل ٹائمز کی تحقیقات میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ شام میں خانہ جنگی کے دوران ملک سے کروڑوں ڈالر باہر لے جانے کی غرض سے بشارالاسد کے خاندان نے روس کے دارالحکومت ماسکو میں 18 انتہائی پر تعیش اپارٹمنٹس خریدے ہیں۔ گزشتہ ہفتے روس کے ایک مقامی اخبار کی خبر کے مطابق بشارالاسد کے 22 برس کے بڑے بیٹے حافظ الاسد ماسکو سے اس وقت پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ دمشق میں افراتفری کے دوران روس کے سرکاری ٹی وی چینل نے یہ خبر دی کہ روسی حکام اس وقت شام میں مسلح اپوزیشن سے ملک میں موجود دو روسی فوجی اڈوں اور سفارتی عملے کی حفاظت کو یقینی بنانے سے متعلق رابطے میں ہیں۔

اس وقت شامی باغی گروہ ملک میں ایک عبوری حکومت تشکیل دے رہے ہیں۔ ملک کا سب سے طاقتور گروہ ہیئت تحریر شام 2011 میں جبھۃ النصرہ کے نام سے منظرِ عام پر آیا تھا اور اس نے اسی برس القاعدہ سے منسلک ہونے کا اعلان کیا تھا تاہم اس تنظیم نے 2016 میں القاعدہ سے تعلق توڑ دیا اور مختلف دیگر گروہوں کے ساتھ مل کر ہیئت تحریر شام کی بنیاد رکھ دی۔ تاہم اقوام متحدہ، امریکا، برطانیہ اور دیگر متعدد ممالک تاحال اسے ایک دہشتگرد گروہ تصور کرتے ہیں۔

تنظیم کے سربراہ احمد الشرع (ابو محمد الجولانی) کی جانب سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ شام میں دیگر مذہبی گروہوں اور برادریوں کیلئے برداشت کا مظاہرہ کریں گے۔ تاہم ان کے گروہ کا ایک جہادی ماضی بھی ہے جس کے سبب کچھ افراد ان کے وعدوں کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے نمائندے گئیر پیڈرسن نے اتوار کو احمد الشرع سے ملاقات کی تھی اور ان کا کہنا ہے کہ شام میں ایک "مستند" تبدیلی کا آنا ضروری ہے۔

قطر نے 13 برس قبل شام میں اپنا سفارتخانہ بند کر دیا تھا لیکن اب اس کی حکومت کی جانب سے ایک وفد دمشق بھیجا گیا ہے تاکہ ملک میں سفارتی سرگرمیاں دوبارہ شروع کی جاسکیں۔ مغربی ممالک نے شام میں سفارتخانے کھولنے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن امریکا اور برطانیہ کا کہنا ہے کہ گزشتہ دنوں ان کے ہیئت تحریر شام سے رابطے ہوئے ہیں۔ تاہم برطانوی حکومت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ "سفارتی رابطے" شروع ہونے کے باوجود ہیئت تحریر شام کی بطور دہشتگرد گروہ حیثیت برقرار ہے۔ دوسری جانب یورپی یونین کی خارجہ پالیسی کی سربراہ کایا کلاس نے کہا تھا کہ روس اور ایران کا "شام کے مستقبل میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے۔

ادھر امریکی وزیر خارجہ انتونی بلنکن نے ہیئت التحریر الشام (ایچ ٹی ایس) کے ساتھ براہ راست رابطے کی تصدیق کی ہے کہ بشارالاسد کی حکومت کے خاتمے کے بعد ملک کا کنٹرول سنبھالنے والے ہیئت التحریر الشام سے انہوں نے پہلا براہِ راست رابطہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ایچ ٹی ایس کو امریکا نے دہشتگرد تنظیم قرار دیا ہوا ہے اور شام کے نئے حکمران گروپ کو ابھی تک اس فہرست سے نکالا نہیں گیا ہے۔ انتونی بلنکن نے اپنی بریفنگ کے دوران صحافیوں کو بتایا کہ اس رابطے کا بنیادی مقصد لاپتہ امریکی صحافی آسٹن ٹائس سے متعلق دریافت کرنا تھا۔

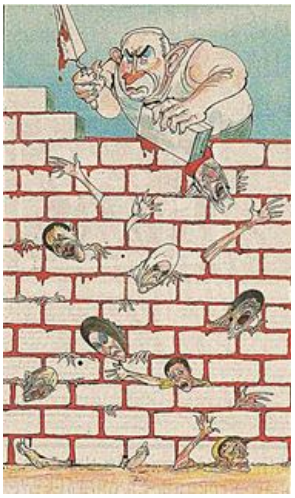

وزیر خارجہ انتونی بلکن نے اس رابطے کی تصدیق اردن میں متعدد عرب ممالک، ترکی اور یورپ کے نمائندوں سے اس ملاقات کے بعد کی جس میں شام کے مستقبل کے حوالے سے معاملات پر غور کیا جارہا تھا۔ اجلاس میں شریک حکام نے شام میں اقتدار کی پرامن منتقلی کے عمل کی حمایت کرنے پر اتفاق کیا۔ اس موقع پر اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ علاقائی ممالک شام کو مزید انتشار کا شکار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس اجلاس کے بعد ایک مشترکہ بیان بھی جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ شام میں ایک ایسی جامع حکومت کی حمایت کی جائے گی جو اقلیتوں کے حقوق کا احترام کرے اور ساتھ ہی ساتھ دہشتگرد گروہوں کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہ دے۔

حالیہ ہفتوں میں شام میں ہونے والی ڈرامائی تبدیلیوں اور ہنگامہ خیز واقعات کے بعد اب شام کے اندر اور باہر بات چیت کا محور ایک ایسی نئی حکومت کے قیام کی اہمیت پر ہے جو شام کے عوام کی نمائندگی کر سکے۔ یاد رہے کہ حیئت تحریر الشام کا اردن میں ہونے والے اجلاس میں کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔ اس اجلاس میں عراقی وزیر خارجہ فواد حسین نے مشرق وسطیٰ اور دیگر علاقوں میں شام کے مستقبل کے بارے میں پائی جانے والی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خطے کے ممالک شام کو لیبیا جیسی صورتحال کا شکار نہیں دیکھنا چاہتے۔

یاد رہے کہ عرب جمہوریہ لیبیا کے کرنل معمر قذافی طویل ترین عرصے تک برسر اقتدار رہنے والے عرب رہنما تھے تاہم 2011 میں تیونس سے شروع ہونے والے استعماری عرب عوامی بیداری کا سیلاب کرنل معمر قذافی کو بھی بہالے گیا تھا۔ "عرب بیداری" کے نام پر اس خطے میں جن استعماری قوتوں نے تباہی مچائی، ان کے عزائم بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہے اور اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے جو بے دریغ انسانی خون بہایا گیا، وہ بھی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے مگر انتہائی پرامن ملک لیبیا جہاں کی عوام ریاستی آسائشوں اور مراعات سے اپنی ترقی کا راستہ طے کر رہی تھی، وہاں اپنی من پسند حکومت لانے کیلئے جو ہر حال میں ان کے احکام کی تعمیل کرے، اس پُرامن لیبیا کو جنگ کے خوفناک شعلوں کے حوالے کر دیا گیا اور آج تک لیبیا کرنل قذافی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد شدید افراتفری کا شکار ہے اور یہی استعماری قوتوں کا پلان ہے کہ مسلم افریقی لیبیا کے تمام قدرتی وسائل پر قبضہ کر لیا جائے اور عرب بہار کے نام پر مسلم افریقی ممالک پر یکطرفہ یورش کے بعد وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

تاہم اب اردن کے اجلاس میں ترکی کے وزیر خارجہ حکان فیدان نے اپنے مؤقف میں کہا کہ "شام کے موجودہ اداروں کو محفوظ رکھنا اور ان میں اصلاحات لانا، اس وقت سب سے ضروری ہے۔ شام میں اقتدار کی منتقلی کے دوران دہشتگردی کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہمیں ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنے اور اپنے اقدامات کو مربوط کرنا ہوگا"۔ اردن میں ہونے والی بات چیت میں شام کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔ برس ہا برس تک بشارالاسد کی حکومت کے حمایتی ایران اور روس کی بھی اجلاس سے غیر حاضری تھی۔ اجلاس میں موجود 8 عرب ممالک کے وزرائے خارجہ نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ شام متحد رہے اور فرقہ واریت کی بنیاد پر تقسیم نہ ہو۔

اسرائیل کی حکومت نے شام میں بشارالاسد کی حکومت کے خاتمے کے بعد گولان کی پہاڑیوں پر یہودی آبادکاری کو وسعت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ نتن یاہو کے مطابق شام کی سرحد پر ایک نیا محاذ کھل جانے کے بعد "یہ قدم اٹھانا ضروری تھا اور اسرائیل کو باغیوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کیلئے یہ

اسرائیل کی جانب سے اٹھایا گیا ایک عارضی قدم ہے"۔ یاد رہے کہ اسرائیل کی یہ تاریخ ہے کہ اس نے اب تک اپنی جارحیت کے سبب تمام علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے یہی مؤقف اختیار کیا تھا اور اب تک ان تمام علاقوں پر قابض ہے۔

اسرائیلی وزیر اعظم نے گولان کی پہاڑیوں پر، جہاں 1967 کی جنگ کے دوران قبضہ کیا تھا (اور بین الاقوامی قانون کے تحت یہ غیر قانونی تصور ہوتا ہے) یہودی آبادی کی تعداد دگنی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ واضح رہے کہ چند دن قبل ہی اسرائیلی فوج نے گولان کی پہاڑیوں پر قائم ایک غیر فوجی بفر زون سمیت شام کی سرحدی حدود میں موجود چند اہم پوزیشنز پر قبضہ کر لیا تھا۔ نیتن یاہو نے ایک بیان میں یہ بھی کہا کہ اسرائیل شام کے ساتھ تنازع میں دلچسپی نہیں رکھتا اور زمینی حقائق کو دیکھتے ہوئے شام کی جانب پالیسی طے کی جائے گی۔ ان کے اس اعلان پر سابق اسرائیلی وزیر اعظم ایہود اولمرٹ نے تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ "گولان کی پہاڑیوں میں آبادکاری کو وسعت دینے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ نیتن یاہو نے کہا کہ ہم شام سے تنازع نہیں چاہتے اور امید کرتے ہیں کہ شام پر کنٹرول سنبھالنے والے باغیوں سے لڑنا نہیں پڑے گا تو پھر ہم مکمل الٹ کام کیوں کر رہے ہیں؟"

یہ پیش رفت ایک ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب شام کے نئے رہنما ابو محمد الجولانی نے شامی ٹی وی سے بات کرتے ہوئے شام پر اسرائیلی حملوں کی مذمت کی ہے۔ یہ حملے خطے میں کشیدگی بڑھا سکتے ہیں۔ شام کسی ہمسائے کے ساتھ تنازع نہیں چاہتا۔ طویل جنگ کے بعد حالات کسی نئے تنازع کی اجازت نہیں دیتے۔ برطانیہ میں موجود شامی آبزرویٹری برائے انسانی حقوق کے اعداد و شمار کے مطابق 8 دسمبر کے بعد سے اب تک ملک میں تقریباً 450 فضائی حملے ہو چکے ہیں۔ یاد رہے کہ گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل کی 30 آبادیاں موجود ہیں جہاں تقریباً 20 ہزار افراد رہتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تحت یہ آبادیاں غیر قانونی ہیں۔ تاہم اس علاقے میں 20 ہزار شامی بھی آباد ہیں جو اسرائیلی قبضے کے باوجود اب تک وہیں مقیم ہیں۔

دوسری طرف اسرائیل نے خطے کے ممالک کی مذمت کے باوجود شام پر مزید درجنوں فضائی حملے کیے ہیں۔ ان حملوں کی تصدیق وار مانیٹرز کی جانب سے کی گئی ہے۔ اسرائیل اس سے قبل یہ کہہ چکا ہے کہ وہ ان "سٹریٹجک صلاحیتوں" کے خاتمے کے لیے یہ کارروائیاں کر رہا ہے جو اس کیلئے خطرے کا سبب بن سکتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے بھی شام میں اسرائیل کے سیکڑوں فضائی حملوں پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔

بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ 13 سالہ خانہ جنگی کے بعد ہوا۔ شام کی ایک دہائی سے زیادہ جاری خانہ جنگی اس وقت شروع ہوئی تھی جب انہوں نے جمہوریت نواز مظاہروں کے خلاف طاقت کا استعمال کیا تھا۔ اس جنگ میں 5 لاکھ سے زائد لوگ مارے گئے تھے جبکہ لاکھوں بے گھر ہوئے۔ اس دوران شام بین الاقوامی طاقتوں اور ان کے پراکسی گروہوں کی جنگ کا میدان بن کر رہ گیا تھا۔ وہ تمام ممالک جو شام کی خانہ جنگی میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے اب اس ملک کے مستقبل پر ان کا بھی گہرا کردار شامل ہو گا۔ اگر شامی عوام کو حالیہ ہفتے میں حاصل ہونے والی آزادی کو مضبوط بنیادوں پر قائم رکھنا ہے تو یہاں کے نئے حکمرانوں کو ملک کے اندر اور باہر مکمل یکجہتی پیدا کرنی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی خطے کے دیگر مسلم ممالک کو بھی اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کے ممکنہ امکانات کو بدلنے کیلئے عملی طور پر میدانِ عمل میں اترنا ہو گا وگرنہ "عرب بہار کا عفریت" گریٹر اسرائیل کی شکل میں ان کو نگلنے کیلئے پوری رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ امت مسلمہ تمام مفادات سے بالاتر ہو کر اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے شام کی تقسیم کو روکے اور شام کے موجودہ زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے وہاں پر امن ماحول پیدا کرنے میں مکمل معاونت کرے۔

بروز بدھ 24 جمادی الآخر 1446ھ 24 دسمبر 2024ء

ایران کی داخلی اور خارجی چیلنجز: ایک پیچیدہ صورتحال

جب کوفہ ایک بار پھر فتح ہونے پر مختار ثقفی کا سر کاٹ کر مصعب ابن زبیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے فرمان جاری کیا کہ جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ دربار میں بیٹھا ایک بوڑھا مسکرایا تو مصعب نے انتہائی غصے سے دریافت کیا: کیوں ہنستا ہے بڈھے؟ اس بوڑھے نے کہا: ماضی یاد آگیا، حال سامنے ہے مستقبل آدھا دکھائی دے رہا ہے۔ مصعب نے حکم دیا کہ تفصیل بتاؤ۔ اس بزرگ نے کہا: سن سکو گے؟ پھر جب اس بوڑھے نے بولنا شروع کیا تو درودیوار ہل گئے:

یہی دربار تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد تخت پر بیٹھا تھا۔ حسین ابن علی کا سر لایا گیا۔ ابن زیاد نے کہا جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم نے جشن منایا۔ ایک بار پھر یہی دربار تھا، جس مختار ثقفی کا سر تیرے قدموں میں پڑا ہے، یہ اسی تخت پہ بیٹھا تھا جہاں اس وقت تو بیٹھا ہوا ہے۔ ابن زیاد کا سر کاٹ کر لایا گیا تو مختار ثقفی نے فرمان جاری کیا، جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم نے جشن منایا۔ آج وہی دربار ہے اور اسی تخت پر تو براجمان ہے۔ مختار ثقفی کا سر لایا گیا ہے، تیرا حکم ہے جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم آج بھی جشن منائیں گے۔ کل بھی یہی دربار ہو گا، یہ تو نہیں جانتا کہ تخت پر کون بیٹھا ہو گا لیکن اتنا پتہ ہے کہ سر تیرا ہو گا اور فرمان جاری کیا جائے گا، جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا اور ہم جشن منائیں گے۔

بوڑھے کی پیشگوئی کے عین مطابق کوفہ کے دربار میں عبدالملک بن مروان کے سامنے مصعب بن زبیر کا سر پیش کیا گیا اور اس نے جشن منانے کا حکم دیا ۔کسی نے بوڑھے کی بات کا عبدالملک بن مروان کے سامنے ذکر کیا تو عبدالملک بن مروان نے فوراً دربار کی عمارت کو گرانے اور دربار کو کوفہ کے کسی دور دراز علاقے میں تعمیر کرنے کا حکم دیا لیکن واقعات تو اب بھی سرزد ہو رہے ہیں۔

تاریخ خود کو ایک مرتبہ پھر دہرا رہی ہے لیکن اس مرتبہ کوفہ کی جگہ دمشق کا انتخاب کیا گیا ہے۔ بشارالاسد کو اقتدار سے بے دخل کیے جانے کے بعد دمشق میں واقع ایرانی سفارتخانے میں رہبر اعلیٰ آیت اللہ خامنہ ای، قاسم سلیمانی اور حزب اللہ کے سابق رہنماء حسن نصراللہ کی مسخ شدہ تصاویر یہ یاددلا رہی ہیں کہ ایران کو کیسے ایک کے بعد ایک نقصان اٹھانا پڑا ہے اور شام میں واقعی ایک انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ دمشق میں ایرانی سفارتخانے کے فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشوں اور ایرانی پرچم کے ٹکڑوں کے درمیان ایران کے رہبر اعلیٰ سمیت دیگر ان تمام رہنماؤں کی تصاویر والے پھٹے ہوئے پوسٹرز بھی نیچے بکھرے پڑے ہیں اور ہر کوئی انہیں پاؤں تلے روندتا ہوا گزر رہا ہے۔ درجنوں ایسی ہی تصاویر جو کل تک ایک عزیمت، شجاعت اور احترام کی حقدار سمجھی جاتی تھی، آج باعثِ عبرت کے مناظر پیش کر رہی ہیں۔

ایرانی سفارتخانے کی فیروزی ٹائلیں تو اپنی جگہ قائم ہیں مگر یہاں ایران کے پاسداران انقلاب کے انتہائی بااثر سابق فوجی رہنما قاسم سلیمانی، جنہیں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے حکم پر مارا گیا تھا، کی ایک بڑی تصویر ہے جس پر ان کے چہرے کو مسخ کیا گیا ہے۔ دمشق میں واقع ایرانی سفارتخانے میں رہبر اعلیٰ اور قاسم سلیمانی کی مسخ شدہ تصاویر یہ یاددلاتی ہیں کہ ایران کو کیسے ایک کے بعد ایک نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اب ایک ایسے وقت پر جب ایران اپنے زخم چاٹ رہا ہے اور اسے ٹرمپ کے ایک اور صدارتی دور کا سامنا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے میں یہ ملک ایک بار پھر بہت سخت گیر پالیسی اختیار کرے گا یا پھر یہ مغربی ممالک کے ساتھ مذاکرات کا دوبارہ آغاز کرے گا؟ اور یہ کہ اس وقت ایران کی اپنی حکومت کس قدر مضبوط ہے؟

بشارالاسد کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد رہبر اعلیٰ نے اپنی ایک شکست کے باوجود خطاب کیلئے ایک دلیرانہ انداز اختیار کیا۔1989 سے ایران کے سیاہ وسفید کے مالک رہنے والے 85 برس کے آیت اللہ خامنہ ای کو اب اپنے جانشین کے چیلنج کا بھی سامنا ہے۔انہوں نے اپنے خطاب میں یہ دعویٰ کیا کہ "ایران مضبوط اور طاقتور ہے اور یہ مزید مضبوط ہوگا"۔ مشرق وسطیٰ میں ایران کی حمایت سے حماس، حزب اللہ، یمن کے حوثی اور عراقی شیعہ گروہوں پر مشتمل اتحاد "مزاحمت کا محور" بھی اسرائیل کے خلاف مزید مضبوط ہو کر ابھرے گا۔تم جتنا دباؤ ڈالوگے، یہ مزاحمت اتنی ہی بڑھے گی۔تم جتنے جرائم کروگے تو یہ مزاحمت اتنی ہی مستحکم ہوگی۔تم ہمارے خلاف جتنا لڑوگے تو یہ لڑائی اتنی ہی پھیلے گی۔" مگر 7/اکتوبر 2023 کو حماس کی طرف سے اسرائیل پر حملے، جسے اگر ایران کی حمایت حاصل نہ بھی تھی تو اس کی تعریف اس نے ضرور کی، کے بعد سے جو کچھ خطے میں ہوا، اس سے ایران کی حکومت ہِل کر رہ گئی۔

اسرائیل کی اپنے دشمنوں کے خلاف کاروائیوں نے مشرق وسطیٰ میں ایک نئے منظر نامے کو جنم دیا ہے جس میں اب ایران کہیں دور دور تک نظر نہیں آتا۔امریکا کے سابق سفارتکار اور تھنک ٹینک ولسن سینٹر کے جیمز جیفری کا کہنا ہے کہ "مزاحمت کے محور کے تمام حصہ دار اب شکست کھا رہے ہیں۔ ایران کے مزاحمت کے محور کو اسرائیل نے کُچلا اور شام میں حکومت کی تبدیلی کے بعد تو اب یہ مزید بکھر رہا ہے۔یمن کے حوثیوں کے علاوہ خطے میں ایران کے پاس کوئی راستہ نہیں۔" ایران اب بھی پڑوسی ملک عراق میں طاقتور مسلح شیعہ گروہوں کی پشت پناہی کرتا ہے مگر جیمز جیفری کے مطابق "جو کچھ ہوا اس سے غیر معمولی طور پر خطے میں (ایرانی) تسلط کا خاتمہ ہوا ہے۔"

بشارالاسد آخری بار عوامی سطح پر یکم دسمبر کو ایران کے وزیر خارجہ کے ساتھ ایک اجلاس میں نمودار ہوئے تھے جب انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ دمشق کی طرف پیش قدمی کرنے والے باغیوں سے سختی سے نمٹیں گے مگر اب اپنی حکومت کے خاتمے کے بعد اس وقت اب بشارالاسد فرار ہو کر روس میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ایران کے شام میں سفیر حسین اکبری نے بشارالاسد کو مزاحمت کے محور کے سرکردہ رہنما کے طور پر متعارف کرایا مگر جب خود بشارالاسد کے اقتدار کا آخری وقت آن پہنچا تو پھر ایران بھی ان کیلئے کچھ کرنے کے قابل نہ رہا اور یہ بھی سننے کو ملا کہ ایران نے بشارالاسد کو آخری وقت میں پناہ دینے سے بھی معذوری کا اظہار کر دیا اور یوں چند دنوں میں مزاحمتی محور میں شامل ایک اہم ترین رہنما کا نام بھی اس فہرست سے مٹ گیا۔

ایران نے خطے میں اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنے اور اسرائیل کے خلاف ایک طاقت کھڑی کرنے کی غرض سے کئی دہائیاں لگا کر مسلح گروہوں کا ایک نیٹ ورک تیار کیا۔یہ سلسلہ 1979 سے شروع ہوتا ہے۔عراق کے ساتھ جنگ کے بعد شام کے حکمران بشارالاسد کے والد حافظ الاسد نے بھی ایران کی حمایت کی۔شام میں اسد خاندان (جن کا تعلق علوی فرقے سے ہے) اور ایران میں شعیہ علما کے درمیان اتحاد نے سنی اکثریتی مشرق وسطیٰ میں ایران کی طاقت کو مضبوط کیا۔ایران کیلئے اپنے اتحادی لبنان، حزب اللہ اور خطے میں دیگر مسلح گروہوں کی مدد کیلئے شام اہم سپلائی روٹ بھی تھا۔

ایران اس سے قبل بھی بشارالاسد کی مدد کیلئے سامنے آیا جب 2011 میں بشارالاسد کے خلاف ایک بغاوت شروع ہوئی تو ایسے میں ایران نے ان کی مدد کیلئے جنگجو، ایندھن اور ہتھیار بھیجے۔فوجی مشیر کے طور پر فرائض سرانجام دیتے ہوئے 2 ہزار سے زائد ایرانی فوجی اور جرنیل مارے گئے ہیں۔اہم ذرائع کے مطابق ایران نے 2011 سے اب تک 30 سے 50 بلین ڈالر خرچ کئے مگر اب ایران کی طرف سے مستقبل میں لبنان میں حزب اللہ

اور دیگر گروہوں کی مدد کیلئے یہ سپلائی لائن کٹ گئی ہے۔مزاحمت کا محور ایک ایسا نیٹ ورک تھا جسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ ایران کیلئے اہم اثاثہ ثابت ہو اور اس کی موجودگی میں تہران پر کسی قسم کا کوئی براہ راست حملہ نہ ہو سکے مگر یہ حکمت عملی واضح طور پر ناکام ہو چکی ہے۔

شام میں بشارالاسد حکومت کے خاتمے کے بعد ایران کیلئے آگے بڑھنے کے امکانات محدود ہو گئے ہیں کیونکہ حالیہ برسوں میں اسرائیل سے براہ راست لڑائی میں تہران کی فوج کمزور نظر آئی ہے۔اکتوبر میں ایران نے اسرائیل پر جو بیلسٹک میزائل داغے، ان کا تعاقب کر کے انہیں بے اثر کر دیا گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ میزائلوں سے اسرائیل کے متعدد فضائی اڈوں کو نقصان بھی پہنچا۔اسرائیل کے جوابی حملے میں ایران کے ایئر ڈیفنس کے نظام اور میزائل بنانے کی صلاحیت کو شدید نقصان پہنچا۔جیمز جیفری کا کہنا ہے کہ "میزائل تھریٹ تو محض کاغذی شیر ثابت ہوا ہے۔ حماس کے رہنما اسماعیل ہنیہ کی جولائی میں تہران میں ہلاکت بھی ایران کیلئے شرمندگی کا باعث بنی"۔

ایران کی ترجیح اول اپنی بقا کو یقینی بنانا ہے۔اب ایران اپنے آپ کو تبدیل کرنے، مزاحمت کے محور میں سے جو بچا ہے، اسے تقویت دینے اور علاقائی تعلقات میں دوبارہ سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ نو منتخب ٹرمپ کے دباؤ سے بچا جا سکے۔ڈینس ہورک نے کینیڈا کے ناظم الامور کے طور پر تین سال ایران میں گزارے۔وہ کہتے ہیں کہ "یہ ایک مضبوط اعصاب والی حکومت ہے جس میں طاقت کے زبردست محور ہیں، اور وہ خطرات سے کھیل سکتے ہیں"۔ان کے مطابق ایران میں اب بھی لڑنے کی بے پناہ صلاحیت ہے جسے اسرائیل سے جنگ کی صورت میں وہ خلیجی عرب ممالک کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔انہوں نے خبردار کیا ہے کہ ایران کو محض کاغذی شیر سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عالمی طور پر ایران اب کافی کمزور ہو گیا ہے۔ابھی اسے غیر متوقع ٹرمپ کا سامنا ہو گا جو 20 دسمبر کو امریکی صدر کا حلف اٹھالیں گے اور دوسرا اسرائیل نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کا انتخاب کیسے کرتا ہے۔ایران یقینی طور پر اپنے "ڈیفنس ڈاکٹرائن" یعنی دفاعی نظریے کو بھی از سر نو ترتیب دے گا جس کا پہلے خاصا انحصار مزاحمت کے محور پر تھا۔اب وہ اپنے نیوکلیئر پروگرام کا بھی جائزہ لے گا اور اس بات کا بھی تعین کرے گا کہ ملک کی وسیع تر سلامتی کیلئے اس پروگرام میں بڑی سرمایہ کاری ضروری ہو گی۔ایران کا یہ اصرار ہے کہ اس کا نیوکلیئر پروگرام مکمل طور پر پُر امن مقاصد کیلئے ہے مگر ٹرمپ نے اپنے پہلے دور اقتدار میں ایران سے 2015 کا معاہدہ ختم کیا۔اس معاہدے کے تحت معاشی پابندیوں کے خاتمے کے بدلے ایران اپنے پروگرام کو محدود کرنے پر رضامند ہو گیا تھا۔

اس معاہدے کے تحت ایران کو یورینیم افزودگی 3.67 فیصد تک کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔کم درجے کی یورینیم افزودگی سے تجارتی نیوکلیئر پاور پلانٹس کیلئے ایندھن پیدا کیا جا سکتا ہے۔جوہری امور پر نظر رکھنے والی اقوام متحدہ کی تنظیم انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی (آئی اے ای اے) کا کہنا ہے کہ اب ایران اسے 60 فیصد تک لے جا کر یورینیم کی افزودگی کی حد میں بہت زیادہ اضافہ کر رہا ہے۔ایران کا کہنا ہے کہ وہ امریکی پابندیوں کے جواب میں ایسا کر رہا ہے۔نیوکلیئر بم کیلئے 90 فیصد اور اس سے زیادہ حد تک یورینیم کی افزودگی درکار ہوتی ہے۔ آئی اے ای اے کے سربراہ رافیل گروسی کا کہنا ہے کہ ایران شاید خطے میں اسے پہنچنے والے نقصانات کے بعد ایسا کر رہا ہے۔

رائل یونائیٹڈ سروسز انسٹیٹیوٹ کے "نیو کلیئر پرو فیلریشن" امور کی ماہر دریادولزیکوف کے مطابق "یہ خاصی تشویشناک صورتحال ہے۔ نیو کلیئر پروگرام 2015 کے مقابلے میں بالکل ایک مختلف جگہ پر ہے"۔ اگرچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایران ایک ہفتے کے اندر یورینیم کی افزودگی سے بم تیار کر سکتا ہے مگر اس کیلئے اسے وارہیڈ کی ضرورت ہے جس سے پھر وہ یہ بم فائر کرنے کے بھی قابل ہو سکے۔ اس عمل میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں یا کم از کم ایک سال کا عرصہ درکار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ایران کس حد تک نیو کلئیر ہتھیاروں کے قریب پہنچ چکا ہے مگر ایران کو اب اس بارے میں علم ہو گیا ہے اور اب اسے پیچھے ہٹانا خاصا مشکل ہو گا"۔

مغربی ممالک کو اس پر تشویش ہے۔ تل ابیب یونیورسٹی میں اسرائیلی انسٹیٹیوٹ فار نیشنل سکیورٹی سٹڈیز کی سینیئر محقق ڈاکٹر ریز زمت کا کہنا ہے کہ "یہ واضح ہے کہ ٹرمپ ایران کو (اس حوالے سے) مکمل دباؤ میں رکھیں گے مگر میرے خیال میں وہ ایران سے مذاکرات کے دروازے بھی کھولیں گے تا کہ اس کے متعلق از سر نو بات چیت کا آغاز ہو سکے اور وہ ایران کو اس کے نیو کلیئر پروگرام سے دستبرداری پر راضی کر سکیں"۔ نیتن یاہو ایران میں حکومت کی تبدیلی چاہتے ہیں مگر ڈاکٹر ریز کے خیال میں "اسرائیل انتظار کرے گا کہ آخر ٹرمپ کیا کرتے ہیں اور ایران اس کا پھر کیا جواب دیتا ہے۔ اس کے امکان کم ہیں کہ ایران جنگ چھیڑنے کا متمنی ہو گا"۔

میں اپنے ایک کالم میں اس توقع کا اظہار بھی کر چکا ہوں کہ میرے خیال میں بطور بزنس مین ٹرمپ ایران سے بات چیت کی راہ نکالیں گے اور ڈیل کی کوشش کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ اسے مذاکرات کی میز تک لانے کیلئے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں گے۔ اس لئے میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ "جنگ سے زیادہ ڈیل کے امکانات ہیں۔ تاہم اس بات کے بھی امکانات موجود ہیں کہ اگر وہ زیادہ دباؤ بڑھائیں گے تو اس سے خرابی بھی پیدا ہو سکتی ہے اور پھر اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلے گا جو امریکا اور ان کے اتحادیوں میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا۔

ایران کو اس وقت متعدد داخلی چیلنجز کا بھی سامنا ہے۔ تہران نے نئے رہبر اعلیٰ کا بھی انتخاب کرنا ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای اب اس بات پر پریشان ہو رہے ہوں گے کہ وہ جاتے ہوئے اپنی وراثت اور اقتدار کی منتقلی اس طرح کریں کہ ایران ایک "مستحکم پوزیشن" پر کھڑا ہو۔ ملک بھر میں 2022 کے احتجاج کے بعد ایرانی حکومت کو بڑا دھچکا لگا تھا۔ یہ مظاہرے اس وقت شروع ہوئے جب ایک نوجوان خاتون مہسا امینی کو اس الزام پر مار دیا گیا کہ وہ معقول پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اس احتجاج کے ذریعے مذہبی رہنماؤں کی اسٹیبلشمنٹ کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا گیا اور پھر ان مظاہروں کو طاقت کے بل بوتے پر کچل دیا گیا۔

ملک کے اندر ابھی یہ غصہ بڑے پیمانے پر ہے کہ ایران ملک سے باہر تو بہت خرچ کر رہا ہے مگر جو بے روزگاری اور افراط زر کا سامنا ایرانی شہریوں کو ہے، اس سے متعلق کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں اٹھائے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر ایران کی نوجوان نسل اسلامی انقلاب سے کٹی ہوئی ہے۔ ان کی اکثریت حکومتی پابندیوں پر سوالات اٹھاتی ہے۔ گرفتاری کے خطرے کے باوجود ہر روز خواتین بغیر پردے کے باہر نکل کر حکومتی اقدام کو ہوا میں اڑا دیتی ہیں۔ ایران پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس سب کے باوجود ابھی شام کی طرح ایران میں حکومت کی تبدیلی کا کوئی امکان تو نہیں ہے لیکن درپردہ کچھ ایسی قوتیں بھی ضرور پنپ رہی ہیں جو کبھی بھی یکدم حیران کر سکتی ہیں۔

جیمز جیفری کا کہنا ہے کہ "میرا نہیں خیال کہ ایرانی عوام دوبارہ اٹھیں گے کیونکہ ایران نے اپنی سلطنت کھودی ہے جو کہ بہت غیر مقبول تھی"۔ڈینس ہورک کے خیال میں اب ایران کی اختلافی آوازوں کیلئے برداشت مزید کم ہو جائے گی کیونکہ اب وہ اپنی اندرونی سکیورٹی پر توجہ دے گا۔پردہ نہ کرنے والی خواتین کی سزاؤں کو بھی مزید سخت کرنے سے متعلق قانون سازی جلدی ہونے والی ہے۔تاہم ابھی ایرانی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔اگر لاکھوں ایرانی اس حکومت کی حمایت نہیں کرتے تو وہاں لاکھوں ایسے بھی ہیں جو اس کے حمایتی ہیں۔میرا نہیں خیال کہ یہ حکومت کسی بھی وقت گر سکتی ہے"۔

اگر ملک کے اندر غصے کو بھی دیکھا جائے اور شام میں ایران کو پہنچنے والے نقصان پر بھی نظر دوڑائی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ایران کے حکمرانوں کو ضرور ایک پیچیدہ صورتحال کا سامنا ہے۔کیا ان مشکل حالات میں ایران اپنے پڑوسی ممالک میں ان عناصر کی مدد کرنا بند کر دے گا جس کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو ایران سے خاصی شکائت ہے۔یقیناً ایران کو اپنے پڑوسیوں کی حمائت کی جس قدر آج ضرورت ہے،اس سے پہلے کبھی ایسی نہ تھی۔

پڑوسی کے مکاں میں چھت نہیں ہے
مکاں اپنے بہت اونچے نہ رکھنا

بروز ہفتہ 27 جمادی الآخر 1446ھ 28 دسمبر 2024ء

بھارت کی بحری توسیع پسندی: چیلنجز اور حقیقت

فضا میں ابھی امریکی پابندیوں کی تلخ گونج ابھی چل رہی ہے کہ اب پاکستان نیوی کی بڑھتی صلاحیتوں پر دشمن کی نیندیں حرام ہو رہی ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان اور انڈیا جنوبی ایشیا میں دو ایسے ہمسایہ ممالک ہیں جو ماضی میں تین باقاعدہ بڑی جنگیں لڑ چکے ہیں اور اس کے علاوہ متعدد ایسے مواقع بھی آئے جب یہ دونوں چوتھی باقاعدہ جنگ کے دہانے سے واپس پلٹے۔ گزشتہ 77 برسوں سے چلی آرہی کشیدگی کی بناء پر دونوں ممالک ایک دوسرے کی عسکری قوت پر نظر رکھتی ہیں۔ انڈین بحریہ کے سربراہ نے ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انڈیا پاکستانی بحریہ کی "حیرت انگیز ترقی" سے پوری طرح آگاہ ہے، جو آئندہ برسوں میں اپنے موجودہ بحری بیڑے کی صلاحیت 50 بحری جہازوں تک بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اِس وقت چین پاکستانی بحریہ کی بحری جہاز اور آبدوزیں بنانے میں مدد کر رہا ہے۔ ہم اُن (پاکستان) کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کے بارے میں پوری طرح آگاہ ہیں، اسی لیے ہم اپنے مفادات پر پڑنے والے کسی ممکنہ منفی اثر کو زائل کرنے کیلئے اپنی حکمت عملی اور آپریشنل منصوبے میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ ہم کسی بھی چیلنج کا سامنا کرنے کیلئے پوری طرح تیار ہیں"۔ پاکستانی بحریہ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چین سے اشتراک پر انڈین تشویش دراصل عالمی طاقتوں کو گمراہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔

حالیہ برسوں میں چین کی بحری طاقت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اس کے بحری بیڑے میں اب امریکا سے زیادہ جہاز موجود ہیں اور اس نے بحر ہند میں کئی ریسرچ اور جاسوسی کرنے والے جہاز مستقل طور پر تعینات کر رکھے ہیں۔ انڈین بحریہ کے سربراہ کا یہ بیان ایک ایسے وقت میں آیا ہے جب انڈیا اور پاکستان کئی برس سے اپنی بحریہ کو وسعت دینے میں مصروف ہیں۔ حالیہ برسوں میں دنیا کے بدلتے ہوئے سیکورٹی پس منظر میں جنگی حکمت عملی میں بحریہ مزید اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

انڈین بحریہ کے مطابق اُن کے پاس اِس وقت چھوٹے بڑے بحری جہازوں کی تعداد 150 ہے جبکہ ان کے پاس دو طیارہ بردار جہاز بھی موجود ہیں، اس کے علاوہ انڈیا کے پاس 16 کنونشنل یعنی روایتی جبکہ دو نیوکلیئر پاورڈ آبدوزیں بھی موجود ہیں۔ انڈین بحریہ کے مطابق اُن کے پاس 275 طیارے، ہیلی کاپٹر اور ڈرونز بھی موجود ہیں جبکہ 50 بحری جہاز اور آبدوزیں تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔ انڈیا نے حال ہی میں ایک اپنا طیارہ بردار بحری جہاز "آئی این ایس وراٹ" بنایا ہے جبکہ ایک اور طیارہ بردار بحری جہاز کی منظوری دی ہے جسے بننے میں ابھی کئی برس لگیں گے۔ اس وقت انڈین بحریہ کے پاس روسی ساخت کا طیارہ بردار جہاز "آئی این ایس وکرم ادتیہ" اور "آئی این ایس وراٹ" آپریشن میں ہیں۔

انڈیا نے حالیہ برسوں میں روس کی مدد سے ملک میں دو جوہری آبدوزیں بنائی ہیں جبکہ مزید دو آبدوزیں آئندہ سالوں میں فعال ہوں گی۔ انڈین بحریہ نے گزشتہ 30-40 برس میں بہت خاموشی سے خود کو وسعت دینے پر توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ اس خطے میں پہلی بحریہ تھی جس نے اپنے بیڑے میں طیارہ بردار بحری جہاز شامل کیا تھا۔ 1964 میں انڈین بحریہ نے برطانیہ سے ایچ ایم ہرکولیس نامی ایک پرانا طیارہ بردار جہاز خریدا تھا جسے "آئی این ایس وکرانت" کا نام دیا گیا تھا۔ انڈیا کی بیشتر آبدوزیں بہت پرانی ہو چکی ہیں۔ اس کی 16 میں سے نصف کنونشنل آبدوزیں جنگ میں استعمال کے لائق نہیں تاہم اب بحریہ نیوکلیر پاورڈ آبدوزیں حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کر رہی ہے۔

بحریہ تین طرح کی ہوتی ہیں: ایک "براؤن واٹر "نیوی، جو سمندر کے اندرونی علاقوں اور دریاؤں وغیرہ کے آس پاس کام کرتی ہے۔ "گرین واٹر نیوی" ساحلی علاقوں کی نگہبانی کیلئے ہوتی ہے جو کہ عموماً 12 سے 16 بحری میل کے دائرے میں آپریٹ کرتی ہے اور بنیادی طور پر اپنے ساحلوں اور بحری حدود کی حفاظت کرتی ہے اور تیسری "بلیو واٹر نیوی" اپنی بحری حدود سے ہزاروں میل دور تک پیٹرولنگ کرتی ہے اور اپنا حق جتاتی ہے۔ اس وقت انڈین بحریہ اب بلیو واٹر نیوی کے زمرے میں آتی ہے اور سب کو علم ہے کہ انڈیا کی بحریہ کی صلاحیت پاکستان سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود انڈیا پر اس خطے میں سپر پاور بننے کا ایک جنگی جنون سوار ہے۔

جبکہ پاکستان میں عسکری ذرائع کے مطابق بحریہ کے پاس مختلف اقسام کے 45 بحری جہاز ہیں، جن میں چھ آئل ٹینکرز بھی شامل ہیں۔ پاکستانی بحریہ کے پاس پانچ آبدوزیں موجود ہیں، جبکہ آٹھ آبدوزیں اور متعدد جنگی جہاز ابھی تیاری کے مراحل میں ہیں۔ پاکستانی بحریہ کے پاس فکسڈ ونگ جہازوں کے تین ، روٹری ونگ جہازوں کے تین اور ڈرونز کا بھی ایک سکواڈرن موجود ہے۔ خیال رہے ایک سکواڈرن میں متعدد طیارے ہوتے ہیں۔ پاکستان کی ساحلی پٹی ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ لمبی ہے۔ تاہم دونوں ممالک کے دفاعی تجزیہ کار کے مطابق دو ممالک کی نیول فورسز کا موازنہ اُن کے پاس موجود جنگی سازوسامان کی بنیاد پر کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ زمینی حقائق کے مطابق ہر ملک کی بحریہ کا مقصد الگ ہوتا ہے۔ پاکستانی نیوی کا مشن دراصل دفاعی نوعیت کا ہے جس کا مقصد اپنی سمندری سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ چونکہ ہماری 90 فیصد سے زیادہ تجارت سمندر کے ذریعے ہوتی ہے تو ہمیں امن اور جنگ دونوں زمانوں میں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کیلئے جو چیزیں چاہییں ہم ان کا بندوبست کرتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں پاکستان کی بحریہ نے انتہائی تیزی سے ترقی کی ہے اور پاکستانی قیادت کو انڈیا کی اس (ترقی) میں دلچسپی کا بخوبی اندازہ ہے۔ پاکستان کی بحریہ ہر دو برس بعد مشقیں کرتی ہے تاکہ کسی بھی جنگ کی صورت میں پیچیدہ آپریشنز کی تیاری ہوسکے۔ رواں برس فروری کے مہینے میں بھی ایسی ہی مشقیں "سپارک 2024" کے نام پر سندھ اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں ہوئی تھی۔ ان مشقوں کے دوران "سمندر میں آپریشنز کے دوران پاکستانی بحریہ کے جنگی جہازوں اور ہوائی جہازوں نے انڈین بحریہ کے جہازوں، آبدوزوں اور ہوائی جہازوں کی موجودگی کا بھی سراغ لگایا جو پاکستان نیوی کی جنگی مشقوں کا خفیہ طریقے سے مشاہدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے"۔

گزشتہ چند برسوں میں پاکستانی بحریہ نے متعدد نئے جہاز اپنے بیڑے میں شامل کیے ہیں اور کئی نئے جہاز اور آبدوزیں ابھی تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ گزشتہ برس پاکستانی بحریہ نے ترکی میں بنائے گئے جنگی جہاز "پی این ایس بابر" اور رومانیہ میں بنائے گئے جنگی جہاز "پی این ایس حنین" کو اپنے بیڑے میں شامل کیا تھا۔ اس طرح پاکستان اور چین کے درمیان چار بحری جنگی جہاز بنانے کا معاہدہ 2018 میں ہوا تھا اور گزشتہ برس یہ معاہدہ اس وقت مکمل ہوا جب چین نے دو ٹائپ 054 اے جنگی جہاز پاکستان کے حوالے کیے۔ اس سے قبل بھی چین ایسے ہی دو جہاز پاکستان کے حوالے کر چکا تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق "پاکستان نے چین کو آٹھ ہنگور کلاس آبدوزیں بنانے کا آرڈر بھی دے رکھا ہے اور توقع کی جا رہی ہے کہ یہ تمام آبدوزیں 2028 تک پاکستانی بحریہ کے بیڑے میں شامل کر لی جائیں گی۔

وائس ایڈمرل ریٹائرڈ احمد تسنیم جو 1971 میں پاکستانی آبدوز "پی این ایس ہنگور" کے کمانڈر تھے اور ان ہی کی قیادت میں پاکستان نے انڈین بحری جہاز "آئی این ایس کھکری" کو تباہ کیا تھا۔ ان کے مطابق وہ گزشتہ 15 برسوں میں پاکستانی نیوی کی برق رفتار ترقی کی وجہ بحریہ کی قیادت کو سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں فیصلہ سازوں کو سمندر کی اہمیت دیر سے سمجھ آئی اور "جب حکومتوں نے اسے نظر انداز کرنا چھوڑا"۔ ہم نے خاموشی سے فنڈ حاصل کیے، نئے پلیٹ

فارمز حاصل کیے، اچھے ہتھیار اور سینسرز خریدے اور یوں پاکستانی بحریہ کی دیگر ممالک کے ساتھ ٹیکنالوجی کی منتقلی کی جو پالیسی انتہائی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

ابھی حال ہی میں رومانیہ اور ترکی میں بنائے گئے جہاز بھی پاکستانی بحریہ میں شامل کیے گئے ہیں اور مستقبل قریب میں پاکستانی بحریہ کے پاس 50 تک بحری جنگی جہاز آجائیں گے۔ پاکستان اور چین مل کر ابھی 8 آبدوزیں بنا رہے ہیں جن میں سے چار چین جبکہ چار کراچی کے شپ یارڈ میں بن رہی ہیں۔ پاکستان کی بحریہ دیگر بحری جنگی جہاز بنانے پر بھی کام کر رہی ہے جس کے کچھ پُرزے پاکستان اور کچھ دیگر ممالک میں بن رہے ہیں۔ دوسری جانب انڈین کا دعویٰ ہے کہ "پاکستان نے چین کے ذریعے اپنے جہاز، میزائل اور آبدوزیں بنانے کی صلاحیت میں اضافہ کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ چین نے پاکستان کو ایریا ڈینائل نامی دو میزائل دیے ہیں جن کی رینج 200 سے 400 کلومیٹر تک ہے اور یہ طیارہ بردار بحری جہازوں کو بھی با آسانی نشانہ بنا سکتے ہیں"۔ ان کے مطابق "چین کو پاکستان کی بحری صلاحیت بڑھانے میں اس لئے بہت دلچسپی ہے کہ چین کی بحریہ بحر ہند میں زیادہ کام کرتی ہے اور اگر پاکستان بحیرۂ عرب کا محاذ سنبھال لیتا ہے تو چین کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے پاس جو کنوینشنل آبدوزیں ہیں اس صلاحیت کی آبدوزیں انڈیا کے پاس بھی نہیں ہیں"۔

دوسری جانب اس خطے پر امریکا اور چین کے درمیان جاری مقابلے کا اثر بھی پڑ رہا ہے اور اس کا فائدہ انڈیا کو ہوتا ہے۔ چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کم کرنے کیلئے امریکا نے "انڈو پیسیفک حکمت عملی" تیار کی ہے۔ امریکا کہتا تو ہے کہ یہ کثیر الاقوامی پالیسی ہے لیکن دراصل یہ ہم خیال ممالک کے ساتھ اتحاد بنانے کی حکمت عملی ہے۔ اس سلسلے میں امریکا نے کواڈ نما اتحاد بنایا جس میں امریکا، انڈیا، جاپان اور آسٹریلیا شامل ہیں اور اس میں اقتصادی، عسکری اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے تعاون کیا جا رہا ہے۔ ان تمام شعبوں میں انڈیا کو ہونے والا فائدہ ہمارے لیے اچھا نہیں کیونکہ وہ ہمارے مخالف ہیں"۔

انڈین دفاعی جریدے "فورس" کے مطابق پاکستان نے کم دفاعی بجٹ کی وجہ سے "سی کنٹرول" کی بجائے "سی ڈینائل" کی پالیسی پر عمل کیا۔ "سی ڈینائل" کی پالیسی میں آبدوزوں کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے کیونکہ وہ زیرِ سمندر رہ کر اپنے ہدف پر حملہ آور ہو سکتی ہیں۔ پاکستان کے پاس موجود منی آبدوزیں سو میٹر کی گہرائی تک جا سکتی ہیں اور یہ بحری سرحدوں کی حدود کے نزدیک کام کرتی ہیں، یعنی اگر دشمن کا کوئی جہاز ان کے بحری حدود کے نزدیک آتا ہے تو اس کے واپسی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

وہ اس بات سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ پاکستان کی بحریہ آج طاقتور ہو چکی ہے اور اس میں کوئی حیرانی نہیں اگر چین کی مدد سے پاکستان زیرِ سمندر چھوڑے جانے والے کچھ ڈرون بھی بنا رہا ہو جو وہ اپنی بحریہ میں شامل کر سکے۔ انڈیا کو پاکستانی بحریہ سے یہ تشویش بھی ہے کہ "خلیج فارس اور بحر احمر کے راستے انڈیا کا بیشتر تیل آتا ہے اور یورپ سے تجارت ہوتی ہے۔ جبوتی میں چین کا بحری اڈہ ہے، ادھر کراچی، گوادر اور مکران کے سمندری خطے میں پاکستان کی بحریہ سرگرم ہے۔ اس خطے میں پاکستان اور چین کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔

ادھر انڈیا نے سمندر میں اپنی ذمہ داری اپنی موجودہ صلاحیتوں سے زیادہ بڑھالی ہے۔ دراصل پاکستان جن بحری علاقوں کی حفاظت کر رہا ہے وہ رقبے کے لحاظ سے انڈیا کے مقابلے میں بہت کم ہیں، یعنی پاکستان پر ذمہ داری بھی کم ہے اور اس کو صرف بحیرہ عرب پر نظر رکھنی ہے اور وہیں لڑائی بھی لڑنی ہے جبکہ انڈیا امریکا کی گود میں بیٹھ کر یہ تاثر دے رہا ہے کہ انڈیا کی بحریہ نے اپنے دائرہ بحر ہند سے بڑھا کر ساؤتھ چائنا سی اور پیسیفک اوشین (بحر الکاہل) تک پھیلا لیا ہے۔ انڈیا کی فوج یا بحریہ کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جو بہت دور تک جا کر مفادات کا تحفظ کر سکے۔ انڈیا نے تھیوری میں عالمی طاقتوں کی طرح بڑھک ماری ہے لیکن زمینی حقائق کے مطابق اتنی دور تک اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں میں انڈین بحریہ نے خود پر کافی سرمایہ لگایا ہے اور وہ "اس علاقے میں تھانیدار کا کردار نبھانا چاہتا ہے۔ فی الحال تو اس کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہے جو اس نے خود پر نیٹ سکیورٹی پرووائیڈر کا لیبل لگایا ہے، یعنی جو کچھ علاقے میں ہو رہا ہے۔ اس اس پر نظر ہے اور اس سب سے نمٹنے کیلئے اس کے پاس قابلیت و وسائل ہونے چاہئیں، یہ صلاحیت فی الحال تو اس کے پاس نہیں ہے لیکن یہ اس کا مقصد ہے جس کے حصول کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

دوسری جانب خود انڈین دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس خطے کی تین قوتوں انڈیا، چین اور پاکستان کی فوجی طاقت کا سوال ہے، انڈیا اور چین کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ جہاں تک انڈیا اور پاکستان کے موازنہ کا سوال ہے آج پاکستان کی بحریہ اور فضائیہ اپنے ماہرین کی مدد اور چین کے تعاون سے بہت طاقتور ہو چکے ہیں۔ پاکستان کی تینوں افواج بشمول بحریہ کا مقصد اپنی زمین کا دفاع کرنا ہے اور ان کے پاس جارحانہ صلاحیتیں بھی ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان کے کوئی جارحانہ عزائم نہیں اور نہ ہی کسی علاقے پر قبضہ کرنا مقصود ہے تاہم اپنی زمین کے انچ انچ کا دفاع کا عزم لئے ہوئے ہیں۔

یاد رہے کہ 25 نومبر 2022 کو شہباز شریف نے ترکی کے صدر اردگان کی دعوت پر اعلیٰ سطح وفد کے ہمراہ استنبول شپ یارڈ میں پاکستان بحریہ کیلئے چار ملجم (MILGEM) کارویٹ بحری جہازوں میں سے تیسرے جہاز پی این ایس خیبر کا افتتاح کیا تھا۔ ملجم منصوبہ ترکی کا قومی بحری جنگی جہازوں کی تیاری کا پروگرام ہے، جسے ترک بحریہ سنبھالتی ہے۔ ان جنگی جہازوں کو فوجی نگرانی، انٹیلی جنس مشنز، قبل از وقت وارننگ، اینٹی سب میرین وارفیئر اور دیگر مشنز کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی بحریہ کیلئے ملجم جنگی جہاز بنانے کا منصوبہ 2018 میں ترکی کی ایک فرم کو دیا گیا تھا۔ گزشتہ برس اگست میں اس منصوبے کے پہلے جنگی جہاز پی این ایس بابر کی افتتاحی تقریب استنبول میں منعقد ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرے جنگی جہاز پی این ایس بدر کا افتتاح مئی 2022 میں کراچی میں کیا گیا۔ یہ تکنیکی طور پر پاکستان نیوی فلیٹ کیلئے جدید ترین جنگی جہاز ہیں۔ ترکی کے مشترکہ طور پر بنائے گئے یہ جنگی جہاز پاکستانی بحریہ کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں جو کہ پاکستان کی میری ٹائم سکیورٹی کی صلاحیت کو بڑھانے میں اہم ثابت ہوں گے۔ سندھ اور بلوچستان کی ساحلی سرحد کو اہم سکیورٹی فراہم کریں گے۔ یہ علامتی طور پر اہم ہے اور ساتھ ہی یہ منصوبہ دو مسلم ممالک کے درمیان تاریخی دوستی اور برادرانہ تعلقات کی ایک مثال بھی ہے۔

یاد رہے کہ پاکستان اور ترکی کے تعلقات کی بنیاد تقسیم برصغیر اور پاکستان کے قیام کے فوراً بعد رکھی گئی۔ اس رشتے کی بنیاد مشترکہ مسلم وراثت، روایات اور بھائی چارہ تھی۔ اس بھائی چارے کی جڑیں تاریخ میں موجود ہیں۔ ترکی کی جدوجہد آزادی کو برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے دی گئی حمایت ترک عوام کے ذہنوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ دونوں ممالک زلزلے اور سیلاب جیسی قدرتی آفات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے ہیں۔

دونوں ممالک کے درمیان سکیورٹی تعاون اور عوام کے درمیان تعلقات میں گرمجوشی رہی ہیں۔ تاریخی طور پر دونوں ممالک نے کشمیر اور قبرص جیسے مسائل پر ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ تاہم اقتصادی تعاون اب بھی بہت محدود ہے۔

اب تک پاکستان اور چین کی دوستی انڈیا کیلئے چیلنج تھی، اب پاک ترک دوستی نے انڈیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ مارچ 2021 میں سعودی گزٹ میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ اردوگان جنوبی ایشیا میں پاکستان کے ساتھ سٹریٹجک اتحاد کو مزید مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ سال مارچ میں اکنامک ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ترکی اور پاکستان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے فیصلے نے ان قیاس آرائیوں کو ہوا دی ہے کہ بحیرۂ روم اور جنوبی ایشیا میں انڈیا کی مشکلات بڑھ سکتی ہیں۔ ترکی کا کہنا ہے کہ اس کا ہدف جنگ زدہ ملک افغانستان میں اقتصادی ترقی کیلئے کام کرنا ہے۔ پاکستان اور ترکی دونوں مشترکہ طور پر ایران کے راستے ریلوے لائن کو توسیع دے رہے ہیں۔

اکنامک ٹائمز کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "پاکستان ترکی کے تیار کردہ ملجم (MILGEM) بحری جنگی جہاز وہاں کے سرکاری دفاعی ٹھیکیدار ایسفاٹ (ASFAT) سے خریدنے کے عمل میں ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے 30 ٹی-ATAK129 ہیلی کاپٹر بھی منگوائے ہیں۔ ترکی سے پاکستان کی یہ دفاعی سازوسامان کی خریداری تین ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ پاکستان نے مشرقی بحیرۂ روم میں ترکی کی گیس کی تلاش کی مہم کی بھی حمایت کی۔ ترکی بھی مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی کھل کر حمایت کرتا ہے۔ فروری 2020 میں اردوگان نے کہا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ ترکی کیلئے بھی اتنا اہم ہے جتنا پاکستان کیلئے۔ آرمینیا آذربائیجان تنازعے میں بھی پاکستان نے ترکی کی کھل کر حمایت کی تھی۔ اب ٹرائیکا (امریکا، اسرائیل اور انڈیا) کو جہاں یہ پریشانی ہے کہ خطے کے سمندری راستوں پر پاکستانی نیوی کی بڑھتی ہوئی برتری کو اڈکونا کام بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے وہاں خلیج فارس اور بحر احمر کی ناکہ بندی سے انڈیا کا بیشتر تیل اور یورپ سے تجارت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور دوسری طرف کراچی، گوادر اور مکران کے سمندری خطے میں پاکستانی نیوی ایک مضبوط طاقت بن چکی ہے جو ملکی دفاع کیلئے پہلے سے کہیں زیادہ اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکی ہے۔

بروز اتوار 28 جمادی الآخر 1446ھ 29 دسمبر 2024ء

شام کی سیاسی پیچیدگیاں اور مستقبل کی پیشگوئیاں

گزشتہ سال 7 / اکتوبر کے بعد خطے میں جاری اسرائیلی سفاکی اور امریکا سمیت اتحادیوں کے گٹھ جوڑ سے آج رونما ہونے والی صورتحال نے بشارالاسد کی حکومت کے اچانک خاتمے کا نہ صرف خطے کے ممالک بلکہ بین الاقوامی منظر نامے پر بھی گہرا اثر چھوڑا ہے اور یہ سلسلہ اب اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں گریٹر اسرائیل کے واضح امکانات کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ کیا اب اس شیطانی مثلث کا رخ ایران اور ترکی کی طرف ہوگا اور بعد ازاں پاکستان کا گھیرا تنگ کرکے اس کی ایٹمی طاقت کو نشانہ بنایا جائے گا؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جن کا تدارک ہوش مندی سے نہ کیا گیا تو مصلحتوں کے سیاہ بادل کسی ہولناک طوفان میں ہمیں تنکوں کی طرح بہالے جائیں گے اور مؤرخ یقیناً ہمارا شمار بھی ان مسلم حکمرانوں کے ساتھ ہی بطور عبرت لکھے گا جس طرح ہمارے پیشرؤوں کو ہلاکو خان کی افواج نے نیست ونابود کر دیا تھا کہ ہم اپنے اقتدار کیلئے خود ہی کو تباہ کرنے پر اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے۔ (خاکم بدہن)

یاد رہے کہ اس سے دو قوتوں، یعنی ایران اور روس جن کی حمایت اور مدد سے بشارالاسد پچھلے کئی سال سے اپنے ملک میں بغاوت کو دبانے میں کامیاب رہے تھے، کے خطے میں زوال کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔ بشارالاسد کے ملک سے فرار اور شام میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد بھی تجزیہ کار اسد حکومت کے زوال کے پیچھے کارفرما وجوہات اور اس کے نتیجے میں خطے پر پڑنے والے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ ماہرین اس کو سمجھنے کیلئے "بٹر فلائی ایفیکٹ" تھیوری کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس نظریے میں بتایا جاتا ہے کہ کیسے دنیا میں رونما ہونے والے واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھانے کیلئے تتلی کے پھڑ پھڑانے کی مثال دی جاتی ہے کہ کیسے ایک تتلی کا اپنے پنکھ ہلانا کہیں دور دراز علاقے میں طوفان کا سبب بن سکتا ہے۔

سیاسی تجزیہ کار اور سابق اسرائیلی سفار تکار میئر کوہن "بٹر فلائی ایفیکٹ" تھیوری کا سہارا لیتے ہوئے شام میں بشارالاسد حکومت کے زوال کو حماس کے اسرائیل پر 7 / اکتوبر کے حملے سے جوڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایرانی حمایت سے یحیٰی سنوار کی قیادت میں کیے جانے والے حملے کا مقصد لبنان میں حزب اللہ کے ساتھ مل کر اسرائیل کے گرد گھیرا تنگ کرنا تھا لیکن ایران خود ہی اس چال کا شکار ہو گیا۔ ایران کے "مزاحمت کے محور" کا زوال، جس میں حزب اللہ اور حماس شامل ہیں، کسی لڑھکتے برف کے گولے کی مانند ہے جو اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے اور شام میں اسد حکومت کا خاتمہ اِسی کا نتیجہ ہے اور اب یہ صورتحال بالآخر ایرانی حکومت کے خاتمے کا باعث بنے گی"۔

ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ اسرائیل اور اس کے مضبوط اتحادی امریکا سمیت اس سارے پلان سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ اس پلان کی کمزوریوں کو بڑھاوا دینے کیلئے اپنے مہروں کو استعمال کر رہے تھے تاکہ اس خطے میں گریٹر اسرائیل کے قیام کی راہیں ہموار کرنے کیلئے حماس اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو 7 / اکتوبر کو ہونے والے حملے کیلئے اکسایا جائے جس کے جواب میں یہ جاری کاروائی سے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلئے اگلے اقدامات پر عملی جامہ پہنایا جائے جس کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ حماس کے اس حملے کے فوری بعد نیتن یاہو کے اُس بامعنی خیز بیان کو ضرور سامنے رکھیں، جس میں اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ "اب خطے میں ان کاروائی کرنے والوں کی نسلیں بھی اس کا خمیازہ بھگتیں گی اسرائیل اپنی صحیح منزلِ مقصود پر پہنچ کر ہی دم لے گا"۔

میئر کو ہن کا کہنا ہے کہ "اب وقت آگیا ہے کہ اسرائیل، امریکا اور عرب ممالک کو خطے کے مستقبل کے بارے میں مشترکہ وژن ترتیب دینا ہو گا۔ حالیہ واقعات کا ایران پر گہرا اثر پڑے گا اور ایران میں بڑے پیمانے پر ہونے والے مظاہرے اس جانب اشارہ ہیں۔ دوسری جانب فلسطین کے مغربی کنارے میں بھی محمود عباس کی حکومت کو ہٹانے کیلئے مظاہرے شروع ہوگئے ہیں۔ خطرہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمین موجودہ واقعات کا فائدہ اٹھانے کے کوشش کرے، ساتھ اُردن میں بھی حکومت کو خطرہ لاحق ہے"۔ گویا ان ممالک کو خطرات سے خوفزدہ کر کے اسرائیل کی گود میں لینے کا منافقانہ عمل شروع کرنے کا اشارہ دیا جارہا ہے۔

ادھر واشنگٹن کی اٹلانٹک کونسل کی محقق عالیہ ابراہیمی مشرق وسطیٰ کی سیاست پر تجزیہ کرتی ہوئے میئر کی اس رائے سے متفق ہیں کہ 7 اکتوبر کے حملے ،اسد حکومت کے خاتمے کی وجوہات میں سے ایک ہیں لیکن وہ اُن نفسیاتی اور فوجی اثرات کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں جو شامی اپوزیشن کے عروج کا باعث بنے۔"ہم اسرائیل پر 7/ اکتوبر کے حملوں اور اسد حکومت کے زوال کے درمیان ایک واضح تعلق دیکھ سکتے ہیں۔" تاہم عالیہ ابراہیمی کی نظر میں حکومت دیگر عوامل جنھوں نے بشارالاسد کے زوال میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ان میں شام کی معیشت کی تباہی، روس کا یوکرین پر حملہ، ترکی کا اسد کو لیکر صبر کا ختم ہونا اور 7/ اکتوبر حملے کے بعد ایران کی طاقت میں کمی شامل ہیں۔

اُن کا کہنا ہے کہ "ایک ایسے وقت میں جب اسد کے مخالفین پہلے سے زیادہ متحد، منظم اور پُرعزم دکھائی دے رہے تھے تو اسرائیل کی حزب اللہ اور شام میں موجود ایران کے پاسداران انقلاب کے خلاف کارروائیوں نے شامی صدر کو مزید کمزور کر دیا تھا"۔ عالیہ ابراہیمی کے مطابق 7/ اکتوبر کو شروع ہونے والے "بٹر فلائی ایفیکٹ" نے غیر ارادی واقعات کے ایک سلسلے کو جنم دیا تاہم ان کی نظر میں نفسیاتی اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا"۔ حماس نے ثابت کیا کہ غالب قوتوں کی بھی کئی کمزوریاں ہوتی ہیں اور طاقت کا توازن کسی بھی وقت پلٹ سکتا ہے۔ شامی باغی شاید اسی سے متاثر تھے اور ایسا خطے کے دوسرے حصوں میں بھی ہو سکتا ہے"۔

سیاسی تجزیہ کار یوواسٹرن بھی اسد حکومت کے خاتمے اور 7/ اکتوبر کے حملوں کے درمیان موجود تعلق کو تسلیم کرتے ہیں تاہم وہ اس کو ثابت کرنے کیلئے "بٹر فلائی ایفیکٹ" تھیوری کے استعمال کے حق میں نہیں۔ اُن کے خیال میں اس سے شام اور خطے میں رونما ہونے والے واقعات کے درمیان تعلق صحیح تناظر میں پیش نہیں ہوتا۔ خطے کے ایک حصے میں پیش آنے والا کوئی بھی واقعہ کسی نہ کسی انداز میں خطے کے دیگر حصوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے"۔ شام میں ہونے والے واقعات کو اسرائیل، لبنان، فلسطین اور دیگر علاقوں میں ہونے والے واقعات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا کہنا ہے کہ خطے میں ملوث تمام قوتوں بشمول ایران، ترکی، امریکا، اسرائیل، روس اور عرب ممالک کے درمیان چند مشترکہ عوامل پائے جاتے ہیں۔ ان تمام ممالک کا خطے میں ہر جگہ کردار پایا جاتا ہے جو اس خطے کو بہت پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ بٹر فلائی ایفیکٹ کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں واقعات کے درمیان کوئی واضح تعلق موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس مشرق وسطیٰ میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان براہ راست تعلق پایا جاتا ہے اور ان کا اثر خطہ عرب کے تمام پڑوسی ممالک پر پڑتا ہے۔

دراصل 7/ اکتوبر کے واقعات کے اثرات اور اس کے نتائج میں اسد حکومت کے خاتمے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تاہم اسد حکومت کا خاتمہ اچانک ہی نہیں ہوا بلکہ یہ اس بڑھتی ہوئی عوامی بغاوت کا نتیجہ تھا جس کا آغاز 2011 میں ہوا تھا اور بعد ازاں جس نے پیچیدہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔

ادلب میں 2020 سے موجود فوجیں اس لمحے کیلئے تیاری کر رہی تھی اور پھر وہ داخلی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ مل گئیں جس نے شامی حکومت کو مزید کمزور کیا۔ اس صورتحال کو بہتر کرنے کی بجائے اسد نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کا راستہ لیا اور منشیات کے کاروبار میں شامل ہونے سے شام کیپٹاگون بنانے والا بڑا ملک بن گیا۔ اگرچہ شامی فوجیوں کی تنخواہوں کو کم کر دیا گیا، وہاں لاپتہ افراد اور قیدیوں کی صورتحال مزید ابتر ہوگئی اور اس تمام صورتحال نے بھی شامی حکومت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔

امریکا نے اُس وقت اسد حکومت کے مضبوطی سے قائم رہنے میں بلواسطہ کردار ادا کیا تھا جب بشارالاسد نے 2013 میں کیمیائی ہتھیار استعمال کیے تھے اور اپنے جوہری پروگرام کیلئے ایران سے بات چیت کو ترجیح دی تھی۔ اسرائیل نے بھی اسد حکومت کو گولان کی پہاڑیوں کے حوالے سے 1974 کے علیحدگی کے معاہدے پر قائم رہنے کی وجہ سے دیگر ممالک کی نسبت کم خطرناک تصور کیا۔ اسرائیل نے اس علاقے میں سنی اکثریت کی بجائے اقلیتوں کے ساتھ معاہدے کو ترجیح دی لیکن پھر روس کے یوکرین پر حملے اور ایرانی مدد میں کمی کی وجہ سے شام میں سکیورٹی کے حوالے سے ایک خلا پیدا ہوا۔ ایران گویا اپنے اقتدار کی بقا کیلئے اسد حکومت کا علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف تنازعات میں کردار جاری رہا۔ تاہم سابق بشارالاسد نے اسرائیل اور کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن لانے کی کوشش کی لیکن انھیں بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا جس میں وہ کوئی بھی فیصلہ نہ لے پائے۔

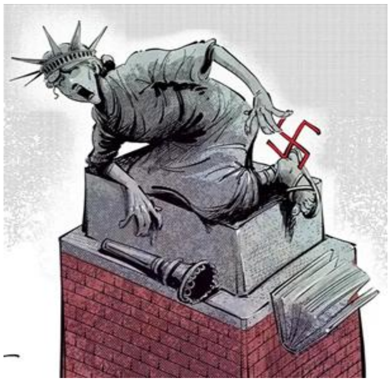

ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے تو مشرق وسطیٰ میں تیزی سے ہونے والی پیشرفت سے علاقائی اور بین الاقوامی توازن کے علاوہ اسد کے حامیوں میں بھی بڑی تبدیلی سامنے آئی۔ روس اور ایران کی جانب ان دونوں کے درمیان اختلافات برقرار رہے۔ نئی سے اسد حکومت کے ساتھ قریبی تعاون کے باوجود امریکی انتظامیہ کے آنے کے بعد، جو یوکرین میں بحران کے خاتمے میں گہری دلچسپی رکھتی ہے، روس کیلئے ایران کی اس علاقے میں ضرورت ختم ہوگئی اور اس سے اتحاد کو نئی شکل ملی اور اس صورتحال نے اسد حکومت کو ایک مشکل پوزیشن میں ڈال دیا۔

آج جب اسد خاندان کے 55 سالہ ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا ہے تو احمد الشرع ایک نئے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ ان کا یہ نیا روپ القاعدہ سے تعلق رکھنے والی ایک جہادی تحریک کے سربراہ سے مختلف ہے۔ احمد الشرع نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے نئی شامی انتظامیہ کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ وہ سیاسی منظرنامے پر بڑے پراعتماد انداز میں داخلی اور خارجی سطح پر نمایاں یقین دہانیوں پر مبنی پیغامات دے رہے ہیں۔ دمشق میں عبوری حکومت کے اعلان کے ساتھ سفارتی سرگرمیاں اور ہمسایہ ممالک کے وفود کی میزبانی دیکھی جارہی ہے۔ ایسے میں نمایاں شخصیات بھی دوبارہ سے منظر پر دکھائی دے رہی ہیں خاص طور پر سابق نائب صدر فاروق جو گذشتہ کئی برسوں میں سیاسی منظرنامے سے غائب رہے ہیں۔

اب مستقبل کے بارے میں سوالات زیادہ سنجیدہ اور پیشگوئی کے اعتبار سے زیادہ مشکل ہوں گے جیسا کہ اب ممکنہ صورتحال کیا ہوگی؟ کیا شام میں بیرونی اثرورسوخ صرف ترکی اور مغرب کی مدد سے اسرائیل تک محدود رہے گا یا پھر مستقبل میں مضبوط عرب اتحاد کا کوئی موقع پیدا ہوگا؟ اس تناظر میں ایران اور اس کے اتحادیوں کی کیا پوزیشن ہوگی؟ یا پھر ہم ایک نئے مشرق وسطیٰ کی شروعات دیکھیں گے؟

مہدی طیب، جو 2013 میں ایران کے پاسداران انقلاب کے نائب کمانڈر تھے، ایران کے شام کے ساتھ تعلقات کی درست وضاحت کرتے ہوئے اور

اسد حکومت کے خاتمے سے تہران کو ہونے والے نقصانات پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اگر ہم نے شام کو گنوادیا تو ہم تہران کو نہیں بچاپائیں گے "۔ ادھر اسرائیلی تجزیہ کار یوواسٹرن کے مطابق بشارالاسد حکومت کے خاتمے کے بعد خطے میں مزاحمت کے محور ایران پر اس کے منفی اثرات نمایاں ہوں گے۔ مزاحمت کے اس محور کو قائم رکھنے کیلئے شام سے سپلائی کی گزر گاہیں تھیں جو انتہائی اہمیت کی حامل تھیں اور اب یہ گزر گاہیں بند ہو گئیں ہیں اور ایران کیلئے حزب اللہ کو ہتھیار بھجوانا مشکل ہو گیا ہے گویا اسد حکومت کے خاتمے سے دراصل اسرائیل کو لاحق ایک بڑا اسٹریٹیجک خطرہ ختم ہو گیا ہے اور شام کی فوجی صلاحیتوں بشمول نیوی کی تباہی سے اسرائیل نے اپنا ہدف حاصل کر لیا ہے۔

اسرائیل نے اپنا یہ ٹارگٹ حاصل کرنے کیلئے نہ صرف برسوں اس پر بھرپور محنت کی ہے بلکہ خطے میں اپنی برتری قائم رکھنے کیلئے وہ ایک باقاعدہ ایک پلان کے تحت آگے بڑھا ہے۔ یہ حادثہ کوئی اچانک نہیں ہوا ہے بلکہ اسرائیل نے گزشتہ برس 7/ اکتوبر سے لیکر پورا سال غزہ اور گردونواح کے علاقوں میں خونی ہولی کھیلتے ہوئے اس کو کھنڈرات بنانے پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھی اور گاہے بگاہے لبنان کے ساتھ اپنی سرحدوں پر حزب اللہ کو صرف اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے سوا کوئی جارحیت نہیں کی کیونکہ وہ حزب اللہ کے ساتھ گزشتہ جنگ میں بری طرح شکست کھا کر اپنے بھرپور اقدامات کی تیاری میں مصروف رہا اور حزب اللہ کو کمزور کرنے کیلئے اس نے لبنان میں داخلی انتشار کو ہوا دیتے ہوئے وہاں پر مسیحی اور حزب اللہ کے درمیان معاہدے کو سبوتاژ کرنے کیلئے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جہاں پورا نیٹ ورک بچھایا وہاں حزب اللہ کے مضبوط وائرلیس سسٹم میں استعمال ہونے والی واکی ٹاکی سسٹم کے سینکڑوں سیٹ میں خصوصی چپ لگا کر ان کی تمام منصوبہ بندیوں سے پیشگی آگاہ رہا اور جب حزب اللہ نے اسرائیل پر جوابی راکٹ برسائے اور ڈرون حملوں کا آغاز کیا تو اسرائیل نے اپنے ظالمانہ منصوبہ کے تحت ان تمام واکی ٹاکی سسٹم میں اسی چپ کو موت کے سندیسے میں تبدیل کر کے انسانیت سوز آپریشن کر ڈالا اور اس کے ساتھ ہی لبنان پر اپنے فضائی حملوں کا سلسلہ تیز کر دیا جس کے جواب میں بالآخر لبنانی حکومت نے اسرائیل کی مرضی کے مطابق نہ صرف معاہدہ کر کے حزب اللہ کے ٹھکانوں پر کمزور لبنانی فوج تعینات کر دی بلکہ اسی دوران اسرائیل نے حزب اللہ کے رہنماؤں کو شہید کر کے لبنان سے ملحق سرحد کو بھی محفوظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شام پر بھی حملے جاری رہے اور بشارالاسد کے فرار کے فوری بعد گولان کے بفرزون پر مکمل قبضہ کر کے اب دمشق سے صرف 26 میل دور تک پہنچ چکا ہے۔

خطے کے سیاسی اور دفاعی تجزیہ نگاروں کو خدشہ ہے کہ شام عراق جیسی کسی صورتحال کی طرف ہی جائے گا اور جن ممالک میں فرقہ واریت اور نسلی تنوع ہے جیسا کہ شام، عراق اور یمن، وہاں نیا مستحکم حکومتی سسٹم بنانے میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں اس لئے یہ واضح نظر آرہا ہے کہ خطے میں بین الاقوامی مداخلت سے شام کی داخلی صورتحال مزید پیچیدہ ہوگئی ہے تاہم اس وقت یہ اندازہ لگانا بھی بڑا مشکل ہے کہ شام میں یا پھر اس خطے میں آئندہ کیا ہوگا؟ تاہم زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہ احمد الشرع نہیں جو دمشق میں داخل ہوگئے بلکہ یہ جنوب سے ایک اور فورس تھی۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ احمد الشرع نے ادلب میں جو کچھ شروع کیا، اس کے ذریعے متحرک آغاز کیا۔ اس لیے یہ غیر معمولی ہو گا کہ ہیت تحریر الشام اکیلے اس ملک پر حکمرانی کرنے کے قابل ہوں۔ شام ایسا ملک ہے جو اپنے تنوع کے حوالے سے نمایاں ہے، پھر چاہے وہ سیاسی قوتوں یا فرقہ ورانہ لحاظ سے ہو، مذہبی لحاظ سے یا پھر نسلی اعتبار سے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ہم مارچ تک نئی حکومت کا قیام دیکھیں اور شاید آئینی اعلان اور اس کے بعد انتخابات لیکن ہم ایک پیچیدہ اور حساس عبوری مرحلے کی ابتدا میں ہیں، جو پراسرایت سے بھرا ہوا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے، درست طور پر اس کی کوئی بھی پیشگوئی نہیں کر سکتا۔ ان پیچیدگیوں کے باوجود خطے سے واقف تجزیہ کار کو پورا یقین ہے کہ شام افغانستان جیسے ماڈل کی طرف نہیں جائے گا۔

آخر میں پاکستان پر میزائلوں کے سلسلے میں امریکی پابندیوں کا سلسلہ ایک بار پھر عالمی توجہ حاصل کر رہا ہے اور جو بائیڈن حکومت نے اپنی شکست کے بعد آنے والی ٹرمپ حکومت کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہوئے پاکستان پر جو پابندیاں عائد کی ہیں یقیناً ٹرمپ کیلئے فوری طور پر ان پابندیوں کو ہٹانے کیلئے وقت درکار ہوگا اور ان پابندیوں کی آڑ میں پاکستان میں جاری سیاسی انارکی کا بھرپور فائدہ اٹھانے کیلئے ٹرائیکا (امریکا، اسرائیل اور انڈیا) کی پوری کوشش ہوگی کہ پاکستان میں جاری سیاسی درجہ حرارت کو باقاعدہ ایک ایسے محاذ میں تبدیل کیا جائے جس کیلئے افغانستان سے باقاعدہ مختلف پراکسیز پاکستان میں دہشتگردی میں مصروف ہیں اور ابھی حال ہی میں دہشتگردوں کی بڑھتی ہوئی کاروائیوں سے مجبور ہو کر پاکستان کو ان دہشتگردوں کے اندرونی ٹھکانوں پر فضائی حملہ کرنا پڑا تو فوری طور پر افغان حکومت نے اس پر بیجا احتجاج کر کے جوابی حملے کی دھمکی دے ڈالی جبکہ پاکستان اس سے قبل ان دہشتگردوں کے بارے میں درجنوں مرتبہ شواہد کے ساتھ افغان حکومت کو کاروائی کیلئے کہہ چکی ہے لیکن شنوائی نہ ہونے کی صورت میں طالبان حکومت کا یہ رویہ صریحاً پاک دشمنی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یہی دشمن کی مرضی ہے کہ دو مسلمان ممالک کے درمیان جنگ کی صورتحال پیدا کر کے ان کو تباہ کیا جائے جیسا ان دشمنوں نے ایران عراق جنگ کے درمیان کیا تا اورج ان دونوں ممالک کی صورتحال آپ کے سامنے ہے۔ یہاں دونوں ممالک کو ہوش مندی کے ساتھ ان معاملات پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے اور طالبان کو بھی اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ رب کریم نے "احسان کا بدلہ ماسوائے احسان کے اور کچھ نہیں" کا حکم دیکر آپس میں محبت کا سبق دیا ہے۔

بروز منگل 30 جمادی الآخر 1446ھ 31 دسمبر 2024ء

"خوش گمانی یا بد گمانی"

ڈونلڈ ٹرمپ 20 جنوری 2025ء کو امریکا کے 47ویں صدر کا حلف اٹھانے جا رہے ہیں۔ ٹرمپ کی جیت پر بالخصوص پاکستان اور بنگلہ دیش میں اس خوش فہمی کو بڑے زور شور سے پھیلایا جا رہا ہے کہ ٹرمپ کا ان ممالک پر دباؤ اس قدر بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں ان کے رہنماؤں کو نہ صرف رہا کر دیا جائے گا بلکہ اقتدار کی مسند پر بھی دوبارہ لا بٹھایا جائے گا گویا ٹرمپ ان دونوں ممالک میں اپنی مرضی کے وائسرائے مقرر کریں گے گویا اب یہ دونوں ممالک امریکا کی نو آبادیاں بن چکی ہیں۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ ٹرمپ کے دوبارہ امریکی صدر بننے سے کچھ ممالک میں بے چینی بڑھی جبکہ کچھ ممالک خوش بھی دکھائی دے رہے ہیں لیکن پی ٹی آئی کے چند رہنماؤں کا خیال ہے کہ ٹرمپ اپنے "اچھے دوست" عمران کو رہائی دلوا دیں گے اور عمران کی نورا کشتی کے نعرے جو عوامی اجتماعات میں "ہم کسی کے غلام نہیں، اور ابسولیوٹلی ناٹ" کہہ کر للکارنا، امریکا یکسر بھول جائے گا۔

ایسا ہی گمان اسی خطے کے ایک اور ملک بنگلہ دیش میں بھی جاری ہے کہ ٹرمپ کی واپسی سے سابق وزیر اعظم شیخ حسینہ اپنا کھویا ہوا سیاسی میدان دوبارہ حاصل کر لیں گی۔ واضح رہے کہ رواں برس اگست کے مہینے میں شیخ حسینہ کو ملک میں طلباء تحریک کے نتیجے میں فرار ہو کر اپنے آقا مودی کی گود میں پناہ لے چکی ہیں اور اب وہاں عبوری حکومت قائم ہو گئی ہے اور نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات محمد یونس کو اس حکومت کا چیف ایڈوائزر مقرر کیا گیا ہے۔ ایسے میں اہم سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ٹرمپ کی ترجیحات میں یہ خوش فہمیاں کہیں موجود بھی ہیں یا حسینہ واجد اور عمران اپنی جماعت کے ووٹروں کے درمیان اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت اور کرپشن کو چھپانے کیلئے ایسے بیانات جاری کر رہے ہیں؟ امریکا میں اقتدار کی تبدیلی کا پاکستان اور بنگلہ دیش کی سیاست پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا پاکستان اور بنگلہ دیش کو ٹرمپ کے دور میں وہی حمایت مل سکتی ہے جو پہلے مل رہی تھی؟

ٹرمپ کی کامیابی پر ایکس اکاؤنٹ پر شیخ حسینہ نے ٹرمپ کے ساتھ تصویر شیئر کرتے ہوئے امریکا کے 47ویں صدر منتخب ہونے پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھا کہ "ٹرمپ کی زبردست انتخابی جیت ان کی قیادت اور امریکی عوام کے ان پر اعتماد کا ثبوت ہے۔ امید ہے کہ ٹرمپ کے دوسرے دورِ حکومت میں بنگلہ دیش اور امریکا کے درمیان دوستانہ اور دوطرفہ تعلقات مزید مضبوط ہوں گے۔ دونوں ممالک کے دوطرفہ اور کثیر الجہتی مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے دوبارہ مل کر کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے نومنتخب صدر اور ان کے اہل خانہ کی اچھی صحت اور درازی عمر کی بھی دعا کی۔

2016 میں ٹرمپ نے امریکی صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹک امیدوار ہیلری کلنٹن کو شکست دی تھی۔ محمد یونس نے اس وقت اس متعلق ردعمل دیتے ہوئے کہا تھا کہ ٹرمپ کی امریکی صدارتی انتخاب میں جیت سورج گرہن اور تاریک دنوں کی طرح ہے۔ 2016 کے انتخابات غلط طرز کی سیاست کا شکار ہو گئے ہیں۔ ٹرمپ کو مشورہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ انہیں دیواروں کی بجائے پل بنانے اور زیادہ آزاد خیال انداز اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس بیان کے بعد کئی تجزیہ کاروں نے خیال ظاہر کیا کہ محمد یونس امریکا میں ڈیموکریٹس کے قریب ہیں۔ جب بنگلہ دیش میں اقتدار کی تبدیلی ہوئی اور محمد یونس کو عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنایا گیا، اس وقت وہ ڈیموکریٹس، بائیڈن انتظامیہ اور ہیلری کلنٹن کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔

اس نئے کردار میں آنے کے بعد یونس کے دورہِ امریکا کا بھی بہت چرچا ہوا۔ 25 ستمبر کو انہوں نے "کلنٹن گلوبل انیشیٹو" پروگرام میں شرکت کی تھی۔ اس پروگرام میں سابق امریکی صدر بل کلنٹن بھی موجود تھے۔ جب سے امریکا میں اقتدار کی تبدیلی آئی اور ڈیموکریٹس کی بجائے ریپبلکن کو اقتدار ملنے جا رہا ہے تو ایسی صورتحال میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ ان پالیسیوں کو جاری رکھیں گے جو بائیڈن انتظامیہ کے دور میں رائج تھیں یا وہ ان

میں کچھ تبدیلیاں کریں گے؟ سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق پہلے امریکا انڈیا کے نقطہ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جنوبی ایشیا کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتا تھا لیکن بائیڈن انتظامیہ نے بنگلہ دیش کو ایک آزاد اکائی کے طور پر دیکھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بنگلہ دیش میں حکومت بدل گئی۔ بنگلہ دیش میں انسانی حقوق اور انتخابات کے حوالے سے پہلے بھی سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں لیکن بائیڈن کے دور میں ان پر زیادہ سختی تھی اور شیخ حسینہ کے ساتھ بھی ان کے اچھے تعلقات نہیں تھے۔

بنگلہ دیش کے بنگالی زبان کے ایک روزنامہ "پرتھم آلو" کے پولیٹیکل ایڈیٹر کدل کلول کے مطابق "اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ حسینہ اور ٹرمپ کے دور میں امریکا بنگلہ دیش کے تعلقات کشیدہ نہیں تھے لیکن اس کے باوجود اس وقت بنگلہ دیش میں انتخابی عمل پر بہت سے لوگوں نے سوالات اٹھائے تھے لیکن ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کی اپیل کے علاوہ سرکاری طور پر کچھ نہیں کہا گیا۔ دونوں ممالک کے درمیان تجارت اور بات چیت جاری رہی۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حال ہی میں محمد یونس امریکا گئے تھے اور انہوں نے جو بائیڈن سے ملاقات کی تھی۔ اس تمام پیشرفت کو دیکھنے کے بعد ہر کوئی تجسس میں ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

این ٹی وی بنگلہ دیش کے برشون کبیر کا کہنا ہے کہ ٹرمپ برصغیر کے بارے میں ایک مختلف نقطہ نظر رکھتے ہیں کیونکہ وہ مودی کے بہت قریب ہیں۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ٹرمپ اقتدار میں واپس آرہے ہیں تو بنگلہ دیش کے لوگوں میں اس بارے میں ملے جلے جذبات تھے لیکن محمد یونس کی قیادت میں اب بھی امریکا کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں۔ بنگلہ دیش میں کوئی تشویشناک صورتحال نہیں تاہم اگلے چند مہینوں کا انتظار کرنا ہوگا کہ حالات کیسے آگے بڑھتے ہیں۔ امید یہی ہے کہ ٹرمپ کے صدر بننے سے بنگلہ دیش کے تعلقات کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچے گا تاہم انڈیا کے ساتھ تعلقات میں کئی اہم تبدیلیوں کا امکان ہے"۔

ادھر کل تک بنگلہ دیش کو اپنی کالونی سمجھنے والے انڈیا کو ایک باضابطہ سفارتی خط بھیجا گیا ہے کہ شیخ حسینہ کو بنگلہ دیشی حکومت کے حوالے کیا جائے۔ بنگلہ دیش میں خارجہ امور کے مشیر توحید حسین نے میڈیا کو بتایا کہ "بنگلہ دیش انہیں عدالتی عمل کیلئے واپس لانا چاہتا ہے۔ بنگلہ دیش میں اگست کے عوامی احتجاج اور مظاہروں کے بعد وہاں کی عبوری حکومت نے ابتدائی تفتیش کے بعد معزول وزیر اعظم کے خلاف سینکڑوں طلبہ کی ہلاکت اور دوسرے معاملات میں کئی مقدمات درج کیے ہیں۔

انڈیا کی وزارت خارجہ نے تصدیق کی ہے کہ بنگلہ دیش نے شیخ حسینہ کی حوالگی کے بارے میں باضابطہ سفارتی خط بھیجا ہے لیکن وزارت خارجہ کے ترجمان رندھیر جیسوال نے کہا کہ وہ اس مرحلے پر اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ یاد رہے کہ بنگلہ دیش کی سابق وزیر اعظم شیخ حسینہ ملک میں اپنی حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج اور پرتشدد مظاہروں کے بعد پانچ اگست کو ڈھاکہ سے ایک طیارے کے ذریعے دلی فرار ہوگئی تھیں۔ اس وقت سے وہ دلی میں مقیم ہیں۔ ابتدائی طور پر اس طرح کی خبریں آئی تھیں کہ وہ دلی سے برطانیہ چلی جائیں گی لیکن وہ کسی وجہ سے وہاں نہیں جا سکیں۔ شیخ حسینہ اور عوامی لیگ کو دلی کے بہت قریب سمجھا جاتا ہے۔ انڈیا سے ان کی قربت اور یہاں پناہ لینے سے بنگلہ دیش کے عوام میں انڈیا کے خلاف شدید ناراضگی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ انڈیا اور بنگلہ دیش کے درمیان مجرموں اور مطلوبہ افراد کی حوالگی کا معاہدہ ہے۔ انڈیا کی حکومت یہ توقع کر رہی تھی کہ کسی نہ کسی مرحلے پر بنگلہ دیش کی عبوری حکومت شیخ حسینہ کی حوالگی کا مطالبہ کرے گی۔ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ انڈیا انہیں ڈھاکہ کے حوالے کرے گا۔ بنگلہ دیش کو بھی علم ہے کہ انڈیا شیخ حسینہ کو اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ اگر ڈھاکہ نے اس سلسلے میں قانونی قدم بھی اٹھایا تو اس عمل میں کئی برس

لگ جائیں گے تاہم انڈیا اور بنگلہ دیش کے درمیان خلیج بنگال سے کہیں زیادہ وسیع خلیج ضرور حائل ہو گئی ہے۔

محمد یونس کی قیادت میں ڈھاکہ میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد انڈین میڈیا میں نئی حکومت کو ایک ریڈیکل اسلام پرست، انڈیا اور ہندو مخالف حکومت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں میڈیا میں مسلسل ایسی خبریں دکھائی گئیں جن میں ملک کے اقلیتی ہندو طبقے اور ان کے مندروں پر حملے کے مناظر تھے۔ انڈیا کی وزارت خارجہ نے بھی گزشتہ مہینوں میں کئی بار بنگلہ دیش کے اقلیتی ہندوؤں اور ان کے مندروں پر ہونے والے حملوں کے بارے میں تشویش ظاہر کی۔ ابھی گزشتہ دنوں انڈیا اور بنگلہ دیش کے درمیان ایک اور تنازع اس وقت اُٹھتا ہوا نظر آیا تھا جب بنگلہ دیشی حکومت کے سربراہ محمد یونس کے مشیر محفوظ عالم نے فیس بک پر ایک پوسٹ شیئر کی تھی جس میں انڈیا کی تین ریاستوں تریپورہ، مغربی بنگال اور آسام کو بنگلہ دیش کا حصہ دکھایا گیا تھا۔

انڈیا میں سٹریٹجک امور کے ماہر براہما چیلانی نے محفوظ عالم کی فیس بک پوسٹ کا سکرین شاٹ شیئر کرتے ہوئے لکھا کہ "محمد یونس نے سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی موجودگی میں محفوظ عالم کا تعارف بطور شیخ حسینہ کی حکومت گرانے کے ماسٹر مائنڈ کے کروایا تھا۔ اب یہ اسلامی طالب علم رہنما اکھنڈ بنگلہ دیش چاہتے ہیں جس میں یہ انڈیا کے بھی کچھ حصے شامل کرنا چاہتے ہیں۔ محفوظ عالم کو محمد یونس کی حکومت میں وزیر خارجہ مقرر کیا گیا ہے۔

خارجہ امور کی تجزیہ کار نینیما باسو کہتی ہیں کہ "وہاں ہندوؤں پر حملے ہوئے ہیں لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ بیشتر ہندو عوامی لیگ کے حامی ہیں۔ بیشتر حملے دراصل عوامی لیگ کے حامی ہندوؤں پر ہوئے ہیں جنہوں نے عوامی لگ کے دورِ حکومت میں مظاہرین پر تشدد میں حصہ لیا تھا۔ یہ حملے بڑے پیمانے پر مسلمانوں پر بھی ہوئے ہیں، اس لیے ان کی نوعیت مذہبی نہیں سیاسی ہے لیکن یہاں جس طرح اسے غلط انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اس سے یقیناً دونوں ممالک کے تعلقات پر اثر پڑا ہے۔ نینیما عبوری حکومت کے قیام کے بعد بنگلہ دیش کا دورہ کر چکی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہاں کے ہندو ملک کے بدلتے ہوئے نظام میں اپنے جمہوری حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر بنگلہ دیش کے ہندوؤں کو موقع مل جائے تو وہ سب انڈیا آ جائیں گے۔ انہیں اگر موقع ملے تو وہ سب امریکا اور یورپ کا رخ کریں گے۔ انہیں انڈیا سے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا عبوری حکومت کے قیام کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات بہت خراب ہو چکے ہیں؟ تو کیا اب شیخ حسینہ کی حوالگی کے مطالبے سے یہ تعلقات اور بھی خراب ہوں گے؟ تجزیہ کار نروپما سبھرامنین کے مطابق اس کا دونوں ملکوں کے تعلقات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ 'انڈیا کے خارجہ سیکریٹری وکرم مشری نے حال میں ڈھاکہ کا دورہ کیا۔ یہ ایک طرح سے دلی کا یہ اعتراف تھا کہ شیخ حسینہ اب مستقبل قریب میں اقتدار میں نہیں آنے والی ہیں اور ان کی جماعت عوامی لیگ کو دوبارہ ایک فعال اور مقبول پارٹی بننے میں بہت وقت لگے گا۔ اس لیے انڈیا کے سامنے یہی راستہ ہے کہ وہ عبوری حکومت کے ساتھ اپنے روابط بہتر کرے۔

ان کا مزید کہنا ہے کہ یہ صرف اس لیے ضروری نہیں ہے کہ بنگلہ دیش میں ایک بڑی ہندو اقلیت ہے بلکہ اس لیے بھی بنگلہ دیش سے اچھے تعلقات رکھنے

ہوں گے کیونکہ اس سے ملک کی شمال مشرقی ریاستوں کی سیکورٹی جڑی ہوئی ہے۔ چین کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ کا بھی سوال ہے۔ خارجہ سکریٹری کا ڈھاکہ کا دورہ اس سمت پہلا بڑا اقدم ہے۔ انڈیا میں سرکاری سطح پر یہ ڈس انفارمیشن بھی پھیلائی جارہی ہے کہ بنگلہ دیش میں اب جمہوریت کمزور پڑ جائے گی اور سخت گیر مذہبی عناصر اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ بنگلہ دیش کی عبوری حکومت میں روشن خیال ارکان کے ساتھ ساتھ ایسے بھی عناصر ہیں جو سخت گیر مذہبی نظریے میں یقین رکھتے ہیں جبکہ انڈیا جو خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہوئے ذرہ بھر ندامت محسوس نہیں کرتا کہ وہ خود کشمیریوں، سکھوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کے ساتھ کس قدر ہولناک انسانیت سوز سلوک کر چکا ہے بلکہ خود گجرات کے مودی قصاب کے دامن سے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون ابھی تک ٹپک رہا ہے اور وہ اپنے کئی انٹرویو میں اس پر اپنے ہندو ہونے پر شرم محسوس کرنے کی بجائے فخر کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ وہاں پہلے سے ایک کوشش رہی ہے کہ تاریخ کو ذرا پیچھے کی سمت موڑ دیا جائے لیکن بنگلہ دیش میں اس طرح کی کوششوں کی مزاحمت ہوتی رہی ہے۔

خارجی امور کی تجزیہ کار نینیما باسو کہتی ہیں کہ "شیخ حسینہ کے خلاف عوام کی سب سے بڑی شکایت تھی کہ وہ خود ہی الیکشن لڑتی تھیں اور خود ہی الیکشن جیت جاتی تھیں۔ دوسری جماعتوں کو انتخاب میں حصہ ہی نہیں لینے دیا جاتا تھا۔ وہاں کیلئے سب سے ضروری چیز ہے کہ وہاں جلد انتخابات ہوں اور اس میں سب جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت ہو کیونکہ جمہوریت میں سب کی شراکت ضروری ہے۔ عبوری حکومت کئی بار یہ کہہ چکی ہے کہ بنگلہ دیش ایک مسلم اکثریتی ملک ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری مذہبی اقلیتوں کو برابر کے حقوق نہیں حاصل ہوں گے"۔

واشنگٹن میں واقع ولسن سنٹر کے ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ مائیکل کوگل مین نے ایک مضمون میں بنگلہ دیش کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ڈھاکہ میں کوئی منتخب حکومت نہیں ہے۔ اس کے باوجود جمہوریت کو بحال کرنے کا عزم لیے ہوئے نئے طاقتور سیاسی گروپ کے ابھرنے سے بنگلہ دیش کی جمہوریت کیلئے امیدیں برقرار ہیں۔ ان میں وہ احتجاجی طلبہ رہنما بھی شامل ہیں جنہوں نے شیخ حسینہ کو ملک سے باہر نکالا۔ ان میں سے بعض رہنما عبوری حکومت میں شامل ہیں۔ اس عبوری حکومت میں حقوق انسانی کے معتبر علمبردار اور بہت سے ایسے عناصر شامل ہیں جو جمہوری اصلاحات پر زور دیتے ہیں"۔

بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کی قیادت نوبل انعام یافتہ محمد یونس کر رہے ہیں۔ ان کا شمار ملک کے سرکردہ جمہوریت پسندوں میں کیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کے عوام بالخصوص نوجوان طبقے میں انہیں بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ماضی میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں جب مزاحمت کاروں نے اپنے ملک کی جمہوریت کو مستحکم کیا۔ اس سلسلے میں چیکوسلواکیہ کے وکلاو ہیویل اور جنوبی کوریا کے کم ڈائی جونگ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان ملکوں میں مزاحمتی جماعتوں نے اقتدار پر قبضہ حاصل کیا اور اس کے بعد وہاں جمہوریت کو مستحکم کیا۔ اس امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا کہ یونس اور ان کے ساتھ آنے والے سٹوڈنٹ لیڈر بنگلہ دیش کے خاندانی اور غیر جہوریت پسند سیاسی رہنماؤں کی سیاست کے خاتمے کیلئے خود اپنی سیاسی جماعت بنالیں۔

ادھر برطانوی وزیرِ ٹیولپ صدیق کا نام بنگلہ دیش میں جاری کرپشن کی تحقیقات کے حوالے سے سامنے آیا ہے اور الزام لگایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں ان کا خاندان مبینہ طور پر تین اعشاریہ نو ارب پاؤنڈ کی خُرد بُرد میں ملوث ہے۔ 42 سالہ ٹیولپ صدیق برطانوی حکومت میں انسدادِ بدعنوانی کی وزیر ہیں اور شیخ حسینہ کی بھانجی ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے 2013 میں بنگلہ دیش اور روس کے درمیان ایک معاہدہ کروایا جس کے باعث بنگلہ دیش میں نیوکلیئر پاور پلانٹ کی کُل قیمت میں اضافہ ہوا۔ بنگلہ دیش کی نئی حکومت حسینہ واجد اور ان کے خاندان کے کرپشن میں ملوث ہونے کی تحقیقات کر رہی ہے اور

ٹیولپ صدیق کانام بھی اسی سلسلے میں سامنے آیاہے جبکہ موصوفہ نے ان الزام کو مکمل سیاسی قرار دیتے ہوئے ان کی آنٹی شیخ حسینہ کو نقصان پہنچانا بتایا ہے۔

کنزرویٹو پارٹی کے شیڈو وزیرِ داخلہ میٹ وِکر کا اس حوالے سے کہنا تھا کہ "لیبر پارٹی کی انسداد بد عنوانی کی وزیر خود ایک کرپشن کیس میں ملوث ہیں، یہ کیئر سٹارمر کے فیصلوں پر لگنے والا نیا داغ ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ٹیولپ صدیق سچ بولیں۔ برطانوی عوام ایک ایسی حکومت کے مستحق ہیں جس کی ترجیحات میں عوامی مسائل شامل ہوں نہ کہ ایسی حکومت جس کی توجہ ایک اور کرپشن سکینڈل پر مرکوز ہو"۔ بنگلہ دیش میں اے سی سی اس وقت شیخ حسینہ کی بہن (ٹیولپ صدیق) سمیت ان کے خاندان اور سابق حکومت کے متعدد اراکین کے خلاف تحقیقات کر رہا ہے۔ بنگلہ دیش کے انٹر نیشنل کرمنل ٹربیونل (آئی سی ٹی) نے بھی "انسانیت کے خلاف جرائم" کے الزامات میں شیخ حسینہ اور دیگر 45 افراد کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر رکھے ہیں۔

حیرت انگیز طور پر شیخ حسینہ اور عمران خان کے سیاسی مستقبل میں مماثلت نظر آرہی ہے۔ دونوں رہنماؤں کے چاہنے والوں کو ٹرمپ سے نہ صرف اپنے رہنماؤں کی رہائی کی بلکہ دوبارہ اقتدار میں آنے کی توقعات ہیں۔ کرپشن مقدمات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جس کا ان کو سامنا ہے۔ سوال یہ ہے کیا ان کی ٹرمپ سے خوش گمانیاں بارآور ثابت ہوسکتی ہیں جبکہ امریکا کا ماننا ہے کہ عالمی سیاست میں "فری لنچ" کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیا چین کے خلاف بنائے گئے اتحاد "کواڈ" میں آلہ کار بننے کی قیمت کے طور پر انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ دیکھیں اب "خوش گمانیوں" کا مقابلہ بد گمانیوں میں کب بدلتا ہے کیونکہ امریکا کی تاریخ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد اپنے دوستوں کی قربانی دیتے ہوئے ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتا کیونکہ پاکستان سے زیادہ کسی کو اتنا تلخ تجربہ نہیں۔

بروز جمعرات 2 رجب المرجب 1446ھ 2 جنوری 2025ء

روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ

اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا امت مسلمہ ہے جس پر چاروں طرف سے ابتلاء کی بارش کر دی گئی ہے لیکن ہمارے تمام دشمن نہ صرف اکٹھے مل کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی عملی سازشوں میں شریک ہیں بلکہ ہمیں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہم ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے میں مصروف ہیں۔یوں تو اس وقت امت مسلمہ کئی مسائل سے دوچار ہے لیکن کشمیر اور فلسطین دو ایسی بڑی مقتل گاہیں بن چکی ہیں جہاں پچھلی سات دہائیوں سے انسانیت مسلسل چیخ و پکار کر رہی ہے لیکن خود کو مہذب کہلانے والی قومیں نہ صرف بہرے اور گونگے شیطان کا کردار ادا کر رہی ہیں بلکہ اس ظلم و ستم میں برابر کے شریک ہیں۔

کشمیریوں اور فلسطینیوں پر قیامت بیت رہی ہے لیکن صد افسوس کہ یہاں ہماری مسلم حکومتوں کی محفلیں شگوفہ بنی ہوئی ہیں۔یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟بستی میں ایسی بے حسی تو کبھی نہ تھی۔درست کہ ہم آج کمزور ہیں اوران کی عملی مدد سے قاصر ہیں لیکن ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ یہ دکھ امانت کی طرح سنبھال کر رکھیں اور نسلوں کو وراثت میں دے جائیں۔کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ موسموں کے بدلنے تک اپنے زخموں کو تازہ رکھیں۔ان سے رستے لہو کو جمنے نہ دیں۔بھلے وقتوں کی بات ہے ابھی روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ہمارا ادیب دائیں اور بائیں کی تقسیم سے بے نیاز ہو کر یہ امانت نسلوں تک پہنچا رہا تھا۔

اقبال،قدرت اللہ شہاب،فیض،شورش کاشمیری،انتظار حسین،حبیب جالب،احمد ندیم قاسمی،ابن انشاء،احمد فراز،رئیس امروہوی،ن م راشد،مستنصر حسین تارڑ،قرۃ العین حیدر،مظہر الاسلام،ادا جعفری،یوسف ظفر،منظور عارف،ضمیر جعفری،خاطر غزنوی،محمود شام،نذیر قیصر،شورش ملک،سلطان رشک،طاہر حنفی،بلقیس محمود.........میرے ملک کتنے ہی نام ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں اور نظموں میں اس دکھ کو آئندہ نسلوں کیلئے امانت کے طور پر محفوظ کر دیا،یہ مگر گزرے دنوں کی بات ہے۔

اب فلسطین سے دھواں اٹھتا ہے تو مرا قلم تو بے اختیار نوحے لکھتا ہے لیکن سوچتا ہوں باقی ادیب کیا ہوئے؟قلم ٹوٹ گئے،سیاہی خشک ہو گئی یا احساس نے دم توڑ دیا؟برسوں پہلے انتظار حسین کا افسانہ "شرم الحرم" پڑھا تھا۔کچھ فقرے آج بھی دل میں ترو تازہ ہیں۔"بیت المقدس میں کون ہے؟بیت المقدس میں تو میں ہوں،سب ہیں،کوئی نہیں ہے۔بچے کمہار کے بنائے پتلے کوزوں کی طرح توڑے گئے،کنواریاں کنویں میں گرتے ہوئے ڈول کی رسی کی مانند لرزتی ہیں۔ان کی پوشاکیں لیر لیر ہیں۔بال کھلے ہیں۔انہیں تو آفتاب نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا تھا۔عرب کے بہادر بیٹے بلند و بالا کھجوروں کی مانند میدانوں میں پڑے ہیں۔صحرا کی ہواؤں نے ان پر بین کیے"۔

انتظار حسین ہی کے افسانے "کانے دجال" کو میں نے کتنی ہی بار پڑھا۔یہ پیراگراف ہر دفعہ خون رلاتا ہے۔"پلنگ پہ بیٹھی اماں جی چھالیاں کاٹتے رونے لگیں۔انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگیں۔ابا جان کی آواز بھر آئی تھی مگر ضبط کر گئے۔اپنے پر وقار لہجے میں شروع ہو گئے: آنحضورؐ ﷺ دریاؤں،پہاڑوں،صحراؤں،سے گزرتے چلے گئے۔مسجد اقصیٰ میں جا کر قیام کیا۔حضرت جبریلؑ نے عرض کیا یا حضرت ﷺ تشریف لے چلیے،آپؐ ﷺ نے پوچھا کہاں؟بولے کہ یا حضرتؐ ﷺ زمین کا سفر تمام ہوا۔یہ منزل آخر تھی،اب عالم بالا کا سفر در پیش ہے۔تب حضورؐ ﷺ بلند ہوئے اور بلند ہوتے چلے گئے..........وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ...... ابا جان کا سر جھک گیا۔پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔بولے "جہاں ہمارے حضورؐ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہوگئے"۔

لڑکپن جوانی میں بدلا اور جوانی ڈھل چلی، کنپٹیوں کے بال اب سفید ہو رہے ہیں اور عائشہ اب چھیڑتی ہے کہ بابا آپ تو بڑھے ہوگئے۔ لیکن یہ فقرہ آج بھی نیزے کی انی کی طرح وجود میں پیوست ہے "جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہوگئے"۔ عشروں پہلے بھی یہ فقرہ پڑھا تو آگے پڑھا نہ گیا۔ آج بھی یہاں پہنچتا ہوں تو آنکھوں میں دھند اتر آتی ہے۔ سید علی گیلانی کا نورانی اور پرعزم چہرہ سامنے آن کھڑا ہو جاتا ہے اور میں شرمندہ ہو کر افسانہ ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔ منیر نیازی والا معاملہ درپیش ہوتا ہے: "اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور"۔ لمحہ موجود کی روشن خیالی کا تو سارا بانکپن ہی مسلمانوں پر غرانے اور غراتے رہنے میں ہے۔ میں مگر بھلے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ جب روشن خیالی کی مسند ابھی مسخروں کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ تب فیض احمد فیض نے فلسطینی مجاہدوں کیلئے ایک ترانہ لکھا تو قرآن کی آیت کو عنوان بنا دیا: لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ ابن انشا کی دیوارِ گریہ پڑھیے، فیض کی سرِ وادیِ سینا کو دیکھیے، ادا جعفری کی مسجد اقصیٰ پر نگاہ ڈالیے، منظور عارف کے آئینے کے داغ دیکھیے، احمد فراز کے بیروت کو دیکھیے، رئیس امروہوی کا فدیہ اور محمود شام کی بنت اقصیٰ دیکھیے، آپ کو سطر سطر یہ دکھ تازہ ملے گا۔ انہوں نے اس دکھ کو اگلی نسلوں تک امانت کے طور پر پہنچایا لیکن آج کیوں قحط الرجال ہے، یہ میں نہیں بلکہ بھارت کی بدنام زمانہ جیل میں صعوبتیں برداشت کرنے والی میری مجاہدہ بہن سیدہ آسیہ اندرابی اور اس کے ساتھ قید فہمیدہ اور نسرین پوچھ رہی ہیں اور میرے پاس ماسوائے شرمندگی، اس کا کوئی جواب نہیں۔ آخر کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اس کا جواب؟ ہم نے اس عالم دین کو کشمیر کمیٹی کا برسوں سربراہ رکھا جو علی اعلان کہتا رہا کہ "پاکستان بننے کی غلطی میں ہمارا ہاتھ نہیں" لیکن پاکستان کے قومی خزانے سے وہ خود اور اس کے دیگر عزیز و اقارب تمام مراعات وصول کر رہے ہیں۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!

ہم نے تو اپنے رب کی اس دھرتی پر سینے پر ہاتھ رکھ کر ہزاروں کے مجمع میں کشمیر کے وکیل ہونے کا دعویٰ کیا تھا، کشمیر کی آزادی کیلئے ہر جمعہ کی دوپہر کو ایک گھنٹے کے علامتی مظاہرہ کا اعلان کیا تھا، لیکن ہوا کیا؟ چند منٹ کا فوٹو سیشن کر کے وکیل کہاں چھپ گیا؟ بلکہ کشمیر کے بارے میں جہاد کا نعرہ بلند کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ کیا پاکستان کو مدینہ ریاست بنانے کا دعویٰ کرنے سے پہلے یہ سوچا نہیں تھا کہ مدینہ کو اسلامی اور فلاحی ریاست بنانے کیلئے بدر اور احد کے علاوہ بھی کئی دیگر معرکوں میں میرے آقا نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خود عملی جہاد کرنا پڑا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اپنا غم اور درد کس سے بیان کروں؟

اس امانت میں صرف درد کا احساس ہی نہیں وقت کے موسموں کے بدلنے کی آس بھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے "خانہ بدوش" کا آخری پیراگراف پڑھیے: "میں سینکڑوں فلسطینیوں سے مل چکا تھا مگر احمد ایک مختلف انسان تھا۔ وہ حقارت سے اسرائیل کا ذکر کرتا تھا بلکہ ایک سپاٹ اور کاروباری انداز میں۔ وطن اس کیلئے ایک اغوا شدہ بچہ تھا جو جذباتی ہونے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی تلاش میں اس کے نقش نہیں بھولنے تھے اور ایک سرد منصوبہ بندی سے خرکار کیمپ تک پہنچنا تھا"۔ یہی نقش ہم بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ نقش کیسے یاد رہتے ہیں؟ ماؤں کی لوریاں انہیں تازہ رکھتی ہیں، نصاب تعلیم تذکیر کا کام کرتا ہے، ادیب اور شاعر کا قلم اسے سنوارتا رہتا ہے۔ ماؤں کے پاس اب وقت نہیں، باپ کی جانے بلا، فلسطین اور کشمیر کیا ہے؟ نصاب تعلیم اجنبی ہو چکا، اور ادیب و شاعر گونگے ہو چکے۔

ایک یلغار ہے جس نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فلسطین کی بات کرنا اب دقیانوسی رویہ ہے کہ عرب جو خود کو فلسطین کا وکیل سمجھتے تھے، نہ صرف اس کا مقدمہ ہار چکے بلکہ خود کو اس وکالت نامے سے آزاد کر کے اس کا نام بھی سننا انہیں گوارہ نہیں۔ ان کی ترجیحات تو اپنے اقتدار کو طول دینا، قومی دولت کو اغیار کے خزانوں میں محفوظ کرنا کہ مشکل وقت میں کام آئے گی۔ انہیں صدام اور معمر قذافی کے عبرتناک انجام سے ڈرایا جاتا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ جب بھیڑ کو ذبح کر دیا جائے تو اس کی بلا سے کہ اس کی بوٹیوں کا سائز کیا ہوگا یا پھر اس کے گوشت کا قیمہ بنایا جائے گا۔

وہ ممالک جو خود کو جمہوریت کی "ماں" کہتے ہیں، انہوں نے اپنے ہاتھوں مصر اور الجزائر کے جمہور کا گلا گھونٹ دیا۔ مرسی حکومت کے ساتھ انسانی حقوق کے علمبرداروں کا سلوک یقیناً آئندہ نسلوں کا سر جھکا دینے کیلئے کافی ہوگا۔ ہزاروں سال پرانی بابل و نینوا کی تاریخ کے حامل عراق کو تاراج کر کے تاتاریوں کے مظالم کو بھی شرمندہ کر دیا گیا۔ عرب ممالک میں بادشاہت کے نظام پر سب ہی معترض ہیں لیکن ان کے حکمرانوں کا استقبال "ریڈ کارپٹ" پر کرتے ہوئے جمہوریت گنگ ہو جاتی ہے۔ جمہوریت کے علمبردار مغرب میں شخصی آزادیاں ایک چیلنج بن چکی ہیں، یہاں کسی بھی خاتون کو برہنہ ہونے کا اختیار تو ہے لیکن اپنی مرضی سے اسکارف نہیں پہن سکتی۔ مذہب کی توہین کرتے ہوئے لحہ بھر کیلئے شرم محسوس نہیں کرتے۔

کون نہیں جانتا کہ معمر قذافی کو امریکا اور مغربی ممالک کے ساتھ اقتصادی روابط نہ رکھنے کی سزا دی گئی، بظاہر تو لیبیا پر یہ کہہ کر حملہ کیا گیا کہ وہاں کے عوام کو قذافی سے بچایا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ معمر قذافی نہ یورپی ممالک اور نہ امریکا کو اپنے اقتصادی معاملات میں مداخلت کی اجازت دیتے تھے بلکہ وہ عالمی منڈی میں تیل کے بدلے ڈالر کے مقابلے میں سونے کا سکہ چلانے کیلئے کوشاں تھے اور تمام تیل پیدا کرنے والے ممالک کو اس فارمولے پر

قائل کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہو رہے تھے۔ قذافی کی کوشش تھی کہ وہ چین، ترکی اور ایشیائی ممالک سمیت ان ممالک کے ساتھ اقتصادی تعلق رکھیں جو امریکا کے اثر سے پاک تھے۔ قذافی کے خلاف یہ بات اڑائی گئی کہ ان کی ایئر فورس بن غازی میں عوامی مظاہروں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے، الجزیرہ ٹی وی پر یہ خبر بھی چلی کہ بن غازی میں بمباری کے نتیجے میں 50 ہزار لوگ مارے گئے، اگرچہ یہ خبر واپس لے لی گئی لیکن اس خبر کے نو فلائی زون قائم کر دیا گیا۔ بعد میں اسی نو فلائی زون کو توڑتے ہوئے بمباری شروع کر دی گئی اور قذافی کے گھر پر بمباری کر کے ان نتیجے میں لیبیا کے اوپر کے ایک بیٹے کو بچوں سمیت شہید کر دیا گیا۔ اس موقع پر پوری عرب اور اسلامی دنیا دیکھتی رہ گئی اور کچھ نہ کر سکی۔ یہ جہاں امریکا کی جانب سے لیبیا کے عوام کو بچانے کیلئے کھلی بدمعاشی اور جارحانہ مداخلت تھی وہاں تمام مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو ان کی اوقات بتا دی گئی اور رہی مغرب کی خاموشی، آج ان کے ضمیروں پر بوجھ بن کر تازیانے برسا رہی ہے۔ اپنے اس جرم کا اعتراف خود مجھ سے مغرب کے کئی دانشوروں نے کیا ہے۔

بالآخر بھارت کا اپنی اقلیتوں سے غلیظ، متعفن آمریت کے سلوک کے بارے میں خود 75 کانگرس امریکی ارکان نے جو بائیڈن کو خط لکھ کر اس کی جمہوریت پر تھوک دیا ہے لیکن کیا جمہوریت کے علمبرداروں کے کانوں پر کوئی جوں رینگی؟ سید علی گیلانی نے اپنی سوانح حیات ''وولر جھیل کے کنارے'' میں دل کے زخم دکھانے سے تو گریز کیا لیکن بین السطور میں چشم کشا منظر ناموں کی نشاندہی کر دی ہے۔ بھارتی بنئے کے سینے پر بیٹھ کر اپنے لاکھوں چاہنے والوں اور سرفروشوں کے درمیان علی الاعلان یہ دعویٰ رقم کر دیا کہ ''ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے'' لیکن ہم نے ان کو کشمیر کا وکیل بن کر کھلا دھوکہ دیا۔ کیا کشمیریوں کا قصور بھی یہ ہے کہ وہ تاریخ عالم میں اُن چند پُرعزم، بلند حوصلہ، حق پرست، حریت پسند اور جذبۂ استقلال سے سرشار

سرشار اقوام میں سرِ فہرست ہیں جو 8 لاکھ سے زائد بھارتی درندوں کے ظلم سے نہ تو خوفزدہ ہیں اور نہ ہی ان کی جارحیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ 1947ء سے لیکر آج تک ان پر زندگی تنگ کر دی گئی ہے جو بلاشبہ ہندو بنئے ڈوگرہ راج کا تسلسل ہے۔ گمنام اجتماعی قبریں، بے گناہ شہداء، معصوم یتیم، بیوہ و نصف بیوہ عورتیں، نابینا بنادیئے گئے بچے، جوان، معذور و بے سہارا بوڑھے اور لہولہان وادئ کشمیر بھارتی مظالم کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن وہ آج بھی اقوامِ عالم کے سب سے بڑے ادارے اقوام متحدہ جو ان دنوں بڑی طاقتوں کی ایک لونڈی کا کردار ادا کر رہا ہے، سے اپنا وہ جائز حق مانگ رہے ہیں جو اس ادارے میں اقوام عالم کے اتفاق رائے سے دنیا کی چند بڑی طاقتوں کے بطور ضامن، ان کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ آج بھی بنیادی انسانی حقوق سے محروم کشمیری خاموش زبانوں، نابینا آنکھوں، بہتے زخموں، لٹی عزتوں اور بے بس ہاتھوں میں جوان لاشے اٹھائے ضمیرِ عالم کو جھنجھوڑنے کی ناکام مگر پُر امید کوشش میں مصروف و شکوہ کناں ہیں۔

1948ء میں اقوامِ متحدہ نے اس دن انسانی حقوق کے تحفظ اور آگاہی کیلئے 48 ممالک کی رضامندی سے 30 دفعات پر مشتمل عالمی منشور جاری کیا تھا-اس منشور کے تحفظ، بہتری اور عمل درآمد کو یقینی بنانے کیلئے ایک مستقل کمیشن برائے انسانی حقوق بھی قائم کیا گیا تھا-انسانی حقوق کے اس عالمی منشور میں بنیادی انسانی حقوق مثلاً انسانی آزادی، مساوی حیثیت، آزادانہ نقل و حرکت، آزادی اظہار، باوقار زندگی، سماجی تحفظ کا حق، مذہبی آزادی اور تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہ بنائے جانے کو یقینی بنایا گیا ہے- گو کہ اِس دن دنیا بھر میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی، مگر سوائے پاکستان و دیگر چند ممالک کے، اقوامِ عالم نے کشمیر و فلسطین میں ہونے والی اندوہ ناک انسان دشمنی کو ہمیشہ کی طرح پسِ پشت ڈالے رکھا ہے۔

مسلمانوں کے دکھ پر رونا اب انتہا پسندی بن چکا۔ اب تو مطالعہ پاکستان بھی مسخروں کے مزاح کا عنوان بن چکا، بیانیہ اب وہی ہے جو مغرب سے آتا ہے اور اس بیانیہ میں بتا دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق انسانی نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے نصاب کو جانے کن کن فضولیات سے بھر رکھا ہے۔ کیا اس میں فلسطین کے محمود درویش کی دو نظمیں ہم شامل نہیں کر سکتے؟ آپ محمود درویش کو پڑھ کر تو دیکھیں۔ میں انگریزی ادب کا بھی طالب علم رہا ہوں اور ورڈز ورتھ، کیٹس، بائرن، شیلے، ییٹس، براؤننگ، ہارڈی، جان ڈن، شیکسپیئر، ملٹن سمیت کتنوں کو پڑھ رکھا ہے لیکن جو بات محمود درویش میں ہے وہ ان میں کہاں۔ محمود درویش، نزار قبانی، سمیح قاسم، فوزی اسمر، حنا ابو حنا، توفیق زیاد، توفیق فیاض، امین حبیبی، ایک کہکشاں آباد ہے، ہمیں جس کا علم ہی نہیں۔ سمیح قاسم کی نظم ''ارم'' تو کمال ہے۔ ابدا علی هذاالطريق ، ر ايا تنابصر الضرير۔ ہمیشہ سے اس راستے پر ہمارے پرچم اندھوں کیلئے بصارت بنے ہیں۔ محمود درویش نے کیا خوب لکھا: ''ويشتمنا اعادينا، هلا! همج هم، عرب۔ نعم عرب''۔ ہمارے دشمن آوازے کستے ہیں، یہ عرب ہیں، یہ اجڈ ہیں اور وحشی۔ ہاں سن رکھو ہم عرب ہیں۔ درویش کے ''اناشيدكوبا'' کا تو جواب نہیں۔

ذرا نزار قبانی کی یہ نظم دیکھیے: ''آل اسرائیل! ایسا اترانا بھی کیا؟ گھڑی کی سوئیاں آج رک گئیں تو کیا ہوا کل یہ پھر سے چل پڑیں گی۔ زمین کے چھن جانے کا غم نہیں، باز کے پر بھی جھڑ جایا کرتے ہیں۔ طویل تشنگی کا بھی ڈر نہیں کہ پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہہ میں ہوتا ہے۔ تم نے فوجوں کو ہرا دیا لیکن تم شعور کو شکست نہیں دے سکے۔ تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ ڈالیں جڑیں مگر باقی ہیں''۔ ہم آج بے بس سہی، مگر جڑیں تو باقی ہیں۔ ان جڑوں کی آبیاری تو ہم کر ہی سکتے ہیں۔ ہم اپنے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے لیکن ہم ان دکھوں کو سنبھال کر تو رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس امانت کو اگلی نسل کو تو سونپ سکتے ہیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔ وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔

محمود درویش نے کہا تھا: "اے میرے وطن میری زنجیروں نے مجھے عقاب کی سختی اور رجائی کی نرمی سکھائی، معلوم نہ تھا ہماری کھال کے نیچے طوفان جنم لیں گے اور دریاؤں کا وصل ہو گا۔ انہوں نے مجھے کوٹھڑی میں قید کیا، میرے دل نے وہاں مشعلیں فروزاں کر دیں، انہوں نے دیوار پر میرا نمبر لکھا لیکن دیواریں مرغزار ہو گئیں، انہوں نے میرے جلاد کی تصویر بنائی، روشن زلفوں سے اسے چھپالیا، میں نے شکست کو اٹھا کر پٹخ دیا اور فاتحین نے تو صرف زلزلوں کو جگایا ہے"۔ ہم کیسے بھول جائیں "جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے"۔

یہ دکھ ہماری اگلی نسل کی امانت ہے۔ آپ کے آنگن میں بچے کھیل رہے ہوں گے۔ انہیں بلائیے، پاس بٹھائیے اور یہ دکھ ان کی رگِ جاں میں انڈیل دیجیے کہ "جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے"۔ اور ہاں ان تمام نوحوں میں بھارتی درندوں کی بے رحم سنگینوں کا شکار، خونِ حق سے تر بتر کشمیر ہم نے کہاں کھو دیا؟ اس کی یادیں اب کیوں دھندلا رہی ہیں؟ اب بھی وہاں کے نوجوان اپنے سروں پر سبز ہلالی پرچم کو اپنا کفن سجا کر راہِ عدم کو روانہ ہونے میں تفاخر محسوس کر رہے ہیں۔ وقتِ رخصت ان کے چہروں کی مسکراہٹ پتہ دے رہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خالق کے حضور اس کے انعامات سے خوش و خرم اور راضی ہو کر ابدی اور دائمی زندگی کی کامیابی کے پروانوں کے تمغوں سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہاں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی نشانی، مردِ بطل حریت سید علی گیلانی کی للکار اور انکار رگوں میں منجمد خون کو ایسی حرارت بخش رہا ہے جس سے جہاں ہزاروں نوجوانوں کے دلوں میں شوقِ شہادت کے جذبوں سے معمور جوانیاں میدانِ عمل میں اتر آئی ہیں وہاں ارضِ جنت سے آسیہ اندرابی نمودار ہو کر متعصب شیطانوں اور ظالم کافروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آتش حریت سے پکار رہی ہے کہ ہمارے کشمیر سے نکل جاؤ کہ میرا کشمیر تو کبھی بھی بھارت کا حصہ نہیں رہا اور جونہی ہندوستانی ہائیکورٹ کشمیری مسلمانوں کے مذہبی رسوم ورواج کے خلاف گائے کے ذبیحہ پر پابندی کا ظالمانہ حکم صادر کرتی ہے تو یہ مومنہ اسی لمحے چوک کے اندر اپنے نگرانی میں اللہ کے راستے میں صدقہ کے طور پر گائے کو ذبح کروانے کے عمل کے بعد خون آلود چھری کو لہرتے ہوئے عدالت کے اس بہیمانہ قانون کے پرزے اڑا کر اپنے رب کو راضی کرنے کیلئے اس کی کبریائی بیان کر کے ایک مثال قائم کر دیتی ہے۔

آج اسی آسیہ کو اس کی دو نوجوان ساتھیوں سمیت بھارت کی سب سے بدترین جیل کی کال کوٹھڑیوں میں قید تنہائی میں ڈال کر اس کے عزم کو شکست دینے کی بدترین کوشش کی گئی جو اب بھی جاری ہیں جبکہ بزدل بنیاء جانتا ہے کہ آسیہ نے ساری عمر ثابت قدمی کی وہ زریں مثال قائم کی ہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے اس کے شوہر ڈاکٹر قاسم کو بے گناہی کے جرم میں آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دینے کے باوجود اس کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہیں آئی۔ اس علیل مجاہدہ کو جیل کی کوٹھڑی میں جہاں انتہائی ضروری ادوّیات سے محروم کر دیا گیا، وہاں کال کوٹھڑی میں قید تنہائی میں ناقص اور مضر صحت غذا بھی سلاخوں سے پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر پھینکی گئی، یقیناً میری مجاہدہ بہن اپنے رب کے اس وعدے پر ایمان کی حد تک یقین لا چکی ہے ،وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ، وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ: اور آخرت تمہارے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے، اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے (سورۃ الضحیٰ: 4-5) اسی لئے وہ آج ہندو درندوں کے تعذیب وابتلاء کو انتہائی بہادری سے برداشت کر رہی ہے۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا

مجھ تک جب ایسی مستند خبریں پہنچتی ہیں کہ ہمارا میڈیا کس قدر آسانی سے ان کو بھولنے کے جرم عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے تو میرے شب و روز مجھے انتہائی

بے چین، پریشان اور کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میرے آقا نبی اکرم ﷺ جنہیں میرے رب نے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ: سب جہانوں کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا، ان کے سینہ مبارک پر نازل الہامی اور آخری کتاب قرآن حکیم کا یہ پیغام کیوں بھول گئے کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا۔ اور تم کو کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور ان بیکس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، نکال کر کہیں اور لے جا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا۔ اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما (نساء:75)۔ کیا کبھی تنہائی میں خود احتسابی کا سامنا کرنا پڑا کہ اس مختصر عارضی زندگی کے چند روزہ اقتدار کا بالآخر حساب تو دینا ہو گا۔ اللہ کے اس برحق پیغام نے کبھی دل پر لرزہ طاری کیا کہ:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ اور اعمال کا وزن کیا جانا اس دن برحق ہے، پس جس شخص کے اعمال نامے بھاری ہوں گے، پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔ اور جس کے اعمال نامے ہلکے ہوں گے یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈالا اس واسطے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔ (الاعراف:8-9) ربِّ ذوالجلال کا یہ حکم بھی پڑھ لیں: فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ پھر جس کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہو گا تو وہ پسندیدہ زندگی میں ہو گا اور جس کا پلہ ہلکا ہو گا تو اس کا ٹھکانہ گڑھا ہو گا۔ اور تجھے کیا معلوم وہ کیا ہے، وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (القارعہ:6-11)

پاکستان میں نظام مصطفیٰ کو نافذ کرنے اور ریاست مدینہ بنانے کا کہہ کر اقتدار حاصل کرنے والے والے تمام کان کھول کر سن لیں اور میرے رب کا یہ اٹل فیصلہ بھی ذہن نشیں کر لیں کہ: أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ, وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ.... کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون! (سورۃ العنکبوت:2۔3) اور ہاں یہ بھی سن لو "وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ"۔ اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور خود بھی اچھے کام کیے اور کہا بے شک میں بھی فرمانبرداروں میں سے ہوں! (سورۃ الفصلات:33۔41)

یقیناً ان حالات میں دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ "جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے"۔

بروز ہفتہ 4 رجب المرجب 1446ھ 4 جنوری 2025ء

امریکا: اسلامی فوبیا کی تاریخ

امریکا میں عمومی طور پر رائے عامہ کے جائزوں کے ذریعے پیشگوئی کی جاتی ہے وائٹ ہاس کا اگلا مکین کون ہو گا، کون سا صدارتی امیدوار عوامی مقبولیت کی کس سطح پر کھڑا ہے۔ کیا یہ جائزے درست بھی ثابت ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ اگلے چند دنوں میں دنیا کے سامنے آجاتا ہے جس طرح حال ہی میں امریکی انتخابات کے نتائج آنے پر جن اداروں نے ٹرمپ کی فتح کی پیشگوئیاں کیں تھیں، ان کے مخالفین ایسے سروے رپورٹس کو مسترد کرتے ہوئے اسے ٹرمپ کی پروپیگنڈہ مہم سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنے حامی ووٹر کو نہ صرف تسلی دیتے تھے بلکہ اپنے امیدوار کملا ہیرس کے حق میں سروے جاری کرتے رہے لیکن کیا واقعی اس مرتبہ اسرائیل کا غزہ میں جاری انسانیت سوز سلوک خاصا زیر بحث رہا جو کملا ہیرس کی شکست کا سبب بنا؟ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کیا امریکا میں اسلام فوبیا کی جاری فضاء میں مسلمان آئندہ امریکی انتخابات پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور امریکا میں مسلمانوں کی تاریخ کیا ہے؟

امریکا کے تیسرے صدر اور اعلانِ آزادی کے خالق تھامس جیفرسن کے پاس نہ صرف یہ کہ قرآن کا نسخہ تھا بلکہ انہوں نے اسلام کو امریکی معاشرے کی تصویر کے ایک ممکنہ رنگ کے طور پر دیکھا اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کی کوشش بھی کی۔ تھامس جیفرسن نے مسلمانوں کو نئی ابھرتی ہوئی امریکی ریاست کے ممکنہ شہریوں کے روپ میں دیکھا۔ امریکا کا اعلانِ آزادی تحریر کرنے سے 11 سال قبل انہوں نے قرآن کا نسخہ خریدا تھا۔ تھامس جیفرسن کا قرآن کا وہ نسخہ آج بھی کانگریس کی لائبریری میں محفوظ ہے اور امریکیوں کے اجداد اور اسلام کے تعلقات کی علامت ہے۔ امریکی راست گو دانشوروں کیلئے یہ تعلقات آج بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

تھامس جیفرسن کے پاس قرآن کے نسخے کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لیتے تھے مگر اس امر کی وضاحت نہیں ہوتی کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی چاہتے تھے۔ تھامس جیفرسن نے بنیادی حقوق پر اسلامی تصور سے پہلی شناسائی سترہویں صدی کے انگریز فلسفی جان لاک کی تحریروں سے حاصل کی۔ جان لاک نے یورپی معاشروں پر زور دیا تھا کہ وہ مسلمانوں اور یہودیوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کریں۔ جان لاک نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی جنہوں نے یہ نکتہ ایک صدی قبل سمجھ لیا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق سے متعلق تھامس جیفرسن کا تصور بحیرۂ اوقیانوس کے آر پار سولہویں سے انیسویں صدی عیسوی تک کے فکری ارتقا کی روشنی میں زیادہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

جب یورپ میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تب بہت سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس امر کی نشانی کے طور پر آزمایا کہ نظریاتی معاملات میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کے حوالے سے تحمل اور رواداری کی حد کیا ہوسکتی ہے۔ یورپ میں قائم ہونے والی نظیروں کی بنیاد پر امریکا میں بھی مسلمان، ''شہریت کی حدود اور رواداری'' کے حوالے سے بحث کا موضوع بن گئے۔ نئی حکومت کی تیاریوں کے دوران جب امریکا کے بانیان نے (جو تمام کے تمام پروٹسٹنٹ تھے) مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو دی جانے والی مذہبی آزادی کے بارے میں غور کیا تو اس حوالے سے اسلامی دنیا میں پائی جانے والی نظیروں کے حوالے دیے۔ امریکا کی بانی نسل نے اس نکتے پر خصوصی بحث کی کہ امریکا کو مذہبی اعتبار سے پروٹسٹنٹ ہونا چاہیے یا تمام مذاہب کے پیروکاروں کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے۔ اس نکتے پر بھی پورے اہتمام سے بحث کی گئی کہ اگر تمام مذاہب کے پیروکاروں کو قبول ہی کرنا ہے تو کیا کسی بھی غیر پروٹسٹنٹ کو صدر کے منصب تک پہنچنے کی اجازت دی جانی چاہیے؟ اس سے انہیں مذہبی آزادی سے متعلق امور پر

غور کرنے کی تحریک ملی۔ انہوں نے کئی باتیں سوچیں مثلاً یہ کہ کیا امریکا میں کوئی ایسی اسٹیبلشمنٹ قائم ہونی چاہیے، جو پروٹسٹنٹ فرقے کو تحفظ فراہم کرتی ہو۔ اس کا بنیادی مقصد مذہب کو ریاست سے الگ رکھنے کا انتظام یقینی بنانا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آئین میں مذہب سے متعلق ٹیسٹ کا معاملہ بھی شامل کیا جاتا تھا، جیسا کہ 19ویں صدی تک ریاستوں میں رہا۔

مسلمانوں کی شہریت کے خلاف مزاحمت کا تصور 18ویں صدی تک حیرت انگیز نہ تھا۔ امریکیوں کو یورپ سے مذہب کے پیشوایانہ اور سیاسی کردار پر کم و بیش ایک ہزار سال کے منفی خیالات ترکے میں ملے تھے۔ مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے منفی تاثر کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ امریکا کے ابتدائی دور کی چند اہم ترین شخصیات نے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کو امریکا کے متوقع شہریوں کی حیثیت سے سوچا ہی نہ جائے۔ بانیانِ امریکا نے مسلمانوں کا ایسے شہریوں کے روپ میں تصور کیا جنہیں تمام حقوق میسر ہوں۔ مسلمانوں کے حقوق کے دفاع سے متعلق بانیانِ امریکا کا یہ حیرت انگیز موقف دراصل یورپ میں سیاسی فکر کے ہزار سالہ ارتقا کا منطقی نتیجہ اور اس کی توسیع کے مترادف تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شدید مخالفت کی فضا میں بھی مسلمانوں کو تمام حقوق کے ساتھ شہری بنانے کا تصور امریکا میں کیوں کر محفوظ رہا؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اس تصور کا 21ویں صدی میں مستقبل کیا ہے؟

انہوں یہ کتاب ہمیں امریکا کے قیام کے ابتدائی دور میں چند نمایاں شخصیات کے ان تصورات سے آگاہ کرتی ہے، جو وہ اسلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ نے اسلام کے بارے میں پائی جانے والی منفی آرا کو جوں کا توں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یورپ نے انہیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں برداشت کا رویہ نہ اپنانے کی غیر محسوس تعلیم دی تھی، مگر انہوں نے اس تعلیم کو قبول نہ کیا۔

امریکا کے بیشتر پروٹسٹنٹ باشندے یہ تصور رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے خیالات کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ایک طرف تو پروٹسٹنٹس میں "اسٹیٹس کو" کی راہ ہموار ہوئی اور دوسری طرف امریکا کے دیگر باشندے یہ سوچنے پر مائل ہوئے کہ دوسروں کی بات سننے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایک طرف اگر مسلمانوں کو قبول نہ کرنے کی سوچ پروان چڑھی تو دوسری طرف امریکیوں کی اکثریت نے یہ سوچنا شروع کیا کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی قبول کرنا چاہیے تاکہ معاشرے میں امتیازی روّیہ نہ پایا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو بھی اپنانے کا شعور پیدا ہوا۔

یہ سب کچھ اس وقت سوچا جا رہا تھا جب مسلمان ابھی امریکا میں آئے نہ تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی انہیں قبول کرنے کی سوچ پروان چڑھائی جا رہی تھی۔ تھامس جیفرسن اور ان کے قریبی رفقا بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں سوچنے اور بحث کرنے سے امریکا میں حقوق کے حوالے سے آفاقیت کی راہ ہموار ہو گی اور پھر یہ ہوا کہ امریکا میں اقلیتوں (کیتھولک عیسائی اور یہودی) کو قبول کرنے اور معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے حوالے سے فکر آگے بڑھی۔ مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث نے امریکا میں یہ تصور پیدا کیا کہ سب کو کھلے دل سے قبول کیا جائے۔

امریکا کو برطانیہ سے حقیقی آزادی 1783ء میں ملی۔ اس سال جارج واشنگٹن نے نیویارک میں سکونت پذیر آئرش کیتھولک عیسائیوں کو خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف 25 ہزار کیتھولک عیسائی تھے، جن کے حقوق خاصے محدود تھے۔ انہیں نیویارک میں کسی بھی طرح کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ جارج واشنگٹن نے اس نکتے پر زور دیا کہ امریکا کو ہر مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو قبول کرنا چاہیے

جن پر مظالم ڈھائے گئے ہوں اور جنہیں مستقل دباؤ میں رکھا گیا ہو۔ انہوں نے یہودیوں کو بھی خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف دو ہزار یہودی تھے جارج واشنگٹن چاہتے تھے کہ امریکی سرزمین پر دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگوں، بالخصوص مذہب کے نام پر نشانہ بنائے جانے والوں کو پناہ ملے۔

1784ء میں جارج واشنگٹن نے ماؤنٹ ورنن کے مقام پر اپنے گھر پر مسلمانوں کے حوالے سے اپنے خیالات کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا۔ ورجینیا سے کسی دوست نے جارج واشنگٹن کو لکھا کہ اسے اپنا گھر بنانے کیلئے ایک بڑھئی اور ایک مستری (معمار) کی ضرورت ہے۔ جارج واشنگٹن نے اسے لکھا کہ کسی بھی مکان کی تعمیر یا فرنیچر کی تیاری میں اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ کاریگر کس مذہب، فرقے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا کاریگر ایشیا، افریقا یا یورپ کا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان، عیسائی یا یہودی ہو یا پھر یہ کہ وہ کسی مذہب پر یقین ہی نہ رکھتا ہو۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا جارج واشنگٹن کے فکری دھاروں میں مسلمان بھی بہتے تھے۔ انہوں نے "امریکا سب کیلئے" کے تصور میں مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہے جارج واشنگٹن کو اندازہ ہو کہ کسی بھی شعبے میں کوئی کردار ادا کرنے کیلئے ابھی بہت دنوں تک مسلمان نمودار نہیں ہوں گے۔

بہر حال مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ 18 ویں صدی عیسوی میں بھی امریکا میں مسلمان سکونت پذیر تھے مگر تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو مستقبل کے امریکی شہری تصور کرتے ہوئے ان کا ذکر کیا تھا۔ جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کی تحریروں اور تقاریر میں مسلمانوں کا ذکر بلا سبب ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں عظیم شخصیات مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے دو متضاد یورپی رویوں اور تصورات کی وارث تھیں۔

ایک تصور یہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات پروٹسٹنٹ عیسائیت کی تعلیمات کے یکسر منافی بلکہ اس سے متصادم ہیں اور یہ کہ جابرانہ حکومتوں کے قیام میں بھی اسلامی نظریات نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ مسلمانوں کو امریکا کے پروٹسٹنٹ معاشرے میں قبول کرنے کا مطلب ایک ایسی برادری کو قبول کرنا تھا جس کے مذہب اور اس سے متعلق تصورات کو یورپ نے غلط، اجنبی اور خطرناک قرار دیا تھا۔ معاملہ مسلمانوں تک محدود نہ تھا۔ امریکی پروٹسٹنٹ تو کیتھولک عیسائیوں کے نظریات کو بھی اِسی طرح اجنبی اور خطرناک قرار دیتے تھے۔ کیتھولسزم کو بھی آزادی کے امریکی تصورات اور وسیع النظری کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔

جیفرسن اور نان پروٹسٹنٹ شہریت کی حامی دیگر شخصیات نے آئین کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ ایک اور فکری دھارے کو پروان چڑھانے میں معاونت کی، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں کو قبول کرنے کی راہ بھی ہموار ہوتی تھی۔ 16 ویں صدی کے جن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے اپنے نظریات کی تبلیغ کی تھی، انہوں نے ان کیلئے جان بھی دی تھی۔ 17 ویں صدی عیسوی میں یورپ کے جن لوگوں نے تمام مذاہب کو قبول کرنے اور تمام ثقافتوں اور نسلوں کے لوگوں کو اپنے ہاں قابل قبول قرار دینے کی بات کی تھی انہیں سزائے موت یا پھر قیدِ بامشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثریت کو ان نظریات کی بنیاد پر ملک سے نکال دیا گیا۔ اس معاملے میں امیر و غریب اور بے کس و طاقتور کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اشرافیہ میں سے بھی جن لوگوں نے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنانے کی بات کی، انہیں شدید مخالفت اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔

یورپ میں رومن کیتھولک چرچ سے متصادم نظریات رکھنے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کسان تھے، سیاسیات سمیت مختلف علوم کے ماہرین تھے یا پھر اوّل اوّل انگریز بیپٹسٹ۔ ان میں کوئی بھی سیاسی قوت رکھنے والا یا اعلیٰ معاشرتی حیثیت کا حامل شخص نہ تھا۔ مذہب کے لگے بندھے نظریات سے ہم

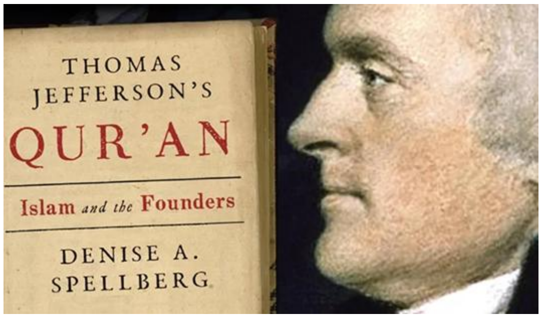

آہنگی نہ رکھنے والے اگرچہ منظم نہ تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے منظم فکر رکھنے والے مسلمانوں کو عیسائی ریاستوں میں ایذاؤں سے بچانے کیلئے خاصی وقیع جدوجہد کی۔

18ویں صدی کی اینگلیکن اسٹیبلشمنٹ کے رکن اور ورجینیا کے ایک اعلیٰ سیاستدان کی حیثیت سے تھامس جیفرسن نے وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ میں اپنے پیش کرنے والوں پر شدید لعن طعن کا سبب بنے تھے اور بہتوں کو تو سزائے موت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ تھامس جیفرسن چونکہ خود اسٹیبلشمنٹ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ان کا مؤقف ورجینیا میں پوری توجہ سے سنا گیا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر تھامس جیفرسن نے نوزائیدہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ کے مرکزی دھارے سے بہت دور جوہڑ کی شکل میں اپنی وقعت کھو بیٹھے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ تھامس جیفرسن نے تمام مذاہب کے لوگوں کو قبول کرنے اور ہر مذہب کے پیروکاروں کے حقوق کو سرکاری مداخلت سے مُبرّا رکھنے کا تصور پیش کیا اور ان پر مبارک باد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مخالفین نے ہر قدم پر ان کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے حلقوں میں جیفرسن کو غیر معمولی وقعت ملی۔ پریسبائٹیریز اور بپٹسٹس سمیت بہت سی ایسی برادریوں نے جیفرسن کی بات پر مسرت کا اظہار کیا جو پروٹسٹنٹس کی جانب سے جبر کا سامنا کرتے رہے تھے۔ ویسے تو خیر امریکی معاشرے کا کوئی بھی طبقہ غیر پروٹسٹنٹس کو جامع امریکی شہریت دینے کے حق میں نہ تھا، مگر پھر بھی مسلمانوں کیلئے ان کے دلوں میں نرم گوشہ ضرور تھا۔

مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث شروع کرنے والے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ 18ویں صدی کے معاشرے میں محض فکری یا نظری سطح پر بھی خاصا اجنبی اور ناقابلِ قبول تھا۔ تب تک امریکی شہریت کا حقدار وہی سمجھا جاتا تھا جو پروٹسٹنٹ، سفید فام اور مرد ہو۔ شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنا لازم تھا۔ ورجینیا میں اس حوالے سے قانون سازی تو ایک بڑے سفر کی محض ابتدا تھی۔ تھامس جیفرسن، جارج واشنگٹن اور جیمز میڈیسن نے شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنے کا عمل شروع کیا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی کیریئر کے دوران اس آدرش کے حصول کیلئے غیر معمولی محنت کی مگر مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ وہ اپنا ادھورا کام بعد میں آنے والوں کیلئے فریضے کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ کتاب پہلی بار اس امر پر بحث کرتی ہے کہ کس طور جیفرسن اور ان کے ساتھی، اسلام کے بارے میں اپنے نامکمل اور مبہم تصورات کے باوجود، مسلمانوں سمیت تمام نان پروٹسٹنٹ افراد کے شہری حقوق کیلئے متحرک رہے۔

جارج واشنگٹن نے جب 1784ء میں مسلمانوں کو محنت کشوں کی حیثیت سے امریکا آنے کی اجازت دینے کی وکالت کی، اس سے ایک عشرہ قبل انہوں نے اپنی محصول پذیر املاک میں افریقی نسل کی دو عورتوں کا ذکر بھی کیا تھا، جو ماں بیٹی تھیں۔ ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا فاطمہ صغیرہ تھا۔ جارج واشنگٹن نے مسلمانوں کو امریکی شہریت دینے کی وکالت کی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو غلام کی حیثیت سے خرید کر اُنہوں نے خود ہی ان کے بنیادی حقوق کی راہ مسدود کی تھی۔ واضح رہے کہ تب تک غلام مسلمانوں کو اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جیفرسن اور میڈیسن کی جاگیروں اور زرعی اراضی پر بھی یہی حقیقت پائی گئی ہو۔ مگر خیر، ان کے غلاموں کے مذہب کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں مغربی افریقا سے محنت کشوں کے طور پر لائے گئے مسلم غلاموں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہ تعداد امریکا میں آباد کیتھولک عیسائیوں

اور یہودیوں سے کہیں زیادہ رہی ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے سابق مسلم غلاموں نے کانٹی نینٹل آرمی میں بھی خدمات انجام دی ہوں۔ مگر خیر، اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اپنے مذہب پر کاربند رہے ہوں اور یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکا ہے کہ امریکا کے بانیوں کو ان کی موجودگی کا علم تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں کے شہری یا شہریتی حقوق سے متعلق بحث پر یہ سابق مسلم غلام اثر انداز نہیں ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا میں مسلمان (پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرح) 17 ویں صدی سے موجود تھے مگر نسل اور غلامی کے عوامل اس قدر مضبوط تھے کہ ان کے مذہب کا معاملہ سات پردوں میں لپٹا رہا۔ امریکا کے بانیان نے جب مستقبل کے امریکی مسلمانوں کے حقوق کا سوچا تھا تو ان کے ذہن میں سفید فام مسلم ہی رہے ہوں گے کیونکہ 1790ء کے عشرے تک کسی بھی نسل یا مذہبی پس منظر کا حامل سفید فام شخص امریکا میں شہریت کیلئے درخواست دے سکتا تھا۔ جیفرسن نے صرف دو مسلمانوں سے ملاقات کی تھی اور وہ دونوں ترک نسل کے شمالی افریقی سفیر تھے۔ جیفرسن نے ان کی رنگت کے بارے میں کچھ کہا، نہ لکھا۔ دونوں بہت حد تک سفید فام تھے۔ ان دونوں میں رنگ یا مذہب کے اعتبار سے جیفرسن کیلئے کوئی کشش نہ تھی۔ اس نے ان دونوں سے ملاقات کی اور انہیں اہمیت دی تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ سیاسی و سفارتی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ اس سے قبل تھامس جیفرسن نے سفیر، وزیر خارجہ اور نائب صدر کی حیثیت سے شمالی افریقا کی ریاستوں سے امریکا کے تنازع کو مذہب کے نقطۂ نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ بحیرۂ روم اور مشرقی بحر اوقیانوس امریکی جہازرانی کو قزاقوں سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ جیفرسن نے ٹریپولی اور تیونس کے حکمرانوں پر واضح کیا کہ ان کا ملک اسلام مخالف جذبات یا تعصب نہیں رکھتا اور ایک مرحلے پر تو وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے دونوں حکمرانوں سے کہا کہ ہم بھی اُسی خدا کی عبادت کرتے ہیں، جس کے عبادت گزار آپ ہیں!

جیفرسن مذہب کو سیاست یا حکومت سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیرون ملک جن خیالات کو رواج دیا، ملک میں اُنہی خیالات کو اہمیت دی۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جیفرسن کے تصورات بنیادی طور پر شمالی افریقا کی ریاستوں سے تعلق کی بنیاد پر پروان چڑھے ہوں گے۔ یہی شمالی افریقا سے متعلق ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بھی تھے۔ یہ نکتہ بھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ جیفرسن نے ذاتی طور پر موحد ہونے کی بنیاد پر اسلامی دنیا سے اپنے تعلق کو زیادہ اہمیت دی ہو گی۔

جیفرسن کے زمانے تک اسلام کے بارے میں بہت سے منفی تاثرات اور تصورات بھی پائے جاتے تھے اور یقینی طور پر وہ ان سے پوری طرح محفوظ یا لاتعلق تو نہیں رہے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق یورپ سے ترکے میں ملنے والے چند تصورات اور مثالوں کو انہوں نے ورجینیا میں مذہب کو ریاستی یا حکومتی امور سے الگ رکھنے کی بحث میں مضبوط بنیاد کے طور پر استعمال کیا ہو۔ جیفرسن نے 18 ویں اور 19 ویں صدی میں اصول اور تعصب کی جس جنگ میں فتح پائی تھی، وہ اب بھی، 21 ویں صدی میں، بحران کی صورت امریکیوں کے سامنے کھڑی ہے۔ 19 ویں صدی کے اواخر سے اب تک امریکا میں مسلمانوں کی تعداد نمایاں رفتار سے بڑھی ہے اور اب امریکا میں آباد مسلمان نسلی تنوع اور تحرک سے متصف ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکا میں مسلمانوں کو کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا۔ جیفرسن کے زمانے میں مسلمانوں کی ایک تصوراتی آبادی کو تعصب کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ آج کے امریکا میں ان مسلمانوں پر سیاسی حملے ہو رہے ہیں، جو ایک حقیقت کی حیثیت سے امریکی معاشرے کا حصہ ہیں۔ نائن الیون کے اور دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا میں مسلمانوں کے خلاف ایسی فضا تیار کر دی گئی ہے، جس میں سبھی اس بات کے حق میں دکھائی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے تمام بنیادی و شہری حقوق نہ دیے جائیں۔

اب امریکا میں یہ بحث بھی زور پکڑ گئی ہے کہ کوئی مسلمان امریکی صدر بننے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ بارک اوباما کے حوالے سے یہی سوال اٹھا تھا مگر یہ سوال نیا نہیں۔ امریکی سیاسی تاریخ میں جیفرسن پہلی شخصیت تھے جن پر مسلمان ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ کوئی امریکی مسلمان صدر بن سکتا ہے یا نہیں، یا اسے صدر بننے دینا چاہیے یا نہیں۔ اِس نکتے پر بحث سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے کہ امریکی شعورِ عامہ میں مسلمان کس طور داخل ہو چکا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے حقوق کس طرح ابتدائی مرحلے میں قومی آدرش کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یوں آج کے امریکا میں مسلمانوں کی شہریت کے مسئلے کو سمجھنے کیلئے 18ویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کے حقوق سے متعلق چھڑنے والی بحث کو سمجھنا لازم ہے۔

امریکی مسلمانوں کے حقوق نے نظری سطح پر تو بہت پہلے قبولیت پالی مگر عملی دنیا میں انہیں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی مسلمانوں کو حقوق کے حوالے سے یومیہ بنیاد پر آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے امریکا میں اسلام کے معروف مورخ جان ایسپوزیٹو کو بھی مجبور ہو کر کہنا پڑا ہے کہ "امریکی مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مغربی "وسیع النظری اور رواداری یعنی کلیت پسندی کی حدود کیا ہیں؟" "ہمیں تھامس جیفرسن کا قرآن" کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کو امریکی آدرشوں کا حصہ کب، کہاں اور کس طرح بنایا گیا۔ مؤرخین نے اب تک یہ ثابت کرنے پر توانائی صرف کی ہے کہ مسلمان مکمل طور پر امریکی آدرشوں کے خلاف ہیں۔ اور یہی لوگ اس نکتے پر بھی زور دیتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ امریکیوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو فطری طور پر غیر امریکی قرار دیکر مسترد کیا ہے۔ بعض مؤرخین نے تو یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکا دراصل 18ویں صدی میں اسلام کی شدید مخالفت اور اس کے جابرانہ طرزِ حکومت کے مآخذ کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ امریکا کی ابتدائی پالیسیوں اور حکمتِ عملی سے متعلق دستاویزات میں اس حوالے سے بہت کچھ مل بھی جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نمایاں حد تک مثبت تصورات بھی ملتے ہیں، جیسا کہ "مستقبل کے امریکی مسلم شہریوں کے حقوق" سے متعلق بحث ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تمام پروٹسٹنٹس نے اسلام کو یکسر اجنبی مذہب کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا۔

یہ کتاب اس نکتے پر روشنی ڈالتی ہے کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ غیر امریکی نہیں تھے بلکہ ملک کے قیام کے وقت ہی سے ان کی ممکنہ شہریت اور متوقع حقوق پر بحث بھی ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سے آئیڈیلز کو اس وقت کے امریکیوں کی اکثریت نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اسلام اور اسلامی دنیا کے حوالے سے جیفرسن کے نظریات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب جان ایڈمز اور جیمز میڈیسن کے خیالات کو بھی عمدگی سے بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی بحث ملک کے بانیان تک محدود نہ تھی۔ ورجینیا میں بیپٹسٹ اور پریسبائٹیریز کی جدوجہد اور مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ان کی معرکہ آرائی کا احوال بھی اس کتاب میں ہے اور کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھنے والے مشہور وکیل جیمز آئرڈیل اور سیموئل جانسٹن کا مسلمانوں کے حقوق کیلئے آواز اٹھانا بھی اسی کتاب سے ثابت ہے۔ ایونجیلیکل بیپٹسٹ جان لیلینڈ نے، جو جیفرسن اور میڈیسن کے ساتھیوں میں سے تھے، مسلمانوں کے حقوق کیلئے کنیکٹیکٹ اور میساچوسیٹس میں آواز اٹھائی۔ ساتھ ہی انہوں نے آئین میں پائی جانے والی خامیوں، پہلی آئینی ترمیم کے نقائص اور ریاستی سطح پر مذہب کے کردار کے خلاف بھی احتجاج کیا۔

اس کتاب میں مغربی افریقا سے تعلق رکھنے والے دو مسلم غلاموں ابراہیم عبدالرحمن اور عمر ابن سعید کا تذکرہ ملتا ہے۔ عمر ابن سعید عربی جانتا تھا اور اس نے عربی میں آپ بیتی بھی لکھی تھی۔ ان دو مسلمانوں کے تذکرے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت امریکا میں ہزاروں مسلمان تھے مگر انہیں

مذہب پر کاربند رہنے سمیت بہت سے حقوق حاصل نہ تھے۔ انہیں شہریت کے حق سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں نے 20ویں صدی میں بھی اپنے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھی۔ انہیں جو حقوق ملے وہ آئین سے مکمل ہم آہنگ نہ تھے۔ یہ حقیقت البتہ انتہائی تلخ ہے کہ آج بھی امریکا میں مسلمان واحد برادری ہے جسے مکمل طور پر قبول نہیں کیا گیا اور آج بھی اس کے اثرات کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قصر سفید کے فرعون ٹرمپ کے یروشلم کو اسرائیل کا دار لحکومت تسلیم کرنے کے فیصلے کی تو کسی شک وشبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی کہ صرف امریکا میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے خلاف یہ کھلا اعلان جنگ ہے۔ دونوں امیدواروں نے اپنی انتخابی مہم میں کھل کر اسرائیل کی حمائت کا اعلان کیا تھا اور ایک مرتبہ پھر نومنتخب ٹرمپ نے تو اسرائیل کو ایران کے ایٹمی پروگرام کو مکمل تباہ کرنے کا بیان بھی دیا اور ایران کی طرف سے میزائل حملوں پر اس کا شدید جواب دینے کی حمائت بھی کی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ جاری اسرائیلی درندگی کی امریکی انتخابات میں دونوں جماعتوں کے امیدواروں کی کھلم کھلا حمائت خطے میں گریٹر اسرائیل کی تشکیل کیلئے جاری اسرائیلی جارحیت پر عالم اسلام خاموش رہ کر اپنی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے یا پھر اپنی تقدیر کو پھر سے سنوارنے کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے؟

بروز منگل ۷ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ ۷ جنوری ۲۰۲۵

زہر کا پیالہ

پانچ سال قبل تین جنوری کو ٹرمپ ہی کی صدارت کے دوران قاسم سلیمانی کو امریکی فوج نے بغداد میں ہلاک کر دیا تھا۔ قاسم سلیمانی ایران کی قدس فورس کے کمانڈر تھے جو پاسداران انقلاب کی وہ شاخ ہے جو غیر ملکی سرزمین پر کاروائیاں کرتی ہے۔ قاسم سلیمانی خطے میں ایرانی اثرورسوخ اور عسکری حکمت عملی کی بنیاد رکھنے والوں میں شامل تھے۔ 3 جنوری 2020 کو امریکی ڈرون سے ان کو نشانہ بنائے جانے سے تین ماہ قبل قاسم سلیمانی نے پاسداران انقلاب کے کمانڈرز سے ایک خفیہ خطاب میں مزاحمت کے اتحاد میں کامیاب اور ناقابل شکست وسعت کی بات بھی کی تھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاسم سلیمانی اپنی موت کی توقع رکھتے تھے اور قدس فورس کی سربراہی کی دو دہائیوں پر ایک رپورٹ پیش کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس خطاب میں کامیابیوں کو ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "پاسداران انقلاب نے معیار اور مقدار کے حساب سے مزاحمت تیار کی ہے، جنوبی لبنان میں دو ہزار سکوائر کلومیٹر کے علاقے سے پانچ لاکھ سکوائر کلومیٹر تک وسعت دی ہے۔ مزاحمت کے بیچ زمینی کامیاب رابطہ قائم ہو گیا ہے، یعنی ایران کو عراق، عراق کو شام، اور شام کو لبنان سے جوڑ دیا گیا۔ آج آپ تہران سے اپنی گاڑی میں روانہ ہو کر بیروت کے جنوبی مضافات تک پہنچ سکتے ہیں"۔ مزاحمت کے اس اتحاد کو قاسم سلیمانی کی اہم کامیابی کے طور پر دیکھا گیا لیکن گزشتہ ایک سال میں اس اتحاد کو شدید دھچکہ پہنچا ہے اور یہ تکبر حالات کے ہاتھوں چکنا چور ہو گیا۔

خطے میں ایرانی اثرورسوخ میں وسعت 1980 کے اوائل میں شروع ہوئی جب تہران نے لبنان میں امریکا اور اسرائیل کے خلاف حزب اللہ کے قیام میں مدد فراہم کی۔ بعد ازاں خطے میں عدم استحکام کی وجہ سے امریکا نے 2003 میں عراق پر حملہ کیا اور 2011 میں عرب دنیا میں عدم استحکام کے بعد دولت اسلامیہ جیسا انتہا پسند گروہ سامنے آیا تو ایران کو اپنا اثرورسوخ بڑھانے کا موقع مل گیا۔ شام میں پاسداران انقلاب کو بھیجنا اور عراق سمیت لبنان میں عسکری گروہوں کی وجہ سے ایران کی سرحد سے لبنان تک ایک زمینی اور علاقائی رابطہ قائم ہو گیا جو اسرائیل کی سرحد تک پہنچتا تھا۔

2003 میں عراق پر امریکی حملے سے قبل ایسا علاقائی اتحاد ممکن نہیں تھا۔ عراق جنگ نے ایران کو اس قابل بنایا کہ وہ نکتوں کو جوڑ سکے، عراق، شام اور وہاں سے لبنان تک راستہ بنا سکے۔ یہ بہت اہم تھا کیوں کہ لبنان میں حزب اللہ خطے میں ایران کا سب سے اہم اتحادی تھا۔ دوسری جانب یمن میں خانہ جنگی کی وجہ سے متعدد شہر ان باغیوں کے قبضے میں چلے گئے جو ایران کے قریب تھے۔ حالیہ برسوں کے دوران مزاحمت کا اتحاد شیعہ اور چند سنی گروہوں کے درمیان اتحاد کی علامت بھی بن گیا، جیسا کہ حماس اور اسلامی جہاد، جس کا مقصد مشرق وسطی میں مغربی اور اسرائیلی اثرورسوخ کو روکنا تھا۔ یہ اتحاد جس میں حزب اللہ، عراق کے عسکری گروہ، یمن کے حوثی باغی، شام میں بشارالاسد کی حکومت شامل تھے، ایران کے ہاتھ میں ایک طاقتور ہتھیار بن گیا۔ اس اتحاد کی غیر موجودگی میں ممکن ہے کہ بشارالاسد کی حکومت بہت پہلے ہی گر جاتی، یوں اس اتحاد نے اسرائیل کے گرد "آتشیں گھیراؤ" قائم کر لیا۔ امریکا کی عراق اور افغانستان میں جنگوں نے تہران کی پوزیشن اور مزاحمت کے اتحاد کو مزید مضبوط کر دیا۔

ٹرمپ کی پہلی صدارت کے دوران امریکی قومی سلامتی کے مشیر جان بولٹن کے مطابق "ایران نے کامیابی سے اتحاد کو وسعت دیتے ہوئے اپنی عسکری طاقت بھی بڑھائی"۔ ان کے مطابق "ایران نے مزاحمت کے اتحاد کو قائم کرتے ہوئے، جسے قاسم سلیمانی اسرائیل کے گرد "رنگ آف فائر" کی حکمت

عملی کا نام دیتے تھے، بہت سنجیدہ کام تھا۔ انہوں نے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی جس کا آغاز لبنان میں حزب اللہ سے ہوا۔ ایران کا جوہری اور بیلسٹک میزائل پروگرام بھی دیکھیں تو انہوں نے کافی اہم کامیابیاں حاصل کیں"۔

پانچ سال قبل ٹرمپ نے قاسم سلیمانی کے قتل کا حکم دیکر ایرانی مزاحمت کے اتحاد کے زوال کی بنیاد ڈال دی۔ اب جب ٹرمپ ایک بار پھر وائٹ ہاؤس میں لوٹ رہے ہیں تو ایران دو دہائیوں میں خطے میں سب سے کمزور حالت میں ہے۔ ٹرمپ نے اپنے گزشتہ صدارتی دور میں ایران پر کافی دباؤ ڈالا جس میں سخت پابندیوں کی بحالی سمیت جوہری معاہدے سے دستبرداری بھی شامل تھی۔ گزشتہ سات سال میں ان پابندیوں نے ایران پر معاشی دباؤ میں اضافہ کیا ہے۔ قاسم سلیمانی کی موت اور اس دباؤ کی وجہ سے ہی ایران کا کردار کمزور ہوا۔

تاہم 7/اکتوبر 2023 کو حماس کے اسرائیل پر حملے کے بعد مزید مسائل پیدا ہو گئے۔ حماس کے رہنماؤں کی ہلاکت اور غزہ میں حماس کی عسکری طاقت میں کمی کے ساتھ ساتھ بیروت میں حزب اللہ سربراہ حسن نصراللہ سمیت متعدد کمانڈرز کی ہلاکت نے اسرائیل کے خلاف ایرانی صلاحیتوں کو گہری چوٹ پہنچائی ہے۔ خطے میں ایران کے سب سے مضبوط اور طاقتور بازو حزب اللہ کی عسکری مشینری کو چوٹ پہنچنے سے خطے میں اسرائیل کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔ بہت سال تک حزب اللہ نے خود کو مزاحمت کے اتحاد کے سب سے طاقتور رکن کے طور پر منوار کھا تھا۔ اب ہم ایک ایسی صورت حال دیکھ رہے ہیں جس میں اس اتحاد کے باقی رہنے کی بحث ہو رہی ہے جو حیران کن ہے۔

مزاحمت کے اتحاد نے طاقت کا پلڑا ایران کے حق میں کر دیا تھا لیکن اب صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ دوسری جانب شام میں بشار الاسد کی حکومت کے خاتمے، جسے "مزاحمت کے خیمے کا اہم ستون" قرار دیا جاتا تھا، نے اس ایرانی اتحاد کو ناقابل یقین چوٹ پہنچائی ہے۔ بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ، جس کی کسی کو توقع نہیں تھی، ایران کیلئے بہت بڑی چوٹ ہے، اس میں کوئی شک نہیں، حزب اللہ کو بھی اس سے نقصان ہوا کیونکہ اب میزائل، اسلحہ اور دیگر سامان، جو ایران سے پہنچتا تھا، نہیں پہنچ سکے گا تو حزب اللہ، جو اسرائیل کی جانب سے شدید دباؤ کا سامنا کر رہی ہے، اب رسد کے مسائل کا بھی شکار ہے۔

ایرانی اتحاد کے بہت سے رہنما نہیں رہے اور زمینی رابطے بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ ایسے میں ایران کو مشکل صورت حال کا سامنا ہے۔ عراق میں چند عسکری گروہوں کے علاوہ اس وقت یمنی حوثی باغی ہی خطے میں باقی بچے ہیں لیکن وہ بھی امریکا اور اسرائیل کے حملوں کی زد میں ہیں۔ ایران کی جانب سے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اور لاکھوں افراد کا خون بہنے کے باوجود خطے میں ایک زمانے میں طاقتور سمجھا جانے والا اتحاد اب غیر معمولی مشکلات کی زد میں ہے۔ ادھر دوسری طرف ٹرمپ کی واپسی سے ایسا لگتا ہے کہ اگر ایران اور امریکا کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا تو شاید وائٹ ہاؤس اپنی توجہ چین اور عراق کی جانب کر دے گا تاکہ ایران کو تیل سے حاصل ہونے والا منافع بھی نہ مل سکے۔

مشرق وسطی کی صورت حال پر ایران کے رہبر اعلی آیت علی خامنہ ای نے دسمبر میں کہا تھا کہ "مزاحمت پر جتنا دباؤ ڈلے گا، یہ اتنا پر عزم ہو گا۔ مزاحمت کا اتحاد پہلے سے زیادہ پھیلے گا"۔ ان کا بیان اس بات کا عندیہ ہے کہ ایران اس اتحاد کو از سر نو بحال کرنے اور اپنے کھوئے ہوئے رابطے دوبارہ قائم کرنے میں سنجیدہ ہے۔ اسرائیلی فوج کے سابق انٹیلیجنس افسر ابراہیم لیون کے مطابق "مزاحمت کے اتحاد میں بدلے کا عزم عروج پر ہے۔ شام کھو دینے کے باوجود ایران رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، شاید موجودہ رہنما سے رابطہ قائم کر کے، شام کی زمین کو استعمال کرنے کی اجازت

حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مشرق وسطیٰ میں حالیہ صورت حال سیاسی جدت کیلئے اہم ہے۔ شاید اسرائیل اور فلسطین کا تنازع حل کرنے کا ایک موقع ہے۔ سیاست دانوں کو چاہیے اس وقت کو استعمال کریں، جنگ کے نتائج کا جائزہ لیں اور خطے میں بہتر مستقبل کیلئے متبادل راستوں پر غور کریں۔

یاد رہے کہ ایران اور اسرائیل دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے عسکری اہداف پر کامیاب حملوں کا دعویٰ تو کیا مگر یہ ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ فریقین کے نقصان کی حد کیا ہے اور کہاں کہاں ان کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ دونوں فریق حملوں کی تصدیق کرتے ہوئے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کا بھی دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن عالمی میڈیا کو ان علاقوں سے کوسوں دور رکھا جا رہا ہے اور کسی کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں مل رہی کہ سچائی سامنے آسکے تاہم ایران کی فضائی دفاعی افواج نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اسرائیل نے تہران، خوزستان اور ایلام صوبوں میں اس کے فوجی اڈوں پر حملے کیے ہیں جس کا کامیابی سے مقابلہ کیا گیا لیکن کچھ مقامات پر محدود نقصان ہوا ہے لیکن اسرائیل نے ابھی تک اپنے نقصان کی بھنک تک نہیں پڑنے دی۔ اس صورت حال میں دونوں ملک اپنی اپنی جگہ پر بظاہر یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ مضبوط ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر ان میں سے عسکری اعتبار سے زیادہ طاقتور کون ہے؟

ایران اور اسرائیل کے درمیان تقریباً 2152 کلو میٹر کا زمینی فاصلہ ہے اور ایران نے وہاں تک اپنے میزائل پہنچا کر یہ تو ثابت کر دیا ہے کہ جس میزائل پروگرام پر وہ کافی عرصے سے کام کر رہا ہے اس میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ ایران کے میزائل پروگرام کو مشرقِ وسطیٰ میں سب سے بڑا اور متنوع سمجھا جاتا ہے۔ 2022 میں امریکی سینٹرل کمانڈ کے جنرل کینتھ میکنزی نے کہا تھا کہ ایران کے پاس 3000 سے زیادہ بیلسٹک میزائل ہیں۔ دوسری جانب اس بات کی کوئی حتمی تصدیق نہیں کہ اسرائیل کے پاس کتنے میزائل ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اگر کسی ملک کے پاس جدید ترین میزائلوں کا ذخیرہ ہے تو وہ اسرائیل ہے۔

میزائلوں کا یہ ذخیرہ اس نے گذشتہ چھ دہائیوں میں امریکا سمیت دیگر دوست ممالک کے ساتھ اپنے اشتراک یا اپنے طور پر ملک ہی میں تیار کیے ہیں۔ سی ایس آئی ایس میزائل ڈیفنس پراجیکٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیل کئی ملکوں کو میزائل برآمد بھی کرتا ہے۔ اسرائیل کے مشہور میزائلوں میں ڈیلائلا، جبریئل، ہارپون، جریکو 1، جریکو 2، جریکو 3، لورا اور پوپیئی شامل ہیں لیکن اسرائیل کے دفاع کی ریڑھ کی ہڈی اس کا آئرن ڈوم سسٹم ہے جو کہ کسی بھی قسم کے میزائل یا ڈرون حملے کو بروقت روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ غزہ سے حماس اور لبنان سے حزب اللہ کے راکٹوں کو متواتر فضا میں ہی تباہ کر کے وہ آج تک اپنا لوہا منواتا رہا ہے۔ اسرائیلی میزائل ڈیفنس انجینیئر اوزی روبن کے مطابق آئرن ڈوم کی طرح کا دنیا میں کوئی اور دفاعی نظام نہیں اور یہ بہت کارآمد شارٹ رینج میزائل ڈیفنس سسٹم ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایران، اسرائیل سے بہت زیادہ بڑا ملک ہے اور اس کی آبادی اسرائیل سے دس گنا زیادہ ہے لیکن اس فرق سے یہ اندازہ لگانا قطعی درست نہیں ہو گا کہ ایران فوجی حساب سے اسرائیل سے زیادہ طاقتور ملک ہے۔ اسرائیل ایران سے کہیں زیادہ رقم اپنے دفاعی بجٹ کی مد میں خرچ کرتا ہے اور اس کی سب سے بڑی طاقت بھی یہی ہے، اگر ایران کا دفاعی بجٹ 10 ارب ڈالر کے قریب ہے تو اس کے مقابلے میں اسرائیل کا بجٹ 24 ارب ڈالر سے ذرا زیادہ ہے۔ جہاں ایران کی آبادی اسرائیل سے کہیں زیادہ ہے اسی طرح اس کے حاضر سروس فوجی بھی اسرائیل کے مقابلے میں تقریباً چھ گنا زیادہ ہیں۔ ایران کے فعال فوجیوں کی تعداد چھ لاکھ دس ہزار جبکہ اسرائیل کے ایسے فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار ہے۔

اسرائیل کے پاس جس چیز کی برتری ہے وہ اس کی ایڈوانس ٹیکنالوجی اور بہترین جدید طیاروں سے لیس فضائیہ ہے۔ اس کے پاس 241 لڑاکا طیارے اور 48 تیزی سے حملہ کرنے والے ہیلی کاپٹر ہیں جبکہ ایران کے پاس جنگی طیاروں کی تعداد 186 ہے اور اس کے بیڑے میں صرف 13 جنگی ہیلی کاپٹر ہیں۔ دونوں ممالک نے ابھی تک اپنی بحری افواج کی زیادہ صلاحیتوں کا مظاہرہ تو نہیں کیا لیکن اگرچہ وہ جدید بنیادوں پر نہ بھی ہو، پھر بھی ایران کی بحری فوج کے پاس 101 جہاز جبکہ اسرائیل کے پاس 67 ہیں۔ ایران نے عراق کے ساتھ جنگ کے بعد سے اپنے میزائل سسٹم اور ڈرونز پر زیادہ کام کیا اور شارٹ اور لانگ رینج میزائل اور ڈرونز بنائے جو مبینہ طور پر اس نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے حریفوں کو بھی مہیا کیے ہیں۔ حوثی باغیوں کی طرف سے سعودی عرب پر داغے میزائلوں کے تجزیے سے بھی یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ایرانی ساخت کے تھے۔ ایران کے میزائلوں میں شہاب ون میزائل ہے جس کی رینج تین سو کلومیٹر ہے جبکہ اسی کا دوسرا ورژن شہاب ٹو 500 کلومیٹر تک مار کر سکتا ہے۔ شہاب سیریز کا تیسرا میزائل شہاب 3 دو ہزار کلومیٹر تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی میزائلوں میں 700 کلومیٹر تک مار کرنے والا ذوالفقار، 750 کلومیٹر تک مار کرنے والا قائم 1 بھی شامل ہیں۔ ایران کے میزائلوں میں ایک اہم اضافہ فتح-110 ہائپر سونک میزائل ہیں جو 300 سے 500 کلومیٹر تک ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

امریکی ادارے پیس انسٹیٹیوٹ کے مطابق مشرق وسطیٰ میں ایران کے پاس سب سے بڑا اور متنوع بیلسٹک میزائلوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایران خطے کا واحد ملک ہے جس کے پاس جوہری ہتھیار تو نہیں لیکن اس کے بیلسٹک میزائل دو ہزار کلومیٹر کے فاصلے تک پہنچ سکتے ہیں۔ بیلسٹک ٹیکنالوجی تو دوسری عالمی جنگ کے وقت بن چکی تھی، تاہم دنیا میں صرف چند ہی ممالک کے پاس یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود اس ٹیکنالوجی کی مدد سے بیلسٹک میزائل بنا سکیں۔

ایران نے گذشتہ دو دہائیوں کے دوران شدید نوعیت کی بین الاقوامی پابندیوں کے باوجود یہ ٹیکنالوجی حاصل بھی کی اور بیلسٹک میزائل بھی تیار کیے۔ ایرانی رہبر اعلیٰ نے حال ہی میں ایک خطاب میں کہا تھا کہ جس عسکری اور میزائل پروگرام سے مغرب پریشان ہے، وہ سب پابندیوں کے دوران بنا۔ 2006 میں اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت کسی بھی قسم کی جوہری ٹیکنالوجی یا مواد کی ایران کو فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس میں ایسا سامان بھی شامل تھا جسے کسی اور مقصد کے ساتھ ساتھ عسکری مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تین ہی ماہ بعد اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے ایک اور قرارداد میں ایران سے روایتی ہتھیاروں یا اسلحہ کی لین دین پر بھی مکمل پابندی لگا دی جس میں عسکری ٹیکنالوجی بھی شامل تھی۔ اس قرارداد کے تحت لگنے والی پابندیوں کی زد میں ایران کے جوہری پروگرام کے ساتھ ساتھ بیلسٹک میزائل پروگرام بھی آیا۔ ایسے میں ایران کیلئے روس اور چین جیسے ممالک سے بھی اسلحہ خریدنا آسان نہ رہا جن سے وہ عراق جنگ کے وقت سے سامان خرید رہا تھا۔ بیلسٹک میزائل جوہری وارہیڈ (یعنی جوہری ہتھیار) لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مغربی ممالک کے مطابق چونکہ ایران نے بیلسٹک ٹیکنالوجی حاصل کر لی ہے اس لیے وہ جوہری توانائی کے حصول اور جوہری ہتھیار بنانے کیلئے ضروری سطح تک یورینیم کو افزودہ کرنے کی کوئی کوشش ترک نہیں کرے گا۔

جولائی 2015 میں ایران اور چھ عالمی طاقتوں کے درمیان مشترکہ جامع پلان آف ایکشن معاہدے کے اختتام اور پھر "قرارداد 2231" کی منظوری کے بعد، ایران کے خلاف اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تمام پابندیاں ہٹادی گئیں۔ تاہم "ٹرگر / سنیپ بیک میکانزم" کے نام سے جانی جانے والی شق نے ہتھیاروں کی پابندیوں کو برقرار رکھا جس کے تحت خاص طور پر پانچ سال تک ایران کے میزائل پروگرام کی نگرانی ہونی تھی۔ یہ ایران پر دباؤ ڈالنے اور اس کے میزائل پروگرام کو کنٹرول کرنے کا ایک حربہ تھا۔ تاہم ایران نے اپنا میزائل پروگرام اس حد تک بڑھایا کہ مارچ 2016 میں امریکا، برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو ایک مشترکہ خط لکھتے ہوئے ایران پر میزائل تجربات کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ اس نے "جے سی پی او اے" معاہدے کے بعد سلامتی کونسل کی "قرارداد 2231" کی خلاف ورزی کی ہے۔

بالآخر 2020 میں ٹرمپ نے اس معاہدے سے دستبرداری کا فیصلہ کیا۔ امریکا کے اس معاہدے سے دستبرداری کی ایک وجہ ایران کے میزائل پروگرام کے خطرے سے نمٹنے اور اس پروگرام کا معائنہ اور تصدیق کرنے کیلئے درکار طریقۂ کار کی کمی تھی۔ اگرچہ ایران نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ مشترکہ جامع پلان آف ایکشن کا حصہ ہے لیکن قرارداد 2231 میں طے شدہ ڈیڈ لائن کے خاتمے کے ساتھ ہی، ایرانی حکومت نے اکتوبر 2021 میں روس اور چین سے ہتھیاروں کی خریداری کیلئے اشتہارات دیے لیکن پابندیاں ابھی تک برقرار ہیں اور انہوں نے ایران کو اب تک اس خواہش کے حصول سے باز رکھا ہے۔

ایران اس وقت 50 سے زیادہ قسم کے راکٹ، بیلسٹک اور کروز میزائلوں کے ساتھ ساتھ عسکری ڈرونز تیار کرتا ہے، جن میں سے کچھ روس اور یوکرین کی جنگ جیسے عالمی تنازعات میں استعمال بھی ہوئے ہیں۔ ایران، عراق جنگ کے دوران ایران کے توپ خانے کی مار کرنے کی حد 35 کلومیٹر تھی جبکہ عراقی فوج کے پاس 300 کلومیٹر تک مار کرنے والے "سکڈ بی" بیلسٹک میزائل تھے، جو ایران کے اندر مختلف شہروں کو نشانہ بناتے تھے۔ جب عراقی فوج نے میزائل حملوں کی بنیاد پر برتری حاصل کی تو ایران نے بھی میزائل استعمال کرنے کا سوچا اور اس وقت رہبر روح اللہ خمینی نے عراق کے میزائل حملوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی۔ اسی سلسلے میں نومبر 1984 میں حسن تہرانی مقدم کی سربراہی میں "پاسدارانِ انقلاب میزائل کمانڈ" کا آغاز کیا گیا۔ ایران نے 1985 میں پہلی بار لیبیا سے روسی ساختہ "سکڈ بی" میزائل خریدے اور 30 میزائلوں کی کھیپ کے ساتھ ہی لیبیا سے تکنیکی مدد کیلئے مشیر بھی ایران آئے اور ایران کا میزائل آپریشن اُن کی مدد سے ہی سرانجام پایا۔

اُس وقت پاسدارانِ انقلاب کی ایروسپیس فورس کے کمانڈر، امیر علی حاجی زادہ، میزائل یونٹ کی تشکیل کے ذمہ دار بنے اور میزائل سرگرمیوں کیلئے ایران کے مغرب میں واقع شہر کرمان میں پہلا اڈہ تیار کیا گیا۔ عراق پر ایران کی جانب سے پہلا میزائل حملہ 21 مارچ 1985 کو ہوا جس میں کرکوک شہر کو نشانہ بنایا گیا۔ دو دن بعد، دوسرا ایرانی حملہ بغداد میں عراقی آرمی آفیسرز کلب پر کیا گیا جس میں تقریباً 200 عراقی کمانڈر مارے گئے۔

اگرچہ ایران نے سینکڑوں میزائل اسرائیل پر داغے ہیں لیکن دوسرے ملک میں جاکر گوریلا آپریشن کرنے کا زیادہ تجربہ اسرائیل کا ہے اور وہ ہمیشہ ہی اس میں کامیاب ہوا ہے لیکن جب بات ہوتی ہے دونوں ممالک کے درمیان ممکنہ جنگ کی تو ایران کے رقبے اور فوج میں زیادہ تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ صاف نظر آتا ہے کہ اسرائیل ایسا نہیں کرے گا۔ اس کی برتری فضائی طاقت، میزائل اور ڈرونز ہیں اور اگر اس نے ردِ عمل ظاہر کیا تو ممکنہ طور پر ان ہی کے ذریعے ہی کرے گا۔ ویسے ماضی میں ایران کے ہائی پروفائل فوجی اور سویلین شخصیات بھی اسی طرح کے حملوں میں ہلاک کی گئی ہیں اگرچہ اسرائیل نے اکثر اوقات اس کا باقاعدہ اعتراف نہیں کیا لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا ہے۔ اس جنگ کا ایک اور پہلو سائبر اٹیک بھی ہوسکتا ہے اور اس جگہ

اسرائیل کافی ولنرایبل (کمزور) لگتا ہے۔ وجہ صاف ہے کہ ایران کا دفاعی نظام اسرائیل کے دفاعی نظام جتنا ایڈوانس نہیں ہے، اس لیے اسرائیل کے نظام پر سائبر حملہ زیادہ آسان ہے۔

اب تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ بشارالاسد کی حکومت کے خاتمے کے بعد آیت اللہ علی خامنہ ای چار مرتبہ اپنے ملک، شام اور مشرق وسطیٰ کے مستقبل کے حوالے سے تقاریر کر چکے ہیں۔ ان کی تقاریر کا مواد اتنا ہی اہم ہے جتنے وہاں بیٹھے سامعین۔ ایرانی رہبر اعلیٰ کو سننے والوں میں ایرانی سپاہی، ایرانی حمایت یافتہ ملیشیا یا حکومت کے حامی تھے۔ یہ تمام افراد کسی نہ کسی طرح شام میں ایک دہائی قبل خانہ جنگی کے واقعات سے جڑے تھے۔ عراق کے خلاف 1980 سے 1988 تک جاری رہنے والی 8 سالہ جنگ میں ان ایرانی فوجیوں کو اپنی شناخت ملی تھی۔ حالیہ تقریر خطے میں ہلاک ہونے والے ایرانی فوجیوں کے اہل خانہ کو بھی سنائی گئی جنہیں ایرانی حکومت "شہید" کہتی ہے۔

اس صورتحال کے دوران آیت اللہ خامنہ ای پر دباؤ ہے کہ وہ حسن نصر اللہ اور قاسم سلیمانی جیسی اہم شخصیات کی عدم موجودگی میں اپنے حامیوں کو جواب دیں کہ: اسد حکومت کے دفاع کیلئے ایران شام کیوں گیا؟ اس بار شام کا دفاع کیوں نہیں کیا گیا؟ اور ایران کے "مزاحمت کے محور" کا مستقبل کیا ہو گا؟ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ایران عسکری اور سفارتکاری دونوں میدانوں میں ناکام ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی امور کے بیشتر ایرانی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ایران کو علاقائی تنازعات پر ناکامی کو تسلیم کرنا چاہیے اور اب وقت آ گیا ہے کہ ایک نئی حکمت عملی اپنائی جائے۔ ایرانی حکومت کو "فتح کے ادب" کی عادت ہو چکی ہے مگر اب اسے "شکست کے ادب" کو سیکھنا پڑے گا۔ عراق کے خلاف جنگ کے اختتام پر اس وقت کے ایرانی رہبر اعلیٰ آیت اللہ خمینی نے واضح طور پر جنگ بندی کی قرارداد کی منظوری کو "زہر کا پیالہ پینے" سے تشبیہ دی تھی۔ تاہم موجودہ ایرانی رہبر اعلیٰ آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی پے در پے تقریروں میں تاحال صاف گوئی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ایرانی حکمت عملی کے کمزور ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کا حوالہ دیتے ہوئے "جنگ احد" کا ذکر کیا جو کہ اسلامی تاریخ کی سب سے اہم جنگوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی۔ خامنہ ای نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ "اسلام کی آمد کے ابتدائی عرصے میں احد کے میدان میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا اور امیر المومنین حمزہ شہید ہوئے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب سر سے پیر تک زخمی ہوئے۔ اس جنگ میں پیغمبر اسلام زخمی ہوئے اور کئی لوگ شہید ہوئے۔ جب وہ مدینہ واپس آئے تو منافقین نے دیکھا کہ یہ فتنہ پھیلانے کا اچھا موقع ہے اور انہوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کیلئے پروپیگنڈا شروع کر دیا"۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ایرانی رہبر اعلی کو ناکامی کی وضاحت کرنے سے زیادہ "فتنے" اور اپنے حامیوں میں ابھرتے شکوک و شبہات کی فکر ہے۔ شام کی ناکامی کے بعد خطے میں ایران کی پوزیشن کمزور نظر آ رہی ہے۔ نئی نسل میں ایران کی اسلامی جمہوریہ کی حمایت کرنے والوں میں گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علاقائی جنگوں اور "مزاحمت کے محور" کے ذریعے اپنی پہچان پائی۔ ایرانی حکومت کے بہت سے حامیوں کو خدشہ ہے کہ جو شام کے سابق حکمرانوں کے ساتھ ہوا، وہ ایران میں دہرایا جا سکتا ہے۔

قاسم سلیمانی کی پانچویں برسی کے موقع پر آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی تقریر میں ان خدشات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "بعض ممالک کی بڑی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ استحکام اور حاکمیت کے اہم عوامل کو منظر سے ہٹا دیتے ہیں۔ (مگر) نوجوانوں کا گروہ اپنی جانیں قربان

کرنے کیلئے تیار رہتا ہے۔ یہ کسی قوم میں حاکمیت کے سب سے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔ انہیں منظر سے ہٹایا نہیں جانا چاہیے۔ ہمارے لیے بھی یہی سبق ہے۔ خدا کا شکر ہے یہاں یہ محفوظ ہیں۔ کچھ دوسرے ممالک کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے استحکام کے عوامل کیا ہیں۔ جب انہیں نکالا جاتا ہے تو خطے کے بعض ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (جب) وہ استحکام اور حاکمیت کے عوامل کو باہر نکال دیتے ہیں تو وہ شام بن جاتا ہے۔"

ایرانی رہبر اعلیٰ نے یہ کہہ کر دراصل اپنے حامیوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اس مشکل مرحلے میں انہیں ان کی ضرورت ہے۔ اسد حکومت کے خاتمے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کی اس تقریر کا مقصد رائے عامہ کے سوالات اور ابہام کا جواب دینا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حامیوں کے خدشات دور ہوں اور ان کے حوصلے بلند رہیں۔ اسی لیے انہوں نے ایک ماہ کے عرصے میں چوتھی مرتبہ خطے میں ایران کی حکمت عملی اور مزاحمت کے محور پر بات کی۔

سقوط دمشق کے صرف تین دن بعد ایرانی رہبر اعلیٰ نے اپنی پہلی تقریر میں بغیر کسی تمہید کے شام کے مسئلے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "وہ جاہل اور نادان تجزیہ کار جو ان واقعات کو ایران کو کمزور کرنے کے مترادف سمجھتا ہے انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایران مضبوط ہے یہ طاقتور سے مزید طاقتور ہو جائے گا۔ دراصل شام کی موجودہ صورت حال اور مصائب شامی فوج کی مزاحمت اور مزاحمت کے جذبے کی کمزوری اور کمی کا نتیجہ ہیں۔ شام کی کمزوری کے برعکس ایرانی مسلح افواج کے اعلیٰ حکام کے حوصلے بلند ہیں۔

ایران کے رہبر اعلیٰ نے ان تمام تقاریر میں بشار الاسد کا نام لینے سے بھی گریز کیا۔ حالیہ برسوں کے دوران ایران اور بشار الاسد کے بیچ تعلقات اتنے قریبی نہیں تھے جتنے شام میں خانہ جنگی کے دوران ہوا کرتے تھے۔ شام کی تعمیر نو کے برسوں میں اور خاص طور پر پچھلے چار سالوں میں بشار الاسد نے اقتصادی دباؤ اور سخت پابندیوں کے باعث ایران کے علاقائی حریفوں بشمول متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے پے در پے حملے اور شام میں سکیورٹی کے مسائل کی وجہ سے ایرانی افواج کی موجودگی کمزور پڑ گئی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ آیت اللہ خامنہ ای اچھی طرح جانتے ہیں کہ بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ ایران کیلئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ یہ ایک ایسا نیا دور ہے جس میں خطرات کے ساتھ ساتھ دوست، دشمن اور جنگ کی لکیروں کو نئے سرے سے متعین کیا جائے گا۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیا آیت اللہ خامنہ ای "زہر کا پیالہ "پیئیں گے اور مغرب کے ساتھ مذاکرات کریں گے یا" جنگ احد" کی طرح شکست تسلیم کرنے کا انتخاب کریں گے۔

بروز جمعتہ المبارک 10 رجب 6441ھ 10 جنوری 2025

شہادت کا رقصِ بسمل

لفظ بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں، معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی طرح، بہت محبت کرنے والے، لاڈو پیار کرنے والے، نازو ادا والے، تنگ کرنے ، روٹھ جانے اور پھر بہت مشکل سے ماننے والے یا ہمیشہ کیلئے منہ موڑ لینے والے۔ کبھی تو معصوم بچوں کی طرح آپ کی گود میں بیٹھ جائیں گے پھر آپ ان کے بالوں سے کھیلیں، ان کے گال تھپتھپائیں تو وہ کلکاریاں مارتے ہیں، انہیں چومیں چاٹیں، بہت خوش ہوتے ہیں وہ۔ آپ ان سے کسی کام کا کہیں تو وہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ محبت فاتح عالم جو ہے۔ کبھی تنگ کرنے پر آجائیں تو ان کا رنگ انوکھا ہو جاتا ہے۔ آپ ان کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھک جاتے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتے کہیں دم سادھے چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ انہیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آپ ہلکان ہوں تو ہو جائیں وہ آپ کو تنگ کرنے پر اترے ہوتے ہیں اور جب آپ کی ہمت جواب دے جاتی ہے تو وہ دیکھو میں آگیا کہہ کر آپ کے سامنے کھڑے مسکرانے لگتے ہیں۔

بچوں کی طرح لفظوں کے بھی بہت ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں اور اگر اللہ نہ کرے وہ روٹھ جائیں اور آپ انہیں منانے کی کوشش بھی نہ کریں تب تو قیامت آجاتی ہے۔ ایک دم سناٹا، تنہائی اداسی، بے کلی آپ میں رچ بس جاتی ہے، آپ خود سے بھی روٹھ جاتے ہیں۔ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کا تو میں نہیں جانتا، میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ میں کئی ہفتوں سے اسی حالت میں ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا، بے معنی لگتی ہے زندگی، دوبھر ہو گیا ہے جینا..... .... لیکن پھر وہی جبر کہ بڑا مشکل ہے جینا، جیئے جاتے ہیں پھر بھی۔ تھوڑی دیر کیلئے ای میل دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان گنت، ہزاروں دعا گو محبتوں کے پھول سجائے میرا اس طرح استقبال کرتے ہیں کہ اپنے کریم و رحیم رب کے کرم و رحم کی بارش میں مکمل طور پر بھیگ جاتا ہوں اور خود میں دوبارہ اتنی قوت محسوس کرتا ہوں کہ اپنے ارد گرد کی بھی خبر لے سکوں۔

مزاحمتی قوت گرتے ہوؤں کو پیروں پر کھڑا کرتی ہے، ڈوبتے ہوؤں کو تیرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور ساحل پر لا پٹختی ہے۔ بیمار کو بیماری سے جنگ میں فتح یاب کرتی ہے (اللہ کے حکم سے) بجھتے دیئے کی لو بجھنے سے پہلے تیز ہو جاتی ہے، کیوں؟ شاید دیا دیر تک جلنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی مزاحمت ہے۔ اندھیروں کے خلاف کبھی کوئی مسافر کسی جنگل میں درندوں کے درمیان گھر جائے تو تنہا ہی مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ایک ناتواں مریض جو بستر سے اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا ناگہانی آفت کی صورت میں چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے کود سکتا ہے۔

لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیاوی کامیابی کے حصول کیلئے مزاحمت کمزور پڑ کر سرد ہو جاتی ہے لیکن اگر مزاحمت کے ساتھ "ایمان باللہ" شامل ہو جائے تو مزاحمت کبھی سرد نہیں پڑتی، راکھ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سلگتی رہتی ہے جہاں مزاحمتی قوت بیدار ہو تو یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ یہ مزاحمتی قوت اس وقت بیدار ہو جب خطرہ حقیقت بن کر سامنے آجائے، جب سر پر لٹکتی تلوار کی نوک شہ رگ کو چھونے لگے، جب سرحدوں پر کھڑے مہیب اور دیو ہیکل ٹینکوں اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ سڑکوں اور چھتوں پر سنائی دینے لگے۔ جب ڈیزی کٹر، کروز اور ٹام ہاک بم بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بہت کچھ "گنوا کر" کچھ بچانے کیلئے ہم مزاحمت پر اتر آئیں گے؟

کیا پاکستانی ذمہ داروں نے دوچار خطرہ کو "لب بام" سمجھنے کی کوئی کوشش کی ہے جس سے دشمن بھی بخوبی سمجھ لے کہ ان کو چھیڑنا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم لڑے بغیر ہی شکست تسلیم کر لیتی ہے تو یہ جسمانی نہیں ذہنی پسپائی ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو جسمانی طور پر زیر کرنے کیلئے دشمن کو زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑتی۔ ہلاکو خان کی فوجیں کھوپڑیوں کے میناریوں ہی نہیں تعمیر کر لیا کرتی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی نے جب

"ملت اسلامیہ" کا نام لیا تو ایک غدار طنزیہ مسکرا اٹھا، کون سی ملت اسلامیہ؟ یہ ذہنی پسپائی کی سب سے گری ہوئی شکل تھی کہ ایک دیو ہیکل انسان اپنے ہی وجود سے انکاری تھا لیکن صلاح الدین ایوبی نے مزاحمت کی قوت کے ساتھ ایمان کو جمع کر کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بعد بیت المقدس ناپاک ہاتھوں سے چھین لیا۔

معاشی کمزوریوں اور سیاسی انارکی وابتری کے باوجود آج ہمیں ثابت قدمی سے میدان میں کھڑا دیکھ کر ہمارا دشمن (انڈیا، اسرائیل اور امریکا) ٹرائیکا آج ہمیں ثابت قدمی سے میدان میں کھڑا دیکھ کر ہمارا دشمن پہلے سے بڑھ کر مصیبت مول لے چکا ہے۔ ایک یقینی شکست کے امکان کے باوجود محض دنیا پر ظاہری غلبے کی خواہش نے اسے ایک ایسی دلدل میں اتار دیا ہے جہاں اگلا قدم اس کی ظاہری شان وشوکت اور مصنوعی ہیبت کا جنازہ نکال کر رکھ دے گا۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمیں گھروں میں بیٹھے ہیبت زدہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ سارے لاؤ لشکر کے باوجود زیادہ خوفزدہ ہے۔ اس کی چڑھائی میں شیر جیسی بے جگری نہیں بلکہ لومڑی جیسی عیاری ہے۔

اب وہ ہمیں دیوار سے لگانے کیلئے پس پردہ دوسرے اقدامات کرنے سے باز نہیں آئے گا یعنی ہمیں سیاسی اور معاشی فتنوں میں مبتلا کرے گا، پس آج ہمیں اپنی مزاحمتی قوت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد "ایمان" ہے اور اس قوت کو مضبوط کرنے والی قوت "اللہ کی نصرت" ہے اور اللہ کی نصرت کیلئے اس کی مکمل حاکمیت کا عملی اعلان کرنا ہو گا۔ جب مومن اپنا سب کچھ اپنے رب کی رضا کیلئے لگا دیتا ہے تو مزاحمت میں اللہ کی نصرت نازل ہو کر اس کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر ایسی روشن مثالیں ان گنت تعداد میں جگمگا رہی ہیں جب نہتے مسلمانوں کی مزاحمت نے وقت کے فرعونوں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آج بھی دنیا بھر میں مزاحمتی تحریکیں پوری شان سے جاری ہیں۔ پتھر نے ٹینک سے شکست نہیں کھائی، دنیا کشمیر اور غزہ میں دیکھ رہی ہے کہ معمولی پتھروں سے جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ جاری ہے۔ جتنا ظلم بڑھتا جا رہا ہے اتنی ہی شدت سے مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔

لیکن کیا مزاحمت کی صرف ایک ہی صورت ہے؟ جب کوئی جابر وقت اپنے لشکروں کے زعم میں کسی قوم پر چڑھ دوڑتا ہے تو ہر مظلوم ہاتھ ہتھیار اٹھا لیتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ایسے وقت میں اس کے بغیر مزاحمت کی کوئی اور صورت نہیں ہوتی لیکن اس سے بھی پہلا مرحلہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے اور ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ مزاحمت "ایمان" کے بغیر کچھ نہیں۔ لہٰذا ایسا کڑا وقت آنے سے پہلے "ایمان" کو بچانا اور قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایمان کی کمزوری ہی ذہنی غلامی اور پسپائی کی طرف لے جاتی ہے، لہٰذا اس وار کی مزاحمت ضروری ہے جس کا نشانہ آج ایمان بن رہا ہے۔ ہمارے نظریات وافکار، ہمارا طرز زندگی، ہماری تعلیم، ہماری معیشت، ہمارا میڈیا یہ سب وہ میدان ہائے کارزار ہیں جو ہماری مزاحمتی قوت کے شدت سے منتظر ہیں۔ یہ ڈوب رہے ہیں، ان کو ساحل پر کھینچ لانے کیلئے بھرپور توانائیوں کی ضرورت ہے۔

آج وہ خطرناک مرحلہ آ چکا ہے جب نحیف ونزار مریض زندگی کی ڈور سلامت رکھنے کیلئے اس پوشیدہ قوت پر انحصار کرتا ہے جو اس کے جسم میں بجلی کی سی طاقت بھر دیتی ہے۔ گونگے، بہرے اور اندھے بھی اس نازک دور کی شدت سے کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جائیں تو جن کو اللہ نے تمام تر توانائیوں سے نواز رکھا ہے ان کو اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے کس نے روک رکھا ہے؟ وطن عزیز کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو دل میں ایک کسک سی پیدا ہو جاتی ہے کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟ پھر سوچتا ہوں کوئی بھی ہو...... جب طاقت ہو اس کے پاس، ہتھیار بند جتھہ ہو، حکم بجا لانے والے خدام ہوں، راگ رنگ کی محفلیں ہوں، جام ہوں، عشوہ طرازی ہو، دل لبھانے کا سامان ہو، واہ جی واہ جی کرنے والے خوشامدی اور بغل بچے ہوں تو اس کے دیدے

شرم وحیا سے عاری ہو جاتے ہیں۔ شرم وحیا کا اس سے کیا لینا دینا! چڑھتا سورج اور اس کے پوجنے والے بے شرم پجاری جن میں عزتِ نفس نام کو بھی نہیں ہوتی۔ بس چلتے پھرتے روبوٹ.........تب طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کل جو جلسہ میں دھمکیاں دیکر اصلاح کا مشورہ دے رہا تھا، جو بینڈ باجے کے ساتھ گھر میں گھسنے کی بات کر رہا تھا، چند گھنٹوں میں یہ حیوانِ نطق اپنا سافٹ ویئر اپ ڈیٹ ہونے پر بالکل خاموش ہے۔ اب دھڑلے سے ایسے ہی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے آنے والے دنوں میں کھل کر چہرہ سامنے آجائے گا۔ کہ وہاں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

لیکن مجھے آج ان کے برعکس کرداروں کا ذکر کرنا ہے کہ جن کا ذکر آنکھوں کی ٹھنڈک، دلوں کا سکون اور اطمینان و فرحت بخش ہے۔ ہاں کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، انکار سننا تو اس کی لغت میں ہی نہیں ہوتا۔ انکار کیا ہوتا ہے وہ جانتا ہی نہیں ہے لیکن ہوتا یہی آیا ہے، ہوتا یہی رہے گا۔ منکر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں مانتے کا نعرۂ مستانہ گونجتا رہتا ہے، تازیانے برستے رہتے ہیں، کھال کھنچتی رہتی ہے، خون بہتا رہتا ہے لیکن عجیب سی بات ہے، جتنی زیادہ شدت سے نہیں مانتے کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر جتن ہر حربہ اپنایا جاتا ہے، وہ آواز اسی شدت سے گونجنے لگتی ہے چاروں طرف۔ نہیں مانتے کا رقص، رقص ہی نہیں رقصِ بسمل، نہیں مانتے نہیں مانتے کا نغمہ اور گھومتا ہوا رقاص۔

کیا بات ہے جی، کھولتے ہوئے تیل کے اندر ڈالا جاتا ہے، تپتے صحراؤں میں لٹا کر، سینے پر پہاڑ جیسی سلیں رکھی جاتی ہیں، برفانی تودوں میں کود جاتے ہیں لیکن نعرۂ مستانہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ رقص تھمتا ہی نہیں اور یہ توحید کا رقص، جنوں تھمے گا بھی نہیں۔ زمین کی گردش کو کون روک سکا ہے! بجا فرمایا آپ نے، بندوں کو تو غلام بنایا جاسکتا ہے، ان پر رزق روزی کے دروازے بند کیے جاسکتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم نادان صرف روپے پیسے کو ہی رزق سمجھ بیٹھے ہیں۔ بندوں کو پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے، قید خانوں میں ٹھونس سکتے ہیں آپ، عقوبت خانوں میں اذیت کا پہاڑ ان پر توڑ سکتے ہیں۔ پنجروں میں بند کر سکتے ہیں، معذور کر سکتے ہیں، بے دست و پا کر سکتے ہیں، ان کے سامنے ان کے پیاروں راج دلاروں کی توہین کر سکتے ہیں، انہیں گالیاں دے سکتے ہیں، جی، جی سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن سپاہی مقبول حسین 40 سال مکار دشمن بھارت کی جیل میں گزار کر اپنے وطن کی خاک کو چوم کر جس شان سے لوٹا، اور اپنے اس جانباز سپاہی مقبول حسین کو جس شان سے پاک سپاہ نے اسی وطن کی خاک کے سپرد کیا کہ فلک بھی یہ پاک نظارہ دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔ رذیل دشمن بندو بنیاء کے ظالموں نے پاکستان کے بارے میں سوالات کے جواب نہ دینے پر بے پناہ تشدد کرنا شروع کر کے اسے ادھ موا کر کے اسے اندھیری کوٹھڑی میں پھینک دیا، جب دوبارہ اس سے سوالات شروع کئے تو اس نے اپنے ہاتھوں سے کاٹی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اب تو منہ میں زبان ہی نہیں تو کیا جواب دوں! یہ نظارہ دیکھ کر دشمن بھی باؤلا ہو گیا اور بے اختیار دشمن کمانڈر پکار اٹھا کہ ان کو شکست دینا ناممکن ہے!

صدیوں سے انسان یہ دیکھتا آیا ہے، انکار کرنے والوں کو بھوکے کتوں اور شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ اس جگہ جہاں چاروں طرف خلق خدا کا ہجوم ہوتا اور ایک جابر تخت پر براجمان ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا اور قہقہے لگاتا اور خلق خدا کو یہ پیغام دیتا کہ انکار مت کرنا، کیا، تو پھر یہ دیکھو یہ ہوگا تمہارے ساتھ بھی۔ ہر فرعونِ وقت اپنی تفریح طبع کیلئے یہ اسٹیج سجاتا ہے، سجاتا رہے گا۔ ایسا اسٹیج جہاں سب کردار اصل ہوتے ہیں، فلم کی طرح اداکار نہیں۔ لال رنگ نہیں، اصل بہتا ہوا تازہ خون، زندہ سلامت انسان کا، رونا چیخنا بھنبھوڑنا کاٹنا سب کچھ اصل.......بالکل اصل۔ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، فرعونیت تو ایک رویے کا نام ہے، ایک بیماری کا نام ہے۔ ایک برادری ہے فرعونوں کی، فرعونوں کی ہی کیا.......ہامان کی، شداد کی، قارون کی، ابولہب

کی، ابو جہل کی، قصر سفید کے فراعین کی، یہود وہنود کے سفاک حکم رانوں کی۔ یہ برادری کا نام ہے جس میں کسی بھی وقت کسی بھی مذہب وملت کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ بس بچتا وہ ہے جس پر رب کی نظر کرم ہو۔

سب کچھ قید کیا جا سکتا ہے، سب کچھ لیکن ایک عجیب سی بات ہے، اسے قید نہیں کیا جا سکتا، بالکل بھی نہیں، مشکل کیا ممکن ہی نہیں ہے۔ عجلت نہ دکھائیں ،خوشبو کو قید نہیں کر سکتے آپ! اور پھر خوشبو بھی تو کوئی ایک رنگ ایک مقام نہیں رکھتی ناں، بدلتے رہتے ہیں اس کے رنگ، خوشبو کے رنگ ہزار...... بات کی خوشبو، جذبات کی خوشبو، ایثار و وفا کی خوشبو...... بس اب آپ چلتے رہیے اور ان تمام خوشبوؤں کی رانی ہے ہمارے شہداء کی خوشبو جنھوں نے اپنا آج ہمارے کل پر قربان کر دیا، یہ ہے ان کی عقائد کی خوشبو جنھوں نے اس معجزاتی ریاست جس کا نام پاکستان ہے، اس سے محبت کو دین کا لازمی جزو سمجھا کہ اس کا قیام 27 رمضان الکریم کی مبارک شب کو ہوا، دین کی خوشبو، نظریات کی خوشبو۔ یہ خوشبو قید نہیں کی جا سکتی۔ جب بھی دبائیں ابھرتی ہے ۔وہ کیا یاد آگیا: "جتنے بھی تو کر لے ستم، ہنس ہنس کے سہیں گے ہم"۔ جتنا خون بہتا ہے اتنی ہی خوشبو پھیلتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب درد خود ہی مداوا بن جاتا ہے درد کا۔ دیکھیے پھر مجھے یاد آگیا:

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے
درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے

یہ سب کچھ میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تھی، یقیناً آپ نے دیکھی، پڑھی یا سنی ہوگی۔ اگر نہیں، تو یاددہانی کی سعادت شائد میرے حصے میں آرہی ہے لیکن نہیں، یہ تو اس کا کمال ہے جس نے ہم جیسے بے خبروں کو بتایا ہے۔
(نیویارک۔ آن لائن) امریکی آرمی کے ایک اسپیشلسٹ میٹری ہولڈبروکس گوانتاناموبے کے عقوبت خانے میں کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ نوجوان فوجی افسر ہولڈبروکس نے جن کی ڈیوٹی صرف چھ ماہ تک کیوبا کے عقوبت خانے میں مسلمان قیدیوں کی نگرانی اور بعض اوقات انہیں ایک ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ہولڈبروکس نے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے وقت رہنمائی کرنا تھی، مسلمان قیدیوں کے اخلاق اور عبادات سے متاثر تلاوتِ قرآن پاک جو وہ عقوبت خانے کی سخت ترین جالیوں کے مختصر سی ای میل میں تسلیم کیا کہ مراکشی اور دیگر مسلمان قیدیوں کے حسنِ اخلاق اور عقب میں کرتے تھے، کی مانیٹرنگ کرتے ہوئے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور کیا بات باقی رہ گئی جناب۔

دیکھیے! چراغ کو تو پھونک مار کر بجھایا جا سکتا ہے، نور کو کون بجھا سکتا ہے! جی جناب نور کو تو پھونک مار کر نہیں بجھایا جا سکتا۔ اسلام نور ہے، قرآن حکیم نور ہے ،روشنی ہی روشنی، صراطِ مستقیم کھرا سودا...... اسی قرآن کو نافذ کرنے کیلئے تو پاکستان جیسی معجزاتی ریاست عطا ہوئی تھی جس نے یہ سکھایا کہ اس ملک کیلئے جان قربان کر دینا سب سے بڑا اعزاز ہے اور ماں باپ، بیوی بچے اور پوری قوم کے علاوہ ملائکہ بھی استقبال کیلئے جمع ہو جاتے ہیں کہ بندے نے اپنے رب سے وفاداری کا جو حلف اٹھایا تھا اس میں یہ کامیاب ہو گیا۔ ہم بھلا اپنے 135 نوجوان جو برف کے پہاڑوں میں دفن ہو گئے تھے، آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ دنیا کے ماہرین نے اپنی تمام تر بہترین جدید ٹیکنالوجی، کوششوں اور تجربات کی روشنی میں برف میں دفن افراد کی بازیابی کو ناممکن قرار دیتے ہوئے ہاتھ اٹھالئے لیکن صد آفرین ہے ان کے بہادر ساتھیوں پر کہ انہوں نے ان تمام پاک پوتر شہداء کو نہ صرف بازیاب کیا بلکہ دنیا کے ناممکن کو ممکن ثابت کر کے دکھا دیا اور یہ ناممکن کو ممکن کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا کہ اب تک آٹھ ہزار سے زائد نوجوان ان سرد ترین وادیوں کا رزق بن گئے ہیں کہ انہوں نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ اس ملک کی سرحدوں کی ہر حالت میں حفاظت کریں گے۔ بابا اقبال کیا خوب فرما گئے:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں کعبے میں گاڑو برہمن کو

آپ سن لیجیے پاکستان بھی نور ہے اور اس کیلئے جان قربان کرنے والے اسی نور کے وہ چراغ ہیں جنہوں نے ملک کو دشمنوں کی پھیلائی ہوئی تمام ظلمتوں سے پاک کرنے کا عزم کرر کھا ہے، آپ نے سنا بھی ہے اور بار بار سنا ہے، میرے رب نے اعلان کر دیا ہے، اس کا فرمان ہے: شہدا زندۂ جاوید ہیں۔ اپنے رب سے رزق پاتے ہیں اور قادرِ مطلق نے خبر دار کیا ہے کہ کبھی مردہ گمان بھی مت کرنا اور اب آپ ذرا دل تھام کر سنئے: جب بدترین تشدد کے بعد بھی وہ قیدی اور ایسے جاں گسل حالات میں وطن کی حفاظت کرنے والے نوجوان مسکرا رہے ہوں تو وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جس سے ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر بھی جنبش نہیں ہوتی، کیا ایسا تو نہیں کہ کوئی شہید اسے تحسین کی نظر سے دیکھ رہا ہو......بدری شہداء یا میدان احد کے شہداء کی مثالیں جب ان کے دلوں کو منور کر دیتی ہوں تو پھر بھلا خوف کیسا۔ ہمارے ان جانبازوں اور شہداء نے آج اپنی اس طاقت کے اس راز کو پالیا جس کا نام خداداد مملکت پاکستان کی محبت سے جڑے ایمان کا پختہ جزو ہے اور یہ وہ مورچہ ہے جس میں پناہ لینے والوں کیلئے دائمی فتح کی خوشخبریاں ہیں۔ ایمان کی آبیاری وقت کی اوّلین ضرورت ہے۔

مزاحمت ایمانی قوت سے مشروط ہے، اس کو کھو دیا تو سب کچھ چھن جائے گا!! ہمارے یہ تمام شہداء ہمارے سروں کے تاج اور اللہ کا انمول تحفہ ہیں۔ یاد رکھیں کہ اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا۔ یہی شہادت کا رقصِ بسمل ہمارا سرمایہ ہے!
"ہمیں پیار ہے پاکستان سے، اور ہمیں پیار ہے اپنے شہداء سے"!

بروز سوموار 13 رجب المرجب 1446ھ 13 جنوری 2025ء

طالبان اور خطے کے ممالک: ایک نئی تزویراتی حقیقت

جب 2021 میں افغانستان میں امریکی اور اس کے اتحادی افواج کے مکمل انخلاء، اشرف غنی کے فرار اور حکومت ختم ہونے کے نتیجے میں افغان طالبان اقتدار میں آئے تو پاکستان میں بیشتر سفارتی اور عسکری امور کے ماہرین کی رائے تھی کہ اس بڑی تبدیلی کے نتیجے میں پاکستان کی خطے میں گرفت مضبوط ہو جائے گی کہ طالبان کی اس فتح میں جہاں پاکستان نے بے شمار قربانیاں دی بلکہ لاکھوں افغان بھائیوں کی مہمان نوازی کرتے ہوئے اپنے ہاں پناہ بھی دی بلکہ ساری دنیا کو علم ہے کہ اگر پڑوس میں پاکستان جیسا وفادار ملک نہ ہوتا تو افغانستان میں نہ صرف سوویت یونین کو شکستِ فاش ہوتی اور وہ عالمی طاقت کی کرسی سے اوندھے منہ گر کر چھ ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا اور نہ ہی امریکا اور اس کے اتحادی اس طرح رسوا ہو کر راہِ فرار اختیار کرتے لیکن کیا وجہ ہے کہ ان تمام قربانیوں کے باوجود دونوں برادر مسلم ممالک کے باہمی تعلقات شدید تناؤ کا شکار ہیں اور بدنصیبی سے یہ سارا معاملہ طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے شروع ہے۔

اگست 2021 میں جب طالبان نے اقتدار سنبھالا تو اُس وقت کے پاکستانی وزیراعظم عمران خان نے کہا تھا کہ افغانستان کے عوام نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی ہیں۔ واضح رہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد لیفٹیننٹ جنرل فیض حمید نے 5 ستمبر 2021 کو کابل کا اچانک دورہ کیا تھا جس کی تصاویر بھی میڈیا کی زینت بنی تھیں جو کہ اس ادارے کے سربراہ کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ آج تک پاکستان بھگت رہا ہے۔ ان دنوں وہ بھی کورٹ مارشل کی زد میں اپنے ہی سابقہ ادارہ کی تحویل میں ہیں۔ ان تصاویر اور ویڈیوز میں ہوٹل کی لابی میں چائے کا کپ تھامے صحافیوں سے غیر رسمی بات چیت کرتے ہوئے 'پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا' کے الفاظ ادا کیے تھے لیکن ان کے اس عمل نے پاکستان کی پریشانیوں میں حد درجہ اضافہ کر دیا۔

لیکن پچھلے 3 سالوں میں چیزیں تیزی سے بدلی ہیں۔ اب بظاہر پاکستان اور طالبان آمنے سامنے ہیں۔ پاکستان بارہا کابل سے مطالبہ کر چکا ہے کہ وہ کالعدم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے خلاف کارروائی کرے جو "افغان سرزمین کو پاکستان میں حملوں کیلئے استعمال کر رہی ہے"۔ طالبان حکومت اِن الزامات کی تردید کر رہی ہے۔ گذشتہ برس دسمبر کے اواخر میں پاکستان نے افغانستان کے سرحدی علاقوں میں انٹیلیجنس پر مبنی آپریشن کیا تھا جبکہ افغان طالبان حکومت نے اس "فضائی کاروائی" پر اسلام آباد سے شدید احتجاج ریکارڈ کروایا تھا اور خبردار کیا تھا کہ افغانستان کی علاقائی خودمختاری حکمران اسلامی امارت کیلئے سرخ لکیر ہے اور وہ اس کا جواب دے گا، جس کے بعد پاکستان کی حدود میں واقع سرحدی چوکیوں پر فائرنگ کے واقعات پیش آئے تھے۔ جبکہ پاکستان کے ازلی دشمن انڈیا نے پاکستان کی جانب سے افغانستان میں حالیہ "فضائی کاروائی" کی مذمت کی جو قطعی طور پر ایک غیر متوقع عمل نہیں تھا کہ انڈیا اس خطے میں اپنے آقا امریکا کی پالیسی پر مکمل طور عملدرآمد کر رہا ہے۔

جہاں ایک طرف افغانستان میں طالبان کی اقتدار میں واپسی کے بعد پاکستانی حکومت حالات میں بہتری کا سوچ رہی تھی وہیں یہ بھی سمجھا جا رہا تھا کہ اس پیش رفت سے انڈیا کو سفارتی اور خطے میں اثر و رسوخ کے اعتبار سے دھچکا پہنچا ہے۔ تاہم حالیہ دنوں میں اب ایک بار پھر انڈیا اور افغان طالبان میں بڑھتی قربت پاکستان کیلئے ایک سرخ لکیر بنتی جا رہی ہے۔ افغانستان میں اشرف غنی کی حکومت کا رخصت ہونا انڈیا کیلئے بڑا دھچکا سمجھا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انڈیا

نے غنی دور حکومت میں افغانستان میں جو اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے وہ ضائع ہو جائے گی لیکن گذشتہ چند مہینوں میں انڈیا کے طالبان کے ساتھ رابطے بڑھے ہیں اور ایک بار پھر افغانستان اور انڈیا کے تعلقات میں گرمجوشی نظر آ رہی ہے۔

انڈیا کے سیکریٹری خارجہ وکرم مصری نے 8 جنوری کو دبئی میں طالبان کے قائم مقام وزیر خارجہ امیر خان متقی سے ملاقات کی ہے جس میں دونوں ممالک نے تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور تعاون کو مضبوط بنانے پر اتفاق کیا ہے۔ طالبان کی وزارت خارجہ نے کہا ہے کہ افغانستان انڈیا کو ایک اہم علاقائی اور اقتصادی شراکت دار کے طور پر دیکھتا ہے۔ یاد رہے کہ 2021 میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ اُن کی انتظامیہ کی انڈیا کے ساتھ اب تک کی اعلیٰ ترین سطح کی ملاقات تھی۔ افغانستان کی وزارت خارجہ نے کہا کہ ایران کی چابہار بندرگاہ کے ذریعے انڈیا کے ساتھ تجارت بڑھانے پر بات چیت ہوئی ہے۔ انڈیا ایران میں چابہار بندرگاہ بنا رہا ہے تاکہ پاکستان کی کراچی اور گوادر پورٹ کو بائی پاس کر کے افغانستان، ایران اور وسطیٰ ایشیا کے ساتھ تجارت کی جا سکے۔

افغانستان کی وزارت خارجہ نے وکرم مصری سے ملاقات کے بعد جاری کردہ بیان میں مزید کہا ہے کہ "ہماری خارجہ پالیسی متوازن ہے اور معیشت کو مضبوط بنانے پر مرکوز ہے۔ ہمارا مقصد انڈیا کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی شراکت داری کو مضبوط بنانا ہے۔ دوسری جانب اس ملاقات کے بعد انڈیا کی وزارت خارجہ نے کہا ہے کہ افغانستان میں ترقیاتی منصوبوں کو دوبارہ شروع کرنے پر غور کیا جا رہا ہے اور تجارت بڑھانے پر بھی بات ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان سمیت دنیا کے کسی بھی ملک نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور انڈیا بھی ان ممالک میں سے ایک ہے۔

دبئی میں طالبان اور انڈیا کے درمیان ہونے والی ملاقات پر پاکستان کی وزارت خارجہ نے کوئی باضابطہ ردعمل ظاہر نہیں کیا ہے تاہم خارجہ امور کے ماہرین اور تجزیہ نگاروں نے اس پیش رفت کو پاکستان کیلئے ایک اہم پیغام کے طور پر دیکھا ہے۔ انڈیا کے انگریزی اخبار "دی ہندو" میں پاکستان کیلئے نامہ نگار نروپما سبرامنیم نے لکھا ہے کہ "دریائے کابل پر بننے والا شہتوت ڈیم طالبان کی ترجیح ہے۔ انڈیا اور افغانستان کے درمیان 2020 میں اس ضمن میں 250 ملین ڈالر کے ایک منصوبے پر معاہدہ ہوا تھا لیکن طالبان کے آنے کے بعد معاملات ٹھپ ہو گئے تھے۔ طالبان اب انڈیا سے اس منصوبے کو مکمل کرنے کا کہہ رہے ہیں"۔

امریکا میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی نے پاکستان کے مقامی نیوز چینل سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستانی حکام سوچ رہے تھے کہ کابل فتح کرنے کے بعد طالبان وہاں آ جائیں گے اور پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا لیکن وہ ہمارے گلے میں پڑ گئے ہیں اور اس سے اگلے دن ٹوئٹر پر لکھا کہ "انڈین سیکریٹری خارجہ وکرم مصری کی طالبان کے وزیر خارجہ سے ملاقات پاکستانی منصوبہ سازوں کیلئے ایک سبق ہے، جو یہ سوچ رہے تھے کہ افغانستان میں طالبان کی آمد سے پاکستان کو فائدہ ہو گا اور انڈیا کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا۔ خارجہ پالیسی کو سمجھنے والوں کا نقطہ نظر سمجھنا چاہیے۔ اگر آپ کبھی بریگیڈ کے کمانڈر تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے"۔

امریکا کی یونیورسٹی آف البانی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر کرسٹوفر کلیری نے لکھا ہے کہ "کئی دہائیوں سے امریکی پالیسی ساز پاکستان کو کہتے رہے ہیں کہ طالبان کی حمایت کرنا حکمت عملی کے لحاظ سے شاید ہی فائدہ مند ہو گا۔ اب چیزیں واضح ہو کر سامنے آ رہی ہیں"۔ پاکستان کی توقعات کے برعکس، کابل میں طالبان کی حکومت آنے کے بعد پاکستان میں عسکریت پسندوں کے حملوں میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان سینٹر فار کانفلیکٹ اور سکیورٹی کے مطابق

2024 میں نومبر کے مہینے میں سب سے زیادہ حملے ہوئے جن میں 240 افراد ہلاک ہوئے جن میں تقریباً 70 سکیورٹی اہلکار شامل تھے۔

امریکی تھنک ٹینک دی ولسن سینٹر کے جنوبی ایشیا انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر مائیکل کوگل مین نے انڈیا اور طالبان کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں پر لکھا ہے کہ "کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ طالبان کے ساتھ انڈیا کی بڑھتی ہوئی قربت افغانستان میں پاکستان کو شکست دینے کی کوشش ہے لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے کہ انڈیا نہیں چاہتا کہ افغانستان کی سرزمین انڈیا میں دہشتگردانہ حملوں کیلئے استعمال ہو"۔ اُن کا مزید کہنا تھا کہ "اس کے علاوہ انڈیا ایران کے چابہار کے ذریعے افغانستان کے ساتھ رابطے بڑھانا بھی چاہتا ہے۔ انڈیا بھی یہاں سے وسطی ایشیا پہنچ جائے گا۔ انڈیا کی اس کوشش کی بنیاد پر وہاں کے لوگوں کا اعتماد بھی بڑھے گا۔ پاکستان چاہتا ہے کہ طالبان افغانستان میں اپنے مخالفین پر قابو پالیں لیکن

طالبان ایسا کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں اور اس کا فائدہ انڈیا کو مل رہا ہے لیکن انڈیا اور طالبان کے تعلقات کو پاکستان کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے"۔ انڈیا کے انگریزی اخبار "دی ہندو" کے بین الاقوامی ایڈیٹر سٹینلے جانی کے مطابق "انڈیا اور طالبان 2021 میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ انڈیا نے افغانستان میں سرمایہ کاری کی ہے اور اسے دہشتگردی پر بھی تحفظات ہیں۔ پاکستان فیکٹر بھی اہم ہے۔ طالبان پاکستان کی مداخلت سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور یہ انڈیا کیلئے ایک موقع ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انڈیا طالبان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کی جلدی میں ہے۔ یہ بین الاقوامی معاہدے کے بعد ہی ہوگا لیکن انڈیا اور طالبان رابطے برقرار رکھیں گے اور آہستہ آہستہ نئے مواقع تلاش کریں گے۔

انڈیا میں پاکستان کے سابق ہائی کمشنر عبدالباسط کا کہنا ہے کہ افغانستان کے حوالے سے پاکستان کی پالیسی بُری طرح ناکام ہو چکی ہے اور بظاہر اس حوالے سے کوئی واضح پالیسی نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں دونوں ممالک کے درمیان تجارت اور تعلقات بڑھانے کی بات ہو رہی ہے اور ساتھ ہی حملے بھی ہو رہے ہیں۔ عبدالباسط کالعدم تنظیم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کو افغانستان کے ساتھ بگڑتے تعلقات کی سب سے بڑی وجہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں دہشتگردانہ حملوں میں اضافہ ہوا ہے اور پاکستانی حکومت ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی کر رہی ہے لیکن ٹی ٹی پی کی محفوظ پناہ گاہیں افغانستان میں ہیں۔ اس طرح یہ سارا معاملہ بہت حساس ہو جاتا ہے۔

یقیناً یہ بہت حساس معاملہ ہے۔ افغان طالبان اور پاکستانی طالبان ماضی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہے ہیں۔ پاکستان بھی چاہتا ہے کہ اس کے کابل کے ساتھ تعلقات اچھے ہوں، لیکن افغانستان میں ٹی ٹی پی کے ٹھکانوں پر کارروائیاں بھی اس کی مجبوری بن چکی ہیں کیونکہ افغان طالبان حکومت ٹی ٹی پی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔

ادھر افغانستان کے سابق سفارتکاروں نے انڈیا اور افغانستان کے درمیان بڑھتے روابط پر تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ سری لنکا، انڈیا اور امریکا میں افغانستان کے سابق سفیر ایم اشرف حیدری نے وکرم مصری اور طالبان کے درمیان ملاقات پر سخت الفاظ میں لکھا ہے کہ "یہ افغانستان کے عوام کے ساتھ غداری ہے کیونکہ یہ افغان جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق کی صورتحال کیلئے تشویشناک ہے۔ پاکستان کی طرح انڈیا بھی جلد یا بدیر اپنی اقدار اور مفادات سے

غداری پر پچھتائے گا۔ یہ مت بھولیں کہ طالبان کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے اس کے بھائیوں اور بہنوں کے کشمیر پر قبضہ کرر کھاہے اور وہ کشمیر کی آزادی کیلئے لڑیں گے۔ آپ کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بامیان میں بدھا کے مجسموں کو طالبان نے تباہ کر دیا تھا اور یہ مجسمے ہماری ثقافت کا اثاثہ تھے"۔ انڈیا میں افغانستان کے سابق سفیر فرید ماموند زئی نے کہاہے کہ "ان لوگوں کو نظر انداز کیے بغیر طالبان حکومت سے کوئی مذاکرات نہیں کیے جاسکتے جو وہاں مسلسل مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کسی بھی مذاکرات میں افغان خواتین اور بچوں کے مفادات کو ترجیح دینی ہو گی۔ وہاں کے انسانی بحران کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انڈیا وہاں طالبان کے مظالم کو جائز نہ بنائے جو کل خود انڈیا کے گلے کا پھندہ بن جائے"۔

کابل میں ایک انڈین وفد کی طالبان حکام سے ملاقات کو خاصی دلچسپی سے دیکھا جارہاہے اور بعض مبصرین اسے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں بہتری کی طرف ایک اشارہ سمجھ رہے ہیں۔ دراصل گذشتہ دنوں انڈین وزارت خارجہ کے ایک اعلی اہلکار جے پی سنگھ نے ایک انڈین وفد کے ہمراہ کابل میں افغانستان کے عبوری وزیر دفاع ملا محمد یعقوب اور قائم مقام وزیر خارجہ امیر خان متقی اور افغانستان کے سابق صدر حامد کرزئی سے ملاقات کی۔ یہ انڈین وزارت خارجہ کے کسی اعلی اہلکار کی ملا محمد یعقوب سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ ملا یعقوب طالبان تحریک کے بانی ملا عمر کے بیٹے ہیں اور موجودہ حکومت میں وہ ایک بااثر رہنما مانے جاتے ہیں۔ وزارت دفاع نے ایکس پر ملا یعقوب اور انڈین وزارت خارجہ کے نمائندے جے پی سنگھ کی ملاقات کی تصویر پوسٹ کی اور تعلقات بہتر کرنے کا ذکر کیاہے۔ انڈیا بھی اب طالبان سے تعلقات بہتر کرنا چاہتاہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ افغانستان میں صرف چین اور پاکستان کا اثر رہے۔ ملا یعقوب اس سے پہلے بھی انڈیا سے مضبوط رشتے قائم کرنے کی باتیں کرتے رہے ہیں اور دفاع کے شعبے میں بھی اشتراک کی امید کر رہے ہیں۔

طالبان سے پہلے کی حکومتوں کے دوران انڈیا افغانستان کی فوج کو ٹریننگ فراہم کیا کرتا تھا جبکہ افغانستان کے فوجی اہلکار انڈیا کی فوجی اکیڈمی میں تربیت حاصل کرنے کیلئے بڑی تعداد میں انڈیا آتے تھے۔ پروفیسر بلقیس کہتی ہیں کہ افغانستان سے انڈیا کے تعلقات تاریخی طور پر اچھے رہے ہیں۔ "طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد انڈیا نے افغانستان کے شہریوں کیلئے ویزا محدود کر دیاہے۔ 4 اور 5 نومبر کو ہونے والی اس بات چیت میں طلبا، تاجروں اور علاج و معالجہ کیلئے آنے والے افغان شہریوں کیلئے ویزا جاری کرنے کے سوال پر بھی مفصل بات ہوئی ہے۔ اب انڈیا بھی تعلقات کی بحالی میں زیادہ دلچسپی دکھا رہاہے۔" انڈیا کے تعلقات چاروں طرف اپنے پڑوسیوں سے اچھے نہیں ہیں۔ یہ انڈیا کے مفاد میں ہے کہ وہ طالبان سے تعلقات بہتر کرے کیونکہ وہ یہ نہیں چاہے گا کہ طالبان بھی اس کے خلاف ہو جائیں۔ وہ نہیں چاہے گا کہ چین اور پاکستان افغانستان کو انڈیا کے خلاف استعمال کریں"۔

انڈین اہلکار سے ملاقات کے بعد طالبان حکومت کی وزارت دفاع نے ایک بیان میں کہا کہ "اس ملاقات میں دونوں رہنماؤں نے باہمی رشتوں کو وسعت دینے اور دونوں ملکوں کے درمیان روابط بڑھانے پر زور دیاہے"۔ بعض افغان اہلکاروں کے حوالے سے انڈین میڈیا نے خبر دی ہے کہ یہ ملاقات اس بات کا اشارہ ہے کہ سفارتی تعلقات نہ ہونے کے باوجود انڈیا اب انسانی بنیادوں پر دی جانے والی امداد سے آگے کی راہ دیکھ رہاہے۔ آنے والے دنوں میں دونوں ممالک کے بیچ تعلقات میں مزید پیشرفت کا امکان ظاہر کیا گیاہے۔

انڈیا کی وزارت خارجہ کے ترجمان رندھیر جیسوال نے جمعرات کو میڈیا بریفنگ میں بتایا کہ افغان رہنماؤں سے بات چیت میں انڈین اہلکاروں نے دیگر باتوں کے علاوہ ایران کی چابہار بندرگاہ کے راستے افغانستان کو تجارت کی پیشکش کی ہے۔ ان کے بقول انڈین اہلکاروں نے طالبان کو بتایا کہ "کس طرح ایران کے تاجر اور بزنس مین ایران کی چابہار بندرگاہ سے اپنے مال کی برآمد اور درآمد اور دیگر کاموں کیلئے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ ایران میں چابہار بندرگاہ

انڈیا تعمیر کر رہا ہے جسے پاکستان کے ساحلی شہر گوادر میں چین کے ذریعے تعمیر کی جانے والی بندر گاہ کے متبادل کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ کابل میں اس ملاقات سے چند ہفتے قبل طالبان کے بعض اہلکار دلی کا دورہ کر چکے ہیں۔ کچھ عرصے سے انڈیا افغانستان کی طالبان حکومت سے اپنے تعلقات رفتہ رفتہ استوار کرنے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

افغانستان میں 2021 میں طالبان کے آنے بعد انڈیا نے طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ دلی میں افغانستان کے سفارتخانے میں گذشتہ حکومت کے جو سفارتکار تھے وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ کسی بھی ملک نے اگرچہ افغنستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تاہم علاقائی ممالک بشمول چین، روس، پاکستان، ایران اور قطر کا سفارتخانے اب بھی کابل میں موجود ہیں۔ حال ہی میں انڈیا نے کابل میں سفارتی مشن بحال کیا۔ طالبان ایک عرصے سے انڈیا پر زور دے رہے ہیں کہ وہ طالبان کی وزاراتِ خارجہ کے سفارتکاروں کو یہاں مامور کرنے کی اجازت دے۔ اس ملاقات میں بھی طالبان نے سفارتکاروں کی تقرری سے متعلق سوال اٹھایا تھا۔ اب ایسی اطلاعات آ رہی ہیں کہ انڈیا طالبان کے سفارتکاروں کو دلی میں مامور کرنے کی اجازت دینے پر غور کر رہا ہے۔ طالبان انڈیا کو کئی بار یہ یقین دہانی کرا چکے ہیں کہ افغانستان کی سرزمین کو انڈیا مخالف سرگرمیوں کیلئے استعمال نہیں ہونے دیا جائے گا۔

گزشتہ برسوں کے دوران پاکستان اور طالبان کے درمیان تعلقات میں اُتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ پاکستانی دفتر خارجہ نے بارہا اپنے بیانات میں افغان طالبان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کی سرزمین پاکستان پر حملوں کیلئے استعمال نہ کی جائے جبکہ طالبان حکام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ افغان سرزمین پاکستان مخالف سرگرمیوں کیلئے استعمال نہیں ہو رہی۔

رواں سال انڈیا اور مالدیپ کے درمیان سرد مہری رہی تھی تاہم اکتوبر میں انڈیا نے مالدیپ کی معاشی بحالی کیلئے ہزاروں ڈالر قرض دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ مئی میں نیپال کے نئے نقشے کے ساتھ جاری کیے جانے والے 100 روپے کے نیپالی نوٹ کے اجرا پر انڈین حکام نے ناراضی ظاہر کی تھی جبکہ ماضی قریب میں بھوٹان کی طرف سے چین سے بہتر سفارتی تعلقات استوار کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ یاد رہے کہ سری لنکا میں ستمبر کو بائیں بازو کی جانب جھکاؤ رکھنے والے سیاست دان انورا کمارا ڈسانائیکے نئے صدر بنے ہیں جنھیں چین کا حامی سمجھا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کی سابق وزیر اعظم شیخ حسینہ اپنی حکومت جانے کے بعد سے انڈیا میں موجود ہیں جہاں انہیں سیاسی پناہ دینے کا معاملہ زیرِ بحث ہے۔

ادھر انڈین خارجہ امور کے ماہرین کے مطابق انڈیا اور طالبان کی حکومت، دونوں کے درمیان باہمی اعتماد کی کمی ہے۔ انڈیا نے طالبان کو تسلیم نہیں کیا لیکن اگر وہ دلی میں افغان سفارتخانے میں طالبان کے سفارتکاروں کو مامور کرنے کی اجازت دیتا ہے تو یہ تعلقات کی باضابطہ بحالی کی جانب ایک بڑا قدم ہو گا لیکن انڈیا ابھی تک طالبان کو تسلیم کرنے سے پہلے "ویٹ اینڈ واچ" کی پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔

دوسری طرف پاکستانی دفتر خارجہ کی ترجمان نے اگست کے دوران کہا تھا کہ اگر عبوری افغان حکومت اپنے شہریوں اور بین الاقوامی برادری سے کیے گئے وعدوں کو یقینی بنائے گی کہ اس کی سرزمین اس کے پڑوسیوں کے خلاف استعمال نہیں کی جا رہی تب ہی اسے تسلیم کرنے میں پیش رفت ہو سکتی ہے۔
مبصرین کے مطابق انڈیا کی حکومت اس وقت مکمل طور پر اپنے نئے مربی ٹرمپ کی گود میں بیٹھ کر ان کی پالیسیوں پر عملدرآمد کر رہا ہے اور ٹرائیکا کی مکمل کوشش ہے کہ "سی پیک" کو کسی بھی صورت میں مکمل نہ ہونے دیا جائے، اس حکمت عملی کے لحاظ سے افغانستان کی اہمیت موجودہ علاقائی پس منظر میں بہت زیادہ ہے اور اس سے تعلقات پوری طرح بحال کرنے کیلئے انڈین حکومت اب اسی طرف قدم بڑھا رہی ہے لیکن یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ

جو طالبان اس وقت انڈیا کو اپنی سرزمین انڈیا مخالف سرگرمیوں کیلئے استعمال نہیں کرنے کی یقین دہانیاں کروا رہے ہیں، اس سے قبل وہ ایسی ہی تحریری یقین دہانیاں دوحہ میں اقوام عالم کو کروا چکے ہیں اور جس پاکستان کی قربانیوں کی بدولت وہ اس مقام پر پہنچے ہیں، اگر اس کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو کل انڈیا کو بھی یقیناً ایسے سلوک کا منتظر رہنا ہو گا جو شائد اس سے کہیں زیادہ شدید اور نا قابل یقین ہو گا اور طالبان کی موجودہ قیادت کو بھی ہوش کے ناخن لینے ہوں گے کہ رب کریم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہے۔

بروز بدھ 15 رجب المرجب 1446ھ 15 جنوری 2025ء

بنگلہ دیش اور انڈیا: سیاسی تناؤ اور کشیدگی

مغربی بنگال میں انڈیا اور بنگلہ دیش کے پانچ اضلاع سے متصل طویل سرحدی ریاستوں پر انڈیا کی طرف سے خار دار تاروں کی باڑ لگانے پر دونوں ملکوں میں سرحدی تنازعہ شدت اور طول اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب بنگلہ دیش کے سیاسی منظر نامے میں تبدیلی ہو رہی ہے اس کے پڑوسی ملک انڈیا کے ساتھ سرحد پر کشیدگی میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جب مغربی بنگال میں بنگلہ دیشی سرحدی گارڈز کی 58 ویں بٹالین کے کمانڈر کرنل رفیق الاسلام نے منگل کے روز بنگلہ دیشی میڈیا کو ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ 'دریائے کوٹلیا کے کنارے پانچ مربع کلو میٹر کا علاقہ قبضے میں لے لیا گیا ہے۔

حالیہ دنوں میں اس سرحدی علاقے میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے جس کی وجہ سے انڈیا کی سرحد کی حفاظت پر مامور فورس بی ایس ایف اور بنگلہ دیشی سرحدی گارڈز بی جی بی کے درمیان کشیدگی اور بے چینی دونوں میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ عام طور پر پرسکون رہنے والی اس سرحد پر اب واضح طور پر تناؤ پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر گزشتہ ایک ہفتے کے دوران اس علاقے میں کشیدگی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد سے انڈین سرحدی حفاظتی فورس اور بنگلہ دیش کے سرحدی گارڈز کو آپس میں مل کر ایک 'فلیگ میٹنگ' (ضابطے کی ایک ملاقات) کرنا پڑی۔

دراصل دریائے کوٹلیا کے کنارے 5 مربع کلو میٹر پر بنگلہ دیش کے قبضے کے بعد اس مسءلے کی سنگینی کو فوری کم کرنے کیلئے دونوں ممالک نے فلیگ میٹنگ میں اس پر قابو پانے کیلئے مذاکرات کئے ہیں۔ اب چاہے مسئلہ سرحدی دراندازی کو روکنا ہو یا انڈیا کی سرحد پر خار دار تاریں لگانے کی بات ہو، بی ایس ایف اور بی جی بی کا اکثر ملاقات کرنا ایک عام بات ہے۔ دونوں پڑوسی ممالک کی سرحد پر سکیورٹی کے فرائض انجام دینے والی ان دونوں فورسز کے درمیان کسی بھی قسم کی جھڑپ کی تاحال مصدقہ اطلاعات تو نہیں ہیں لیکن کئی مقامات پر کشیدہ صورتحال پائی جاتی ہے۔ اس میں مغربی بنگال کا سب سے اہم علاقہ نارتھ 24 پرگنا ضلع میں واقع بونگاؤں میں واقع پیٹراپول سرحدی چوکی جو سب سے مصروف سرحدی چیک پوائنٹ ہے جہاں بنگلہ دیشی سرحدی گارڈز بھی تعینات رہتے ہیں۔

'دریائے کوٹلیا کا یہ متنازعہ علاقہ جس پر بنگلہ دیش نے قبضے کا اعلان کیا ہے وہ باگڈا حلقے کے راناگھاٹ گاؤں میں آتا ہے اور پیٹراپول سرحدی چوکی سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ سرحد کے دوسری جانب بنگلہ دیش کا علاقہ مہیش پور ہے۔ رفیق الاسلام کے اس بیان کے بعد دونوں ممالک کے درمیان کشیدہ صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ سرحدی فورسز کے افسران کا کہنا ہے کہ اس معاملے کو مزید خراب ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس کے بعد صورتحال کو قابو میں لے لیا گیا ہے۔

ایسے میں گزشتہ روز بنگلہ دیشی وزیر خارجہ کے سیکریٹری محمد جاشم الدین نے ڈھاکہ میں تعینات انڈین ہائی کمشنر پرنے ورما کو طلب کر کے انڈین بارڈر سکیورٹی فورسز (بی ایس ایف) کی تازہ سرگرمی پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انھیں یہ پیغام دیا کہ وہ انڈیا میں تمام متعلقہ حکام کو یہ بتا دیں کہ وہ ایسی 'اشتعال انگیز حرکتوں' سے باز رہیں اور سرحد پر خاردار تاریں لگانے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے 'غیر قانونی' قرار دیتے ہوئے خبردار بھی کیا کہ اس عمل سے دونوں ممالک کی سرحد پر کشیدگی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ انڈین میڈیا کے مطابق جاشم الدین نے ڈھاکہ نے انڈیا پر دوطرفہ

معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرتے ہوئے سرحد کے ساتھ پانچ مقامات پر باڑ لگانے کی کوشش کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اسے فوری روکنے کا مطالبہ کیا ہے۔

رفیق الاسلام کے بیان کے بعد پیٹراپول کی سرحدی چوکی پر انڈیا کی بی ایس ایف کے اعلیٰ افسران اور بنگلہ دیشی سرحدی گارڈز کے درمیان ایک ہنگامی فلیگ میٹنگ سے قبل ہی انڈین سرحدی فورس بی ایس ایف نے رفیق الاسلام کے دعووں کو یکسر مسترد اور گمراہ کن بیان قرار دیتے ہوئے کہا ہے 'بی ایس ایف یہ یقین دہانی کرانا چاہتا ہے کہ ایک انچ زمین بھی قبضے میں نہیں لی گئی ہے اور نہ ہی ہم ایسی کسی بھی کارروائی کی اجازت دیں گے۔ انڈین سرحدی حفاظتی فورس نے مزید وضاحت کی کہ اس علاقے میں بین الاقوامی سرحد دریائے کوڈالیا درمیان سے گزرتی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان سرحد کی درستگی کے ساتھ پہلے ہی نشان دہی کی جاچکی ہے۔ دریا کے دونوں طرف ستون اور پتھر نصب کیے گئے ہیں تاکہ سرحد کو واضح طور پر نشان زد کیا جاسکے۔' توسوال پیدا ہوتا ہے کہ فوری طور پر یہ فلیگ میٹنگ بلانے کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے۔

اب جانتے ہیں کہ بنگلہ دیشی سرحدی گارڈ کے افسر نے اپنے متنازع بیان میں مزید کیا کہا اور کس بنیاد پر کہا؟ بنگلہ دیشی افسر نے رفیق الاسلام نے بیان میں دعویٰ کیا کہ 'پہلے بنگلہ دیش کے اس سرحدی گاؤں والوں کو دریائے کوڈالیا کا استعمال کرنے میں مشکلات درپیش تھیں تاہم موجودہ صورت حال کے تناظر میں اب ہمارے دریائے کوڈالیا کے کنارے رہنے والے اس پانی کو بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری جانب انڈیا کے بی ایس ایف حکام نے جواباً کہا کہ 'دریا کے دونوں اطراف کے بسنے والے اپنے اپنے علاقوں میں پانی کا استعمال کرتے رہے ہیں اور یہ صورتحال اب بھی ویسی ہی برقرار ہے۔' یاد رہے کہ اس علاقے میں دونوں ممالک کے درمیان خاردار تاروں کی باڑ موجود نہیں ہے۔

مغربی بنگال قانون ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر سبیند وادھیکاری نے اس واقعے کی کی ویڈیو اپنے سوشل میڈیا پیج پر شیئر کی ہے۔ جس کے بعد خاردار تاروں کی باڑ لگانے کا کام کچھ دیر کیلئے روک دیا گیا۔ انڈین بارڈر سکیورٹی فورس کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیشی بارڈر گارڈ کے افسران کو یہ اطلاع تھی کہ انڈین سرحد پر خاردار تاریں لگائی جارہی ہیں۔ بی ایس ایف نے بنگلہ دیشی سکیورٹی حکام کو واضح کیا کہ خاردار تاریں لگانے کا کام دونوں ممالک کے درمیان ایک معاہدے کی بنیاد پر کیا جارہا ہے۔ نامہ نگاروں سے بات کرتے ہوئے نیلوتپل پانڈے کے مطابق غلط فہمی دور ہونے کے بعد تار لگانے کا کام دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔

انڈیا میں حکمراں جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما سبیند وادھیکاری نے اس پورے معاملے کے بارے میں سوشل میڈیا پلیٹ فارم 'ایکس' پر پوسٹ کرتے ہوئے لکھا کہ 'بنگلہ دیشی بارڈر گارڈ کے سپاہی سکھدیو پور گاؤں کے لوگوں کے قوم پرست جذبات کی وجہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔' اتنا ہی نہیں، انھوں نے اپنی پوسٹ میں یہ بھی لکھا کہ 'مقامی انڈین شہریوں نے بی ایس ایف کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش بارڈر سکیورٹی فورس کو یہ باور کرایا کہ بنگلہ دیش بارڈر سکیورٹی فورس کی اس طرح کی کوششوں کو قومی سلامتی کے مفاد میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یہ لوگوں میں پیدا ہونے والی بیداری کا نتیجہ ہے۔'

اسی دوران ایک اور ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہورہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ یہ ویڈیو تریپورہ کے کیلاشہر کے مکورولی علاقے کا ہے۔ اس ویڈیو میں 'مشتبہ بنگلہ دیشی سمگلروں' کو انڈین بارڈر سکیورٹی فورس کے جوانوں کے ساتھ تصادم میں مصروف دیکھا جاسکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے 1971 میں قیام کے بعد سے اس

کے انڈیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ انڈیا-بنگلہ دیش سرحد پر حالات کبھی خراب نہیں ہوئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان لوگوں کی آمد و رفت اور تجارت آسانی سے جاری رہی۔ لیکن اب بنگلہ دیش میں جو ہو رہا ہے اس سے واضح ہے کہ ان کے درمیان تناؤ پیدا ہو گا۔ سرحدی دیہات کے لوگ اپنی حفاظت کے بارے میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ یہاں کئی اہم علاقے ایسے ہیں جہاں خاردار تاریں نہیں ہیں۔ ایسی جگہوں پر شہری خود اپنے دفاع کیلئے پیش پیش رہتے ہیں۔ انھوں نے جس قدر ہو سکے حفاظتی انتظامات کرنے شروع کر دیے ہیں۔ وہ نگرانی کے کیمرے نصب کرنے اور رات کے وقت گشت جیسے کاموں میں مصروف ہیں۔

انڈیا ہمیشہ سے بنگلہ دیش سے لوگوں کی مبینہ دراندازی کو ایک بہت بڑے مسئلے کے طور پر پیش کرتی رہی ہے اور انڈیا کی مختلف ریاستوں میں ہونے انتخابات میں اس کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ اس سرحدی علاقے میں دراندازی کے معاملے پر سیاسی جماعتیں بھی ایک دوسرے کو نشانہ بنا رہی ہیں اور حملے کر رہی ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے فروری کے مہینے میں دہلی میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں بھی دراندازی کو بڑا مسئلہ بنا کر پیش کیا تھا۔ تاہم مغربی بنگال میں اس معاملے پر حکمران ترنمول کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے درمیان اکثر تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے۔ ریاستی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے عہدیداروں کے ساتھ اپنی سالانہ میٹنگ میں کہا کہ انھوں نے ان علاقوں کے ناموں کی نشاندہی کی ہے جہاں مبینہ طور پر دراندازی ہو رہی ہے۔

ریاستی سکریٹریٹ میں مختلف محکموں کا جائزہ لینے کے دوران بنرجی نے کہا: 'بارڈر سکیورٹی کی ذمہ داری ترنمول کانگریس یا ریاستی پولیس کے پاس نہیں ہے، یہ بارڈر سکیورٹی فورس کا کام ہے، وہ دراندازی اور جرائم پیشہ افراد کی مدد کر رہے ہیں، میں ان کے خلاف کارروائی کروں گی۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کو خط لکھوں گی۔'

ممتا بنرجی نے مغربی بنگال کے تین سرحدی علاقوں کا نام بھی لیا جہاں دراندازی سب سے زیادہ ہے۔ ممتا بنرجی کے بیان کے بعد بی ایس ایف کے جنوبی بنگال بارڈر ایریا کے انڈین فورس بی ایس ایف سے تعلق رکھنے والے ڈپٹی کمشنر آف پولیس نیلوتپل کمار پانڈے نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے بیانات بارڈر سکیورٹی فورس کے جوانوں کے حوصلے پست کر رہی ہیں۔ بی ایس ایف ایک 'ذمہ دار فورس' ہے اور اپنی ذمہ داریاں ایمانداری سے نبھا رہی ہے۔ بنگلہ دیش سرحدی حفاظتی فورس کے افسر کا بیان یقینی طور پر الجھن کا باعث بنا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس وقت 'سرحدی علاقے میں صورتحال پہلے جیسی ہی ہے اور سرحد کے دونوں طرف امن قائم ہے۔' دریں اثنا ایک اور واقعہ پیش آیا جب مالدہ ضلع کے سکھدیوپور میں منگل کو خاردار تار لگانے کا کام جاری تھا۔ اس وقت بنگلہ دیش بارڈر سکیورٹی فورس کے جوانوں نے کام روکنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد سرحدی علاقے میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سکھدیوپور کے گاؤں والے وہاں جمع ہو گئے۔ گاؤں والوں نے 'بھارت ماتا کی جئے۔۔۔ جئے شری رام۔۔۔ وندے ماترم۔۔۔' جیسے نعرے لگائے۔

دوسری جانب بی جے پی وزیر اعلی ممتا بنرجی کے بیان کے خلاف جارحانہ انداز اپنا رہی ہے۔ اپوزیشن لیڈر سوبیندھو ادھیکاری نے وزیر اعلیٰ کو ایک خط لکھا ہے جس میں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ انھوں نے اس میں ذکر کیا کہ سکیورٹی فورسز کے افسران اور سپاہی ملک کی خدمت کرتے ہیں اور بدترین حالات میں بھی ملکی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سکیورٹی فورسز سرحد کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ فوجیوں کے بارے میں توہین آمیز بات کرنے پر ملک آپ کو معاف نہیں کرے گا۔'

انھوں نے سوال کیا کہ کس طرح مقامی حکام دراندازوں کو راشن کارڈ اور شناختی کارڈ جاری کرتے ہیں جو سرحد پار کر کے کسی گاؤں میں پناہ لیتے ہیں اور پولیس افسران ان کی تصدیق کیسے کرتے ہیں۔ خط میں انھوں نے الزام لگایا کہ مغربی بنگال حکومت خاردار تاریں لگانے میں انڈین بارڈر سکیورٹی فورس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مغربی بنگال میں، ریاستی حکومت بنگلہ دیش کی سرحد کے ساتھ لگ بھگ 300 کلومیٹر خاردار تاروں کیلئے زمین مختص کرنے میں بھی سستی دکھارہی ہے۔ واضح رہے کہ بنگلہ دیش میں سرکاری نوکریوں کیلئے شروع ہونے والی طلبہ تحریک حکومت مخالف پر تشدد احتجاج میں بدلی تو 15 سال بر سر اقتدار رہنے والی سفاک اور جمہوریت کے لبادے میں ڈکٹیٹر سابق وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد کو فرار ہو کر اپنے آقا مودی کے پاس پناہ لینا پڑی اور وہ اب تک کڑے پہرے میں زندگی کے دن گزار رہی ہیں۔ اس سارے قصے میں ظالم ڈائن حسینہ واجد کے سب سے زیادہ پسندیدہ مقرر کردہ بنگلہ دیش کی فوج کے آرمی چیف وقار الزمان کا مرکزی کردار رہا جنھوں نے ایک طرف حسینہ کو فرار ہونے کیلئے ہیلی کاپٹر فراہم کیا اور طلبہ کے مطالبے پر مجبور ہو کر نوبل انعام یافتہ محمد یونس کو ملک کی عبوری حکومت کا نگران مقرر کیا اور دوسری جانب سابق وزیر اعظم خالدہ ضیا سمیت کئی سیاسی مخالفین کو بھی رہا کرنا پڑا۔

اس غیر معمولی اور اچانک تبدیلی پر جہاں مودی حکومت سنبھل نہ پائی وہاں حسینہ واجد کے بیٹے سجیب واجد نے ایک عالمی میڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے بنگلہ دیش میں آنے والی تبدیلی کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتے ہوئے کئی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا 'بنگلہ دیش کا سیاسی مستقبل بھی پاکستان کی طرح ہو سکتا ہے۔ اور (آنے والے دنوں میں) بنگلہ دیش میں اسلامی شدت پسند دوبارہ سے اپنی جگہ بنائیں گے، جنھیں ان کی (سابق) حکومت نے بڑی مشکل سے محدود کیا تھا۔ اور اب بنگلہ دیش دوسرا پاکستان بننے جارہا ہے۔'

پاکستان کے دفترِ خارجہ نے اس بیان پر کوئی بھی ردعمل دینے سے انکار کیا ہے جبکہ متعدد سابق پاکستانی سفارت کاروں سے جب رابطہ کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ 'یہ ایک معیوب موازنہ اور تجزیہ ہے۔' بنگلہ دیش کی صورتحال پر نظر رکھنے والے سیاسی مبصرین اور تجزیہ کار اس بارے میں ملے جلے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈھاکہ سے وکیل رضوانہ مسلم نے اسی عالمی میڈیا پر سجیب واجد کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'یہ غصے یا بغض میں دیا گیا بیان ہے جس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ پہلے تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بنگلہ دیش میں اسلامی رہنما اب موجود نہیں ہیں۔ عوامی لیگ کی سابق حکومت نے ایسی تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا تھا جو اسے طویل مدت میں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس میں جماعتِ اسلامی سرِ فہرست تھی جس کے کئی رہنماؤں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، جماعت اسلامی کے ہزاروں ارکان کو جیل کی ایسی کال کوٹھڑیوں میں قید کر دیا گیا جہاں روشنی تک نہیں جاتی اور ملک میں اس جماعت پر اب پابندی عائد ہو چکی ہے اور اس کی زیادہ تر قیادت اب ملک سے باہر ہے۔ اب ان جماعتوں کا ملک واپس آنے کا جواز اس لیے نہیں بنتا کیونکہ بنگلہ دیش میں طلبہ تحریک پرانے چہروں کو نہیں دیکھنا چاہتی اور وہ مذہبی حکومت کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ تو اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔'

نئی دہلی سے صحافی جینت رائے چوہدری بھی بنگلہ دیش کے حالات کے پاکستان کے ساتھ موازنہ کو درست نہیں گردانتے۔ انھوں نے بھی حسینہ کے بیٹے کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'اگر آج بنگلہ دیش کا موازنہ خطے کے دیگر ممالک سے کریں تو اس نے ترقی میں نا صرف پاکستان بلکہ انڈیا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بنگلہ دیش اس وقت دنیا میں تیارہ شدہ کپڑے برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے لیکن ہم حسینہ کے اپنے مخالفین کے ساتھ مظالم اور خوفناک کرپشن کو کیوں بھول جاتے ہیں جس کا تذکرہ اب برطانیہ کے میڈیا میں ان کی بھانجی کا نام لیکر کیا جارہا ہے۔

یاد رہے کہ 1971 میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش جنوبی ایشیا کا غریب ترین ملک تھا جس کے معاشی حالات اتنے ابتر تھے کہ اُس وقت امریکی قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر نے بنگلہ دیش کو 'باسکٹ کیس' کہا تھا۔ یہ حالات 1974 میں مزید خراب اس وقت ہوئے جب بنگلہ دیش میں سیلاب آیا اور اس کے نتیجے میں قحط سالی ہوئی اور اسی دوران امریکی صدر رچرڈ نکسن کی حکومت نے بنگلہ دیش کو دی جانے والی امداد بھی ختم کر دی۔ مگر آج تقریباً 52 برس بعد بنگلہ دیش جنوبی ایشیا کی تیزی سے ترقی کرتی معیشت بن کر ابھرا ہے۔

بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے ماہرین کا خیال ہے کہ اس ترقی میں سب سے بڑا ہاتھ غیر سرکاری تنظیموں کا ہے جن میں محمد یونس کا گرامین بینک اور فضلِ حسن عابد کا شروع کیا ہوا ادارہ 'براک' شامل ہیں۔ جینت رائے چوہدری نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ 'اس وقت انڈیا میں یہ خدشہ ہے کہ پاکستان جیسا بننے کے بجائے بنگلہ دیش کہیں افغانستان نہ بن جائے۔' ان کے مطابق اس کی مثال 1990 کی دہائی میں افغانستان میں طالبان کی حکومت سے جا ملتی ہے۔ 'اُس وقت کئی بنگلہ دیشی نوجوان طالبان کی سوچ سے متاثر ہو کر افغانستان منتقل ہو گئے تھے اور ان کیلئے لڑنے کو بھی تیار تھے۔ لیکن ان کی حکومت کے گِرنے کے بعد یہی نوجوان واپس بنگلہ دیش آ گئے ہیں۔'

انھوں نے کہا کہ یہ وہ دور تھا جب شیخ حسینہ واجد کی حکومت کم عرصے کے بعد ختم ہو چکی تھی اور بنگلہ دیش نیشنل پارٹی اقتدار میں آئی تھی۔ طالبان کی حمایت کرنے والا گروہ اب پھر سے سرگرم ہو سکتا ہے۔ اسی لیے پاکستان بننے سے زیادہ بڑا خدشہ مجھے بنگلہ دیش کے افغانستان بننے کے بارے میں ہے۔' تاہم پاکستان کے انسٹیٹیوٹ آف سٹریٹجک سٹڈیز میں انڈیا سٹڈی سینٹر کے مطابق پاکستان اور بنگلہ دیش کا بنیادی ڈھانچہ بہت مختلف ہے۔ پاکستان میں فوج نے طویل عرصے تک حکمرانی کی ہے۔ جبکہ بنگلہ دیش میں تواتر سے جمہوری حکومتیں رہی ہیں۔ 2000 کی دہائی کے بعد زیادہ عرصہ جمہوری حکومتوں کا رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں بنیادی طور پر معیشت مضبوط ہوتی دکھائی دی ہے۔ خواتین پہلے سے زیادہ باشعور ہیں اور طلبہ یونین مضبوط رہی ہیں اور ملک کی سیاست کو بہتر طور پر سمجھتی ہیں۔ یہاں کی اپنی تہذیب، زبان ہے اور جمہوری اقدار کو تقویت دی جاتی ہے۔'

بنگلہ دیش کے حالات کا پاکستان کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بنگلہ دیش میں فوجی آمریت یا حکومت آنے کا سوال نہیں بنتا اور اگر کسی ہائبرڈ نظام کو متعارف کیا بھی جاتا ہے تو وہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکے گا۔ یاد رہے کہ جب بنگلہ دیش کے ملٹری چیف نے شیخ حسینہ کی حکومت ختم ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم عبوری حکومت بنائیں گے، تب طلبہ یونین نے نا صرف اس بات کو رد کیا بلکہ نوبیل انعام یافتہ محمد یونس کو بطور امیدوار سامنے لے کر آئے اور بنگلہ دیش کے تمام فوجی افسران نے اپنے چیف کو طلباء کا یہ مطالبہ ماننے کا مشورہ دیا جس کے فوری بعد انہوں نے طلباء کے ساتھ باہمی مذاکرات کے بعد محمد یونس کو حکومت بنانے کی دعوت دینی پڑی۔

بنگلہ دیش کی مضبوط طلبہ یونین نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ ان کی متحرک تحریک سیاست میں فوج کے کردار کو محدود کرے گی کیونکہ فوج میں بھی ان کے وفادار اور حامی ہیں۔ فوج میں ان کے حمایتی گروہ کی بنیادی وجہ شیخ حسینہ کی جانب سے اپنی جماعت عوامی لیگ کے ساتھ وفادار فوجیوں کو ترقی دینا ہے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اگر آرمی چیف وقار الزمان کو بھی دیکھیں تو ان کی وفاداری پہلے شیخ حسینہ اور عوامی لیگ کے ساتھ تھی اور حسینہ کو فرار میں مدد دینے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے خود پر ہونے والی حسینہ واجد کی مہربانیوں کا جواب دیتے ہوئے ان کے فرار میں مدد کی تاہم طلبہ یونین اب نہیں چاہیں گے کہ شیخ حسینہ یا ان کی باقیات اب آنے والی حکومت کا حصہ بنیں۔ تو پاکستان اور بنگلہ دیش ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں۔

جمعتہ المبارک 17 رجب المرجب 1446ھ 17 جنوری 2025ء

کرپشن مافیا: سزا و جزا

یوں تو پاکستان کی تاریخ کرپشن کے ایسے کئی سنسنی خیز مقدمات سے بھری پڑی ہے جس میں پاکستان کے کئی حکمرانوں کو مقدمات کا سامنا کرنے کے ساتھ سزاؤں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اسلام آباد کی احتساب عدالت جج ناصر جاوید رانا نے اڈیالہ جیل میں 18 دسمبر 2024 کے بعد تین مرتبہ مؤخر اور محفوظ کئے گئے 190 ملین پاؤنڈز کیس میں بالآخر عمران خان، بشریٰ بی بی، ان کے وکلاء اور تحریک انصاف کی قیادت کی موجودگی میں 17 جنوری 2025 کو سابق وزیر اعظم عمران خان کو 14 سال قید اور 10 لاکھ روپے جرمانے اور ان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کو سات برس قید اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی ہے۔ عمران خان اور بشریٰ بی بی کے خلاف 190 ملین پاؤنڈز یا القادر ٹرسٹ کیس میں 450 کنال سے زیادہ زمین جو نجی ہاؤسنگ سوسائٹی بحریہ ٹاؤن کی جانب سے القادر یونیورسٹی کو عطیہ میں دی گئی تھی، القادر یونیورسٹی کو بھی سرکاری تحویل میں لینے کا حکم دیا ہے۔

عدالتی فیصلے کے مطابق مقدمہ کی سماعت کے دوران استغاثہ کی جانب سے جو گواہان پیش کیے گئے، ملزمان کے وکلا یعنی عمران خان اور بشریٰ بی بی کی دفاعی ٹیم انہیں جھٹلا نہیں سکی۔ استغاثہ کا مقدمہ بنیادی طور پر دستاویزی شواہد کے گرد بُنا گیا تھا، جسے ناقابل تردید شواہد کی مدد سے عمران خان اور بشری بی بی کے خلاف کامیابی سے ٹھوس اور جامع انداز میں ثابت کیا گیا۔ پراسیکیوشن کے شواہد میں چند تضادات موجود ہو سکتے ہیں جو ایسے وائٹ کالر جرم میں فطری ہوتے ہیں لیکن متعدد مواقع ملنے کے باوجود وکیل دفاع پراسیکیوشن کے مقدمے کو جھٹلانے میں ناکام رہے۔

عمران خان اور ان کی اہلیہ بشریٰ بی بی سمیت 8 افراد کے خلاف 190 ملین برطانوی پاؤنڈ یا القادر ٹرسٹ ریفرنس اسلام آباد کی احتساب عدالت میں یکم دسمبر 2023 میں دائر کیا گیا تھا۔ آٹھ میں سے دو ملزمان یعنی عمران خان اور ان کی اہلیہ پر اس مقدمے میں فردِ جرم 27 فروری 2024 میں عائد کی گئی تھی اور دونوں نے صحتِ جرم سے انکار کیا تھا۔ احتساب عدالت کی جانب سے اس مقدمے میں پانچ ملزمان کو اشتہاری بھی قرار دیا گیا ہے جس میں عمران خان کے مشیر شہزاد اکبر، سابق وزیر زلفی بخاری، نجی ہاؤسنگ سوسائٹی کے سربراہ ملک ریاض، اُن کے بیٹے اور بشریٰ بی بی کی دوست فرح شہزادی شامل ہیں۔ عدالت نے اُن کے دائمی وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے ہیں اور ان کی پاکستان میں جائیدادیں قرق کرنے کا بھی حکم دے رکھا ہے۔ اس مقدمے کی احتساب عدالت میں سماعت کے دوران نیب کی جانب سے مجموعی طور پر 35 گواہان کو پیش کیا گیا تھا جن میں عمران خان کی کابینہ میں شامل دو وفاقی وزرا پرویز خٹک اور زبیدہ جلال بھی شامل تھیں۔

نیب نے عمران خان اور ان کی اہلیہ کے خلاف القادر یونیورسٹی ٹرسٹ کے نام پر پنجاب کے شہر جہلم میں واقع سینکڑوں کنال اراضی سے متعلق انکوائری کو باقاعدہ تحقیقات میں تبدیل کیا تھا، نیب کے حکام اس سے قبل اختیارات کے مبینہ غلط استعمال اور برطانیہ سے موصول ہونے والے رقم کی وصولی کے عمل کی انکوائری کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہی کیس ہے جس میں عمران خان کو 9 مئی 2023 کو اسلام آباد ہائی کورٹ کے احاطے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر احتساب عدالت کی جانب سے اس کیس میں عمران خان کی درخواست ضمانت مسترد ہوئی تھی جس کے بعد اسلام آباد ہائی کورٹ نے دس لاکھ روپے مچلکوں کے عوض عمران خان کی ضمانت کی درخواست منظور کر لی تھی۔

یہ معاملہ اُس وقت سامنے آیا جب 2019 میں سابق وفاقی وزیر فیصل واڈا سے منسوب ایک بیان میڈیا کی زینت بنا کہ کابینہ کے اجلاس میں ایک ایسے معاملے کی منظوری لی گئی ہے جس کے بارے میں کابینہ کے ارکان کو پہلے آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور ایک بند لفافے میں برطانوی ادارے نیشنل کرائم ایجنسی

اور حکومت پاکستان کے درمیان طے پانے والے ایک معاہدے کے بارے میں اس وقت کے احتساب سے متعلق عمران خان کے مشیر شہزاد اکبر نے کابینہ کے ارکان کو زبانی طور پر آگاہ کیا تھا۔ فیصل واڈا کے بقول اس معاملے پر اُس وقت وفاقی کابینہ میں موجود فواد چوہدری اور شیریں مزاری نے بھی سوالات اٹھائے تھے۔

یاد رہے کہ کیبنٹ ڈویژن کے رولز کے مطابق وفاقی کابینہ میں کوئی بھی معاملہ زیر بحث لانے سے سات روز قبل اسے سرکولیٹ کرنا ہوتا ہے اور نیب حکام کی جانب سے اس ضمن میں جو احتساب عدالت میں ریفرنس دائر کیا گیا اس میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ وہ کیا جلدی تھی کہ اس معاملے کو سات دن پہلے کابینہ ممبران کو سرکولیٹ نہیں کیا گیا؟

نیب کا الزام ہے کہ "یہ معاملہ عطیے کا نہیں بلکہ بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض اور عمران خان کی حکومت کے درمیان طے پانے والے ایک مبینہ خفیہ معاہدے کا نتیجہ ہے جس کے تحت نجی ہاؤسنگ سوسائٹی بحریہ ٹاؤن کی جو 190 ملین پاؤنڈ یا 60 ارب روپے کی رقم برطانیہ میں منجمد ہونے کے بعد پاکستانی حکومت کے حوالے کی گئی، وہ بحریہ ٹاؤن کراچی کے کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اس سوسائٹی کے ذمے واجب الادا 460 ارب روپے کی رقم میں ایڈجسٹ کر دی گئی تھی۔ پھر اس کے عوض بحریہ ٹاؤن نے مارچ 2021 میں القادر یونیورسٹی ٹرسٹ کو ضلع جہلم کے علاقے سوہاوہ میں 458 کنال اراضی عطیہ کی اور یہ مبینہ معاہدہ بحریہ ٹاؤن اور عمران خان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کے درمیان ہوا تھا۔"

نیب کی جانب سے دائر کیے گئے ریفرنس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عمران خان کے دور میں 6 نومبر 2019 کو برطانیہ کے نیشنل کرائم ایجنسی کے ساتھ ڈیڈ سائن کی جبکہ رقم کی پہلی قسط 29 نومبر 2019 کو سپریم کورٹ کے اکاؤنٹ میں آچکی تھی جبکہ وفاقی کابینہ سے اس ڈیڈ کی منظوری 3 دسمبر 2019 کو لی گئی اور وفاقی کابینہ کو یہ تک نہیں بتایا گیا تھا کہ پہلی قسط پاکستان پہنچ چکی ہے۔ نیب کے مطابق پاکستان کے ایسٹ ریکوری یونٹ، جس کی سربراہی شہزاد اکبر کر رہے تھے اور نیشنل کرائم ایجنسی کے درمیان بات چیت 2018 سے جاری تھی اور معاملات پر مبینہ طور پر پردہ ڈالنے کیلئے بعد میں کابینہ سے منظوری لی گئی۔ نیب حکام کے مطابق ملک کا کوئی قانون یہ نہیں کہتا کہ نیشنل کرائم ایجنسی اور ایسٹ ریکوری یونٹ کے درمیان سائن ہونے والی ڈیڈ کو پبلک نہیں کیا جائے گا۔ عمران خان اور بشریٰ بی بی کے خلاف دائر اس ریفرنس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ برطانیہ سے آنے والے یہ پیسے وفاقی حکومت کے اکاؤنٹ کی بجائے سپریم کورٹ کے اکاؤنٹ میں منگوائے گئے۔ اس طرح ملزم عمران خان نے بطور وزیر اعظم فیور دی جس کے بدلے میں ڈونیشن (عطیہ) ملا۔ نیب آرڈیننس کے تحت اگر معاملہ پبلک افس ہولڈر کے پاس زیر التوا ہو تو اس شخص سے کوئی بھی چیز لینا رشوت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ریفرنس میں یہ بھی الزام عائد کیا گیا تھا کہ بشریٰ بی بی کی دوست ملزمہ فرح شہزادی کے نام پر بھی 240 کنال اراضی منتقل ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس مقدمے کے ایک اور ملزم زلفی بخاری کے نام پر بھی جب زمین ٹرانسفر ہوئی تو اس وقت بھی ٹرسٹ کا وجود تک نہیں تھا۔

عمران خان اور دیگر ملزمان ان الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے ٹرسٹیز میں عمران خان اور ان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کے علاوہ تحریکِ انصاف کے رہنما زلفی بخاری اور بابر اعوان شامل تھے تاہم بعد ازاں یہ دونوں اس ٹرسٹ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اس وقت وفاقی کابینہ کے اجلاس کے بعد اس مبینہ خفیہ معاہدے سے متعلق کچھ تفصیلات بھی منظر عام پر لائی گئی تھیں۔ ان دستاویزات پر عمران خان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کے بطور ٹرسٹی القادر یونیورسٹی پراجیکٹ ٹرسٹ کی جانب سے دستخط موجود تھے۔ دوسری جانب پاکستان تحریک انصاف کی قیادت اور اس کیس میں پیش ہونے والے وکلا اس

ریفرنس کو "سیاسی مقدمہ" قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ملک کے قانون میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ وفاقی کابینہ کے فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

پی ٹی آئی کا مؤقف ہے کہ جس رقم سے متعلق ریفرنس بنایا گیا وہ عمران خان کے اکاؤنٹ میں نہیں گئی بلکہ سپریم کورٹ کے اکاؤنٹ میں موجود ہے اور حکومت کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ یہ رقم وہاں سے سرکاری خزانے میں جمع کروا سکتی ہے۔ نیشنل کرائم ایجنسی کے ساتھ معاہدے کے بعد پاکستان کو جو رقم موصول ہوئی وہ 190 ملین پاؤنڈ نہیں بلکہ 171 ملین پاؤنڈ تھی۔ دوسری طرف حکومت نے 190 ملین پاؤنڈ کیس کو "میگا کرپشن سکینڈل" قرار دیتے ہوئے کہا الزام لگایا کہ پاکستانی پراپرٹی ٹائیکون ملک ریاض کی پاکستان سے برطانیہ منی لانڈرنگ کی رقم برطانوی نیشنل کرائم ایجنسی نے پاکستانی حکومت کے حوالے کی جو پاکستانی عوام کی امانت تھی۔ این سی اے نے تو اپنا وعدہ پورا کیا مگر عمران نے اپنے معاون شہزاد اکبر کی وساطت سے یہ رقم پاکستان کے قومی خزانے میں پہنچنے کی بجائے سیدھی سپریم کورٹ کے اس اکاؤنٹ تک پہنچا دی جس میں ملک ریاض بحریہ ٹاؤن کراچی کے مقدمے میں سپریم کورٹ کو 460 ارب روپے کے ایک تصفیے کے ذریعے قسطوں میں ادائیگی کر رہے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ "یہ کیسا ٹرسٹ ہے جس کا پیسہ بزنس ٹائیکون (ملک ریاض) کا اور ٹرسٹی میاں بیوی بن رہے ہیں۔" برطانوی نیشنل کرائم ایجنسی (این سی اے) کی طرف سے ملنے والی یہ رقم "پاکستان کے عوام کی امانت تھی، کابینہ سے بند لفافہ منظور کروا کر پاکستانی قوم کو اتنا بڑا ٹیکہ لگانے کا عمران کے پاس کیا جواز تھا؟"

ایک زمانہ تھا کہ ملک ریاض کا شمار پاکستان کے امیر ترین افراد میں کیا جاتا تھا۔ پاکستان میں ان کے رہائشی منصوبوں کی شہرت یہاں تک تھی کہ ان کی کامیابی کے چرچوں کے ساتھ ان کے انٹرویوز کبھی ٹی وی پر اور اخبارات کی زینت بنتے رہے۔ باپ بیٹا دونوں نیب کو 190 ملین پاؤنڈ ریفرنس میں مطلوب ہیں۔ اسلام آباد کی ایک احتساب عدالت نے ایک سال قبل 190 ملین پاؤنڈ کیس میں ملک ریاض کو اشتہاری قرار دیا جبکہ ان کے بیٹے احمد علی ریاض سمیت پانچ ملزمان کی جائیدادیں منجمد کر دی ہیں۔ عدالت نے ان کی مسلسل عدم پیشی پر انہیں گرفتار کرنے اور ان کے ملک میں موجود اثاثے منجمد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب ملک ریاض اور ان کے بیٹے علی ریاض دبئی میں ایک نئے کاروبار کا آغاز کر کے وہی مقیم ہیں۔

ملک ریاض اور ان کے بیٹے احمد علی ریاض کے اثاثوں کی تفصیلات نیب نے عدالت کے سامنے پیش کی ہیں مگر یہ اثاثے ایک مختلف کہانی سنا رہے ہیں۔ عدالت کو ملک ریاض کی نیب کے ذریعے اثاثوں کی جو دستاویزات موصول ہوئی ہیں اس میں انہیں بحریہ ٹاؤن لمیٹڈ کا چیف ایگزیکٹو افسر ظاہر کیا گیا ہے مگر بحریہ ٹاؤن کو ان کی ملکیت میں کہیں ظاہر نہیں کیا گیا۔ ملک ریاض اور ان کے بیٹے کے نام پر اسلام آباد اور راولپنڈی میں چند پلاٹس (کیھوٹ) اور بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات عدالت کو دی گئی ہیں۔ نیب کے مطابق یہ ملک ریاض اور ان کے بیٹے کے معلوم اثاثے ہیں یعنی ایسے اثاثے جو ان کے نام پر ہیں وہ ریونیو حکام نے نیب کو بھیجے اور نیب نے عدالت میں جمع کرا دیے۔ نیب نے احتساب عدالت میں ملزمان کی ملکیتی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں کی تفصیلات جمع کرائی ہیں۔

ان عدالتی دستاویزات کے مطابق کاغذوں کی حد تک ملک ریاض اور ان کے بیٹے کے پاس نہ کوئی گاڑی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی چھت میسر ہے مگر 190 ملین پاؤنڈز کے ریفرنس تک کے سفر میں اثاثوں کی فہرست اتنی سکڑ کیسے گئی؟ کیا ملک ریاض اور علی ریاض بحریہ ٹاؤن میں شیئر ہولڈرز تک بھی نہیں ہیں ؟ تاہم بحریہ ٹاؤن کی جو تفصیلات عدالت کے سامنے پیش کی گئی ہیں، یہ پورے نظام انصاف کی وضاحت کر دیتی ہیں۔ ملک میں یہ عام کلچر ہے کہ زیادہ پیسے والے لوگ اپنے نام اثاثے نہیں رکھتے اور ان کے ایسے اثاثے بے نامی ہوتے ہیں۔ اس وقت ملک میں "ٹرانفسر آف پراپرٹی ایکٹ" پر عملدرآمد نہیں ہو رہا اور نجی رہائشی سکیمیں اپنے رہائشیوں کے ساتھ ایگریمنٹ ٹو سیل اور پھر "سیل ڈیڈ" کرنے کی بجائے صرف انہیں پلاٹ یا گھر خریدنے کے بدلے "الاٹمنٹ لیٹرز" جاری کرتی ہیں، جس کی وجہ سے قومی خزانہ ٹیکس سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

ملک ریاض نے ماضی میں سرکار کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے منفرد انداز ہی اختیار کیے رکھا ہے۔ ملک ریاض نے نیب کے ساتھ جتنی بھی پلی بار گین کی ہیں ان میں انہوں نے نیب کو پیسہ کسی تیسرے شخص کے ذریعے ادا کیا اور اس پلی بار گین کا نام پیکج بار گین رکھا گیا، جو ایک ایسی اصطلاح تھی جس کا نیب کے اپنے قانون میں کوئی ذکر موجود نہیں۔ اس پیکج بار گین میں یہ بات لکھی ہوتی تھی کہ فلاں ریفرنس میں اب نیب ملک ریاض اور شریک ملزمان کو گرفتار نہیں کرے گا اور فائل کا منہ ہمیشہ کیلئے بند رہے گا۔

واضح رہے کہ اس سے پہلے احتساب عدالت کے جج محمد بشیر نے جہاں ملک ریاض اور ان کے بیٹے کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں منجمد کرنے کے احکامات جاری کیے وہیں انہوں نے سابق وزیر اعظم کے معاونین زلفی بخاری اور شہزاد اکبر، فرح خان گوگی اور ایک وکیل ضیاالمصطفیٰ نسیم کی جائیدادیں بھی منجمد کرنے کا بھی حکم دیا تھا۔ عدالت نے ملک بھر کے ریونیو افسران کو ملزمان کی غیر منقولہ جائیدادیں ضبط کرنے کا حکم دیا جبکہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن افسران کو ان کے ناموں پر رجسٹرڈ گاڑیاں ضبط کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔ عدالت نے کمرشل بینکوں کو ہدایت کی کہ وہ ان کے کھاتوں کو منجمد کریں اور لین دین یا سرمایہ نکالنے کی اجازت نہ دیں۔ عدالت نے ان ملزمان کی ملکیتی جائیدادوں سے کرائے کی آمدنی حاصل کرنے کیلئے نیب کے ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر کو بطور رسیور بھی مقرر کیا۔

تاہم یہ کونسا کوئی پہلی بار ہوا ہے کہ جائیداد ضبطگی کا حکم دیا گیا ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس وقت ملک میں عدالتی فیصلوں پر عملدرآمد کروانا ایک بڑا چیلنج ہے۔ سپریم کورٹ نے ملک ریاض اور ان کے رہائشی منصوبے بحریہ ٹاؤن سے متعلق متعدد فیصلے دیے مگر کئی برس گزرنے کے باوجود آج تک جنگلات کی زمینیں تک واپس نہیں لی جاسکی ہیں اور ملک ریاض تحقیقات کا حصہ بننے کیلئے ایک بار بھی نیب کے سامنے پیش نہیں ہوئے ہیں۔

عدالت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ معاملات کی چھان بین کرائے تاہم ان کے مطابق عدالت کو خود نیب جیسے ادارے بھی اصل صورتحال سے آگاہ نہیں کرتے اور گواہان بھی حقائق سے پردہ نہیں اٹھاتے اور پھر آخر میں ایسے بااثر ملزمان باآسانی بری ہو جاتے ہیں اور منجمد اثاثے پھر واپس انہی ہاتھوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے ایک بینچ نے برطانیہ سے 190 ملین پاؤنڈز قومی خزانے میں جمع کرانے کا حکم دیا تھا۔

ملک ریاض القادر ٹرسٹ کیس میں اشتہاری قرار دیے جاچکے ہیں۔ پاکستان میں ملک ریاض سیاسی جماعتوں، میڈیا کے ساتھ ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اپنے روابط کیلئے جانے جاتے ہیں اور اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر مشکل سے نکلنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں تاہم انہوں نے 28 مئی 2024 کو

سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر اپنی پوسٹ میں دعویٰ کیا تھا کہ قومی احتساب بیورو (نیب) کے حکام نے بحریہ ٹاؤن راولپنڈی کے دفاتر پر چھاپہ مارا ہے اور یہ سب کچھ ان پر "دباؤ ڈالنے" اور "وعدہ معاف گواہ" نہ بننے کے نتیجے میں کیا جا رہا ہے لیکن ملک ریاض وعدہ معاف گواہ نہیں بنے گا۔ کسی بھی سیاسی اقتدار کی جدوجہد میں فریق نہ بننے کے اپنے عوامی اعلان کے بعد، مجھے کھلی توڑ پھوڑ اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل 26 مئی کو سوشل میڈیا پلیٹ فارم ٹوئٹر پر ایک ذو معنی ٹویٹ کرتے ہوئے ملک ریاض نے لکھا تھا کہ انہیں "سیاسی مقاصد کیلئے دباؤ" کا سامنا ہے، وہ کسی صورت نہیں جھکیں گے۔ وعدہ معاف گواہ بننے کے متعلق "اوور مائی ڈیڈ باڈی" کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا" کٹھ پتلی نہیں بنیں گے"۔

بروز سوموار 20 رجب المرجب 1446ھ 20 جنوری 2025ء

لڑا دے ممولے کو شہباز سے

بدھ 15 جنوری 2025ء کو بالآخر وزیرِ اعظم شیخ محمد بن عبد الرحمان الثھانی نے قطر میں پریس کانفرنس کے دوران اقوامِ عالم کو کئی مہینوں سے درپردہ اسرائیل اور حماس کے حکام قطر، مصر اور امریکی ثالثوں کے ذریعے مذاکرات کے نتیجے میں جنگ بندی کے اس معاہدے کی تصدیق کر دی ہے جس میں اسرائیلی فوجوں کے غزہ سے انخلا، حماس کی جانب سے یرغمالیوں کی رہائی اور اسرائیل کی جانب سے فلسطینی قیدیوں کی رہائی شامل ہوگی۔ معاہدے کا آغاز گزشتہ روز اتوار 19 جنوری سے شروع ہو گیا ہے، حماس نے 3/ اسرائیلی ریڈ کراس کے حوالے کر دیئے جس کے جواب میں 69 خواتین اور 21 فلسطینی نوجوانوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔

غزہ میں جنگ جنوبی اسرائیل پر 7 اکتوبر 2023 کو شروع ہوئی تھی۔ اس حملے میں تقریباً 1200 افراد ہلاک اور 251 شہریوں کو یرغمال بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد اسرائیل نے حماس کو تباہ کرنے کیلئے غزہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ کے غزہ میں وزارتِ صحت کے مطابق 46 ہزار 640 افراد شہید ہو چکے ہیں جبکہ حقیقت میں شہداء کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ حماس کے حملے اور اس کے نتیجے میں اسرائیلی ردِ عمل نے خطے کی صورتحال کو ہمیشہ کیلئے بدل کر رکھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر حماس نے غزہ کے سب سے مربوط حملے کی ابتدا کیسے کی؟

سنیچر (ہفتہ) یہودیوں کیلئے "سیبیتھ" کا دن تھا جس کا مطلب ہے کہ بہت سے خاندان گھروں میں، دوستوں سے ملاقاتوں یا پھر عبادت گاہوں میں وقت بتانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے یا شائد بہت سے اسرائیلی سو رہے ہوں گے کہ اچانک صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے وسعت اور منصوبہ بندی کے حساب سے غیر معمولی راکٹوں کی برسات نے دنیا بھر کو چونکا دیا۔ برسوں سے اسرائیل نے غزہ کی پٹی کو رکاوٹوں کے ذریعے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ تاہم حماس کی جانب سے چند ہی گھنٹوں میں یہ رکاوٹیں عبور کر لی گئیں۔ غزہ کی پٹی کو کنٹرول کرنے والی تنظیم حماس نے جو اکثر راکٹوں کے استعمال جیسی حکمت عملی استعمال کرتی رہی تھی، یہاں بھی اپنے جارحانہ حملوں میں انہی راکٹوں کا استعمال کیا۔ حماس کے اِن راکٹوں کے خلاف اسرائیل کا جدید "آئرن ڈوم" نامی دفاعی میزائل نظام عموماً مؤثر ثابت ہوتا ہے لیکن سنیچر کی صبح انتہائی مختصر وقت میں داغے گئے ہزاروں راکٹوں نے اس نظام کو غیر مؤثر کیسے کر دیا، یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے؟

راکٹوں کی اتنی بڑی تعداد ثابت کرتی ہے کہ اس حملے کی منصوبہ بندی مہینوں سے جاری تھی۔ حماس کا دعویٰ ہے کہ پہلے مرحلے میں پانچ ہزار راکٹ داغے گئے جبکہ اسرائیل کے مطابق داغے گئے راکٹوں کی تعداد حماس کی جانب سے بتائی گئی تعداد سے نصف تھی۔ غزہ کی پٹی سے 60 کلومیٹر دور اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب تک میں الارم بجنا شروع ہو گئے اور جلد ہی مغربی بیت المقدس اور دیگر شہروں میں جہاں جہاں میزائل گرے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔ راکٹوں کی اس برسات کے دوران حماس کے مسلح فدائی اُن مقامات پر اکٹھے ہوئے جہاں سے انہوں نے غزہ کو الگ کرنے والی رکاوٹیں عبور کرنا تھیں۔

واضح رہے کہ اسرائیل نے اپنی فوج اور آبادکاروں کو 2005 میں غزہ سے نکال لیا تھا لیکن اب تک غزہ کی فضا، سرحدوں اور ساحلوں پر اسرائیل کا ہی کنٹرول ہے۔ غزہ کی پٹی کے گرد کہیں کنکریٹ سے بنی دیوار ہے تو کہیں کانٹے دار باڑ نصب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فوجی چوکیاں موجود ہیں جبکہ ایسے ہی حملوں کی روک تھام کیلئے کیمرا نیٹ ورک اور سینسر بھی نصب تھے۔ چند ہی گھنٹوں میں اس رکاوٹ کو مختلف مقامات پر پار کر لیا گیا۔ حماس کے چند

فدائیوں نے تو اس رکاوٹ کو مکمل طور پر بائی پاس کیا جس میں فضائی گلائیڈرز بھی شامل تھے (غیر مصدقہ فوٹیج میں کم از کم سات ایسے فضائی گلائیڈرز اسرائیل میں دیکھے گئے)۔ چند فدائی کشتیوں کے ذریعے اسرائیل میں داخل ہوئے۔

اسرائیلی فوج کا کہنا ہے کہ اس کی جانب سے حماس کی دو کشتیوں کو اسرائیل میں داخل ہونے سے روکا گیا لیکن اس حملے کی خصوصیت کراسنگ پوائنٹس پر متعدد اور منظم حملے تھے۔ پانچ بج کر 50 منٹ پر حماس کے مسلح ونگ کے ٹیلی گرام اکاؤنٹ پر ابتدائی تصاویر شائع ہوئیں جو کریم شالوم کے مقام پر لی گئی تھیں۔ یہ اسرائیل میں غزہ سے داخل ہونے کیلئے سب سے جنوبی مقام ہے۔ ان تصاویر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ باڑ کے پار مسلح فدائی ایک فوجی چوکی پر حملہ آور ہوتے ہیں اور پھر زمین پر دو اسرائیلی فوجیوں کی خونیں لاشیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور تصویر میں پانچ موٹر سائیکلوں پر سوار مسلح فدائی خاردار رکاوٹ کے ایک حصے کو کاٹ کر داخل ہو رہے ہیں، ایک اور حصے پر ایک بلڈوزر کی مدد سے خاردار رکاوٹ کو گرایا جا رہا تھا۔ یہاں درجنوں مسلح افراد موجود تھے جن میں سے چند تقسیم کرنے والی رکاوٹ کو عبور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کریم شالوم سے تقریباً 43 کلومیٹر دور، غزہ کے شمال میں، حماس کی جانب سے ایریز کے مقام پر خاردار رکاوٹ کو پار کرنے کی ایک اور کوشش جاری تھی۔

یہاں سے جاری ہونے والی فوٹیج میں دیکھا گیا کہ کنکریٹ کے بیریئر پر دھماکہ ہوتا ہے جو حملے کے آغاز کا اشارہ ہے اور پھر ایک مسلح جنگجو اپنے ساتھیوں کی جانب ہاتھ لہرا کر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ دیتا ہے۔ بلٹ پروف جیکٹ پہنے، رائفلیں تھامے آٹھ جنگجو اسرائیلی فوجی چوکی کی جانب دوڑتے ہیں اور فائرنگ کرتے ہیں۔ اس ویڈیو میں آگے چل کر زمین پر اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں دکھائی دیتی ہیں جبکہ فدائی، جو واضح طور پر تربیت یافتہ اور منظم ہیں، کمپاؤنڈ میں تمام کمروں کا جائزہ لیتے رہے۔ غزہ کی پٹی پر سات سرکاری کراسنگ پوائنٹس ہیں جن میں سے چھ اسرائیل اور ایک مصر کے کنٹرول میں تھا۔ تاہم چند گھنٹوں کے اندر حماس نے پوری سرحد سے اسرائیلی علاقے میں گھسنے کا راستہ ڈھونڈ لیا۔

حماس کے جنگجو غزہ سے نکل کر ہر سمت میں پھیل گئے۔ اسرائیلی حکام سے حاصل شدہ معلومات سے علم ہوتا ہے کہ وہ 27 مقامات پر حملہ آور ہوئے اور بظاہر انہیں حکم تھا کہ وہ دیکھتے ہی گولی چلا دیں۔ حماس کے فدائی سب سے دور جس مقام تک پہنچے وہ غزہ کے مشرق میں 22 کلومیٹر دور اوفاکم کا قصبہ تھا۔ سدیروت میں فدائی ایک پک اپ ٹرک میں قصبے سے گزرے جو غزہ کے مشرق میں تین کلومیٹر دور ہے۔ تقریباً ایک درجن مسلح فدائی اشکیلون کی خالی سڑکوں پر دیکھے گئے جو ایریز کے شمال میں ہے۔ جنوبی اسرائیل کے متعدد مقامات پر ایسے ہی مناظر دیکھے گئے اور اسرائیلی حکام نے عام شہریوں کو گھروں میں چھپ جانے کی تاکید کی۔

اسرائیل کا کہنا ہے کہ ریئم کے قریب ایک صحرا میں ایک موسیقی فیسٹیول ہو رہا تھا جس میں بڑی تعداد میں نوجوان شرکت کر رہے تھے۔ ان مسلح نوجوانوں نے موسیقی فیسٹیول اور دیگر مقامات سے تقریباً 100 کے قریب فوجی اہلکار اور عام شہریوں کو اغوا کر کے غزہ لیجایا گیا۔ اسرائیلی آبادیوں کے ساتھ ساتھ حماس نے دو فوجی تنصیبات کو بھی نشانہ بنایا۔ ریئم سے سامنے آنے والی فوٹیج میں کئی جلی ہوئی گاڑیاں اس اڈے کے قریب سڑک پر نظر آتی ہیں۔ راکٹ حملے کی ابتدا کے چند گھنٹوں میں سینکڑوں اسرائیلی ہلاک ہو چکے تھے اور یہ سب ایک ایسے انداز میں ہوا جو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ چند گھنٹوں میں اسرائیل کے جنوبی علاقوں میں فوجی مدد پہنچنا شروع ہو گئی لیکن ایک وقت تک حماس کا غزہ سے باہر کافی علاقے پر کنٹرول تھا۔ حماس کے اس حملے کے بعد کی داستان سے آپ سب واقف ہیں کہ نیتن یاہو نے پہلے ردعمل کے طور پر یہ دھمکی دی تھی کہ حماس اور ان کے مددگاروں کی نسلیں بھی

ہمارے انتقام کو یاد رکھیں گی اور اس نے ایسا کر دکھایا اور خطے کے تمام مسلم ممالک کا ردعمل ایسا تھا جیسا کبوتر بلی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اب جنگ بندی پر بھی ابھی تک کسی کا تبصرہ تک نہیں آیا۔

دوسری جانب امریکی صدر جو بائیڈن نے بھی نائب صدر کملا ہیرس اور وزیر خارجہ انتھونی بلنکن کے ہمراہ پریس کانفرنس میں اس معاہدے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس معاہدے کے بعد غزہ میں لڑائی رک سکے گی، فلسطینی شہریوں کو انسانی امداد کی فراہمی ممکن بنائی جائے گی اور یرغمالیوں کو ان کے خاندانوں کے ساتھ 15 ماہ کی قید کے بعد ملنے کا موقع ملے گا۔ جو بائیڈن کے مطابق اس معاہدے تک پہنچنا آسان نہیں تھا اور یہ سب سے مشکل مذاکرات میں سے ایک تھے۔ ان کے مطابق "ایران گذشتہ دہائیوں کے مقابلے میں خاصا کمزور ہے اور حزب اللہ بھی "بری طرح کمزور ہو چکا ہے" جبکہ حماس نے بھی اپنے متعدد سینیئر رہنماؤں اور جنگجوؤں کی ہلاکت کے بعد اس معاہدے پر اتفاق کیا ہے"۔ تاہم اب بھی بہت سے اہم نکات موجود ہیں جو اسے مستقل جنگ بندی کا معاہدہ بننے سے روک سکتے ہیں۔ اس معاہدے کی تفصیلات کا تاحال باضابطہ طور پر اعلان تو نہیں کیا گیا لیکن مذاکرات سے جڑے اہلکاروں نے معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔

معاہدے کا مسودہ تین مراحل پر مشتمل ہے جس کے بارے قطری وزیرِ اعظم کو امید ہے کہ یہ "مستقل جنگ بندی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ ایک فلسطینی عہدیدار کے مطابق مجوزہ امن منصوبے کا پہلا مرحلہ 42 دن یا 60 دن تک جاری رہنے والی جنگ بندی ہے۔ حماس معاہدے کے پہلے مرحلے میں 33 یرغمالیوں کو رہا کر کے اسرائیل واپس بھیجا جائے گا جس میں بچے، خواتین بشمول خواتین فوجی، 50 سال سے زائد عمر کے مرد، زخمی اور بیمار افراد شامل ہوں گے۔ اس کے بعد آئندہ ہفتوں میں مزید یرغمالیوں کی رہائی کا عمل روک دیا جائے گا۔ جنگ بندی کے پہلے روز حماس کی جانب سے یرغمال بنائے گئے 3 افراد کو فوری طور پر رہا کیا جائے گا۔

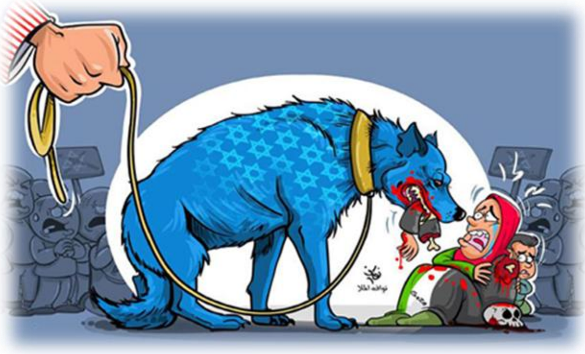

اسرائیل کا ماننا ہے کہ ان یرغمالیوں میں سے زیادہ تر زندہ ہیں لیکن حماس کی جانب سے ان کے بارے میں کوئی باضابطہ تصدیق نہیں کی گئی ہے۔ ان میں سے 94 غزہ میں موجود ہیں جن میں سے 34 ہلاک ہو چکے ہیں۔ 4 اسرائیلی ایسے بھی ہیں جنھیں جنگ سے پہلے اغوا کیا گیا تھا، جن میں سے دو ہلاک ہو چکے ہیں۔ جنگ بندی سے متعلق تجویز کردہ مسودے میں کہا گیا ہے کہ جنگ بندی کے 16 ویں دن اسرائیل اور حماس امن منصوبے کے دوسرے اور تیسرے مرحلے پر مذاکرات شروع کریں گے۔ اس میں فلسطینی قیدیوں کی رہائی کے بدلے باقی تمام زندہ یرغمالیوں کی واپسی شامل ہو گی۔ اسرائیل شمالی غزہ میں بے گھر ہونے والے رہائشیوں کو علاقے کے جنوب سے واپس آنے کی اجازت دے گا بشرطیکہ ہتھیاروں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ پیدل سفر کرنے والے افراد کو ساحلی روڈ کے ذریعے غزہ میں اپنے گھروں تک جانا ہو گا۔ جو لوگ گاڑیوں کے ذریعے سفر کریں گے انہیں صلاح الدین روڈ کے ذریعے وسطی غزہ میں داخلے کی اجازت ہو گی۔

یاد رہے کہ غزہ کی 23 لاکھ آبادی میں سے تقریباً تمام کو اسرائیلی انخلا کے احکامات، اسرائیلی حملوں اور جنگ کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑنے پڑے ہیں۔ جنگ بندی کے آغاز کے چند روز بعد اسرائیلی فوجی غزہ کی پٹی سے مرحلہ وار انخلا کے حصے کے طور پر وسطی غزہ میں نیتزاریم کوریڈور سے نکلنا شروع کر

دیں گے۔ تاہم اسرائیل مصر کے ساتھ غزہ کی جنوبی سرحد کے ساتھ فلاڈیلفیا کوریڈور میں کچھ فوجی رکھے گا۔ مصر اور غزہ کے درمیان رفح کراسنگ کو آہستہ آہستہ بیمار اور زخمی افراد کے علاج کیلئے علاقہ چھوڑنے کیلئے کھول دیا جائے گا اور مزید انسانی امداد کی اجازت دی جائے گی۔

جنگ بندی کے دوسرے فیز میں زندہ مرد فوجیوں اور شہریوں کو اسرائیل کے حوالے کیا جائے گا، جبکہ مارے جانے والے یرغمالیوں کی لاشیں بھی اسرائیل کے حوالے کی جائیں گی۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ غزہ میں اس وقت 94 یرغمالی موجود ہیں جن میں سے 34 افراد کی ہلاکت کی اطلاعات ہیں۔ اس کے علاوہ غزہ میں چار مزید اسرائیلی شہری بھی موجود ہیں جنہیں جنگ کے شروع ہونے سے قبل اغوا کیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق حماس کے جن فدائیوں نے 7 اکتوبر 2023 کو اسرائیل پر حملہ کیا تھا انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ تمام یرغمالیوں کی رہائی کے بعد ہی اپنے فوجیوں کو مکمل طور پر واپس بلالے گا۔ اس کے بعد یہ مبینہ طور پر غزہ کے مشرقی اور شمالی اطراف میں 800 میٹر چوڑے بفر زون برقرار رکھے گا جو اسرائیل کی سرحد سے متصل غزہ پر سیکورٹی کنٹرول برقرار رکھے گا۔ جنگ بندی کے معاہدے کا تیسرا فیز غزہ کی تعمیر نو سے متعلق ہے۔ خیال رہے کہ حماس اور اسرائیل کی جنگ کے دوران غزہ کا بڑا حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے لہٰذا اس مرحلے یعنی تعمیرِ نو کے کام میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔

اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگ بندی کے دوسرے اور تیسرے مرحلے پر کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ ان کے بارے میں مذاکرات ابتدائی جنگ بندی کے 16 ویں دن شروع ہوں گے لیکن اب بھی کچھ سوالات موجود ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ: غزہ کے انتظامی امور کس کے ہاتھ میں ہوں گے؟ اسرائیل غزہ کا انتظام حماس کو دینے کے حق میں نہیں ہے اور اس نے اس کے انتظامی امور فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے جو کہ غربِ اردن میں اسرائیل کے قبضے میں موجود متعدد علاقوں کا انتظام سنبھالتی ہے۔

اسرائیل موجودہ تنازع کے اختتام کے بعد بھی غزہ کی سیکورٹی کنٹرول اپنے ہاتھ میں چاہتا ہے تاہم اسرائیل امریکا اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ مل کر غزہ میں ایک عبوری انتظامیہ تشکیل دینے کے منصوبے پر کام کر رہا ہے جو فلسطینی اتھارٹی میں اصلاحات ہونے تک غزہ کا انتظام چلائے گی۔ اس وقت حماس شاید اس پریشانی کا بھی شکار ہو کہ کہیں جنگ بندی کا پہلا فیز مکمل ہونے کے بعد اسرائیل کسی مستقل معاہدے سے انکار ہی نہ کر دے۔ اگر اسرائیلی وزیر اعظم حماس کے ساتھ کسی امن عمل کیلئے راضی بھی ہو جاتے ہیں تب بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وہ اپنی کابینہ کو اس بات پر راضی نہ کر سکیں۔

اسرائیلی وزیر خزانہ بتسلئیل سموتریش اور قومی سلامتی کے وزیر ایتار بن غفیر ایسے کسی بھی معاہدے کے مخالف ہیں۔ سموتریش نے سوشل میڈیا پر لکھا کہ ایسا کوئی بھی معاہدہ اسرائیل کی قومی سلامتی کیلئے "قیامت خیز" ثابت ہو گا اور وہ اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ حماس کو مبینہ طور پر خدشہ ہے کہ اسرائیلی حکومت ان یرغمالیوں کی واپسی کے بعد ایک مرتبہ پھر سے غزہ پر حملے شروع کر سکتا ہے جنہیں امن منصوبے کے پہلے مرحلے کے دوران واپس لایا جانا ہے۔ دیگر تفصیلات بھی ہیں جو اس معاہدے کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

اسرائیل تمام یرغمالیوں کی واپسی چاہتا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ کون سے یرغمالی زندہ ہیں یا مر چکے ہیں اور ممکن ہے کہ حماس کے پاس ان میں سے کچھ کا سراغ تک نہ ہو۔ اسرائیل ان قیدیوں کو رہا کرنے سے بھی انکار کر رہا ہے جنہیں حماس رہا کروانا چاہتی ہے۔ ان میں مبینہ طور پر وہ لوگ بھی شامل ہیں جو 7 اکتوبر کے حملوں میں ملوث تھے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ اسرائیل غزہ کی سرحدوں پر مجوزہ بفر زون سے اپنے فوجیوں کو کب نکالے گا یا انہیں مستقل طور پر وہاں رکھے گا۔

تاہم اس حیران کن حملے کی برق رفتاری اوراس سے ہونے والے نقصان نے اسرائیل اوراس کے تمام حواریوں کو حیران کر دیا ہے کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا، ایک ایسا سوال ہے جو کئی برسوں تک پوچھا جاتا رہے گا لیکن یہ معمہ بھی ابھی تک حل نہیں ہوسکا کہ اسرائیل کی موساد جیسی خفیہ ایجنسی جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہمیں چڑیا کی چونچ میں پتھر کی منزل کی بھی خبر ہوتی ہے، وہ حماس کی اس منصوبہ بندی سے کیسے غافل رہی؟ کیاایسا تو نہیں کہ گریٹر اسرائیل کے قیام کیلئے اس کی اجازت دی گئی اور حماس کے ساتھ ان کی پشت پناہی کرنے والی قوتوں کو بھی ختم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

یادرہے کہ 1982ء میں قیام میں آنے والی حزب اللہ نے 2000ء میں اسرائیلی جارحیت کو بری طرح پسپائی پر مجبور کر دیا تو اسرائیل کے تمام اتحادی بھی ششدر رہ گئے اوراسی دن سے باقاعدہ ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ خطے میں اسرائیلی برتری کیلئے جہاں "عرب بہار" کے نام پر لیبیا اور دیگر ملکوں کو تاراج کیا جائے گا وہاں خطے کی عرب بادشاہتوں کو بھی واضح پیغام دیا جائے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ خطے کے حکمرانوں کی کمزوریوں کو استعمال کرتے ہوئے "حماس" کو تنہا کرنے کیلئے بتدریج کام شروع کیا گیا اور حماس نے 15 ماہ تک جس شجاعت، سرفروشی سے قربانیوں کی مثال قائم کی ہے، تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ بابا اقبال "ساقی نامہ" میں کیا خوب فرما گئے:

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چِیر دیتی ہے یہ
اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

بروز بدھ 22 رجب المرجب 1446ھ 22 جنوری 2025ء

سوشل میڈیا کا مؤثر اور مثبت استعمال: ایک ضرورت

سوشل میڈیا انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے جو دنیا بھر میں لوگوں کے باہمی رابطوں اور معلومات کی ترسیل میں انقلاب لے آیا ہے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کی ترقی کا ایک نمایاں مظہر ہے، جس نے نہ صرف مواصلات کو آسان بنایا بلکہ عوامی زندگی کے ہر شعبے میں گہرا اثر چھوڑا ہے۔ گزشتہ دنوں میڈیکل پیشہ میں انسانیت کی خدمت میں اپنی تحقیق کی بناء پر نمایاں عالمی حیثیت کے حامل میرے انتہائی محترم دوست نے مجھے لندن یو کے کے ایک مضمون "سوشل میڈیا پر ہمیں تقسیم کرنے کی متحرک قوتیں مزید بڑے تعلیمی ادارے (یو سی ایل اسکول آف مینجمنٹ) کے استاد ڈاکٹر کولن فشر کا خراب ہونے والی ہیں" پڑھنے کیلئے ارسال کر کے اس پر لکھنے کی دعوت دی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوشل میڈیا اس وقت دنیا بھر میں کس قدر مؤثر ہو چکا ہے کہ اب مغربی معاشرے کے دانشوروں کے خدشات بھی سامنے آرہے ہیں کہ سوشل میڈیا بالخصوص "میٹا" کے پلیٹ فارمز پر نفرت انگیز تقاریر اور جھوٹ کے سیلاب کے سامنے سچ کو بری طرح مسخ کیا جارہا ہے۔

آیئے آج اس مضمون میں، ہم سوشل میڈیا کی تاریخ، اس کے موجودہ حالات، فوائد اور نقصانات کے اثرات کا تحقیقی ریفرنسز کے ساتھ تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی شروعات 1990 کی دہائی میں ہوئی جب انٹرنیٹ عام ہوا۔ 1997 میں "سکس ڈگریز" کے نام سے پہلی سوشل میڈیا ویب سائٹ منظر عام پر آئی، جہاں صارفین پروفائل بنا سکتے تھے اور دوستوں کے ساتھ رابطہ کر سکتے تھے۔ 2004 میں "فیس بک" کے آغاز نے سوشل میڈیا کے منظر کو یکسر بدل دیا۔ 2006 میں "ٹویٹر" اور اب "ایکس" نے مائیکرو بلاگنگ کا تصور متعارف کرایا، جبکہ "واٹس ایپ" (2009) اور "انسٹاگرام" (2010) نے تصاویر اور پیغام رسانی کو عام کیا۔ جدید تحقیق کے مطابق، سوشل میڈیا کے استعمال میں 2010 کے بعد تیزی سے اضافہ ہوا، خاص طور پر اب تو موبائل انٹرنیٹ کے فروغ کے بعد طوفانِ بدتمیزی کے سامنے سچ کی روشنی پر جھوٹ اور ظلم کے اندھیرے سبقت لیتے دکھائی دے رہے ہیں۔

سوشل میڈیا کا استعمال دنیا بھر میں بے حد بڑھ چکا ہے۔ "وی آر سوشل" اور "ہوٹ سوئٹ" کی 2023 کی رپورٹ کے مطابق تقریباً 5 بلین لوگ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز استعمال کر رہے ہیں۔ ان پلیٹ فارمز کے ذریعے لوگ خبروں، تفریح، تعلیم، اور کاروبار سمیت مختلف مقاصد کیلئے جڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں بھی سوشل میڈیا کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) کی 2022 کی رپورٹ کے مطابق، ملک میں انٹرنیٹ صارفین کی تعداد 124 ملین سے تجاوز کر چکی ہے، جن میں سے ایک بڑی تعداد سوشل میڈیا استعمال کرتی ہے۔ فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ، انسٹاگرام، یوٹیوب، اور ٹک ٹاک نوجوانوں میں بے حد مقبول ہیں۔ سوشل میڈیا نے معلومات کی ترسیل کو نہایت آسان، سہل اور تیز رفتار بنا دیا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق 80 فیصد لوگ خبریں حاصل کرنے کیلئے سوشل میڈیا پر انحصار کرتے ہیں۔

سوشل میڈیا نے کاروبار کو ایک نئی جہت دی ہے۔ ای کامرس اور ڈیجیٹل مارکیٹنگ نے کاروباری اداروں کو اپنی مصنوعات اور خدمات دنیا بھر میں متعارف کرانے کا موقع دیا ہے۔ "ای کامرس جرنل" کے مطابق، سوشل میڈیا کے ذریعے کیے جانے والے کاروبار میں سالانہ 30 فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سوشل میڈیا تعلیمی مواد تک رسائی کا ایک اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ طلباء آن لائن لیکچرز، ویڈیوز، اور دیگر تعلیمی مواد سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ "یونیورسٹی آف کیلیفورنیا" کی ایک تحقیق کے مطابق، آن لائن تعلیم نے طلباء کی تعلیمی کارکردگی میں 25 فیصد تک بہتری پیدا کی ہے۔

سوشل میڈیا نے دور دراز کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ یہ پلیٹ فارم دوستوں اور خاندان کے افراد کے ساتھ رابطے میں رہنے کیلئے بہترین معاون ہیں۔ ہزاروں میل دور والدین، عزیز و اقارب سے رابطے کیلئے مہنگے داموں سے استعمال ہونے والے "زمینی اور موبائل فون" کو یکسر ختم کرتے ہوئے سوشل میڈیا نے درجنوں مفت پروگرامز کو متعارف کروا کے ایک انقلاب برپا کر دیا وہاں اس میڈیا نے ایک وقت میں درجنوں ممالک میں بیٹھے عزیز و اقارب کو ایک ہی وقت میں "ویڈیو لنک" کے ساتھ منسلک کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ ان اداروں نے دنیا بھر میں اپنے صارفین کو لاکھوں ڈالر خرچ کر کے یہ مفت خدمت کیوں فراہم کی ہے؟ "ہارورڈ بزنس ریویو" کی ایک تحقیق کے مطابق، سوشل میڈیا نے 60 فیصد لوگوں کی سماجی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔

دوسری طرف سوشل میڈیا کے غیر ضروری استعمال سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، اوسطاً ہر صارف روزانہ دو سے تین گھنٹے سوشل میڈیا پر گزارتا ہے۔ سوشل میڈیا پر موجود غیر حقیقی معیارات اور منفی تبصرے افراد کی ذہنی صحت پر منفی اثر ڈال سکتے ہیں۔ "امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن" "اے پی اے" کی تحقیق کے مطابق، سوشل میڈیا کا زیادہ استعمال ڈپریشن اور اینزائٹی میں 25 فیصد اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ سوشل میڈیا پر شیئر کی گئی معلومات کے غلط استعمال کے خطرات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ "سائبر سیکیورٹی جرنل" کے مطابق، 2021 میں دنیا بھر میں 80 فیصد ڈیٹا لیک کے کیسز سوشل میڈیا سے منسلک تھے۔ سوشل میڈیا پر جھوٹی خبریں اور افواہیں پھیلانا آسان ہو گیا ہے، جو سماجی اور سیاسی مسائل کو جنم دے سکتی ہیں۔ "رپوٹرز انسٹی ٹیوٹ" کی ایک رپورٹ کے مطابق 70 فیصد لوگ غلط معلومات کو بغیر تحقیق کے شیئر کرتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی سب سے بڑی خرابیوں میں سے ایک اس کا سیاسی مقاصد کیلئے غلط استعمال ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک، جیسے پاکستان، میں سیاسی جماعتیں اور دیگر عناصر سوشل میڈیا کا استعمال پروپیگنڈا پھیلانے اور اپنے مخالفین کو بدنام کرنے کیلئے کرتے ہیں۔ جھوٹی خبروں اور گمراہ کن معلومات کے ذریعے عوام کو بھڑکایا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں سیاسی انارکی پیدا ہوتی ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں دشمن ممالک بھی سوشل میڈیا کے ذریعے سیاسی اور سماجی مسائل کو ہوا دینے میں ملوث ہیں۔ "عالمی میڈیا" کی ایک رپورٹ کے مطابق، بعض ممالک منظم طریقے سے فیک اکاؤنٹس اور بوٹس کے ذریعے غلط معلومات پھیلاتے ہیں تاکہ پاکستان میں عدم استحکام پیدا کیا جا سکے۔ یہ پروپیگنڈا مقامی تنازعات کو بڑھاوا دینے اور عوام کو تقسیم کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

کمیونٹی نوٹس کے نظام اکثر منظم گروہوں کے سیاسی ایجنڈوں کے ذریعے استحصال کے خطرے سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، چینی قوم پرستوں نے مبینہ طور پر ویکیپیڈیا میں چین-تائیوان تعلقات سے متعلق اندراجات کو چین کے حق میں تبدیل کرنے کیلئے کامیاب مہم چلائی ہے اور وہ کسی حد تک اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح انڈین اور اسرائیلی خفیہ ایجنسیاں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کیلئے سوشل میڈیا کو بے دریغ استعمال کر رہی ہیں۔

جھوٹے بیانیے سیاسی اختلافات کو بڑھاوا دیتے ہیں جس کی بناء پر سیاسی استحکام کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ عوام کے درمیان نفرت پیدا ہونے کی وجہ سے معاشرتی تفریق میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ دشمن عناصر کی طرف سے چلائے جانے والے مہمات قومی سلامتی کیلئے خطرہ بنتے ہیں اور یہی خطرات ہمسایہ ممالک کے درمیان محبت والفت پیدا کرنے کی بجائے ایسی دشمنی کی بنیاد رکھ رہے ہیں جن سے ملکوں کی سلامتی کے خطرات اس قدر بڑھ جاتے ہیں

کہ دشمن قوتیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگ کی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں جن سے لاکھوں افراد کی زندگیاں داؤ پر لگ جاتی ہیں۔ یقیناً ایک دن کی جنگ بھی ملکوں کو ترقی کو سالوں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

گزشتہ تین سال سے مصنوعی انٹیلی جنس نے سوشل میڈیا کے دیگر پروگرامز پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس کے فوائد میں سرفہرست مصنوعی انٹیلی ڈیٹا اینالیسز، پروڈکٹ ڈیزائن، اور آٹومیشن جنس پیچیدہ کاموں کو تیزی اور مؤثر طریقے سے انجام دیتا ہے۔ خاص طور پر صنعتی اور کاروباری شعبوں میں وقت اور لاگت کی بچت ہوتی ہے۔ صحت کے شعبے میں مریضوں کی تشخیص، ایکس رے، ایم آر آئی اور اسکینز کے فوری نتائج حاصل ہو جاتے ہیں۔ روبوٹک سرجری اور ذاتی نوعیت کے علاج کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔

مصنوعی انٹیلی جنس تعلیم میں بہتری کی بنیاد پر تعلیمی پلیٹ فارمز پر طلباء کی ضروریات کے مطابق مفید مواد فراہم کرتی ہے۔ آن لائن لرننگ کو آسان اور زیادہ انٹرایکٹو بنایا جا رہا ہے۔ ٹرانسپورٹیشن میں انقلاب لاتے ہوئے خودکار گاڑیاں پر مبنی نیویگیشن سسٹم کی مدد سے سفر کو محفوظ اور مؤثر بناتے ہوئے قیمتی وقت کی بچت کا کام لیا جا رہا ہے۔ مصنوعی انٹیلی جنس نے خاص طور پر ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل معیشت میں نئی صنعتوں اور روزگار کے مواقع پیدا کیے ہیں۔ مصنوعی انٹیلی جنس کے فوائد کے ساتھ اس کے نقصانات کو بھی جاننا ضرور ہے۔ مصنوعی انٹیلی جنس پر مبنی آٹومیشن کی وجہ سے خاص طور پر روایتی اور مینویل کاموں میں بہت سے ملازمتیں ختم ہو رہی ہیں۔ مصنوعی انٹیلی جنس میں سسٹمز کو تربیت دینے کیلئے بہت زیادہ ڈیٹا کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے پرائیویسی کی خلاف ورزی کا خطرہ بڑھتا ہے۔

الگورتھمز میں تعصب یا غلط معلومات شامل ہو سکتی ہیں، جو غیر منصفانہ فیصلوں کا باعث بن سکتی ہیں جس سے جانبداری اور عدم شفافیت کے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ سائبر حملوں، جعلی ویڈیوز (ڈیپ فیکس) اور دیگر مجرمانہ سرگرمیوں کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے سیکورٹی کے خطرات کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ مصنوعی انٹیلی جنس پر زیادہ انحصار انسانی فیصلوں اور جذباتی سمجھ بوجھ کو کمزور کر سکتا ہے جس سے اخلاقی اور معاشرتی مسائل بڑھ سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر جنگی نظاموں میں خودکار ہتھیاروں کے استعمال سے انسانی جانوں کا خطرہ بڑھ سکتا ہے جس کی واضح حالیہ مثال اسرائیل کی طرف سے حزب اللہ کے وائرلیس سسٹم (واکی ٹاکی) میں مخصوص سمز کے استعمال سے پہلے کئی ماہ ان کے نظام کی جاسوسی کی گئی اور بعد ازاں اسے ایک ہی اشارہ سے بلاسٹ کر کے سینکڑوں افراد کو ہلاک کر دیا گیا اور سینکڑوں کی تعداد میں عمر بھر کیلئے معذور کر دئے گئے۔

بہتر بنانے کے بے شمار مواقع فراہم کرتے ہیں لیکن اس کے اس میں شک نہیں کہ مصنوعی انٹیلی جنس اور دیگر سوشل میڈیا کے پروگرامز انسانی زندگی کو مؤثر اور محفوظ استعمال کیلئے مناسب قواعد و ضوابط اور اخلاقی حدود کا تعین ضروری ہے۔ معاشرے کو ان کے فوائد سے مستفید ہونے کیلئے نقصانات کو کم کرنے کی حکمت عملی نہ اپنائی گئی تو یہ کل دنیا کو تاریک کرنے کا پیشگی نوٹس بھی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے، جھوٹ اور غلط اطلاعات کو ایک سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ انسانی معاشرے میں انتشار اور فتنہ کا سبب بنتی ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث میں بہتان تراشی اور جھوٹ بولنے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جھوٹ بولنے والوں کو بدترین انجام کی وعید دی ہے:

اِذۡ تَلَقَّوۡنَہٗ بِاَلۡسِنَتِکُمۡ وَتَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاہِکُمۡ مَّالَیۡسَ لَکُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ وَّتَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا ٭ۖ وَّہُوَ عِنۡدَاللّٰہِ عَظِیۡمٌ،وَلَوۡ لَاۤاِذۡسَمِعۡتُمُوۡہُ قُلۡتُمۡ مَّایَکُوۡنُ لَنَاۤاَنۡ نَّتَکَلَّمَ بِہٰذَا ٭ۖ سُبۡحٰنَکَ ہٰذَابُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ(النور:15-16)

جب تم نے اس کو اپنی زبانوں سے نقل کیا اور اپنے منہ سے وہ کہا جس کا تمہیں علم نہ تھا، اور تم نے اسے معمولی سمجھا، حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت بڑی بات تھی۔

یٰۤاَیُّہَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤااِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤااَنۡ تُصِیۡبُوۡاقَوۡمًۢابِجَہَالَۃٍ فَتُصۡبِحُوۡاعَلٰی مَافَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ۔(الحجرات:6)

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔

میرے آقا ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جو شخص کسی مسلمان پر جھوٹا الزام لگائے، اسے جہنم کے پل پر روکا جائے گا یہاں تک کہ وہ اپنی بات سے رجوع کرے۔ (سنن ابی داؤد)

آج دنیا بھر کے دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ سوشل میڈیا پر پھیلائی ہوئی جھوٹی خبریں، اطلاعات اور دیگر مواد خانگی بربادی میں براکردار ادا کر رہا ہے اور یہی نہیں کہ اسی میڈیا کو کنٹرول کرنے والے اداروں کی مدد سے کئی ملکوں کو تاراج کر دیا گیا جس کی سب سے بڑی مثال عرب بہار کے نام پر چلائی گئی تحریک اور عراقی صدر صدام پر دنیا کو تباہ کرنے والے ہتھیاروں کا جھوٹا الزام لگا کر نہ صرف لاکھوں عراقیوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا بلکہ ہزاروں سال پرانی عراقی تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا گیا اور دوسری طرف لیبیا کے معمر قذافی جس نے اپنے ملک کے عوام کی سہولت اور مراعات کیلئے بے مثال خدمات انجام دیں اور لیبیا کو ایک بہترین فلاحی ریاست میں تبدیل کر دیا۔ اس کا محض قصور یہ تھا کہ اس نے اپنے ملک کو بیرونی اثرات اور دباؤ سے محفوظ کرنے کیلئے وقت کے فراعین کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور اپنے پٹرول کی فروخت کیلئے "امریکی ڈالر" میں لین دین سے انکار کر دیا تھا لیکن اسی میڈیا پر غلط خبریں چلائی گئیں کہ معمر قذافی کی ایئر فورس نے اپنے ہی شہر بن غازی میں بمباری کر کے 50 ہزار شہریوں کو ہلاک کر دیا لیکن اگلے ہی دن اس خبر سے انکار کر دیا گیا لیکن اس خبر کی آڑ میں لیبیا پر "نو فلائی زون" قائم کر کے معمر قذافی کے خلاف مہم شروع کر دی گئی جس کے نتیجے میں لیبیا جیسے خوشحال ملک میں خانہ جنگی شروع کروا دی گئی اور آج لیبیا کا پٹرول مکمل طور پر استعمار کے قبضے میں جا چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق، جھوٹ اور غلط اطلاعات کے پھیلاؤ کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اس سے نہ صرف معاشرتی امن تباہ ہو جاتا ہے بلکہ اس سے جہاں اعتماد کا فقدان پیدا ہوتا ہے بلکہ فتنہ و فساد کو ہوا ملتی ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں جھوٹی اطلاعات کے نتیجے میں نہ صرف سماجی تنازعات پیدا ہوتے ہیں بلکہ دشمن عناصر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر سیاسی انارکی کو ہوا دیتے ہیں۔ قرآن اور سنت کی تعلیمات کی روشنی میں، یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ تحقیق کے بغیر کسی خبر کو نہ پھیلائیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ بہترین تعلیم و تربیت کے ذریعے معاشرتی تعلیم کے ذریعے عوام کو اسلامی اصولوں کی اہمیت سے روشناس کرایا جائے اور تحقیقی شعور پیدا کر کے قرآن کی تعلیمات کے مطابق، ہر خبر کی تحقیق کو لازمی قرار دیا جائے اور بہتان تراشی اور جھوٹ کے پھیلاؤ کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے۔

اگر ہم ان اقدامات کی طرف آج ہی اپنا سفر شروع کر دیں تو آپ خود دیکھیں گے کہ سماجی مسائل اور حقوق کے بارے میں آگاہی پیدا ہونے سے لوگوں کے شعور کی بیداری سے روابط میں بہتری آنا شروع ہو جائے گی اور تعلیمی ترقی کے مواقع بھی وسیع ہونا شروع ہو جائیں گے جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ سوشل میڈیا کا زیادہ منفی استعمال سماجی تعلقات کو متاثر کر رہا ہے جس سے سماجی علیحدگی سے نوجوان نسل ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار ہو رہی ہے اور جھوٹی

معلومات اور پروپیگنڈا معاشرتی تفریق کا سبب بن رہے ہیں۔

یقیناً سوشل میڈیا کے مثبت نتائج سے قطعی انکار نہیں کہ اس سے لوگوں کے درمیان روابط میں بہتری آئی ہے اور وہ خاندان کے افراد جو یکسر ایک دوسرے کیلئے اجنبی بنتے جارہے تھے، ان کو آپس میں ملانے میں ایک مثبت کردار سامنے آرہا ہے۔ سماجی مسائل اور حقوق کے بارے میں آگہی اور ادراک پیدا ہورہا ہے، تعلیم کے مواقع پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں اور دنیا بھر کے کاروباری اداروں میں کام کرنے والے اب اپنے گھروں سے بیٹھ کر دفاتر کا کام سرانجام دیکر اربوں ڈالر کی بچت کرنے میں معاون ثابت ہورہے ہیں جس سے افراد کی زندگی میں جہاں سہولتوں میں اضافہ ہورہا ہے وہاں ڈیپریشن میں کمی اور معیارِ زندگی بہتر ہورہا ہے لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ سوشل میڈیا کے منفی اثرات کے نتیجے میں نوجوان نسل ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹی معلومات اور پروپیگنڈے کی بناء پر معاشرتی تفرقے کا شکار ہوکر خودکشیوں کی طرف بھی جلد مائل ہورہے ہیں جس سے کئی خاندان متاثر ہورہے ہیں۔

اس کیلئے اب ضروری ہوگیا ہے کہ سوشل میڈیا کے غلط استعمال کو روکنے کیلئے سخت قوانین نافذ کیے جائیں۔ عوام کو جھوٹی معلومات کی پہچان اور ان سے بچاؤ کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے فیک اکاؤنٹس اور غلط معلومات کی نشاندہی کیلئے استعمال کیا جائے ۔سائبر کرائم کے ساتھ سختی سے نمٹنے کیلئے مزید انقلابی تبدیلیوں کو متعارف کروایا جائے بلکہ سوشل میڈیا ٹیکنالوجی کے ماہرین کو آگے بڑھ کر ایسے محفوظ پروگرام متعارف کروانے کی ضرورت ہے جو اسے اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کی بقاء کیلئے محفوظ بنا سکیں۔

سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر اثرانداز ہورہا ہے۔ جہاں اس کے بے شمار فوائد ہیں، وہیں اس کے نقصانات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سوشل میڈیا کا استعمال اعتدال اور مثبت مقاصد کیلئے کریں تاکہ اس کے نقصانات سے بچا جاسکے اور اس کے فوائد سے بھرپور استفادہ کیا جاسکے۔ تحقیقی اداروں کی رپورٹس اور ماہرین کی تجاویز کے مطابق، سوشل میڈیا کا استعمال منظم اور تعمیری ہونا چاہیے تاکہ اس کے مثبت اثرات کو مزید فروغ دیا جاسکے۔

بروز جمعۃ المبارک 24 رجب 1446ھ 24 جنوری 2025ء

پاک بنگلہ دیش: دفاعی تعاون کی اہمیت

ہمارے خطے میں سیاست کا یہ چلن ہو گیا ہے کہ لوگوں کو مذہب کی آڑ میں اس قدر بزدل بنا دو کہ وہ محرومیوں کو قسمت اور ظلم کو آزمائش سمجھ کر صبر کر لیں ۔ حقوق کیلئے آواز اٹھانا گناہ سمجھیں، غلامی کو اللہ کی مصلحت قرار دیں اور قتل کو موت کا دن معین سمجھ کر چپ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلام قومیں بد کرداروں کو بھی دیوتا مان لیتی ہیں اور آزاد قومیں عمر بن خطاب جیسے بے مثل حکمرانوں کا بھی محاسبہ کرتی ہیں۔

جس دن ہم نے اپنے بچوں کو یہ ذہن نشین کرا دیا کہ ہمارے ہیرو وہ نہیں جو جنگ و جدل اور خون بہانے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں بلکہ ہمارے ہیرو تو وہ ہیں جو انسانی و حیوانی زندگی کا احترام اپنے رب کے خوف کا حکم سمجھ کر خود پر فرض کر لیتے ہیں، اور ان کی راتیں اللہ کے خوف سے سجدوں میں جھکی رہتی ہیں اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو کر اللہ کی ودیعت کردہ قوت کے ساتھ اس ظلم کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ہیرو ہمارے سائنسدان، قلمکار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہمارے استاد بنیں گے تو پھر ہی معاشرے سے ہمارے بچے جرائم اور تشدد سے نفرت کرنا سیکھیں گے۔ اس لئے اپنے بچوں کو حق اور باطل میں فرق سمجھاتے ہوئے ایسی زندگی سے محبت سکھائیں جو ہمیشہ کی اخروی زندگی کا زادِ راہ بن سکے۔

اس کی حالیہ مثال یوں ہے کہ صرف دو ہفتے قبل 2 جنوری کو میرے آرٹیکل "خوش گمانی یا بدگمانی" میں بنگلہ دیش کی ظالم ترین مفرور حسینہ کی سگی بھانجی ٹیولپ صدیق کی مبینہ بدعنوانی کا ذکر کیا تھا اور آج تمام عالمی میڈیا میں یہ خبر وائرل ہو رہی ہے کہ برطانوی کابینہ کی رکن ٹیولپ صدیق نے بنگلہ دیش میں اپنے خلاف بدعنوانی کے مقدمے کی تحقیقات کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ 42 سالہ ٹیولپ صدیق برطانوی وزارت خزانہ میں اقتصادی وزیر تھیں اور وہ بنگلہ دیش میں گذشتہ برس عوامی احتجاج کے بعد حکومت چھوڑنے والی سابق وزیرِ اعظم شیخ حسینہ واجد کی بھانجی ہیں۔

ٹیولپ صدیق پر الزام ہے کہ انہوں نے 2013 میں بنگلہ دیش اور روس کے درمیان ایک معاہدہ کروایا جس کے باعث بنگلہ دیش میں نیوکلیئر پاور پلانٹ کی کُل قیمت میں اضافہ ہوا۔ ٹیولپ صدیق کا نام بنگلہ دیش میں شیخ حسینہ کی حکومت کے دوران بدعنوانی کی تحقیقات کے حوالے سے سامنے آیا ہے اور الزام ہے کہ بنگلہ دیش میں ان کا خاندان مبینہ طور پر تین اعشاریہ نو ارب پاؤنڈ کی خُورد بُرد میں ملوث ہے۔ برطانوی وزیر کے طور پر خدمات انجام دینے کے دوران، ٹیولپ کا کام ملک کی مالیاتی منڈیوں میں ہونے والی بے ضابطگیوں سے نمٹنا بھی تھا۔ بنگلہ دیشی نژاد وزیر کی جانب سے وزارت چھوڑنے کا فیصلہ بنگلہ دیش میں بدعنوانی کی ایک اور تحقیقات میں شامل کیے جانے کے بعد کیا گیا ہے۔

صدیق لندن کی ہیمپسٹڈ اور ہائی گیٹ سیٹ سے لیبر پارٹی کے رکن پارلیمنٹ ہیں۔ اس سے قبل وہ شیخ حسینہ سے وابستہ افراد کی جانب سے لندن میں جائیدادوں کے استعمال پر بھی تحقیقات کی زد میں آچکی تھیں۔ برطانوی اخبار فنانشل ٹائمز نے اپنی ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا تھا کہ شیخ حسینہ کی حکومت سے وابستہ ایک شخص نے ٹیولپ کو کنگز کراس کے علاقے میں فلیٹ دیا تھا۔ میل آن لائن کی رپورٹ کے مطابق ٹیولپ نے 2022 میں یہ فلیٹ بطور تحفہ حاصل کرنے کی خبروں کو مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ فلیٹ ان کے والدین نے خریدا ہے۔ انہوں نے اخبار کو خبر شائع کرنے پر قانونی کارروائی کی دھمکی بھی دی تھی لیکن پھر لیبر پارٹی سے وابستہ ذرائع نے اخبار کو بتایا تھا کہ یہ فلیٹ ٹیولپ صدیق کو ایک پراپرٹی ڈویلپر نے تحفے میں دیا تھا، جس کے مبینہ طور پر ان کی خالہ شیخ حسینہ سے روابط تھے۔

برطانوی وزیراعظم کے مشیر سر لاؤری میگنس نے ایک ہفتے تک اس معاملے کی تحقیقات کیں۔ سر لاؤری نے تحقیقات کے بعد اپنے خط میں کہا کہ "ٹیولپ صدیق نے اعتراف کیا کہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ کنگز کراس میں ان کے فلیٹ کا اصل مالک کون ہے۔ ٹیولپ یہ فرض کر رہی تھیں کہ ان کے والدین نے یہ فلیٹ اس کے سابقہ مالک سے خرید کر انھیں تحفتاً دیا تھا اور یوں انہوں نے نادانستہ طور پر عوام کو فلیٹ دینے والے فرد کی شناخت کے بارے میں گمراہ کیا"۔

ان کے نانا شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش کے پہلے صدر تھے۔ 1975 میں جب ڈھاکہ میں فوجی بغاوت ہوئی تو مجیب الرحمان اور ان کے خاندان کے بیشتر افراد مارے گئے تاہم ٹیولپ کی والدہ ریحانہ اور ان کی بہن شیخ حسینہ بیرون ملک ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھیں۔ ان کی والدہ کو برطانیہ نے اس وقت سیاسی پناہ دی جب وہ بہت چھوٹی تھیں۔ ان کے والد ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور ان کی ٹیولپ کی والدہ سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی جہاں انھوں نے شادی کر لی اور اپنے خاندان کو لندن منتقل کر دیا۔

2017 میں چینل 4 کے ایک انٹرویو کے دوران میزبان نے ٹیولپ صدیق سے پوچھا تھا کہ انہوں نے بنگلہ دیش میں کبھی اپنی خالہ کو چیلنج کیوں نہیں کیا جن پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا الزام ہے۔ اس بحث کے بعد پروگرام کے ایڈیٹر نے شکایت کی تھی کہ ٹیولپ صدیق کا رویہ ایک حاملہ پروڈیوسر کے ساتھ "دھمکی آمیز" تھا، بعد ازاں ٹیولپ صدیق نے اپنے رویے پر معافی مانگ لی تھی۔

ادھر شیخ حسینہ کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد حالیہ دنوں میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان تعلقات میں بہتری آئی ہے اور سفارتی سطح پر بہت سی پیش رفت ہوئی ہیں جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی اور تجارتی تعلقات میں تیزی سے قربت بڑھ رہی ہے جس سے دونوں ممالک کے درمیان غلط فہمیوں کی دیواریں منہدم ہونا شروع ہو گئی ہیں اور ملکی تجارت میں ایک بہترین اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ اب بنگلہ دیش نے پاکستانی طلبا کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی اجازت بھی دے دی ہے۔ دوسری جانب پاکستان نے بھی بنگلہ دیشی شہریوں اور طلبا کیلئے ویزا حاصل کرنے کے عمل کو خاصا آسان بنا دیا ہے اور بنگلہ دیشی طلباء کو پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں داخلے کیلئے بہترین سہولتوں کا اعلان کر دیا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی پرووائس چانسلر پروفیسر سائمہ حق بیدیشہ نے بتایا کہ یہ فیصلہ 13 نومبر کو وائس چانسلر پروفیسر نیاز احمد خان کی صدارت میں منعقدہ سنڈیکیٹ اجلاس میں کیا گیا۔ نئی پالیسی کے مطابق پاکستانی طلبا ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکیں گے اور بنگلہ دیشی طلبا پاکستان میں تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اس فیصلے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ شیخ حسینہ کے اقتدار سے باہر ہونے کے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مختلف سطحوں پر قربت مسلسل بڑھ رہی ہے۔

واضح رہے کہ حال ہی میں 1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پہلی بار پاکستان کا بنگلہ دیش کے ساتھ سمندری رابطہ بحال ہوا جب ایک پاکستانی مال بردار جہاز کراچی سے بنگلہ دیش کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع چٹاگانگ کی بندرگاہ پر پہنچا۔ اس سے پہلے دونوں ممالک کے درمیان بحری تجارت سنگاپور یا کولمبو کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر سیما حق بیدیشہ نے بنگلہ دیش کے انگریزی اخبار ڈھاکہ ٹریبیون کو بتایا کہ "پاکستان کے ساتھ تعلقات کئی سطحوں پر اچھے نہیں تھے جس کی وجہ حسینہ کا پاکستان دشمنی اور ہندوستان کا دباؤ تھا لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ ہمارے بہت سے طلبا سکالرشپ پر پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ کئی لوگ تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل

کرلیا ہے۔اس معاملے میں پاکستان کے ساتھ معمول کے تعلقات بحال کر دیے گئے ہیں،اب دوسرے اداروں کو بھی بڑھ کر ملکی مفاد کیلئے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے جس کی داغ بیل ہم نے ڈال دی ہے"۔

ڈھاکہ یونیورسٹی نے بنگلہ دیش کی تاریخ میں ایک اہم کردارادا کیاہے۔بنگلہ دیش میں حکومتوں کے خلاف احتجاج کی آواز بھی اسی یونیورسٹی سے اٹھی ہے۔اس سال جولائی،اگست میں شیخ حسینہ کے خلاف تحریک کا آغاز بھی ڈھاکہ یونیورسٹی سے ہوا۔یادرہے کہ بھارتی خفیہ ایجنسیوں بالخصوص "را" نے اسی یونیورسٹی سے 1971 کی جنگ میں بھی اہم کردارادا کیا تھا۔ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا اوراساتذہ کو پاکستان کے فوجی آپریشن سرچ لائٹ کے دوران نشانہ بنانے کا جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے بنگالی عوام کو اشتعال دلانے میں اہم کردارادا کیا تھا۔

حسینہ واجد نے اپنے بھارتی آقاؤں کی مدد سے ڈھاکہ یونیورسٹی کو پاکستان مخالف تحریک کی جائے پیدائش کے طور پر استعمال کرتے ہوئے خوب شہرت پائی اور شیخ حسینہ کی حکومت کے دوران یونیورسٹی میں یہ مطالبہ کیاگیاکہ پاکستان 1971 میں مشرقی پاکستان میں نسل کشی پر معافی مانگے۔اسی پر اکتفا نہیں کیاگیابلکہ شیخ حسینہ کے خصوصی حکم پر2015 میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں پاکستانی طلبہ کے داخلے پر پابندی عائد کردی گئی تھی لیکن آج قدرت اور تاریخی مکافاتِ عمل کا یہ فیصلہ سامنے آیاہے کہ اسی یونیورسٹی سے حسینہ کے تمام احکامات کو منسوخ کرتے ہوئے ڈھاکہ یونیورسٹی نے پہل کرتے ہوئے انقلابی اقدامات اٹھاتے ہوئے نہ صرف پاکستانی طلباء کیلئے داخلوں کی اجازت دے دی ہے بلکہ ملک کے تمام اداروں کو پاکستان دشمنی کے تمام اقدامات کو ختم کرنے کامشورہ بھی دیاہے۔

مودی سرکار بنگلہ دیش میں بری طرح ناکامی کے بعد شب وروز مختلف قسم کے پروپیگنڈہ پھیلانے کی کوششوں میں مصروف ہے جس میں اس نے بنگلہ دیش کی عبوری حکومت پر اقلیتوں خصوصاً ہندوؤں پر حملے کروانے اوراسلامی انتہاپسندوں کی حمایت کرنے کے الزامات بھی لگائے جارہے ہیں۔ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی اپنی انتخابی مہم میں بھارتی ہندوووٹرز کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے تشویش کااظہار کیا تھا۔

بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے چیف ایڈوائزر محمد یونس نے 18 نومبر کو بھارتی انگریزی اخبار "دی ہندو" کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ہندوؤں پر حملے سے متعلق سوالات کو پروپیگنڈا قرار دیا۔محمد یونس نے کہا کہ "ٹرمپ کے پاس بنگلہ دیش اوراس کی اقلیتوں کے بارے میں مناسب معلومات نہیں ہیں لیکن جب ٹرمپ کو حقیقت کا علم ہو گا تو وہ بھی حیران رہ جائیں گے۔میں یہ نہیں مانتا کہ امریکا میں نئے صدر کے آنے سے سب کچھ بدل جائے گا۔اگرامریکا میں اقتدار میں تبدیلی ہوئی ہے تو بنگلہ دیش میں بھی ایساہی ہواہے۔ایسی صورتحال میں آپ کو تھوڑاانتظار کرناچاہیے۔ہماری معیشت درست راستے پر ہے اورامریکا اس میں بہت دلچسپی لے گا"۔

"دی ہندو" نے ان سے سوال کیاکہ یہ صرف ٹرمپ کامعاملہ نہیں ہے۔انڈیانے بھی کئی بار پریس کانفرنسز میں بنگلہ دیش میں ہندوؤں پر حملوں کامعاملہ اٹھایاہے۔اس کے جواب میں محمد یونس نے کہاکہ 16 / اگست کو میری وزیراعظم مودی سے فون پر پہلی بات چیت ہوئی تھی۔مودی نے بھی بنگلہ دیش میں اقلیتوں کے ساتھ برے سلوک کے بارے میں بات کی۔میں نے انہیں واضح طور پر بتایاکہ یہ سب پروپیگنڈا ہے"۔انہوں نے مزید کہاکہ "کئی صحافی

یہاں آئے، اور کئی لوگوں نے کشیدگی کے بارے میں بات کی لیکن حقیقت وہ نہیں ہے، جو میڈیا میں کہی جارہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس پروپیگنڈے کے پیچھے کون ہے لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بعد ازاں تحقیقات کے بعد یہ پروپیگنڈہ بھی بے نقاب ہو گیا کہ دراصل مندر کے ساتھ عوامی لیگ کا دفتر تھا جہاں سے مظاہرین کے ہجوم پر پتھراؤ کیا گیا جس کے جواب میں مشتعل ہجوم نے جوابی طور پر پتھر برسائے جس کو مندر پر حملہ قرار دیکر جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا۔

بنگلہ دیش میں انڈین ہائی کمشنر پرنے ورمانے 17 نومبر کو "بے آف بنگال کنورسیشن" میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بنگلہ دیش میں اقتدار کی پر تشدد تبدیلی کے باوجود انڈیا کے بنگلہ دیش کے ساتھ اقتصادی، ٹرانسپورٹ، توانائی اور عوامی سطح پر تعلقات مثبت ہیں۔ ہمارے تعلقات کثیر الجہتی ہیں اور کسی ایک ایجنڈے پر منحصر نہیں ہیں"۔

تاہم پاکستان میں بنگلہ دیش کی نئی حکومت کا مؤقف مثبت طور پر لیا جارہا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ شیخ حسینہ کا اقتدار سے باہر ہونا پاکستان کیلئے ایک اچھا موقع ہے۔ انڈیا شیخ حسینہ کے اقتدار سے باہر ہونے پر خوش نہیں ہے۔ انڈین لابی امریکا میں بنگلہ دیش کے خلاف فعال ہو گئی ہے۔ یہ لابی ٹرمپ انتظامیہ کو بنگلہ دیش پر پابندیاں عائد کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بنگلہ دیش سے برآمد ہونے والے زیادہ تر گارمنٹس امریکا کو بھیجے جاتے ہیں۔ ٹرمپ نے ٹیرف عائد کرنے کی وکالت کی ہے۔ اگر ٹرمپ ٹیرف لگاتے ہیں تو بنگلہ دیش کو بہت نقصان ہو گا"۔

بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان سمندری روابط کا آغاز ایک خوشگوار معاشی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک پاکستانی کارگو جہاز براہ راست چٹاگانگ پہنچا ہے۔ اس سے پہلے دونوں ممالک کے درمیان جتنی بھی تجارت ہوتی تھی وہ سنگاپور اور سری لنکا کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اس سے انڈیا میں ہلچل اور ماتم کا سماں ہے۔ بنگلہ دیش کی قیادت اب بہت کھلے ذہن کی حامل ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ انڈیا کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے خلاف ہیں لیکن انہوں نے اپنے مواقع کھلے رکھے ہیں اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کیوں نہ بڑھائے جائیں۔ اب اگلا قدم یہ ہو گا کہ تجارتی اور صنعتی دنیا کی تنظیمیں بھی ایک دوسرے کے دورے کریں گی اور ممکن ہے کہ اگلے سال تک دونوں ممالک کے درمیان خارجہ سیکرٹریز کی سطح پر بات چیت شروع ہو جائے۔

بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمن پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ شیخ مجیب نے ذوالفقار علی بھٹو (جو بعد میں وزیر اعظم بنے) سے اس وقت تک بات کرنے سے انکار کر دیا تھا جب تک پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرلے۔ پاکستان نے بھی ابتدا میں بنگلہ دیش کی آزادی کو مسترد کر دیا تھا لیکن پاکستان کے رویے میں اچانک تبدیلی آئی اور فروری 1974 میں اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو نے بطور وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمن کو باضابطہ دعوت بھیجی۔ پہلے تو مجیب نے شرکت سے انکار کر دیا لیکن بعد میں اس دعوت کو قبول کر لیا گیا۔

اس کانفرنس کے بعد انڈیا، بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ ہوا۔ ان تینوں ممالک نے 9 اپریل 1974 کو ایک معاہدے پر دستخط کیے تاکہ 1971 کی جنگ کے بعد باقی ماندہ مسائل کو حل کیا جاسکے۔ پاکستان نے 28 اگست 1973 کے انڈیا اور پاکستان کے درمیان معاہدے میں درج چاروں اقسام کے غیر بنگالیوں کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ پاکستان کی وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کی جانب سے ایک بیان جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ اگر پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں کسی قسم کا جرم کیا ہے تو یہ قابل افسوس ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جون 1974 میں ڈھاکہ کا دورہ کیا۔اس دورے کے دوران بنگلہ دیش نے اثاثوں کی تقسیم کا معاملہ اٹھایا۔اس دورے سے دونوں ممالک کے تعلقات میں برف پگھلنے لگی۔پاکستان نے 22 فروری 1974 کو او آئی سی کے اجلاس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ "اللہ کے نام پر اور اس ملک کے شہریوں کی جانب سے ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔کل ایک وفد آئے گا اور ہم انہیں 7 کروڑ مسلمانوں کی جانب سے گلے لگائیں گے۔اس مشترکہ اعلامیہ کے بعد انڈیا کو بنگلہ دیش بنانے کے سلسلے میں تمام سرمایہ کاری کے ساتھ اپنا دل بھی ڈوبتا نظر آنے لگا اور اسی دن یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ بظاہر بنگلہ دیش کو ایک آزاد ملک رہنا دیا جائے لیکن اس کی تمام ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی جائے جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش میں مجیب الرحمان کے قتل سے لیکر جنرل ضیاء الرحمان، جنرل حسین محمد ارشاد اور بیگم ضیاء سے لیکر حسینہ واجد کے اقتدار میں آنے تک کی تمام حکومتوں کو مسلسل اندرونی اور داخلی مسائل میں مبتلا رکھا گیا اور اس سارے عرصے میں مجیب الرحمان کی بیٹی حسینہ واجد جو اپنے والد کے قتل کے موقع پر انڈیا میں موجود تھی، کی انڈیا میں پرورش کی گئی اور بالآخر حسینہ واجد کو اقتدار میں لا کر انڈیا نے خود کو خطے کی سپر پاور بنانے کیلئے دیگر ہمسایہ چھوٹی ریاستوں پر اپنی پالیسیوں کو جبراً نافذ کرنے کی کوششوں کا میں اضافہ کر دیا۔

ادھر پہلی مرتبہ 14 جنوری 2025 کو بنگلہ دیش کے آرمڈ فورسز ڈویژن کے پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹننٹ جنرل ایس ایم قمر الاسلام نے جی ایچ کیو راولپنڈی میں پاکستان کے آرمی چیف جنرل عاصم منیر سے ملاقات کے دوران خطے کے بدلتے سیکورٹی حرکیات پر مفصل بات چیت کی اور دونوں ممالک کے درمیان مزید فوجی تعاون کی راہیں نکالنے پر غور کیا اور مضبوط دفاعی تعاون کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے دونوں برادر ممالک کے درمیان شراکت داری اور تعاون بیرونی اثرات سے بالاتر ہونے کی یقین دہانی کروائی۔

دوسری طرف سری لنکا نے بہادری کے ساتھ انڈیا کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے اپنی خود مختاری کو قائم رکھتے ہوئے پاکستان اور چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو اک نئی جہت دی ہے۔یاد رہے کہ سری لنکا جو برسوں سے انڈیا کی پراکسی "تامل دہشتگردوں" کی بناء پر خانہ جنگی جیسی مشکلات میں مبتلا تھا، پاکستانی کمانڈوز کی خوصی مدد سے سری لنکا کو اس مصیبت سے مکمل نجات ملی ہے جس کی بناء پر ہر شعبے میں دونوں ممالک کے تعلقات انتہائی خوشگوار اور دوستانہ ہیں اور اب بنگلہ دیش میں آنے والی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے انڈیا پر یہ خوف طاری ہے کہ نیپال، بھوٹان، مالدیپ اور میانمار کے چین اور پاکستان سے بڑھتے ہوئے تعلقات مہابھارت کا خواب چکنا چور کرنے کیلئے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انڈیا پھر سے افغان طالبان اور ایران کی سرزمین کو پاکستان کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان ان حالات سے اپنے ہمسایہ ملک چین کے ساتھ سر جوڑ کر مکمل طور پر استفادہ کرنے کیلئے کوشاں ہے؟

بروز اتوار 26 رجب المرجب 1446ھ 26 جنوری 2025ء